
١١٩٤

# نئی کارمینا نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ

ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں ایک مدت سے عالمی شہرت یافتہ کارمینا کو زیادہ موثر بنانے کے لیے تحقیق جاری تھی تاکہ اسے دورِ جدید کے انسان کی ضروریات سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ نئی کارمینا اسی تحقیقی عمل کا ماحصل ہے۔ پودینے کے جوہر اور دیگر مفید اجزا کی شمولیت نے نئی کارمینا کو زیادہ قوی اور زود اثر بنا دیا ہے۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کو درست رکھنے میں اب پہلے سے زیادہ مفید و معاون ہے۔ خرابیٔ ہضم کی شکایات مثلاً بدہضمی، قبض، گیس، دردِ شکم اور بھوک کی کمی وغیرہ کے لیے اس کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

دردِ شکم میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں۔

---

بدہضمی، قے یا متلی کی شکایت میں نئی کارمینا کی دو ٹکیا

---

نئی کارمینا کی دو سے چار ٹکیاں باقاعدگی کے ساتھ سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کی جائیں قبض سے نجات مل جاتی ہے۔

---

بھوک کی کمی کی شکایت میں صبح ناشتے سے پہلے دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیے۔

---

بچوں کو حسبِ عمر آدھی یا ایک ٹکیہ نئی کارمینا د

---

خوش ذائقہ

## نئی کارمینا



ہمدرد

ہر گھر کی اہم ضرورت






Adarts CAR 1/88

سنجیدہ اور فکری ادب کا نمائندہ




کراچی

جلد: ۲ ——— شمارہ: ۲

——— اگست ۱۹۸۸ء

چیئرمین ریڈرز پبلیکیشنز ——— عبداللہ دادا بھائی

مدیر ——— حسنین کاظمی

مدیر معاون اعزازی ——— ممتاز مرزا

معاون اعزازی ——— مشرف احمد

عام شمارہ ——— ۱۰ روپے

سالانہ ——— ۱۱۰ روپے

ششماہی ——— ۵۵ روپے

بیرون ملک ——— سالانہ ۲۵ پونڈ یا ۴۰ ڈالر

پتہ: ماہنامہ "دائرے" شاہین چیمبرز ۴۔ کمرشل ایریا
بلاک ۷، ۸ کے۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی۔ ٹیلیفون نمبر ۴۳۵۸۰۴

پرنٹر وسیم احمد صابری نے شیخ سلطان ٹرسٹ پریس ۲۵ سول لائنز۔ ابیومنٹ سے چھپوایا
اور سید محمد فضل پبلشر نے ریڈرز پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی کی جانب سے شائع کیا۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی



علامہ اقبال نے آزادی کو بحرِ بیکراں سے تعبیر کیا ہے۔
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت پاکستان کی کشتی پر ہم نے اسی
بحرِ بیکراں میں اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔
آیئے غور کریں کہ اس کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کے
لئے ہم کیا کر رہے ہیں!



دادا بھائی فاؤنڈیشن ــــــ دائرے کے اشتراک کے ساتھ

# شمارہ نما

اداریہ

# پہلی کرن

اگست کا مہینہ برصغیر کے رہنے والوں کے لئے آزادی کے حصول کی یادیں اپنے ساتھ لاتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ان یادوں میں فخر و سربلندی کا بڑا سامان ہے۔ اس آزادی کے لئے قربانی دینے میں مسلمان ہمیشہ پیش پیش رہے۔ مسلمانوں نے برصغیر میں انگریزوں کے استعماری اقتدار کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی کبھی نہیں بھولے کہ اپنے نظریۂ حیات اور اپنی صدیوں کی تاریخ کی بنیاد پر وہ اپنے لیے ایک آزاد اور جداگانہ مملکت کے حصول کا حق رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر تو برطانوی ہند میں مسلمان اقلیت میں تھے لیکن شمال مشرق اور شمال مغرب کے علاقوں میں ان کو عددی اکثریت بھی حاصل تھی لہٰذا اسی سیاسی اصول یعنی جمہوریت کے تحت جسے انگریزوں نے برصغیر میں متعارف کیا، مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا مطالبہ ممکن اور قابلِ حصول بنا۔

آزادی انسان کے لئے زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے، قدرت کا سب سے بڑا انعام ہے۔ ہمارا دین، اسلام، تکریم آدمیت کا علمبردار ہے اور توحید پر ایمان انسان کے لئے ہر نوعیت کی غلامی سے نجات کا سب سے محکم اور معتبر وسیلہ ہے اور اگر ہم اپنے جذبات اور خواہشات اور اپنے مفادات اور تعصبات سے مغلوب ہونے کی روش ترک کر دیں تو پھر یہ آزادی جسے ہم نے بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے، یہ تا ابد قائم رہے گی، انشاءاللہ۔

۱۶ اگست بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کا یوم وفات ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے ایک مضمون شامل اشاعت ہے۔

اس مرتبہ دائرے کی کتابت میں ایک تجربہ کیا جا رہا ہے اور دو طویل مضامین نستعلیق کتابت کے بجائے ٹائپ کے عکس میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ قارئین کرام اس سلسلے میں اپنی رائے سے نوازیں تو ہمیں آئندہ کے لئے فیصلے میں آسانی رہے گی۔

---

معروف نقاد اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کے داماد گزشتہ دنوں بہ عارضہ سرطان انتقال کر گئے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

حسنین کاظمی

سرشار صدیقی

# حمد

## وظیفۂ گردشِ لہو ہے

خامشی خود ایک زباں ہے
جس میں آوازوں کی کوئی گونج نہیں ہے
جس میں لفظوں کی کوئی تشکیل نہیں ہے

---

اپنے رب کی حمد و ثنا میں
دھڑکن کا مدّھم آہنگ ہو
یا، سانسوں کے زیر و بم کا
اک بے نام تسلسل ——
کیا ہے ؟
اگر یہ تسبیح و تحلیل نہیں ہے

---

عرشِ اَنا سے واپس آکر
ذاتِ کی خاک بسر رفعت پر
اپنے یقیں کی محرابوں میں
آنکھوں کا پیشانی بن کر
فرشِ زمیں کو بوسہ دینا
کیا یہ ——
روح کے سجدہ کرنے کی تمثیل نہیں ہے

---

میری یہ خاموش عبادت
میرے ایماں سے ہے عبارت
میرا عقیدہ
میری عقیدت
جذبوں کی تاویل نہیں ہے

---

# نعت

کس کی جراَت آئے خاک برابر سائیں
تیرے در کا ادنیٰ سا ہوں نوکر سائیں

میں نے پہنا طوق غلامی کا جس دن سے
مجھ سے ترساں دارا اور اسکندر سائیں

عرش بنا قدموں کے صدقے "عرش معلیٰ"
تیرے چرچے تو افلاک سے اوپر سائیں

عارض صبح، شام ہیں زلفیں، پھول پسینہ
دھوون تیرے قدموں کی ماہ واختر سائیں

بنجر دل سے ٹھنڈے میٹھے چشمے پھوٹے
تیرے دم سے موم ہوئے ہیں پتھر سائیں

منزل تو خود اُس کی خاطر سرگرداں ہے
جس اُمت نے تجھ سا پایا راہبر سائیں

تجھ کو بخشی مولا نے نبیوں کی امامت
میرے آقا میرے پاک پیمبر، سائیں

شرم سے دامنگیر گناہوں کی عریانی
بخش مجھے بھی اپنے کرم کی چادر، سائیں

کاش مجھے بھی اپنے پاس بلاتے آقا
مدت گذری میں ہوں گھر سے بے گھر سائیں

آپ کے در کو چھوڑ کے آخر، درد کا مارا
آپ بتائیں جائے کہاں یہ بابر، سائیں

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

# آزادی کے بعد اُردو دانشوری کا جائزہ

اس مختصر مقالہ کا موضوع آزادی کے بعد اُردو دانشوری کا ایک جائزہ ہے دانشوری کا مفہوم بڑا وسیع ہے اور اس میں شعروادب کے علاوہ جملہ علوم وفنون آجاتے ہیں۔ وہ علوم بھی جن کا تعلق محض فکر، فلسفہ، منطق اور علوم متعلقہ سے ہے اور وہ جن کا تعلق تاریخ، سیاست، تعلیم، حیاتیاتی (BIOLOGICAL) اور طبعیاتی (PHYSICAL) علوم (SCIENCES) سے ہے۔ مذہبیات اور اس کے مختلف مباحث اور موضوعات بھی اس میں شامل ہیں اور زندگی کے لئے مستقبل کی منصوبہ بندی کی تجاویز اور منصوبوں کا مطالعہ بھی دانشوری کا حصہ ہے۔ یہ جملہ موضوعات کسی بھی زبان میں ادا ہو سکتے ہیں، لیکن کتنے، کس حد تک اور کس معیار تک، اس کا تعلق اس زبان سے ہے جس کو ان کے اظہار اور ان پر بحث کا ذریعہ بنایا جائے، اس کے ذخیرۂ الفاظ، اس کے تاریخی سرمائے، اس کی علمی اور فنی روایات، اس کے اسالیب اور سب سے زیادہ اس زبان اور اس کے ذریعے ماضی، حال اور مستقبل پر غور وفکر کے لئے احساس ذمہ داری یا (COMMITMENT) یہ احساس ذمہ داری جو فکر و دانش کی اساس ہے جبر و زبردستی یا (REGIMENTATION) سے پیدا نہیں ہوتا، سوائے ایسی صورت کے جب یہ جبر یا (REGIMENTATION) خود اس فکر کی بنیاد بن جائے جس پر دانشور ایمان رکھتا ہو اور یہ جبر پھر جبر نہیں رہتا معمول بن جاتا ہے۔ آپ اسے عقیدہ کہیں، مذہب، ایمان، نظریہ چاہے جس نام سے یاد کریں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کے عشرہ میں آزادی کی جدوجہد اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور ہمارا شعروادب بھی اس کی عکاسی کر رہا تھا، شاعروں اور ادیبوں کا تعلق خواہ دائیں بازو سے تھا یا بائیں بازو سے اس جدوجہد میں سب یکساں طور پر شریک اور فعال تھے، اس لئے اس دور کے ادب میں فکری اعتبار سے بڑا عزم و استقلال، کرب و بے چینی، مستقبل کا خواب جھلکتا تھا، لیکن بعض پہلو ایسے تھے جہاں فکری دھارے الگ الگ تھے،

ایک متحدہ ہندوستان یا آزاد پاکستان اور آزاد بھارت ایک طرف وطن کو قوم کی بنیاد اور دوسری طرف مذہب اور دین کو اس کی اساس سمجھا جا رہا تھا ان دو فکری اور نظریاتی تقاضوں کی منطق اس مقالہ کا موضوع نہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دونوں محاذ اپنی اپنی فکر کے مطابق ایک مقصد یعنی آزادی کے حصول کے لئے جد و جہد میں مصروف تھے۔

اسی عشرہ میں اس تحریک کے شباب کا دور شامل ہے جسے اصطلاحی طور پہ ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا تھا، اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہوگا کہ اس تحریک نے اس ملک میں جنم نہیں لیا تھا اور اس کے رشتے اور تانے بانے ایک وسیع تر نظریاتی تحریک سے منسلک تھے، اس کا سارا زور انقلاب اور بغاوت پہ تھا اور یہ فکری رویہ صرف سیاست تک منحصر اور محدود نہیں تھا بلکہ اس کی زد میں بلکہ اخلاقی اور تہذیبی قدریں آگئی تھیں جن کو اس تحریک کے علمبردار ایک فرسودہ نظام کی نشانی سمجھتے تھے اور ایک نئے نظام کے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے قدامت اور روایت کے اس اندھیرے کو دور کرنا ضروری تھا یہ طوفان ایسی شدت سے اٹھا کہ بظاہر تمام سماجی قدریں اور روایات اس کے زور کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہتی نظر آئیں لیکن آندھی صرف چڑھنے کے لئے ہی نہیں آتی، یہ اترتی بھی ہے اور جب اترتی ہے تو پھر مطلع صاف ہوتا ہے۔ یہ عشرہ گزر گیا تو اس انداز فکر میں بھی تبدیلی آئی اور یہ تبدیلی اس اعتدال کی صورت میں نظر آتی ہے جس میں روایت کی اہمیت اور تجربے کی ضرورت میں ہم آہنگی کو ایک صحت مند اور مثبت ادبی نظریہ کے طور پہ قبول کیا گیا، ۱۹۶۰ء کے بعد کی شاعری، تنقید اور ادب کی تمام دوسری اصناف میں اس کا اظہار ملتا ہے اور قدرتی طور پر یہاں ایک نئے فکری دور کے آثار ملتے ہیں۔

آزادی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان اور بھارت دونوں میں آزاد مملکتوں کی حیثیت سے قیام کے بعد، تعمیر نو کا ایک احساس اور ضرورت جنم لیتی ہے۔ آزادی جو بڑی جانی، مالی اور ہر طرح کی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی تھی اسے قائم رکھنے اور بدلے ہوئے حالات میں نئے تقاضوں کو پورا کرنے اور نئے چیلنج قبول کرنے کی اہمیت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ ان کاموں کے لئے جذبات کی شدت سے زیادہ فکر کے ٹھہراؤ کی ضرورت ہوتی ہے، تعمیر نو کے نئے منصوبے جذبات کے ساتھ فکر کی گہرائی، علم کی گہرائی اور صلاحیتوں کے مناسب استعمال کی حاجت ہے۔ اس لئے اس عشرہ کے فوراً بعد اگرچہ بعض اصناف خصوصاً شاعری اور افسانوی ادب میں ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ان سے پیدا ہونے والے واقعات اور معاملات کا احساس اور اظہار شعر و ادب میں سب سے نمایاں عنصر ہے لیکن ایک عشرہ میں ہی سنجیدہ فکر اور تعمیری جذبہ سامنے آجاتا ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، آیئے اردو کے حوالے سے اس سلسلے کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

اعلیٰ ترین سطح پہ ہر طرح کے علمی اور ادبی، تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور مباحث کے لئے اردو کو ذریعۂ اظہار بنانے سے اس بات کی مزید تصدیق ہو گئی کہ اردو میں تمام علوم و فنون کے اظہار کی جس میں دنیا کے جدید ترین علوم شامل ہیں پوری صلاحیت ہے۔ ضرورت صرف اس صلاحیت سے کام لینے کی ہے اس تصدیق کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انگریزی کی بالادستی اور ہمارے پورے تعلیمی اور تہذیبی نظام میں اس کی گرفت اب آہستہ آہستہ کمزور پڑ رہی ہے اور یہ بات پوری طرح تسلیم کر لی گئی ہے کہ کسی غیر ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم و تحقیق بنا کر کسی اعلیٰ منزل تک

رسائی تو دور کی بات ہے معمولی علمی و فنی استعداد بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس اندازِ فکر کی تبدیلی کا کچھ اندازہ مختلف اداروں سے ہوتا ہے جو مختلف منصوبوں کی تکمیل کے لئے قائم کئے گئے۔ ان میں سے بعض اداروں کا قیام ہماری تہذیبی روایات اور تاریخی سرمائے کے تحفظ کی خاطر عمل میں آیا۔ مثلاً انجمن ترقی اُردو جس نے ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی اُردو کے قدیم ادب کی بازیافت میں گراں قدر خدمات انجام دی تھیں ان کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ اس سلسلے میں انجمن نے قاموس الکتب کی کئی جلدیں شائع کیں جن میں اُردو کی کتابوں کا موضوع کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے مولوی عبدالحق کی مرتبہ لغت کبیر کی دو جلدیں شائع کیں، تذکروں اور تاریخوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے اور بعض نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ انجمن نے پی ایچ ڈی کے لئے لکھے جانے والے بعض مقالات بھی شائع کئے اور اس طرح قدیم ادبی آثار اور روایات کے تحفظ کے کام کو آگے بڑھایا۔

کم و بیش اسی مقصد کے لئے ایک اور ادارہ مجلس ترقی ادب کے نام سے شائع ہوا، مجلس نے بھی اپنے منصوبوں میں سب سے زیادہ اہمیت اُردو کے قدیم آثار اور روایات کے تحفظ کو دی ہے، مثلاً مجلس نے سر سید احمد خاں کے مضامین و مقالات کئی جلدوں میں مرتب کر کے شائع کئے، تذکروں کے بعض اڈیشن نئی ترتیب و تدوین کے ساتھ شائع کئے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے اُردو میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی پر جو کام ہوا تھا وہ اس مقصد کے لئے قائم ہونے والے اداروں نے کیا تھا، مثلاً دلی کالج کا دار الترجمہ، سائنٹفک سوسائٹی سر سید احمد خان والی، جامعہ عثمانیہ وغیرہ لیکن اب یہ کام ان تمام اداروں نے اپنے ذمہ لیا جو اُردو کے علمی سرمایہ میں اضافہ کو بھی اپنے فرائض میں شامل سمجھتے تھے، مثلاً مجلس نے جدید طبعیات کا تعارف از پروفیسر محمود انور، نامور مسلم سائنسداں از حمید عسکری، خلاء کی تسخیر از حبیب اللہ خان شائع کیں، دو جلدیں طب جدید پر بالتصویر ماہیت الامراض کے عنوان سے حکیم محمد شریف جامعی نے شائع کی۔

مرکزی ترقی اُردو بورڈ بھی کم و بیش ان مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم ہے بنیادی طور پر اس کے ذمہ اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے مناسب منصوبوں پر عمل کرنا تھا، ایک کام اس بورڈ نے یہ کیا کہ اُردو کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والے پچاس سال کے مضامین کا ایک اشاریہ یا (INDEX) تیار کرایا۔ افسوس کہ یہ بعض اسباب کی بنا پر شائع نہیں ہو سکا لیکن کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں محفوظ ہے، اس کا ایک اور اہم منصوبہ بنیادی اُردو، کا تعین تھا، یہ لغت اب شائع ہو چکی ہے اور اس کے بنیادی اُردو پنجابی، بنیادی اُردو سندھی اڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں بعض اور دو لسانی لغت بھی تیار ہوئے لیکن یہ شائع نہیں ہوئے، البتہ ایک پانچ لسانی لغت اس ادارہ نے شائع کی۔

اُردو کے حوالے سے ایک INTER-DISCIPLINARY منصوبہ بندی، مطالعے اور تحقیق کی روایت کو تقویت پہنچی جو پھر دراصل ہماری ایک قدیم علمی روایت کی بازیافت ہے، پچھلی نصف صدی کو تخصیص یا (SPECIALIZATION) کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے اور اس روایت نے ایسے ماہرین پیدا کئے جو اپنے علوم میں درجہ کمال کو پہنچ گئے لیکن علوم کے باہمی ربط اور انحصار کے علم سے محروم ہو گئے، ہمارے پرانے علماء بیک وقت عالم دین بھی تھے، اس کے لئے وہ زبان ادب لغت اور قواعد کے بھی عالم

ہوتے تھے، منطق، فلسفہ، حکمت، کیمیا، شعر و ادب سب پر اُن کی نظر ہوتی تھی اور وہ حقیقی معنوں میں جامع علوم تھے اور ان کی اس جامعیت کا فیض ان کے شاگردوں تک پہنچتا تھا، دورِ جدید کے شاگرد ایسے اساتذہ اور علماء کی فیض رسانی سے محروم ہو گئے، اب اس طرح کے بین العلوم مطالعے اور تحقیق کی اہمیت کو محسوس کیا جانے لگا ہے اور بعض علوم و فنون اعلیٰ تعلیم کے لیے بعض دوسرے علوم اور شعبوں کا علم بھی ایک لازمی شرط قرار دیا جانے لگا ہے۔ ہمارے نظامِ تعلیم، تدریس اور تحقیق میں یہ بھی ایک اہم موڑ ہے۔

جیسا کہ میں اس مقالہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اردو کے حوالے سے جب فکری اور ذہنی تجزیہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ایک بات جو خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے وہ تاریخی شعور اور روایت کی اہمیت اور تسلسل کا احساس ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اردو میں بعض اہم تاریخی دستاویزات کا ترجمہ ہوا ہے اور تاریخ اور تہذیب کے مختلف ادوار پر کئی کتابیں، مضامین اور مقالات لکھے گئے ہیں۔

خالص فلسفہ، مابعد الطبیعات، منطق اور معقولات و منقولات پر بھی اس فن کے ماہرین کی توجہ رہی، ابتدائی دور میں پروفیسر محمد شریف صاحب اور خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے فلسفہ کے بعض موضوعات پر اور خلیفہ صاحب نے اقبال کی فکر اور فلسفہ پر مضامین اور کتابیں تصنیف کیں، اس سمت میں بھی فلسفہ کی بعض بنیادی کتابوں کے ترجمے اور ان کے جدید اڈیشن تعلیقات اور حواشی کے ساتھ شائع ہوئے۔

مذہب کے حوالے سے ۱۹۴۷ء میں تصنیف تالیف و ترجمہ ہونے والی کتابوں، مضامین اور مقالات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو آج بھی جاری ہے۔ بعض تصانیف انفرادی ہیں بعض اداروں، انجمنوں وغیرہ نے بھی اس قسم کی تصانیف کا پورا سلسلہ شروع کیا ہے اور اس موضوع پر بنیادی مسائل اور عصری مسائل و معاملات دونوں کی طرف توجہ رہی ہے۔

یوں تو پاکستان میں اُردو میں بہت سے رسالے شائع ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض کا علمی اور ادبی معیار خاصا بلند ہے لیکن بعض رسالے جن کی حیثیت محض ایک رسالے کی نہیں تھی بلکہ جو بذاتِ خود ایک ادارہ تھے ختم ہو گئے ان میں ادبی دنیا خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، مولانا صلاح الدین احمد جو اس کے مدیر تھے ایک مردِ قلندر تھے اور درویشی اور قلندری کی جو صفات میں نے ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں اپنی آنکھوں سے ان کی ذات میں دیکھیں وہ کم لوگوں میں نظر آئیں۔ انہوں نے ادیبوں، انشاپردازوں، ناقدوں، شاعروں اور مضمون نگاروں کی پوری ایک نسل کی ذہنی تربیت کی اور موجودہ نوجوانوں کی ذہنی بیداری میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ نیرنگِ خیال بھی اپنی روایتی اہمیت ختم کر چکا، سر عبدالقادر کا مخزن اگرچہ اصل مخزن کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء سے پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی، افسوس کہ نئے ادبی مزاج کا ساتھ نہ دے سکا اور ختم ہوا، ایک اور تاریخی ادارہ ہمایوں تھا جو میاں بشیر احمد کے نام اور کام سے زندہ تھا، میاں صاحب خود ہماری تہذیبی روایات شرافت اور وضعداری کی ایک علامت تھے، ان کے بعد اب ایسا کوئی رسالہ نہیں رہا جسے ہمایوں کا درجہ دے سکیں، رسالہ اُردو جاری ہے لیکن اب یہ وہ نہیں جو عبدالحق کا رسالہ اُردو تھا، بات یہ ہے کہ رسالے صرف رسالے نہ تھے، ادبی تحریکات کے علمبردار تھے اور ان کے مدیر بڑی قدآور شخصیات تھے اور نیشنل کالج لاہور کا رسالہ اور نیشنل کالج میگزین اس علمی اور تحقیقی معیار کا تھا کہ برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی اسے

بڑی وقعت اور اہمیت حاصل تھی، یہ اب بھی نکلتا ہے لیکن اب
اس کا وہ معیار نہیں رہا۔ اس کا تاریخی دور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ
کی ادارت کے ساتھ ختم ہو گیا جو اب ایک دوسرے منصوبے یعنی
دائرۂ المعارف اسلامیہ یعنی لائیڈن والی ENCYCLOPEDIA
OF ISLAM کے ترجمے و اضافے کی تکمیل میں مصروف ہیں
جو بجائے خود ایک وقیع علمی کام ہے۔ [1]

اُردو میں خاص طور پر ۱۹۴۷ء کے بعد اقبال کے حوالے
سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں خود اقبال کے اپنے افکار و
خیالات کی اشاعت اور ان کی تشریح و توضیح کے علاوہ ان کی فکر
اور فن پر مختلف زاویوں سے جائزہ لیا گیا ہے اس سلسلے میں سب سے
پہلے علامہ اقبال کے وہ لیکچر یا خطبات ہیں جو
RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS
THOUGHT. IN ISLAM کے نام سے مشہور ہیں،
اگرچہ انگریزی اصل خطبات پر مختلف مضامین و مقالات موجود ہیں
لیکن مکمل خطبات کا (جن میں مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں
دیئے ہوئے چھ خطبے اور ساتواں خطبہ ARISTOLIAN
SOCIETY LONDON کی فرمائش والا شامل ہے) مکمل
ترجمہ سید نذیر نیازی نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ اگرچہ علامہ کی زندگی اور
ان کی نگرانی میں شروع ہوا تھا لیکن یہ ۱۹۵۸ء میں مکمل ہوا۔ نذیر
نیازی کے ترجمے میں خطبات کے دیباچہ میں اس کی فکری اہمیت
کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

"ان خطبات میں جو مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت
پر مرتب ہوئے اور مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں دیئے گئے
میں نے اسلام کی روایات فکر، علیٰ ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے
ہوئے جو علم انسانی کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں
الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک (مذکورہ بالا مقصد)
حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب نے متعلقاتِ خطباتِ اقبال
کے عنوان سے دس مقالات کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو ۱۹۷۷ء
میں علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات ولادت کے سلسلے کی مطبوعات
میں شامل ہے۔ اس تقریب میں اقبال کے حوالے سے بعض اور
کتب کا کچھ ذکر ہم آگے چل کر کریں گے، زیر نظر مجموعہ میں پہلا مقالے
کا موضوع اقبال اور دینی تجربہ ہے
اور اس میں سترہ (۱۷) ذیلی عنوانات میں دینی فلسفہ کی تشکیل نو اور
عقلیت سے متعلق اقبال کے مؤقف اور نیز اس مسئلہ پر بحث کی
گئی ہے ثقافت اسلامی کی روح علامہ کے ان خطبات کی روشنی
میں کیا ہے، دینی تجربات کی اصل حقیقت کیا ہے اور کیا دینی تجربہ
ممکن ہے۔ یہ اقبال کی فکر کا ایک بنیادی سوال ہے، اس ضمن
میں کانٹ اور اقبال کے نقطہ ہائے نظر کے بنیادی اختلاف کی مختصر
وضاحت کی گئی ہے اور مقالہ نگار کے نزدیک علامہ نے پانچویں
خطبے میں ثقافت اسلامی کی روح سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے
کہ اسلام میں مشاہدے اور حسی تجربے کا طریقہ قابل قبول ہے
لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اپنی خود اجباریت کی بنا
پر ذہن انسانی اپنے آپ کو ان حدود سے باہر لے جانے کی کوشش
کرتا ہے جو اولاً زمان و مکان نے پیدا کر دیئے ہیں، آخر میں مضمون نگار
لکھتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک دینی تجربہ ممکن ہے اور حکیم مشرق
کے پیغام کو اس منصوبے میں سمجھا جا سکتا ہے۔
"میں دعا کرتا ہوں لہٰذا میں کشف کر سکتا ہوں کہ دراصل یہ
ساری بحث علامہ کے ساتویں خطبے سے متعلق ہے جو آپ نے لندن

---
[1] ڈاکٹر عبداللہ اس زمانے میں زندہ تھے۔

میں دیا تھا' اس کے بعد دو مضامین علامہ اقبال کے سفر مدراس کی تفصیل اور دوسرے میں خطبات میں شامل معروف اور غیر معروف شخصیات کے احوال و افکار درج ہیں۔ اس کے بعد علامہ اقبال کا تصور تقدیر از محمد منور' اقبال کا تصور بقائے دوام از منظر حسین' خطبات میں علمائے اسلام کے حوالے ڈاکٹر امین اللہ وثیر' اقبال اور فخر رازی ڈاکٹر سید عبداللہ' گلشن راز جدید خطبات کے آئینہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ' اقبال اور شبستری ایک تقابلی مطالعہ' ڈاکٹر سید عبداللہ اور آخری مضمون اقبال کے ہم عصر عبداللہ قریشی کا ہے جس میں نادر کاکوروی اور میر غلام بھیک نیرنگ کا ذکر ہے۔ اقبال کے حوالے سے جامعات میں ان کی فکر و فن پر پی ایچ ڈی کے لئے کئی مقالے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض انگریزی میں ہیں لیکن اُردو میں لکھے جانے والے مقالات میں اسلامی تصوف اور اقبال' اقبال کا تصور بقائے دوام' اقبال کا تصور خدا' اقبال کا تصور مذہب' اقبال کا ذہنی ارتقاء' اقبال کا فلسفہ حیات' اقبال کا فلسفہ خودی اور اس کا ماخذ و مقصد' اقبال کا فلسفہ تعلیم' اقبال کا مرد مومن' اقبال کا نظریہ فن' اقبال کی شاعری میں تصور ابلیس' اقبال کے افکار و نظریات ملفوظات کی روشنی میں' اقبال کے معاشی نظریات' ڈاکٹر اقبال پر مولانا روم کا اثر' علامہ اقبال اور اجتہاد' علامہ اقبال کے سیاسی نظریات' فکر اقبال میں فلسفہ مزاجیت کا ایک جائزہ' وغیرہ یہ موضوعات اُردو میں فکری تخلیق و تنقید سے متعلق ہیں۔

اب تک اس مقالہ میں جو کچھ کہا گیا اسے پچھلے چالیس سال کی دانشوری کا اُردو میں پورا احاطہ نہیں کہہ سکتے اس میں صرف بعض نمایاں تحریکات' جہات موضوعات و مباحث سے چند نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ (تلخیص)



قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ڈاکٹر تہمینہ اختر

# جگن ناتھ آزاد کی تنقید "نشانِ منزل" کی روشنی میں

جگن ناتھ آزاد ہندوستان کے ایک مقبول و معروف شاعر ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ پاکستان میں بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے ہندوستان میں تو غلط نہ ہوگا۔ غالباً ان کی اسی شاعرانہ مقبولیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک نقاد کے طور پر اُردو دنیا میں انہیں اپنی حیثیت تسلیم کرانے کے لئے سالہا سال انتظار کرنا پڑا۔ حالانکہ ان کا سب سے پہلا تنقیدی مقالہ ۱۹۳۹ء میں ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔

لیکن وہ مقالہ اقبال کے متعلق تھا۔ اقبال اسکالر کے طور پر آزاد صرف برصغیر ہی میں ایک مسلمہ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اس ضمن میں انہیں ایک عالمگیر مقام حاصل ہے۔ اور آج ان کا نام ان اقبال اسکالروں میں لیا جاتا ہے جن کے کام کو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

دراصل علم و ادب کی دنیا میں بہت کم اہل قلم ایسے ہوئے ہیں جنہیں ان کے قارئین نے ایک سے زیادہ حیثیتوں میں تسلیم کیا ہو۔ سید احتشام حسین نے افسانے بھی لکھے اور شاعری بھی کی لیکن دنیا نے انہیں محض ایک نقاد کے طور پر تسلیم کیا۔ کلیم الدین احمد کی شاعری بھی اسی طرح نظر انداز ہوگئی جس طرح ڈاکٹر گیان چند کی شاعری۔ لیکن اس کے باوجود اسی اردو دنیا میں ایسے فنکار بھی موجود ہیں جن کی ایک سے زیادہ حیثیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ مثلاً غالب، اقبال اور فراق جنہیں نظم نثر دونوں پر ایک خلاقانہ قدرت حاصل تھی۔ اس ضمن میں احمد ندیم قاسمی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی دو تخلیقی حیثیتیں ہیں۔ وہ صف اوّل کے شاعر بھی ہیں۔ اور صفِ اوّل کے افسانہ نگار بھی۔ فیض شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم نقاد بھی ہیں۔ اسی سلسلے میں آل احمد سرور، علی سردار جعفری، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر وحید اختر کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ ایسی مثالیں اور بھی ہیں لیکن زیادہ نہیں اور انہی کم مثالوں میں ایک تابندہ مثال جگن ناتھ آزاد کی ہے جو شاعری اقبالیات اور تنقید میں ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ آزاد کا اعتراف بطور شاعر اور بطور ماہر اقبالیات تو ایک مدت سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن

بطور نقاد کے ان کے کام کی شناخت بہت بعد میں آکے ہوئی۔ حالانکہ ان کے ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالے پر آج سے چالیس سال قبل مولانا صلاح الدین نے ایسے توصیفی جملے لکھے تھے جو آج بھی کسی نقاد کے لئے فخر کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے آزاد کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ "نشانِ منزل" ہے جس کے حروفِ اوّل میں آزاد لکھتے ہیں۔

"نشانِ منزل" میرے تنقیدی مقالات کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل تنقیدی مقالات پر مشتمل میرا ایک مجموعہ "اقبال اور اس کا عہد" کے نام سے چھپ چکا ہے ..." دراصل آزاد نے اپنے اس بیان میں معروضی انداز اختیار نہیں کیا۔ "اقبال اور اس کا عہد" خواہ تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہو یا اقبال پر ایک کتاب ہو وہ آزاد کے اس کام کا حصہ ہے جو انہوں نے اقبال پر کیا ہے۔ اس کتاب کو عام تنقید میں شامل کرنا اس لئے مناسب نہیں ہے کہ یہ کتاب اقبالیات کے کھاتے میں جا چکی ہے اور ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی یہ اگر شائع ہو چکی ہے تو اس لئے نہیں کہ یہ عام تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے، بلکہ اس لئے کہ یہ اقبال پر معیاری تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اقبال پر آزاد کی اس وقت غالباً سات یا آٹھ کتابیں چھپ چکی ہیں جن کی اہمیت کا اعتراف عالمگیر طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں ہو رہا ہے۔ اس لئے آزاد اگر اقبال پر اپنے کام کو اپنے دوسرے تنقیدی کام سے الگ رکھیں تو ایک نقاد کے طور پر قاری کو ان کا مقام متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔

"نشانِ منزل" چودہ تنقیدی مقالات اور نو نثری تقریروں پر مشتمل ہے۔ تنقیدی مقالات میں دو مقالے اقبال پر ہیں "حسرت موہانی اور اقبال" اور "اقبال: صرف مسلمانوں کے شاعر؟" اور

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مقالوں میں آزاد نے اقبالیات کے جن گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے وہ صرف یہی نہیں کہ مطالعۂ کلامِ اقبال میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں بلکہ ایسے گوشے ہیں جو اس سے قبل پردۂ خفا میں تھے۔

آزاد اپنے مقالے "حسرت موہانی اور اقبال" میں آل احمد سرور کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کرنے کے بعد کہ یہ عنوان "حسرت موہانی اور اقبال" پروفیسر آل احمد سرور کا تجویز کیا ہوا ہے۔ جب اس مضمون کی گہرائی میں اترتے ہیں تو ایک جہانِ معنی لے کر نمودار ہوتے ہیں۔ اس مضمون کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں آزاد مولانا حسرت موہانی کے اس خطبۂ استقبالیہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۲۵ء میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اور اس کا اقبال کے خط مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء بنام قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

یہ مولانا حسرت موہانی کی ۱۹۲۵ء کی تحریر ہے۔ اگر ہم اس تحریر کو علامہ اقبال کے اس خط کی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھیں جو انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو جناب محمد علی جناح کو لکھا تھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کی تحریریں ہیں اور الگ الگ اشخاص کی ہیں تو دونوں کے سیاسی مسلک میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔

لیکن آزاد کی اس تحریر کا مفہوم پوری طرح سمجھنے کے لئے اسے مندرجہ ذیل اقتباس کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہوگا۔

لیکن اقبال کا سیاسی شعور حسرت کے مقابلے میں بہت گہرا تھا۔ انہوں نے غلبۂ آئینِ سوویت کی بات کبھی نہیں کی۔ دو چار برس یا دس بیس برس کا تو

ذکر ہی کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال کو کمیونزم یا سوشلزم سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا انہوں نے مطالعے کے ذریعے سے سوشلزم اور کمیونزم کو دیکھا تھا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالی تھی۔ اس کے خلاف حسرت کا لگاؤ کمیونزم کے ساتھ جذباتی نوعیت کا تھا لیکن حسرت کے لگاؤ کو محض جذباتی کہہ کر کمیونزم اور سوشلزم کے بارے میں ان کے کلام اور ان کی نثر کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ جو فنکار ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۴۸ء تک سوشلزم کے لئے رطب اللسّان رہا ہو اس کے اس چوتھائی صدی کے تعلقِ خاطر کو محض جذباتی لگاؤ کہہ کر نظر انداز کر دینا ادبی دیانت کے منافی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اقبال کا عقلی طور پر کیا ہوا تجزیہ اور حسرت کا بیتّنہ جذباتی لگاؤ ایک مقام پر ایک دوسرے کے اس قدر قریب آجاتے ہیں کہ یہ ہم آہنگی ہمارے دور کے لئے بڑی حیرت کا باعث بن جاتی ہے۔

اقبال پر دوسرا مضمون آزاد کا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے ایک توسیعی لیکچر کے طور پر ۲۸ اپریل ۱۹۸۰ء کو پشاور یونیورسٹی‘ پشاور (پاکستان) میں پڑھا۔ اس مقالے میں آزاد نے اقبال کی اردو اور انگریزی نثر کے حوالے سے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ کیا اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر تھے؟

اس مقالے میں آزاد بغیر کسی تمہیدی عبارت آرائی کے نفسِ مضمون پر بحث شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

> اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار قرآن اور حدیث ہیں لیکن اس سے یہ مراد لینا کہ اس کے علاوہ مشرق و مغرب کے تمام فکری دھاروں سے اقبال بے نیاز ہے ہیں، اقبال کے فکر و فن سے باتوجہ مطالعے کا نتیجہ نہیں۔

صرف یہی نہیں کہ اقبال نے مختلف نظام ہائے فکر کا بغور مطالعہ کیا بلکہ ان کے اپنے نظام فکر میں ان نظام ہائے فکر کے اکثر پہلوؤں کے ردّ و قبول کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ چنانچہ ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں اسلامی فکر کے ساتھ ہی ساتھ قدیم ہندوستانی فلسفہ، اور مارکس اور اینگلز کا جدلیاتی مادی نظامِ فکر بھی شامل ہے۔ اگر ہم کلام اقبال سے یہ تمام فکری عناصر خارج کر دیں تو ان کی نظم و نثر کا اکثر حصہ مفہوم سے عاری ہو کر رہ جاتا ہے اور فکر اقبال کی محض ایک ادھوری تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ مطالعۂ کلام اقبال میں قدیم ہندوستانی فلسفے، مغربی فلسفے اور مارکس اور اینگلز کے جدلیاتی مادی نظام فکر میں سب سے زیادہ اہمیت میں مغربی فلسفے کو دوں گا۔ اگرچہ فلسفۂ مغرب کے تعلق سے کلامِ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے اکثر افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ اہل قلم کی ایک جماعت نے یہ ثابت کرنے کے لئے پورا زور لگا دیا ہے کہ علامہ اقبال نے قدم قدم پر مختلف مغربی فلسفیانہ نظریات کی تردید اور تغلیط کی ہے اور دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے جن کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کا پرتو ہیں۔ یہ حضرات اس ضمن میں نیٹشے اور برگساں کا ذکر خاص طور سے کرتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے انتہا پسندانہ ہیں اور حقیقت سے دور ہیں۔ حقیقت ان کے بین بین چلتی ہے اور اس پر سے اقبال نے خود اپنی نثر و نظم میں اکثر پردہ اٹھایا ہے۔

کتاب کے چودہ صفحات پر مشتمل یہ بحث The Reconstruction of Religious Thought in Islam. کے حوالوں سے بھرپور ہے۔ ان اہم مستشرقین کے حوالے بھی اس مضمون میں بہت ہیں جنہوں نے اقبال کے متعلق لکھا ہے اور آخر میں آزاد اس ساری بحث کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

سورج اگرچہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مشرق سے اس کی مناسبت ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کے باوجود خورشید کی روشنی صرف مشرق تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے انداز سے مشرق، مغرب، شمال، جنوب، افلاک زمین ہر ایک کو منور کرتا ہے اور اس مثال کی روشنی میں اس سوال کا جواب کہ کیا اقبال مسلمانوں کے شاعر ہیں؛ ہندوستان بلکہ ہندوستان کی بیداری کے شاعر بھی ہیں ایشیا کی بیداری کے شاعر بھی ہیں اور عالم انسانیت کے شاعر بھی ہیں۔

اس علمی اور تحقیقی مقالے میں جس کے اکثر مباحث پہلی بار اردو دنیا کے سامنے آرہے ہیں جو بات ایک عام قاری کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو کے اس مقالے میں انگریزی کے اقتباسات موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اردو کتاب میں انگریزی تحریر کے کیا معنی۔ مناسب بات تو یہ تھی کہ ان انگریزی عبارتوں کی جگہ صرف ان کا اردو ترجمہ دیا جاتا۔ اور اگر اصل عبارت کی شمولیت ضروری تھی تو حاشیے میں ان کا ترجمہ دیا جاتا۔ اسی طرح سے فارسی اشعار کے اقتباسات کا بھی حاشیے میں اردو ترجمہ ضروری تھا۔ اب وہ زمانہ گیا جب اردو والوں کے لئے فارسی ایک طرح سے اپنی زبان تھی۔ آج اردو والوں کے لئے فارسی انگریزی سے بھی زیادہ مشکل ہوگئی ہے۔ اس لئے ترجمے کے بغیر فارسی شاعری کے اقتباسات دینے سے مصنف کا مقصد حل نہیں ہوسکتا۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس بات کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ جواہر لال نہرو کی ادبیات سے اردو والوں کو آشنا کرانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ جواہر لال نہرو کو ہندوستان کے ایک رہنما اور پہلے وزیر اعظم کے طور پر یا عالمی حیثیت کے سیاست داں کے طور پر کون نہیں جانتا۔ لیکن اس بات سے آگاہی عام نہیں ہے کہ انگریزی انشا پردازی میں ان کا مقام کس قدر بلند تھا۔

جواہر لال نہرو کے انگریزی ادب پاروں کا ترجمہ کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں۔

"ترجمے میں اصل زبان کی خوبی کو منتقل کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اور مجھے احساس ہے کہ میں اس نازک فرض سے بخوبی عہدہ برا نہیں ہوسکا ہوں۔۔۔۔"

لیکن نہرو کے جو ترجمے آزاد نے کئے ہیں ان سے تو یہی گماں ہوتا ہے کہ اردو میں جواہر لال نہرو کو پہلی بار ایک معیاری مترجم ملا ہے۔ جواہر لال نہرو کی وصیت انگریزی میں ہے۔ اسے جگن ناتھ آزاد نے اردو کا لباس ان الفاظ میں پہنایا ہے۔

اس بارے میں میرے کوئی مذہبی جذبات نہیں ہیں۔ گنگا اور جمنا سے میرا دلی تعلق اس وقت سے چلا آرہا ہے جب میں ابھی بچہ ہی تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ تعلق خاطر بھی بڑھتا گیا۔ میں نے موسموں کے ساتھ ساتھ ان دریاؤں کے بدلتے ہوئے مزاج بھی دیکھے ہیں اور اس تاریخ، دیو مالا روایت، گیتوں اور کہانیوں پر بھی غور کیا ہے، جو ایک زمانے سے ان کے ساتھ وابستہ ہوتی

چلی آ رہی ہیں۔ اور ان کے وجود کا جزو بن گئی ہیں.....
گنگا ہندوستان کے صدیوں پرانے تہذیب و تمدن کا ایک نشان ہے۔ ہمیشہ بہتے چلے جانے اور ہمیشہ ایک تغیر سے آشنا رہنے کے باوجود گنگا وہی قدیم گنگا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمالہ کی وہ برف پوش چوٹیاں اور گہری وادیاں یاد آجاتی ہیں جن سے مجھے والہانہ عشق ہے۔ اور ان سرسبز و شاداب میدانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جہاں میں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ وہی گنگا جو صبح کی روشنی میں تبسم اور رقصاں نظر آتی ہے۔ شام کے سایوں میں ایک اداس اور پراسرار تصویر بن جاتی ہے۔ سردیوں میں یہی گنگا ایک چھوٹی سی نہر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور جب برسات آتی ہے تو اس پر ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا گماں ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس میں وہ تمام تخریبی قوتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں جو سمندر کا خاصہ ہیں۔"

اس ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ کاش جواہر لال نہرو کی انشا پردازی کے ایسے تمام نمونے اردو میں منتقل ہو سکیں۔
"اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟" میں اقبال اور دوسرے یورپین اہل قلم کی انگریزی نثر اگر آزاد اسی طرح سے اردو میں منتقل کر دیتے تو اس مقالے کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

جوش ملیح آبادی کے بارے میں آزاد کی اس رائے سے اختلاف مشکل ہو گا۔

"جوش کو وہ آہنگ اور انداز بیان ملا تھا جو گہرے دقیق فلسفیانہ مضامین کے لئے بہت مناسب ثابت ہو سکتا تھا۔ انہیں مختلف مسائل پر سوچ بچار کرنے کا شوق بھی ہے۔ لیکن کمی یہ رہی کہ یہ شوق ان کی فطرتِ ثانیہ نہ بن سکا اور اپنی سوچ بچار اور وجدان کو وہ یک جان نہ کر سکے۔ بعض دفعہ میں نے انہیں فلسفیانہ کتابوں پر نظر ڈالتے بھی دیکھا اور ان کتابوں کا استعمال انہوں نے یوں کیا کہ ان میں مندرج فلسفیانہ مقولوں کو منظوم لباس پہنا دیا۔ کبھی نظم کے اشعار میں اور کبھی رباعیات میں۔"

"فرحت کی رامائن" تاریخی اعتبار سے جگن ناتھ آزاد کا پہلا مقالہ ہے جو "نشانِ منزل" میں شامل ہے۔ یہ ۱۹۴۲ء کی تخلیق ہے آزاد نے اس مقالے کو کتاب میں شامل کرتے ہوئے ایک معذرتی انداز اختیار کیا ہے۔ اور حرفِ اول میں لکھا ہے۔

"تو یہ اور اسی طرح کی یادیں اس مقالے کے ساتھ وابستہ ہیں اور محض اسی وجہ سے یہ مقالہ شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔"

میرے نزدیک اس معذرتی بیان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا مقالہ آج سے چالیس برس پہلے کی تخلیق پروفیسر آزاد کی آج کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اس موضوع پر جگن ناتھ آزاد اگر آج لکھیں تو ظاہر ہے کہ اس میں اتنے طویل اقتباسات نہیں ہوں گے لیکن "نشانِ منزل" میں اس مقالے کی موجودگی آزاد کی تنقید کے ارتقاء کا جائزہ لینے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اور ہمیں اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہے کہ جون ۱۹۴۲ء کے ادبی دنیا (لاہور) میں جب یہ مقالہ شائع ہوا تھا تو مولانا صلاح الدین احمد ایسے جلیل القدر نقاد نے اس کے متعلق اداریے میں لکھا تھا۔

"اشاعتِ زیرِ نظر کے مضامین میں جگن ناتھ آزاد کا قیمتی مضمون اردو کی ایک بلند پایہ مثنوی "فرحت

کی رامائن خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ جناب آزاد ہمارے ان نوجوان لکھنے والوں میں سے ہیں جنہوں نے قلم اٹھانے سے پیشتر ادبیات کے مطالعے میں خاص کاوش سے کام لیا ہے اور موجودہ مضمون ان کے مذاقِ سخن اور دقتِ نظر کا ایک نہایت روشن ثبوت ہے۔ ہمارے پنجاب میں جہاں اچھے افسانہ نگاروں کی کوئی کمی نہیں اچھے مقالہ نگاروں کا تو گویا قحط ہے۔ نوجوان مصنف عموماً ریسرچ اور مطالعے سے گھبراتے ہیں۔ حالانکہ یہی وہ عناصر ہیں۔ جن کے خلطِ باہم سے ادبیاتِ عالیہ کی تخلیق ہوتی ہے۔

رامائن ہندوستان کی پاکیزہ ترین روایات کا وہ لازوال سرچشمہ ہے جس کی شیرینی اور لطافت میں زمانے کی ہزار ہا گردشیں آج تک کوئی فرق پیدا نہیں کر سکیں۔ سنسکرت کے علاوہ (برج) بھاشا اور بھاشا کے ہندی اور اُردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں یہ انمول خزانہ جوں کا توں موجود ہے۔ فرحت نے اسے اُردو مثنوی کے قالب میں ڈھال کر درحقیقت اُردو ادب کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ مثنوی کی زبان اور روانی حقیقتاً قابلِ داد ہے اور یہ آج سے اسی سال پیشتر کے شرفا کی زبان کا ایک نادر نمونہ ہے اور اس کا غالباً سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ یہ ان تنگ نظر لوگوں کا ایک جیتا جاگتا اور مسکت جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ آزاد نے ہمیں اس بیش بہا تصنیف سے آشنا ہونے کا موقع دے کر ایک نہایت مفید کام کیا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ان کے اس مضمون کو اسی دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس کا یہ حق دار ہے۔"

"عالمی معیار اور اردو" اگرچہ کلچرل اکیڈیمی سری نگر کی فرمائش پر لکھا ہوا ایک مقالہ ہے۔ جو بقول مصنف کلچرل اکیڈیمی جموں و کشمیر آل انڈیا کانفرنس، جموں (جنوری ۱۹۸۰ء) میں پڑھا گیا لیکن دراصل یہ پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ میرؔ، غالب اور اقبال کی عالمی ادب میں کوئی حیثیت نہیں۔ اس مقالے میں اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر آزاد نے پروفیسر کلیم الدین احمد کی تحریروں کے وہ اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جو کلامِ اقبال کو عالمی سطح پر لے آتے ہیں اور جن سے کلیم الدین احمد خود اپنے آپ کی تردید کرتے چلے جاتے ہیں۔

نشریات والے حصے میں ادیب اور ادبی تخلیق، انشا پردازی، فکر اور جذبہ، اردو زبان اور اس کا صحیح استعمال، اردو شاعری میں جدید رجحانات، مرحوم کافی البدیہہ کلام اور غالب اور اقبال، ہر اعتبار سے تنقیدی مقالات ہیں۔ لیکن اقبال عالمی کانگریس (لاہور) اور کچھ یادیں دوسرے ملکوں کی" تنقیدی نشریات کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اول الذکر نشریے کی بدولت اقبال عالمی کانگریس لاہور (۱۹۷۷ء) کی ایک مفصل روداد "نشانِ منزل" میں محفوظ ہوگئی ہے۔ اور ثانی الذکر نشریہ اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ آج اُردو دنیا کے مختلف ملکوں میں کس حد تک مقبول ہے۔ اور برطانیہ، بلجیم، جرمنی، روس، برما اور نیپال میں کس طرح اُردو کے کامیاب جلسے اور مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی نثر کئی انواع پر مشتمل ہے۔ مثلاً ان کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" کا موضوع شخصیت نگاری ہے۔ "اقبال اور مغربی مفکرین" کا موضوع فلسفہ ہے۔ "اقبال اور کشمیر"

کاموضوع تاریخ اور تحقیق ہے "پشکن کے دیس میں" جس کے اکثر حصے ہندوپاکستان کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔
سفرنامہ ہے لیکن ایک قدرِ مشترک جو ان تمام نثری کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اندازِ بیان کی دلکشی ہے۔ پروفیسر آزاد کی نثر کا موضوع کردار نگاری ہو یا فلسفہ یا تنقید حسنِ بیان کی دلکشی قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ اس لئے ان کی نثری کتابوں کے بارے میں متعدد نقادوں نے یہ لکھا ہے کہ کتاب ایک بار ہاتھ میں لے کے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ "نشانِ منزل" بھی اسی خوبی سے مزین ہے اور تنقید ایسا موضوع جو عام طور سے خشک سمجھا جاتا ہے اس کتاب میں آکر "افسانۂ آں شبے کہ بایار گذشت" کی تفسیر بن گیا ہے۔

---

# عکسِ ایام



سید انور کے ساتھ ایک شام کے موقع پر ہاجرہ مسرور، ڈاکٹر حنیف فوق اور سید انور



سید انور



(پہلی قطار) ناصرہ حسین، شوکت صدیقی۔ نامعلوم۔ ابن انشاء (دوسری قطار) رفیق خاور۔ سید انور۔ جمیل الدین عالی
(تیسری قطار) یونس احمر، صہبا لکھنوی۔ سرشار صدیقی اور بعض دوسرے افراد



حضرت جوش ملیح آبادی ۔ سید انور اور جمیل الدین عالی ۔



سید انور ۔ فیض احمد فیض ۔ ممتاز حسن اور سابق گورنر مشرقی پاکستان و صدر انجمن ترقی اور اختر حسین ۔

تحسین الرحمٰن مرتضیٰ

# مولوی عبدالحق
# تضادات سے بنتا ابھرتا انسان!

مولوی عبدالحق صاحب کو خود احتسابی کے لمحوں میں اپنے بارے میں حالی کی یہ رباعی یاد آتی تھی ؎

جیسا نظر آتا ہوں، نہ ایسا ہوں میں
اور جیسا سمجھتے ہیں، نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی، عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

یہاں مولوی صاحب کا اپنے بارے میں تاثر ہے جو شخصیات کو سمجھنے اور پرکھنے میں ملکہ رکھتے ہیں اور سیرت نگاری میں باکمال ہیں۔ "چند ہم عصر" میں انہوں نے جیتے جاگتے اور حقیقت پسندانہ شخصی مرقعے پیش کئے ہیں ان کو لائق رکھ کر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اپنے بارے میں ان کا یہ تاثر بھی ویسا ہی درست ہوگا جیسا دوسروں کے بارے میں ان کا مشاہدہ قرینِ حقیقت ہوتا ہے۔

حالی کی رباعی میں مولوی صاحب نے خود اپنا جو جائزہ پیش کیا ہے اسے محض مولوی صاحب سے عقیدت و احترام کی خاطر ان کا "انکسار" قرار دے کر نظر انداز کر دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہ ایک منصف مزاج، بے لاگ اور بے رحم سیرت نگار کی خود احتسابی و خود آگاہی ہے جو بجائے خود واجب الاحترام ہے۔

مجھے مولوی صاحب کی بانوے سالہ زندگی میں محض ایک ماہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس مختصر سی مدت میں ان کے بارے میں میرا وہ تصور ٹوٹا جو محض ان کی عظمت و شہرت اور بزرگی کے حوالے اور ان سے اپنی طالب علمانہ عقیدت و ارادت کی کمزور جذباتی بنیادوں پہ قائم تھا اور اس شکستہ تصور کی جگہ اس نئے تاثر نے لی جو مشاہدے اور ان سے قربت کے تجربے کی مضبوط بنیاد پر استوار ہوا تھا۔ لگ بھگ گیارہ سو مہینوں پر پھیلی ہوئی ان کی طویل زندگی کو محض ایک ماہ کے مشاہدے و تجربے کی میزان پر تولنا ان سے انصاف نہ ہوگا۔ میں ایسی بے انصافی کی نیت بھی نہیں رکھتا۔ میں تو محض اتنی سی بات کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ماہ کی قربت میں ان کی شخصیت کے متعلق میں نے جو نیا تاثر لیا اس سے مولوی صاحب کے بارے میں خود ان کے اپنے تاثر کی تردید نہیں توثیق ہوتی ہے۔

میرے ذہن میں جذباتِ عقیدت نے مولوی صاحب کا جو بے بنیاد

تصور نے پہلے سے ڈھال رکھا تھا اس کے مطابق وہ تمام عیبوں سے پاک، اپنے اخلاق و کردار اور سیرت و مزاج کی خوبیوں میں عام انسانوں کی سطح سے بالا کہیں فرشتوں سے قریب تر تھے۔ یہ محض انفرادی نہیں ہمارا اجتماعی مرض ہے کہ ہم انسانوں کو فرشتے یا شیطان کے معیار پر پرکھ تول کر قبول کرنے یا مسترد کردینے کے عادی ہیں اور شاذ ہی انسانوں کو خالص انسانی سطح پر سمجھنے اور قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولوی صاحب کے مرض الموت کے زمانے میں مجھے ایک ماہ مولوی صاحب کے ساتھ جناح ہسپتال کراچی میں رہنے اور انہیں شب و روز قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر چند کہ بیماری کے دن کسی فرد کی معمول کی زندگی کی نمائندگی نہیں کرتے مگر پھر بھی میں نے اس عرصے میں مولوی صاحب کی شخصیت کو تمام تکلفات، رکھ رکھاؤ اور وضع و احتیاط کے حجابات سے دور اس طور پر دیکھا کہ وہ مجھے اپنے تصور سے مختلف نظر آئے۔ یعنی فرشتہ نہ شیطان بلکہ صرف اور صرف انسان دکھائی دیئے۔ وہ انسان جو عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ ساتھ کمزوریاں اور پستیاں بھی رکھتا ہے۔ میں نے ان کی شخصیت میں بہت سے تضادات یکجا دیکھے۔

●

وہ شگفتہ مزاج بھی تھے اور غصہ ور بھی۔ با اخلاق بھی تھے اور بے لحاظ بھی، دل دار بھی تھے دل آزار بھی۔ مذہب پسند بھی مذہب بیزار بھی۔ غرض یہ کہ قدم قدم پر تضادات سے بنتا اور اُبھرتا انسان ان کی شخصیت کے آئینے میں اپنی چہرہ نمائی کرتا تھا۔ اس نشست میں ان کے ساتھ گذارے ہوئے ایک ماہ کے کچھ واقعات کی جھلکیاں دیکھ لیجئے۔ یہ جھلکیاں ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف گوشوں کی عکاس ہیں۔

پیرانہ سالی اور بیماری سے بے حال زندگی میں بھی مولوی صاحب کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا رنگ باقی تھا جو اچھے دنوں میں نہ جانے کتنا شوخ رہا ہوگا۔ ہسپتال میں متعدد نرسیں ان کی خدمت پر مامور رہیں۔ ایک معمولی صورت، گہری سانولی رنگت اور بجھی بجھی سی شخصیت والی نرس جو اپنے بارے میں پسندیدگی کے کلمات کے لئے ترسیدہ ہی رہتی ہوگی۔ مولوی صاحب کی شگفتہ مزاجی سے ایسی تازگی پاگئی کہ اس کی شخصیت مولوی صاحب کے کمرے میں آتے ہی بدلی بدلی اور بالیدہ سی نظر آتی تھی۔ یہ نرس عام طور پر دوپہر کے کھانے کے بعد لال دوا کا مکسچر پلانے آتی تھی۔ ایک روز مولوی صاحب کی طبیعت قدرے بحال اور موزوں تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مولوی صاحب نے گرجدار الفاظ میں بڑے جوش کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ "آگئیں مس روح افزا!" ــــ مولوی صاحب نے "روح افزا" دوا کی سرخ رنگت اور شربتِ روح افزا سے اس کی مماثلت کے سبب کہا تھا۔ نرس نے اسے اپنی شخصیت کے لئے مولوی صاحب کا خراجِ تحسین سمجھا اور ایسی نہال ہوئی کہ اس کی ڈیوٹی خواہ ہسپتال کے کسی وارڈ میں ہوتی وہ روزانہ ایک چکر مولوی صاحب کے کمرے کا ضرور لگاتی اور مولوی صاحب اُسے روح افزا پکار کر شاد کردیتے تھے۔

●

ان کے غصے کا تجربہ بھی مجھے ہسپتال میں ان سے اپنی ملاقات کے پہلے ہی گھنٹے میں ہوگیا تھا۔ میں اس زمانے میں اردو کالج کا طالب علم تھا۔ حکیم اسرار احمد صاحب کریوی نے مجھے مولوی صاحب کی تیمارداری کی ذمہ داری تفویض کی تھی۔ جسے میں نے اپنے لئے سعادت سمجھ کر قبول کیا تھا۔ مولوی صاحب کو میرے بارے میں یہ اطلاع دے کر میں ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہوں گا۔ حکیم صاحب کچھ دوائیں بازار سے لانے کے لئے چلے گئے۔ میں مولوی صاحب کے بستر کے سامنے بچھے ہوئے دوسرے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے رُخ پھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کو دیکھا تو وہ بدستور تک رہے تھے۔ میں نے بے چینی سی محسوس کرکے پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر مولوی صاحب پر نظر پڑی تو وہ پلکیں جھپکائے بغیر مسلسل گھور

رہے تھے۔ اب میں پریشان ہوا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

مولوی صاحب کی گرجدار آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔

"میں کچھ بھی نہیں" میں نے عرض کیا۔

"اپنا کام کرو" مولوی صاحب بولے۔

میں نے وضاحت کی کہ اس وقت مجھے سوائے اس کے کوئی کام نہیں کہ آپ کی خدمت کے لئے حاضر رہوں۔ میری یہ وضاحت غضب ہوگئی۔ مولوی صاحب پھٹ پڑے۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ مجھے اپنے قریب ایسے نوجوان پسند نہیں ہیں جن کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہ ہو۔ نکموں کو میں اپنے پاس نہیں بٹھاتا۔"

میں اس اچانک اظہارِ غضب سے گھبرا گیا اور اپنی نادانستہ غلطی کی معافی چاہی جسے انہوں نے بڑی آسانی سے قبول کیا اور بڑی نرمی سے سمجھایا۔

"مجھے جب کچھ کام تم سے لینا ہوگا تو کہہ دوں گا۔ فرصت کے وقت میں تمہیں پڑھتے رہنا چاہیئے۔"

میں نے وعدہ کیا کہ اگلے روز سے کتابیں اپنے ساتھ لایا کروں گا۔ تاہم اس وعدے پر بھی میری بخشش نہ ہوئی اور مولوی صاحب نے الماری میں سے کچھ رسائل کر پڑھنے کی ہدایت کی۔ الماری میں ان کی روزانہ کی ڈاک میں آئے ہوئے اشتہارات، کتابچوں، یا مطبوعہ کتابوں کی فہرستوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر مولوی صاحب نے پورا دن یہ سب کچھ پڑھوایا اور پہلے ہی روز کے تجربے نے مجھے باور کرا دیا کہ مولوی صاحب نے اپنی فعال زندگی کے ساٹھ برس تک کس طرح اور کس رفتار سے کام کیا ہوگا۔



اس تجربے کے بعد سے میں اپنی کتابیں ہسپتال میں لے آیا اور اپنی عام زندگی کے معمول سے کہیں زیادہ اس ایک ماہ میں مطالعہ کیا۔ مولوی صاحب روزانہ کچھ دیر کے لئے مجھ سے اخبارات پڑھوا کر سنتے تھے۔ انہیں کچھ اونچا سنائی دیتا تھا اس لئے مجھے بہت بلند آواز سے اخبارات پڑھنا پڑتے تھے اور میری آواز وارڈ میں دور دور تک سنی جاتی تھی چنانچہ روزانہ کے اس معمول کی وجہ سے میں ہسپتال میں "ریڈیو بابائے اردو" کے نام سے موسوم ہوگیا۔ وہ اپنی روزانہ کی ڈاک بھی مجھ سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ ایک روز ڈاک میں ایک رسالہ "تیس روزہ چاند" بھی آیا۔ میں پہلے سے اس رسالے سے واقف نہیں تھا۔ مولوی صاحب نے فرمائش کی کہ میں اس میں سے کچھ سناؤں۔ یہ پورا رسالہ فیچر، کارٹونوں، فحش لطیفوں اور بے ہودہ لذتوں سے بھرپور تحریروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا پڑھ کر سنانا میرے لئے دوبھر ہوگیا۔ جو صفحہ کھولتا تھا اور جو چیز پڑھ کر سنانا شروع کرتا تھا اس کا پورا کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ ایسے دشوار لمحوں میں میری ہچکچاہٹ محسوس کر کے مولوی صاحب کہتے ـــ "اگلا صفحہ پڑھو!" دس پندرہ منٹ کی اس تکلیف دہ مشق کے بعد مولوی صاحب نے میری گلوخلاصی کرتے ہوئے ہدایت کی کہ یہ رسالہ الماری میں رکھ کر اپنا معمول کا مطالعہ کروں۔

میں اس ہدایت کے بعد آسودہ ہوکر یہ رسالہ چھوڑ کر اپنی کسی کتاب کے مطالعے میں منہمک ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کے سکوت کو مولوی صاحب کی آواز نے توڑا۔

"آئندہ یہ رسالہ تم کبھی مت پڑھنا۔ اصل میں ہمیں بابائے اردو سمجھ کر اردو زبان میں چھپنے والے تمام طرح کے رسالے، اخبارات، کتابچے، اشتہارات اور کتابیں وغیرہ بھیجی جاتی ہیں اور ہم انہیں اس خیال سے پڑھتے ہیں کہ ہمیں اردو میں لکھی جانے والی اچھی اور بری ہر طرح کی تحریروں کی خبر رہے۔ ان سب کا پڑھنا ہماری ضرورت ہے، تمہاری نہیں۔ تمہیں ایسی چیزیں بالکل نہیں پڑھنی چاہیئں ان سے

اخلاق اور کردار بگڑتا ہے۔"

"جی بہت اچھا۔" میں نے اپنی کتاب پر نظریں گاڑتے گاڑتے جواب دیا اور بہت دیر تک سوچتا رہا کہ مولوی صاحب کے یہاں کوئی اولاد نہیں۔ وہ زندگی میں تربیتِ اولاد کے جھمیلوں میں پڑے اور نہ اس کا کوئی تجربہ رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے یہاں بچوں کی تربیت کا شعور کتنا صاف اور گہرا ہے۔



مولوی صاحب کیسے با اخلاق تھے۔ اس کا مشاہدہ ہسپتال میں روز ہوتا تھا۔ جو لوگ ان کی عیادت کے لئے آئے تھے ان سے خوب گفتگو کرتے تھے، بعض اوقات یہ نشستیں گھنٹوں طویل بھی ہو جاتی تھیں۔ ہم تیمارداروں کو سخت دشواری پیش آتی تھی کہ کیسے یہ مجلسیں درہم برہم کریں اور کس طرح مولوی صاحب کے "نامہربان و ناداں" عیادت کنندگان کو کھسکائیں۔ ایک روز مولوی صاحب دوپہر کے وقت آرام کر رہے تھے کہ ناگہانی دو چار طالب علم وارڈ کی دیواریں کود پھاند کر آ نکلے اور کمرے پر دستک دی، میں باہر نکلا تو انہوں نے بتایا کہ وہ سکھر سے آئے ہیں۔ اور باباۓ اردو سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا۔

"ملاقاتوں سے مولوی صاحب بہت بے آرام ہوتے ہیں۔ انہیں ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اس لئے آپ ملنے پر اصرار نہ کیجئے۔"

وہ مُصر ہوئے ــــ "ہم صرف دور سے مولوی صاحب کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے کبھی انہیں دیکھا نہیں اور صرف اسی لئے سکھر سے آئے ہیں۔"

"میں کھڑکی کا پردہ ہٹا دیتا ہوں۔ مولوی صاحب کھڑکی کے قریب ہی بستر پر دراز ہیں آپ باہر سے انہیں دیکھ لیجئے۔"

میں نے طالب علموں کو اس تجویز پر آمادہ کر کے پردہ ہٹایا تو پردہ کھسکانے کی آہٹ پر مولوی صاحب نے آنکھیں کھول دیں اور پوچھ لیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" میں نے صورتِ حال کی وضاحت کی تو انہوں نے فوراً طالب علموں کو اندر بلوالیا اور ان سے پانچوں منٹ تک باتیں کیں۔ طالب علموں نے خود ہی سمجھداری سے اجازت طلب کی تو یہ مجلس ختم ہوئی۔ طالب علموں کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے میری خبر لی اور کہا کہ آئندہ عیادت کے لئے آنے والوں اور خصوصاً طالب علموں کو بالکل نہ روکا جائے، انہوں نے سمجھایا۔

"دور سے عیادت کے لئے آنے والوں کو کمرے کے باہر ہی سے لوٹا دینا بد اخلاقی ہے!"

میں نے اپنے دفاع میں عیادت کی خاطر آنے والوں کے لئے ڈاکٹروں کی ممانعت کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔

"ڈاکٹر صرف علاج کرنا جانتے ہیں۔ آداب و اخلاق کے تقاضے نہیں سمجھتے، تم ان کی عائد کردہ ممانعت کی پرواہ مت کرو۔ وہ کرو جو اخلاق کا تقاضہ ہے۔"



اور صاحبو ایک روز اسی پیکرِ اخلاق کی ایسی بے مروتی اور بے لحاظی کا بھی مشاہدہ ہوا جو آج بھی پسینہ لا دینے کو کافی ہے۔ مولوی صاحب کے ایک ملازم ہمارس خاں نے جو ہسپتال میں ہر وقت موجود رہتا تھا کمرے میں آ کر اطلاع دی۔

"جی ایک بیگم صاحبہ بابا جی سے ملنے آئی ہیں۔"

بیگم صاحبہ کا نام سنتے ہی حکیم صاحب (اسرار احمد کریوی) کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ بڑی عجلت کے ساتھ مجھے یہ ہدایت دے کر ملحقہ غسل خانے میں گھس گئے کہ:

"بیگم صاحبہ سے یہ کہہ کر معذرت کر لو کہ مولوی صاحب

سو رہے ہیں:

میں ابھی حکیم صاحب کی بے حواسی پر اپنی حیرت کو سمیٹ بھی نہ پایا تھا کہ بیگم صاحبہ نے دروازے کا پردہ ہٹا کر بلند آواز سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ مولوی صاحب نے آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا اور گرجدار آواز میں پوچھا:

"کون ہے؟"

"بندی... آداب عرض کرتی ہے!" مگر ابھی شاید بیگم صاحبہ کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ پوری گھن گرج کے ساتھ "زادی" پر ختم ہونے والی ایک گالی کمرے میں پھیلی اور "دفع ہو جاؤ" کے الفاظ سے مکمل ہو کر ایک ہولناک سناٹے میں گم ہو گئی۔ ایسا سناٹا جس میں بیگم صاحبہ کے لوٹتے قدموں کی چاپ بہت دیر تک سنی جاتی رہی۔ حکیم صاحب غسل خانے سے برآمد ہوئے اور بہت دیر تک اس تکلیف دہ واقعے پر کف افسوس ملتے رہے۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ اردو ہی کی ترقی کے ایک سرکاری ادارے میں ان خاتون کی رفاقت کار کے زمانے میں کچھ اختلافات ہوئے تھے جن کے زخم مولوی صاحب کی طبیعت سے ہنوز مندمل نہیں ہوئے تھے۔ مجھ پر اس واقعے کا بہت اثر ہوا اور کئی روز تک کبیدہ خاطر رہا۔ بلکہ آج بھی ان خاتون سے جو اپنے تمام اختلافات کے باوجود محض اخلاص اور محبت سے محض ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوئی تھیں مولوی صاحب کی بدسلوکی پر صدمہ اور حیرت محسوس کرتا ہوں۔

●

اس واقعے کے بعد مجھے کچھ بزرگوں کا پُراسرار رویّہ بھی سمجھ میں آ گیا۔ ان میں ایک میرے کالج (اردو کالج) کے سابق پرنسپل میجر آفتاب حسن صاحب اور اسی کالج کے ایک اور استاد خواجہ آشکار حسین صاحب مرحوم تھے۔ جو مولوی صاحب کے زمانۂ علالت میں بڑی پابندی سے دوسرے تیسرے روز ہسپتال آتے تھے۔ مگر ایک دفعہ بھی دونوں حضرات میں سے کوئی ملاقات کے لئے مولوی صاحب کے پاس کمرے میں نہیں آئے بلکہ آ کر نیچے لان میں پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ جاتے تھے۔ اور کسی ذریعے سے مجھے یا بنارس خاں کو اوپر سے بلوا کر تفصیل سے مولوی صاحب کی خیریت اور علاج معالجے کی تفصیلات دریافت کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے برسوں کالج کے معاملات پر مولوی صاحب کی ٹھنی رہی اور بالآخر ایوب خاں کے مارشل لاء کے ذریعے مولوی صاحب میجر صاحب کو اردو کالج سے بیک بینی و دوگوش رخصت کر دینے میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان تینوں حضرات کے باہمی روابط میں اخلاص اور عداوت کی سرحدیں ایسی مربوط و متصل دکھائی دیتی تھیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ان میں حقیقتاً کون "بڑا" ہے اور کون "چھوٹا"۔ میں آج تک یہ طے نہ کر سکا کہ یہ مولوی صاحب کی عظمت تھی جو باہمی روابط کی بہت سی تلخیوں کے باوجود ان حضرات کا رشتہ ارادت و عقیدت مولوی صاحب سے منقطع نہ کرا سکی یا یہ ان حضرات کی اخلاقی برتری یا عالی ظرفی تھی کہ مولوی صاحب کی گالیوں کے خوف سے ان کے کمرے میں قدم رکھنے کی ہمت نہ پانے کے باوجود یہ لوگ ان کی پرسشِ احوال کے لئے پابندی سے ہسپتال ضرور آتے تھے۔ وضع داری کی قدیم روایات کو نبھانے والی انسانوں کی یہ جنس اب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔

●

اردو کالج میں اگرچہ مولوی صاحب کے ہی ایما پر تبدیلی آئی تھی۔ مگر یہ تبدیلی ان کے حسب خواہ نہیں تھی۔ ایوب خاں مرحوم نے مولوی صاحب کی فرمائش کی تعمیل میں اپنے لئے دوست نوازی کی سبیل پیدا کر لی تھی۔ جب کبھی ایوب خاں علی گڑھ میں انٹر میں پڑھا کرتے تھے تو عطاء الرحیم صاحب وہاں ان کے سینئر تھے۔ عطاء الرحیم صاحب انجمن طلباء کے صدر یا سیکرٹری منتخب ہوئے تو انہوں نے اپنی

کابینہ کا ایک رکن ایوب خاں کو بھی نامزد کیا۔ یہ ہر دو حضرات کی دوستی کی ابتدا تھی۔ پھر عطاء الرحیم صاحب فوج ہی میں تعلیم کے شعبے سے منسلک ہوئے اور کرنل کے مرتبے تک پہنچے۔ اردو کالج سے میجر آفتاب حسن صاحب کو رخصت کیا گیا تو ایوب خاں صاحب نے اپنے ان ہی رفیقِ دیرینہ کو کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا۔

کرنل عطاء الرحیم صاحب بنیادی طور پر شریف آدمی تھے اور بے ضرر بھی، بس کمزوریاں دو تین ہی تھیں۔ اوّل یہ کہ ان کی سادہ لوحی حماقت کی حدوں کو چھوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ مولوی صاحب سے ان کا اظہارِ نیازمندی فطری نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر خوشامد اور چاپلوسی کا شائبہ ہوتا تھا۔ تیسرے یہ کہ اپنے طرزِ عمل میں وہ مولوی صاحب یا اردو کی تحریک سے زیادہ اپنے مربی ایوب خاں سے وابستگی و وفاداری کے رشتے استوار رکھتے تھے۔

میجر آفتاب حسن صاحب مولوی صاحب کے کھلے "دشمن" سمجھے جاتے تھے اور عطاء الرحیم صاحب اپنی جاں نثاری کا تاثر دیتے تھے۔ مگر دونوں کے عمل کا یہ فرق میرے ذاتی تجربے کا حصہ بنا کہ میجر آفتاب حسن صاحب نے کالج سے اپنے رخصت ہونے سے قبل کالج کے علمی و ادبی مجلے "برگِ گل" کی مجلسِ ادارت کو دستاویزی اہمیت کا ضخیم "بابائے اردو نمبر" نکالنے کی ذمہ داری تفویض کی۔ چنانچہ میجر صاحب کی کالج میں موجودگی تک کئی مہینے اس منصوبے پر محنت ہوئی اور تقریباً سات سو صفحات کی کتابت ان ہی کے زمانے میں مکمل ہوئی۔ مزید تین سو صفحات کی کتابت کا کام ہنوز باقی تھا کہ میجر صاحب کی جگہ کرنل صاحب پرنسپل ہو کر آ گئے۔ انہیں جب "بابائے اردو نمبر" کے منصوبے کا علم ہوا تو انہوں نے اس منصوبے پر کام روک دیا اور ہدایت کی کہ اس منصوبے کو مؤخر کر کے پہلے اتنی ہی ضخامت کا "ایوب نمبر" نکالا جائے۔ مجلسِ ادارت کو تامل ہوا تو تینبیہ و تحریص کے حربے استعمال ہوئے۔ مجلسِ ادارت کو اپنے تعلیمی کیریئر کی "عاقبت" خراب نہیں کرنی تھی اور پھر کرنل صاحب کی یہ تحریص کارگر رہی کہ ایوب نمبر کے پانچ سو نسخے سرکاری "ادارۂ تعمیرِ نو" خریدے گا اور اسی طرح بابائے اردو نمبر کی بہتر اہتمام کے ساتھ اشاعت کے لئے فنڈز مہیا ہو جائیں گے۔ اس طرح میجر آفتاب حسن صاحب کے مجوزہ "بابائے اردو نمبر" سے پہلے "برگِ گل" کا کرنل عطاء الرحیم صاحب کا تجویز کردہ "ایوب نمبر" شائع ہوا اور اس کی اشاعت میں کالج کے اپنے تمام فنڈز ضائع ہو گئے۔ "بابائے اردو نمبر" کی اشاعت کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ بچی۔ ادارۂ تعمیرِ نو سے بھی کچھ نہ ملا۔ برگِ گل کی مجلسِ ادارت نے "بابائے اردو نمبر" پر اپنی محنت اور سات سو صفحات کے قریب کتابت شدہ مواد کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے انجمن ترقی اردو سے سعیٔ بازی کی۔ انجمن نے اس کتابت شدہ مواد میں سے اپنے سہ ماہی جریدے اردو کے بابائے اردو نمبر کے لئے "بہتر نصف" کا انتخاب کیا اور یوں سات سو صفحات پر مبنی کتابت شدہ مواد کے "بہتر نصف" اور "کہتر نصف" پر مبنی "اردو" اور "برگِ گل" کے دو الگ الگ بابائے اردو نمبر شائع ہو گئے اور ان کی اشاعت مولوی صاحب کے انتقال کے بعد ہوئی۔



کرنل صاحب باقاعدگی سے ہسپتال آتے تھے۔ ان کی حد سے متجاوز سادہ لوحی اور غیر فطری سی نیازمندی کے امتزاج سے ایسے مواقع پیدا ہوتے رہتے تھے جو مولوی صاحب کے لئے اظہارِ ظرافت یا اظہارِ غضب کا وسیلہ بنتے تھے۔ جب ایک مرحلے پر یہ طے ہوا کہ مولوی صاحب کو بغرضِ علاج یورپ جانا ہوگا تو کرنل صاحب ان کی روانگی کے انتظامات کے سلسلے میں خاصے سرگرم ہو گئے۔ مولوی صاحب کا اصرار تھا کہ یورپ ہو یا کوئی اور جگہ وہ جہاں بھی جائیں گے اپنی وضع اور لباس نہیں بدلیں گے۔ وہی ترکی ٹوپی ہوگی، وہی شیروانی اور وہی علی گڑھ کی تراش والا سفید پاجامہ، ترکی ٹوپی اور شیروانی کی حد تک تو

کوئی معالجہ نہ تھا۔ مگر سوتی کپڑے کا سفید پاجامہ ان کے معالجین کے خیال میں یوسپ کی سردی سے ان کی مدافعت کے سلسلے میں ناکافی تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب خاص رد و کد کے بعد اس بات پر آمادہ ہوئے کہ ان کے لئے سفید فلالین کے دو پاجامے سلوائے جائیں جو عام سوتی کپڑے کے مقابلے میں سردی سے زیادہ بہتر مدافعت کر سکیں گے۔ کرنل صاحب نے بڑی خوشی اور گرم جوشی سے اس خدمت کی سعادت اپنے لئے قبول فرمائی۔

تیسرے چوتھے روز کرنل صاحب سلے ہوئے پاجامے لے کر ہسپتال پہنچ گئے اور بڑے شوق سے پاجامے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔ مولوی صاحب اس وقت کسی قدر خوشگوار موڈ میں بستر ہی پر بیٹھے تھے۔ پاجاموں پر ایک نظر ڈال کر انہوں نے پوچھا۔

"رحیم صاحب درزی نے پاجامے بہت میلے کر دیئے ؟"

"نہیں تو مولوی صاحب! پاجامے تو صاف ہیں!" کرنل صاحب نے اپنی کارکردگی کے بارے میں اس منفی تبصرے پر کسی قدر پریشان ہو کر کہا۔

"تو پھر کیا آپ نے یہ پاجامے کورے لٹھے کے سلوائے ہیں؟ یہ صاف اور سفید تو نہیں ہیں" مولوی صاحب نے چڑ کر پوچھا۔

"جی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دراصل آپ کے آرام کی خاطر میں نے کپڑے کو الٹی طرف سے سلوایا ہے۔ تاکہ نرم رواں بدن کی طرف رہے اور (کورے لٹھے کی طرح میلا میلا سا نظر آنے والا) غیر رواں دار پہلو باہر کی سمت رہے۔"

مولوی صاحب کے چہرے پر برہمی اور ناگواری کی لہر آئی اور گزر گئی۔ انہوں نے کچھ کہا تو نہیں مگر ان کا مکمل اور مسلسل سکوت سب کچھ بتا گیا۔ کرنل صاحب اس گمبھیر خاموشی کو توڑنے میں ناکام رہے اور بجھے بجھے انداز میں اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ ان کے جاتے ہی مولوی صاحب پھٹ پڑے :

"اسرار احمد ان پاجاموں کو ایک طرف ڈال دو۔ میں نہیں پہنوں گا ــــ عجب فیل خر مغز ہے یہ شخص!"

حکیم صاحب نے پاجامے وہاں سے ہٹا دیئے اور کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں مولوی صاحب کا غصہ فرو ہوا اور انہوں نے کسی قدر شگفتہ انداز میں حکیم صاحب سے مخاطب ہو کر کہا

"بھئی اس فہرست میں حکیم امامی سے اوپر ان کا نام لکھ دو۔ یہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔"

"جی اچھا!" حکیم صاحب نے ہنس کر جواب دیا اور بات ختم ہو گئی۔ عطاالرحیم صاحب کی فربہی اور ان کی قابلِ رحم حد تک سادہ لوحی پر فیلِ خر مغز والا جامع تبصرہ تو سمجھ میں آیا مگر فہرست ـــ حکیم امامی کا حوالہ اور اعزاز والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں پوچھنے پر حکیم صاحب نے وضاحت کی کہ بنگلور میں مولوی صاحب کے کوئی دوست حکیم امامی تھے جن کی حماقتوں سے مولوی صاحب عاجز تھے۔ مولوی صاحب بیوقوفوں سے بہت چڑتے تھے اور ان کی صحبت کو عذاب سمجھتے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنے دوستوں اور شناساؤں میں سے ایسے افراد کی فہرست مرتب کر رکھی تھی جن کے فیضِ صحبت کے عذاب سے وہ پناہ مانگتے تھے۔ اس فہرست میں حکیم امامی برسوں سے نمبر ایک چلے آ رہے تھے۔ مگر اس روز مولوی صاحب نے حکیم امامی کو اس اعزاز سے محروم کر کے کرنل صاحب کو اس سے سرفراز کر دیا۔

●

مولوی صاحب کے طویل سفر کے مضمرات پر ان کے معالجین پوری طرح یکسو نہیں تھے اور ابھی بیرونِ ملک روانگی کی کوئی تاریخ طے نہیں ہوئی تھی کہ اسی اثنا میں صدر پاکستان کی طرف سے سی ایم ایچ راولپنڈی میں ان کے علاج کی پیش کش موصول ہو گئی۔ اخبارات میں

اس پیش کش کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں تو بہت سے بے خبروں کو خبر ہوئی کہ ان کے شہر میں کوئی بابائے اردو بھی رہتے ہیں۔ بیمار ہیں اور ایسے اہم ہیں کہ صدرِ مملکت ان کی خدمت کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اس خبر کے ملتے ہی بہت سے موقع پرستوں کو مولوی صاحب کی عیادت کا خیال آیا۔ اور ہسپتال میں مولوی صاحب کی عیادت کے لئے آنے والے ایسے اجنبیوں کی تعداد بڑھ گئی جن سے نہ کبھی مولوی صاحب کے مراسم رہے اور نہ ملاقات۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں بیمار بابائے اردو کی جانِ ناتواں سربراہِ مملکت سے قربت کا وسیلہ محسوس ہوئی اور بس ان کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک روز ایک خاصے فربہ بدن والے صاحب سوٹ میں ملبوس ٹائی باندھے اور جناح کیپ پہنے ہوئے وارڈ کا زینہ چڑھنے کی مشقت طے کرنے کے بعد پسینے میں نہائے ہوئے مولوی صاحب کے کمرے میں وارد ہوئے۔ بڑی چاپلوسانہ عقیدت کے ساتھ انہوں نے مولوی صاحب کی دست بوسی فرمائی اور مزاج پرسی کی۔ مولوی صاحب بستر پر دراز تھے۔ عینک تکیے کے نیچے رکھی تھی۔ ایسی کیفیت میں نہ وہ کسی کو دیکھ کر پہچان سکتے تھے اور نہ سن کر (ثقلِ سماعت کے باعث) حکیم صاحب نے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ رئیس بلدیہ ہیں۔ آپ کی عیادت کے لئے آئے ہیں۔ مولوی صاحب نے کسی قدر سرد مہری کے ساتھ رسمی علیک سلیک کی اور خاموش ہو کر بے تعلق ہو گئے۔ وہ صاحب جو رئیس بلدیہ ہی نہیں بڑے صنعت کار بھی تھے کرسی پر بیٹھ گئے اور حکیم صاحب سے مولوی صاحب کی پرسشِ احوال کے بعد گویا ہوئے:

"دیکھئے جی کیسی بدقسمتی کی بات ہے اتنا بڑا آدمی ہمارے شہر میں ہسپتال میں پڑا رہا اور ہم اس کی خدمت سے غافل رہے۔ بابائے اردو تو جی پورے ملک بلکہ ان سب ملکوں کے لئے کہ جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے قابلِ فخر ہیں۔ یہ اس شہر کا سامان ہیں۔ ان کی خدمت ہمارے لئے سعادت ہے۔ صدر صاحب نے علاج کی پیش کش فرما کر بڑی عزت افزائی کی۔ مگر دیکھیں نا جی ہمارا صدر تو سپاہی ہے۔ وہ ذاتی حیثیت میں کوئی امیر آدمی تو نہیں ہے۔ مگر غریب آدمی کا دل بڑا ہوتا ہے۔ اس نے غریب ہوتے ہوئے بابا جی کے علاج کی پیش کش کر کے بڑے دل والی بات کی ہے۔ مگر یہ تو ہمارے سوچنے کی بات ہے نا جی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ہم یہ بوجھ اپنے غریب صدر پر کیوں ڈالیں۔ بابا جی اس شہر کا سامان ہیں۔ ان کی خدمت ہمارا فرض بنتی ہے۔ ان کی آمدورفت راولپنڈی میں ان کے تیمارداروں کے قیام و طعام اور علاج معالجے کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ میں برداشت کروں گا یہ بوجھ۔ آپ صدر صاحب کو اطلاع کر دیں جی۔" یہ لمبی سی تقریر کر کے وہ اٹھے اور فرمانے لگے۔

"کسی کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔ میں ابھی پی آئی اے سے ٹکٹ بنوا دیتا ہوں۔ انہیں اوپن رکھیں گے۔ جب روانگی کا پروگرام طے ہو جائے تو اسی حساب سے کنفرم کرا لیجئے۔ میں انشاء اللہ روانگی سے پہلے حاضر ہوتا رہوں گا اور ہر ممکن خدمت کروں گا، انشاء اللہ۔"

ان کے یہ اقدامات اور اعلانات اتنے اچانک تھے کہ ہمیں مولوی صاحب سے مشورے یا اپنے ردِّعمل کے طے کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ حکیم صاحب نے مجھے ان کے ساتھ جانے کی ہدایت کی اور میں اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیا۔ پی آئی اے سے انہوں نے مولوی صاحب کے لئے دوہری یا تہری نشست والا ٹکٹ بنوایا تاکہ وہ لیٹ کر سفر کر سکیں اور مزید دو ٹکٹ بنوا کر میرے حوالے کئے اور بتایا کہ وہ کل پھر ہسپتال آئیں گے۔ انہوں نے اپنی گاڑی ہی میں مجھے واپس ہسپتال پہنچایا۔ میں کمرے میں پہنچا تو حکیم صاحب نہیں تھے اور مولوی صاحب بستر پر دراز مگر بیدار تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا:

"تم کہاں تھے ؟"
میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بس غضب ہو گیا۔ وہ غصے سے کانپنے لگے اور غضب ناک آواز میں بولے :
"تو اب میرے علاج کے لئے شہر میں خیرات اکٹھی ہونے لگی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم کیوں گئے تھے اس کے ساتھ کس سے پوچھ کر گئے تھے ؟" میں مولوی صاحب کے اس پُر اشتعال ردِّ عمل سے گھبرا گیا اور گھگھیا کر بولا۔
"مجھ سے تو حکیم صاحب نے کہا تھا کہ تم چلے جاؤ ان کے ساتھ اس لئے میں گیا تھا"
"حکیم صاحب تو ..." اور اس کے بعد مولوی صاحب نے حکیم صاحب کی شان میں بہت کچھ بے نقط ارشاد فرمایا اور میں سہم گیا کہ اب واپسی پر جب حکیم صاحب کی باز پرس ہو گی تو وہ مجھ پر الگ برسیں گے اور بعد ازاں ایسا ہوا بھی۔ حکیم صاحب پر اپنی برہمی کا اظہار مکمل کرنے کے بعد مولوی صاحب نے مجھے حکم دیا :
"ابھی یہ ٹکٹ لے کر جاؤ اور اس کے منہ پر مار کر بتا دو کہ میں نے زندگی میں اپنے لئے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا ہے اور صدقے سے بھی کچھ نہیں لوں گا۔ میں اپنا علاج خود اپنے پیسے سے کراؤں گا۔ میں ایسا کنگال نہیں ہوا کہ میرے علاج کے لئے خیرات جمع ہونے لگے۔" میں یہ حکم پاتے ہی کمرے سے نکل گیا اور برآمدے میں بیٹھ کر حکیم صاحب کا انتظار کرنے لگا۔

اگلے روز رئیس بلدیہ جھومتے جھامتے سہ پہر کے وقت آن پہنچے اور شامت اعمال کہ انہوں نے براہ راست نقد رقم کی تھیلی مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کرنی چاہی۔ بس پھر کچھ نہ پوچھئے کہ مولوی صاحب نے ان کی کیسی تواضع فرمائی۔ مگر بڑے مضبوط اعصاب کے تھے یہ رئیس کہ ان پر ہر تبرّا و دشنام بے اثر ہوتے جا رہا تھا اور مطلقاً بے مزہ ہوئے بغیر وہ یہ سوغات دشنام ہنس ہنس کر وصول کر رہے تھے اور ہم سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے۔
"دیکھیں نا جی بزرگوں کی تو یہی شان ہوتی ہے۔ ان کی ڈانٹ تو تبرک ہوتی ہے جی۔ جیسے یہ تبرک ملا اس کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ بس جی ہمارا جو فرض تھا وہ ہم نے پورا کیا۔ بزرگوں کو نہیں قبول تو یہ اللہ کی مرضی۔ اچھا جی اللہ بزرگوں کو صحت دے، خدا حافظ۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے رخصت ہو گئے۔
ہماری یہ بےبسی کہ مولوی صاحب کی اس حالتِ غضب میں ہم مظلوم و معتوب رئیس بلدیہ سے نہ اظہارِ ہمدردی کر سکے اور نہ انہیں رخصت کرنے کے لئے کمرے سے باہر نکل سکے۔



ہسپتال کے ایک ماہ کے تجربے میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ مولوی صاحب خونی رشتوں میں ویسی گرمجوشی اور تیزی محسوس نہیں کرتے تھے جیسی گرمجوشی اور تپاک ان کے یہاں جذباتی اور حسّی رشتوں میں نظر آتا تھا۔ ہسپتال میں مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ احمد حسن صاحب اور ان کے صاحبزادے ہفتے میں ایک آدھ بار ملنے آتے تھے اور ہسپتال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب دنیا میں ایسے یکا و تنہا نہیں تھے جیسے سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بھائی کا خاندان اور دوسرے اعزہ کراچی میں موجود ہیں مگر مولوی صاحب نے نہ صرف تجرّد کی زندگی گزاری بلکہ اپنے عزیز و اقارب سے بھی کٹ کر الگ تھلگ ہی رہے۔ یہ علیحدگی پسندی بھی مولوی صاحب کی طرف سے یک طرفہ ہی نظر آتی تھی۔ دو طرفہ ہوتی تو شیخ احمد حسن صاحب اور ان کے بچے بھی عیادت کے لئے نہ آیا کرتے۔
ہسپتال میں جب بھی دونوں بھائیوں کو یکجا دیکھا تو ان میں علیک سلیک سے زیادہ کچھ نہ دیکھا۔ تاہم ان میں کوئی بات نہیں

ہوتی تھی۔ شیخ احمد حسن جو بالکل مولوی صاحب ہی کی وضع قطع کے تھے کمرے میں آتے تھے اور سلام کے تبادلے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھے رہتے تھے اور تھوڑی دیر بعد سلام کا تبادلہ کر کے رخصت ہو جاتے تھے۔ ان خونی رشتوں کی سرد مہری کے مقابلے میں محض جذباتی اور حسی رشتوں میں مولوی صاحب کی دلچسپی، فعالیت اور گرمجوشی بھی دیکھی۔

حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والے ان کے ایک مرحوم دوست نواب منظور یار جنگ کی بیوہ اور ان کے بچے کراچی میں تھے۔ یہ لوگ یہاں کچھ معاشی مسائل سے دوچار تھے۔ مولوی صاحب غالباً ان کی کچھ مسلسل مالی اعانت کرتے تھے۔ مگر اس خاندان کے سابقہ اعزاز و اکرام کے خیال سے اپنے اس حسن سلوک کا اخفا کرتے تھے کہ اس خاندان کے افراد کی عزت نفس کو صدمہ نہ پہنچے جنہوں نے ماضی میں بہت اچھے دن گزارے تھے۔ مولوی صاحب کو ہسپتال میں ان لوگوں کی آمد کی پہلے سے اطلاع ہوتی تھی۔ چنانچہ بڑے اہتمام سے ان کی تواضع کے لئے پھل اور مشروبات منگا کر رکھے جاتے تھے۔ مولوی صاحب ان لوگوں کی کچھ مالی اعانت کرتے تھے اس کا اندازہ بھی مجھے بس یوں ہوا کہ جس روز انہیں آنا ہوتا تھا اس سے ایک روز قبل بنک سے کچھ پیسے منگوا کر مولوی صاحب تکیے کے نیچے رکھ لیتے تھے اور جب یہ لوگ آتے تھے تو تھوڑی دیر بعد ہمیں ہدایت ہوتی تھی کہ ہم کمرے سے باہر چلے جائیں۔ آخری بار جب مولوی صاحب کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور وہ غالباً ان لوگوں سے زیادہ باتیں نہ کر سکے تو بچیاں اشکبار آنکھوں کے ساتھ کمرے سے نکل کر رخصت ہوئیں۔

●

مولوی صاحب کا مذہب کا معاملہ بھی مجھے چیستاں نظر آیا۔ اپنی وضع قطع سے وہ بڑے پاکیزہ اور بھلے مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ شکل وصورت سے اور لباس سے بھی وہ خاصے دیندار معلوم ہوتے تھے۔ مگر ایک دو بار مجلسوں میں جب میں نے انہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں اوٹ پٹانگ لطیفے سناتے یا سن کر محظوظ ہوتے دیکھا تو مجھے بڑی اذیتناک حیرت ہوئی۔ مذہب کے بارے میں ان کے فکر و عمل میں بڑا خوفناک تضاد تھا۔ ہر مذہب کا بنیادی تصور خدا کا ہوتا ہے مگر یہ تصور ان کی ایمانیات سے کم از کم مجھے خارج دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ میرا تاثر اول اول یہی بنا تھا کہ مولوی صاحب محض نام کے مسلمان ہیں ورنہ حقیقتاً وہ بے دین اور ملحد ہیں۔

مگر ایک روز مجھے بالکل دوسری طرح کی خوشگوار حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری (مرحوم) اور ابن انشاؔ (مرحوم) مولوی صاحب کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب بھی موجود تھے۔ ایک آدھ صاحب کوئی اور تھے جن کا نام ذہن میں نہیں آ رہا۔ مولوی صاحب کی طبیعت بھی خاصی بحال تھی۔ ہلکی پھلکی گفتگو ہو رہی تھی۔ ابن انشاؔ (مرحوم) غالباً جناب جمیل الدین عالی اور قدرت اللہ شہاب صاحب سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں مولوی صاحب کے علاج معالجے کے انتظامات میں ہونے والی پیش رفت کی تفصیل بتا رہے تھے کہ اسی اثنا میں ڈاکٹر احسن فاروقی (مرحوم) کمرے میں داخل ہوئے اور مولوی صاحب کو سلام کر کے سامنے والے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب نے بڑی گرمجوشی ان کی پذیرائی کی اور (غالباً کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بی اے ہاشمی صاحب سے فاروقی صاحب کے تنازعے سے باخبری کی بنیاد پر) پوچھا:

"سنائیے فاروقی! یونیورسٹی میں کیا ہو رہا ہے؟"

"وہی ہو رہا ہے جو مسلمانوں کی تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔"

فاروقی صاحب نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ ان کی تلخی کا سبب یہ تھا کہ وہ بی اے ہاشمی صاحب سے جھگڑے کے نتیجے میں بالآخر اپنی ملازمت سے محروم ہو چکے تھے۔

"کیا ہوتا رہا ہے مسلمانوں کی تاریخ میں؟" مولوی صاحب کے لہجے میں بڑی برہمی کے آثار تھے جنہیں محسوس کئے بغیر فاروقی صاحب نے نہایت مختصر جواب دیا۔

"غنڈہ گردی!"

مولوی صاحب کے اعصاب یہ جواب سنتے ہی گویا ٹوٹ گئے اور انہوں نے دھاڑ کر کہا:

"جاہل ہو تم، نکل جاؤ میرے کمرے سے میں جاہلوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

فاروقی صاحب نے یہ بات غالباً مولوی صاحب کی "بے دینی" اور "الحاد پسندی" کی شہرت کے پیش نظر کہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں مولوی صاحب کے مزاج سے مکمل آگاہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال یہ رہا ہوگا کہ مولوی صاحب ان کا یہ جواب پاکر خوش ہوں گے۔ مگر جو ردعمل ہوا وہ ان کے لئے غیر متوقع تھا اور وہ بوکھلا گئے۔ مگر آدمی سمجھدار تھے۔ مولوی صاحب کے غصے کو فرو کرنے کے لئے تعمیل حکم کرتے ہوئے فوراً اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے اور باہر نکل جانے کی بجائے بڑی پرکاری اور خاموشی سے مولوی صاحب کے پلنگ کی پائنتی بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب کچھ دیر چلے گئے۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ سب ہی لوگ اس اچانک صورت حال سے دم بخود تھے۔ پھر مولوی صاحب خود ہی بولے۔

"ہاشمی نے فاروقی کو بہت ستایا ہے۔ بے چارا ذہنی طور پر بہت زچ ہو گیا ہے۔ تب ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔"

"جی ہاں مولوی صاحب بالکل صحیح رائے دی ہے آپ نے۔" فاروقی صاحب نے بول کر پھر اپنی موجودگی کی اطلاع دی۔

"اچھا! تم گئے نہیں یہیں موجود ہو!" مولوی صاحب کا غصہ ڈھل چکا تھا۔

"جی ہاں مولوی صاحب میں تعمیل ارشاد کرکے آپ کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور آپ کی صحبت سے محروم بھی نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے آپ کے قدموں میں آ بیٹھا ہوں۔"

"بہت خوب!" مولوی صاحب نے شگفتگی سے کہا۔

اور اس کے بعد مولوی صاحب نے اسلام کی تاریخ کے روشن پہلوؤں، تہذیب انسانی پر اسلام کے احسانات اور عالمگیر تمدنی ارتقاء پر مسلمانوں کی تاریخ کے اثرات کا بھرپور محاکمہ کرتے ہوئے بہت ہی فاضلانہ قسم کا لیکچر دیا جسے سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ اور مذہب کے معاملے میں مولوی صاحب کا جو پہلا تاثر مجھ پر قائم ہوا تھا اس کی شدت میں کسی قدر کمی آئی۔ خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، شخصیت اور ثقافتی میدان میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا ذکر مولوی صاحب نے جیسی عقیدت و محبت سے کیا وہ بڑا بصیرت افروز تھا۔ مولوی صاحب کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کو غنڈہ گردی کی تاریخ کہنا جہالت ہے یا جھوٹ۔ سچی بات یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو تمدن، تہذیب، شائستگی اور علم کا نکھار دیا ہی مسلم تاریخ نے ہے۔

مذہب کے بارے میں رویوں کے اس تضاد میں مکمل تطبیق تو ممکن نہیں بس اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ مولوی صاحب کے ذہن نے اسلام کے نظام عقائد و عبادات کو تو قبول نہیں کیا مگر تہذیب و ثقافت کی صورت گری اور ترقی کے سلسلے میں اسلام کے قائدانہ کردار کے وہ محض معترف ہی نہیں تھے بلکہ اس معاملے میں وہ اتنے جذباتی تھے کہ مخالفت میں کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ مگر میں آج تک یہ گتھی نہیں سلجھا سکا کہ مولوی صاحب کے ذہن نے اسلام کے نظام عقائد کو کیوں قبول نہیں کیا جب کہ تاریخ اور تہذیب انسانی پر اس کے مثبت اثرات اور فیوض و برکات سے انہیں انکار نہیں تھا۔

آفاق صدیقی

# حسن حمیدؒ

آج سے بیس برس پہلے میری ایک کتاب "تاثرات" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں تنقیدی مضامین کے علاوہ دوستوں کے کچھ قلمی خاکے بھی شامل تھے۔ حسن حمیدی کے بارے میں ان کی شخصیت کے حوالے سے میں نے لکھا تھا "ان حضرت کے رگ و ریشے میں کیسی ہوئی بجلیاں بھری ہیں۔ بڑے تیز طرار، بے حد ذہین، خاصے پڑھے لکھے لیکن طوفانی آدمی ہیں۔ پہلے لاہور میں رہتے تھے ۱۹۵۲ء میں سکھر آ گئے اور مشاعروں میں اپنی تند و تیز انقلابی نظموں سے وہ سماں پیدا کیا کہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ لیڈر بھی ہو گئے۔ اسی لیڈری کے چکر میں یکے بعد دیگرے کئی ملازمتیں چھوڑیں، کچھ عرصہ ضلع سکھر کے قصبہ نوعاقل کے ایک ہائی اسکول میں پڑھایا وہاں سے اکتائے تو خیرپور میں جا بسے اور وہاں بھی "ادبستان" کے نام پر وہ ہنگامے برپا کئے کہ ہر کس و ناکس کی زبان پر ان کا نام آنے لگا اور خفیہ پولیس کے محکمے کو ان سے بڑی محبت ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد سوئی گیس کمپنی کے افسر تعلقات عامہ بن گئے لیکن ان کی دوستی افسروں سے کہیں زیادہ مزدوروں سے رہی اس لئے یہ ملازمت بھی بے وفا ثابت ہوئی۔ دوبارہ سکھر آئے اور روزنامہ "کلیم" کے مدیر ہو گئے۔ یہ مشغلہ بھی راس نہ آیا تو سکھر کے ایوان صنعت و تجارت میں آفس سکریٹری کی کرسی سنبھالی پھر وکالت پڑھی اور وکیل بن کر محنت کشوں اور مزدوروں کے مستند لیڈر کی حیثیت سے نیشنل عوامی پارٹی کے ہو رہے۔

حسن حمیدی کو میں پیار میں ہمیشہ "لیڈر" کہا کرتا۔ ان کا آبائی وطن پٹنہ (عظیم آباد) تھا جہاں یکم فروری ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حمید عظیم آبادی کئی کتابوں کے مصنف، فن عروض کے ماہر اور قادر الکلام شاعر تھے۔

۱۹۴۷ء تک "لیڈر" کی تعلیم و تربیت اپنے وطن میں ہی ہوتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ اردو ادب میں ایم اے کیا۔ یونیورسٹی میں طلبہ یونین کے جنرل سکریٹری رہے۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں ساہیوال (منٹگمری) کے حلقہ ارباب ذوق کے نائب معتمد ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں اپنے بڑے بھائی مبارک سرور

حمیدی کے پاس سکھر آ گئے جو ان دنوں ریلوے ہائی اسکول میں انگلش ٹیچر تھے اور ملیڈر کے چھوٹے بھائی عزیز حمیدی اس زمانے میں حلقۂ ادب اسلامی سکھر کے سرگرم رکن تھے۔ طرحی مشاعروں اور تنقیدی نشستوں میں دونوں بھائیوں کی خاصی نظریاتی نوک جھونک رہتی لیکن ایسی بدمزگی کبھی نہ پیدا ہوتی جو ادبی پیش رفت میں رکاوٹ ڈالے۔

۱۹۵۲ء کے وسط میں جب ہم نے بڑے پیمانے پر سندھ ادبی کانفرنس کے انعقاد کا ڈول ڈالا تو لیڈر نے مجلس انتظامیہ کے رکن کی حیثیت سے بھرپور تعاون کیا۔ شیخ ایاز، شیخ راز، عبدالہٰی شمسی، ن۔ م نیازی، مقبول صدیقی، اور کئی دوسرے احباب کانفرنس کی تیاریوں میں پیش پیش تھے کہ انعقاد سے پہلے ایک ایسا مسئلہ پیدا ہو گیا جس کے سبب مجلس انتظامیہ آدھی رہ گئی۔ طے کیا گیا تھا کہ کانفرنس کا افتتاح ملے۔ کے بروہی صاحب فرمائیں گے جو اس دور میں وفاقی وزیر قانون تھے۔ انہوں نے ہماری دعوت کو منظور بھی کر لیا تھا لیکن ان کی سرکاری مصروفیات کی وجہ سے جب کانفرنس کی تاریخوں میں تبدیلی کی نوبت آئی تو شمسی صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر وہ مصروف ہیں تو پیر زادہ عبدالستار کو مہمان خصوصی بنایا جائے۔ یہ تجویز شیخ ایاز نے نامنظور کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمسی صاحب کی قیادت میں کئی احباب واک آؤٹ کر گئے۔ دسمبر ۱۹۵۲ء میں یہ کانفرنس تو ہوئی، بروہی صاحب نے افتتاح کیا، مولانا عبدالمجید سالک، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، محشر بدایونی، شاعر لکھنوی، صہبا لکھنوی، حمایت علی شاعر، خالد علیگ، کرار نوری، خمار انصاری اور بہت سے سندھی اور اردو کے ادیب و شاعر شریک بھی ہوئے لیکن اس کانفرنس کے بعد سکھر کے احباب ادب دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ کانفرنس کے سکریٹری کے طور پر میں شیخ ایاز کے ساتھ تھا اس لئے کئی احباب بہت دنوں تک مجھ سے برگشتہ خاطر رہے مگر حسن حمیدی کی دلداری میں کوئی فرق نہ آیا۔

حسن حمیدی اپنے ادبی سفر کے آغاز سے انجام تک ترقی پسند تحریک کے بڑے پرجوش حامی رہے۔ انہوں نے عالمی سیاست کے تناظر اور اپنے ملک میں رونما ہونے والے حالات و واقعات پر جو نظمیں لکھیں ان میں انقلابی گھن گرج، باغیانہ جوش و خروش اور مفکرانہ سنجیدگی کی ملی جلی کیفیات پائی جاتی ہیں مثال کے طور پر اولیں دور کی چند نظموں کے اقتباسات :۔

جلوۂ حسن سحر دیکھ رہے ہیں کچھ لوگ — چشم ادراک میں احساس کی بینائی ہے
ہر قدم پر دلِ پُرخوں نے جلائے ہیں چراغ — جیسے گلیوں میں ستاروں کی برات آئی ہے
شاہراہوں پہ بھی بکھرے ہیں لہو کے غنچے — جیسے گلزار بنانے کی قسم کھائی ہے
حسن ہے قتل گہہ دیدہ وراں کی تخلیق — جب بھی آئی ہے صلیبوں پہ بہار آئی ہے

( الجزائر )

الجزائر اور جنوبی افریقہ میں سامراجی چنگل سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جو قربانیاں دی گئیں حسن حمیدی کی نظموں میں ان کا عکس جا بجا جھلملاتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے

کس نے مرتی ہوئی تہذیب کو للکارا ہے — آج آواز بہ اندازِ دگر آتی ہے
سینۂ عزم پہ زخموں کے چراغ — جام چھلکاتی ہوئی آج سحر آتی ہے

ماں کی سہمی ہوئی آغوش میں ممتا کی یہ لاش — آج تو موت بھی معصوم نظر آتی ہے



یہ در و بام پہ گلرنگ لہو کی کرنیں — تیری گلیوں میں شفق پھوٹ رہی ہو جیسے
کانپتے ہاتھوں میں تو خیز جگر کے ٹکڑے — دستِ ظلمت سے کرن چھوٹ رہی ہو جیسے
صبح پہ رات کی یلغار رہے گی کب تک — دستِ مظلوم میں تلوار رہے گی کب تک

(جنوبی افریقہ)

پچھلے چالیس برس میں جہاں جہاں حریت پسندوں نے ملک و قوم کی آزادی اور انسانیت کی سربلندی کے لئے ظلم و جبر کے اندھیروں میں اپنے لہو سے چراغ روشن کرنے کی جدوجہد کو جاری رکھا حسن حمیدی نے اپنی شاعری میں اس جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری سمجھا۔ دس بارہ سال پہلے جب ان کا پہلا شعری مجموعہ "شہر سلاسل" منظر عام پر آیا تو اس میں زیادہ تر نظمیں ایسے ہی موضوعات پر تھیں۔ ان نظموں میں سطحی نعرہ بازی سے گریز کرتے ہوئے فکر و احساس کی گہرائی و گیرائی کے رجائی پہلو کو وہ اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔

چپ ہو کیوں آج رفیقانِ سفر کچھ تو کہو
شب ہو تاریک تو شکوں کی کرن پھوٹتی ہے — لب ہوں خاموش تو زخموں کے دہن بولتے ہیں
عرصۂ حشر نہیں بزمِ رقیباں ہی تو ہے — بولنے والے سرِ دار و رسن بولتے ہیں
اہلِ دل نغمہ فشاں رقص کناں چلتے ہیں — مضطرب شعلہ بجاں برق و شاں چلتے ہیں
آبلے پھٹتے ہیں اور کاہکشاں بنتی ہے — یہ جو مٹتے ہیں تو قدموں کے نشاں چلتے ہیں



عالمی سیاست کے ساتھ ساتھ اپنے وطن کے حالات و واقعات پر بھی وہ تاریخی شعور کی روشنی میں منظوم تبصرہ کرتے ہیں۔ "ایک صدی پہلے، ایک صدی بعد" ان کی مشہور نظم ہے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے برصغیر پر مغربی استعمار کے غلبے اور پھر عہد بہ عہد اس کے پھیلتے ہوئے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ۱۹۵۷ء تک آتی ہے۔ اس نظم کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے :۔

جس وقت شبِ تار کی یلغار ہوئی تھی — کہتے ہیں کہ اک صبح نمودار ہوئی تھی
اغیار تو دربار کی تزئین بنے تھے — اپنوں سے ملاقات سرِ دار ہوئی تھی
یوں رسم رہِ عشق کی تبدیل ہوئی تھی — فریاد بھی افکار میں تحلیل ہوئی تھی
خوں گشتہ جبینوں سے سحر چھانک رہی تھی — ظلمت کی نئے رنگ سے تزئیل ہوئی تھی

آگے چل کر دکن اور بنگال میں جو کچھ ہوا اور اپنوں کی غداری و مکاری کے باعث، برطانوی اقتدار کو جو تقویت ملی اس کی جانب چند اشارے ہیں مثلاً :۔

جو دار کے شایاں نہ تھے زنداں میں ملے تھے     رنگوں کی وادی میں نئے پھول کھلے تھے
ٹیپو کا لہو بیچنے والوں کا کرم ہے     پردے میں اجالے کے وہی شامِ الم ہے
سہمی ہوئی آہوں کے جنازے کو اٹھائے     کہتے ہیں کہ ہاتھوں میں بہاروں کا علم ہے

نظم کے آخری حصے میں وہ حصولِ آزادی کے بعد کی گھٹن اور سیاسی و معاشرتی ماحول کی ابتری پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہتے ہیں :۔

بولو کہ یہاں کوئی بھی خورسند نہیں ہے     اٹھو کہ درِ نورِ سحر بند نہیں ہے
ماحول کا یہ رنگ ہمیشہ نہ رہے گا     تاریخ تو افراد کی پابند نہیں ہے

پہلے دور کی نظموں میں ۱۹۷۱ء تک حسن حمیدی نے موضوعات کے تنوع اور جدید حسیت کا بڑا خیال رکھا ہے۔ مرگِ احساس، قہقہوں کا زہر، اب نئی صبح مسکرائے گی، فکرِ نو، شہر بدر اور زیرِ لب ان کی کامیاب نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ نظمیں کربِ آگہی اور جرأتِ اظہار کے وہ نقوش اجاگر کرتی ہیں جن میں خلوص و محبت، حسن و جمال، امن و آشتی، ہمدردی و ایثار، عزم و ہمت اور انسانیت نوازی کی مرصع کاریاں نمایاں ہیں۔ اسلوبِ بیان سے کہیں کہیں تیکھے طنز اور بلند آہنگ لہجے کے جوہر بھی دکھائے ہیں تاہم مجموعی فضا فکر و فن اور جذبہ و احساس کے جلال و جمال کی آئینہ دار ہے۔ 'فکرِ نو' میں وہ اپنے ماحول اور تہذیبِ حاضر کے تضادات پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ کشاکش یہ نفرتوں کا جلال     یہ تباہی کے نت نئے دستور
یہ تجسس یہ ارتقاء کی بات     جیسے بیوہ کی مانگ میں سیندور
ہر جبینِ وفا عرق آلود     خوف و دہشت سے زیست کا مفلوق
اشک بر دوشِ چشمِ جلوہ طلب     سہمی سہمی صبا حتوں کی شفق
فکرِ نو! ہے ترے تعرف میں     بیکراں مستعار تابانی
پھر بھی دل ہے کہ سہما جاتا ہے     میرے احساس کی یہ نادانی
دودھیا آنچلوں میں کھلتے پھول     مسکرانے کا حق بھی رکھتے ہیں
نوجوانی کے تھرتھراتے ہونٹ     گنگنانے کا حق بھی رکھتے ہیں
زندگی امن سے عبارت ہے     امن آئینِ بزمِ فطرت ہے
ہم محبت کے گیت گاتے ہیں     زیست پروردۂ محبت ہے

حسن حمیدی کا دوسرا شعری مجموعہ 'جرمِ آگہی' کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ عوامی تحریکوں اور محنت کشوں کی بیباک حمایت کے سلسلے میں کئی مرتبہ قید و بند سے واسطہ پڑا۔ اس مجموعے کی بیشتر نظموں اور غزلوں کو اسی لئے انہوں نے 'مرحمتِ کنجِ زنداں' کہا ہے۔ پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں :۔

"ہم نے اس دھرتی سے پیار کیا، اپنی ماں سمجھ کر۔ اس کے سپوتوں سے پیار کیا اپنا خون سمجھ کر اور ان کے ناطے سے دنیا کے تمام دکھی انسانوں سے پیار کیا۔ پیار کے یہ آبگینے نفرتوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر کرچیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم ان کرچیوں کو پلکوں سے چنتے چنتے بینائیوں کو لہولہان کر بیٹھے۔ پیار کی ان کرچیوں نے ہمیں کیا دیا؟ پھر بھی ہم بکتے رہتے ہیں عادی مجرموں کی طرح۔ جرم و سزا کا یہ تسلسل جاری ہے ہم نے ماں کی آغوش کو فاختاؤں کا آشیانہ تصور کیا شاہینوں کی رزم گاہ نہیں۔ دوسری طرف وہ مشاہیر، جنہوں نے وطن سے پیار کیا لیکن طوائف سمجھ کر۔ وہ اقتدار کے طبلے کی تھاپ پر دھنیں ترتیب دیتے رہے انہیں مجرے کا معاوضہ بھی ملا اور حب الوطنی کا تمغہ بھی۔

لمحات اسیری اجنبی مسافر کی طرح وارد نہیں ہوئے ان حلقہ بہ حلقہ مٹیالی فصیلوں سے میری دیرینہ آشنائی ہے۔ زندگی کے ان گنت شب و روز اس عشرت کدے میں بسر کر چکا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ عقاب کی طرح بلند تنہائیوں پر فن کے آشیانے تعمیر نہیں کرتا۔ میں حقائق پر عقائد کے غلاف نہیں چڑھاتا۔ میں آئینے پر نقش و نگار نہیں بناتا۔ میں ہم خرما و ہم ثواب کی دوغلی حکمت عملی کا قائل نہیں۔"

"جرم آگہی" کا منظوم انتساب بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ ان کی کومٹ منٹ (commitment) نظری اور عملی دونوں دائروں میں مسلک شبیری سے ہے۔

میں اپنی زندہ تحریروں کو
ان چہروں سے منسوب کروں
سب زندہ حرف انہی کے ہیں
جو زندہ رہنے کے اسلوب سے واقف ہوتے ہیں

"جرم آگہی" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اسی عنوان پر ایک مثنوی ہے جس کا مرکزی خیال عالم انسانیت کے بنیادی حقوق کی بحالی کے لئے جسم و جاں کی قربانیاں دینے سے عبارت ہے۔ یہ مرکزی خیال ایک سچی کہانی کے طور پر نذیر اور حمیدہ جیسے حریت پسند کرداروں اور کئی ذیلی کرداروں کی مدد سے ابھارا گیا ہے مگر مرکزی کردار بذات خود راوی کا ہے جو اپنے آپ کو ایک گاؤں کی معاشرت و معیشت کے حوالے سے سامنے لاتا ہے اور پھر ایک غریب کسان کے بیٹے نذیر کی امنگوں کا ترجمان بنتا ہے جو بچپن سے علم و آگہی کا شیدا تھا لیکن جاگیردارانہ جبریت نے اسے جبراً حصول علم سے محروم رکھا۔ جوانی میں اس نے شہر کا رخ کیا، مزدوروں میں شامل ہوا، محنت کشوں کا رہنما بنا۔ ایک دن عدالت میں حمیدہ کا مقدمہ پیش ہوا تو وہ بھی وہاں موجود تھا۔ حمیدہ خود بھی ایک کسان کی بیٹی تھی اسے جاگیردارانہ و ظالمانہ سماج سے بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ نذیر بھی محنت کشوں کی رہنمائی کے جرم میں قید تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی بے پناہ محبت میں مبتلا ہوئے۔ نذیر حمیدہ کو زنداں کے روپ میں دیکھتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے نذیر کو قید خانے ہی میں قتل کرا دیا گیا۔ حمیدہ کا شعلۂ بغاوت اور زیادہ بھڑک اٹھا۔ اور آخر کار اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوا۔

یہ مثنوی انداز بیاں اور جزئیات نگاری کے اثر آفریں محاسن رکھتی ہے اس کے بہت سے اشعار میں طنزیہ لہجے کی کاٹ سے بڑا کام لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کون جذبوں سے پیار کرتا ہے　　　شہر سنگ شمار کرتا ہے

فردِ تنہائی کے عذاب میں ہے　　　ایسے زندہ ہے جیسے خواب میں ہے

دل تو کاغذی سفینہ ہے　　　شب کی دستار کا نگینہ ہے

جرم آگہی کے دوسرے حصے میں کچھ نظمیں ہیں اور کچھ غزلیں۔ نظمیں قریب قریب سب ہی نظم آزاد کی ہیئت (FORM) میں ہیں۔ گرفتاری، برتاؤ، تاریخ کی عدالت، زخم پسپائی دے، وراثت، عیادت، بھکاری، حسین چڑیا، کل تو بازار میں، نامۂ شوق اور تفتیش لائق مطالعہ نظمیں ہیں۔ یہ تمام نظمیں تخلیقی تجربات کے اعتبار سے فکر و فن کی پختگی اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونے والے دانشوروں کی ذہنی کیفیات کا اظہار کرتی ہیں۔

پچھلے کئی برس حسن حمیدی امراضِ قلب کا شکار رہے مگر سوچے سمجھے نظریات سے عملی وابستگی بدستور قائم رہی۔ دل کا دورہ کئی بار پڑا اور کچھ ماہ پہلے جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ عجیب شخص تھا کہ آخر وقت تک مسکراہٹیں اس کے لبوں پر مچلتی رہیں۔ وہ زندگی پر جان نچھاور کرنے والا موت کے خوف سے ہمیشہ بے پرواہ رہا۔ جب کبھی ملاقات ہوئی اس نے کبھی یہ دکھڑا نہ رویا کہ زندگی کی جولانیاں ختم ہو رہی ہیں۔ آخری ملاقات میں بڑے عزم سے کہنے لگا کہ اب اپنی غزلوں کا مجموعہ 'میراث' کے نام سے جلد از منظرِ عام پر لانا چاہتا ہوں۔ یہ مجموعہ تو اس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا البتہ مختلف غزلوں کے جو اشعار سنائے تھے ان میں سے کچھ اشعار یاد آ رہے ہیں۔

صدا کو سایۂ شمشیر کیوں سمجھتے ہیں　　　ہر ایک جبر کو تقدیر کیوں سمجھتے ہیں

---

لازم نہیں کہ کل بھی جوابات مل ہی جائیں　　　کچھ بھی ہو زندگی کے سوالات لکھ تو لو

---

تاریخ سطحِ آب کی تحریر کیا پڑھے　　　گر زخم ہی دیتے ہیں تو گہرائیاں بھی دے

---

کب تک بتا سکیں گے یہ دانشورانِ وقت　　　اپنوں کی گردنوں پہ یہ شمشیر کس کی ہے

---

ہر بے سماعتی کے بدن سے سخن کریں　　　جو کام بھی کریں وہ جنابِ حسن کریں

'جنابِ حسن' کے کاموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اب دیکھئے نا یہی بہت بڑا کام ہے کہ موصوف موت کی بے سماعتی کو بھی کئی سال تازہ بہ تازہ اشعار اس اعتماد کے ساتھ سناتے رہے کہ ؎

اوروں کے واسطے تو صبا پھول لائے گی
مرنے سے میرے کوئی قیامت نہ آئے گی

شان الحق حقی

# بھگوت گیتا کے تمہیدی اشلوک

## (میدان جنگ میں ارجن کا مذبذب)

یہ گویا "بھگوت گیتا" کے تمہیدی اشلوک ہیں جن کے بعد شری کرشن کے مواعظ و معارف شروع ہوتے ہیں اور وہ ارجن کو جنگ پر آمادہ کرتے ہیں۔ مہابھارت میں شری کرشن پانڈووں کے حامی اور ارجن کے رتھ بان تھے ــــ

مری رتھ کو صف آرا لشکروں کے بیچ لے چلیے
کہ میں دیکھوں ذرا، اے رہنمائے بے خطا[1] میرے

کہ رن میں کون کون اترا ہے، اب لڑنا ہے کس کس سے
جو آئے ہیں جِلو میں سورما دسرت[2] کے جائے کے

یہی ٹھہری وہاں اس مردم بیدار[3] کی جب رائے
ہری کرشن اس رتھوں کی رتھ[4] کو رن کے درمیاں لے آئے

وہاں دکھلا کے بھیشم، درون اور سب سورماؤں کو
کہا سارے کرو موجود ہیں، لو پارتھا[5] دیکھو

تو ارجن نے دو جانب اپنے فوج اقربا دیکھی
وہاں تھے باپ، دادا بھی، گرو بھی، عم بھی بھائی بھی

۱ اَچُت (اَ۔ چیُت) = بے خطا ۲ اصل تلفظ دھرت راشٹر، پراکرتی بولیوں اور عوامی لہجے میں دسرت۔ ۳ لعل گڈاک یشیہ نیند پر غالب (گڈاکہ نیند کے لئے بھی آتا ہے غفلت وجہل کے لئے بھی) بیدار۔ اس کا عین بدل ہے ۴ رتھوتم یعنی اُتم رتھ = اعلیٰ، اونچی۔
۵ یعنی پرتھا (شری کرشن کی پھوپھی) کا بیٹا۔

وہاں بیٹے بھی تھے، پوتے بھی تھے اور ساتھ کے کھیلے
خسر بھی، خیر خواہ و جاں نثار و دوست سب اپنے

یہ چہرے جب نظر آئے تو جی بھر آیا ارجن کا
سبھی اس کے شناسا تھے سبھی سے اس کا ناتا تھا

کہا اپنے جو اپنوں سے تلے ہیں لڑنے مرنے پر
مرا دل کانپتا ہے، خشک ہیں لب، کیا کہوں گردھر

لرزتا ہوں کھڑے ہیں رونگٹے، پیشانی جلتی ہے
کماں بھی کپکپاتے ہاتھ سے میرے نکلتی ہے

کھڑا رہنا بھی مشکل ہے مرا اب، سر میں چکر ہے
نتیجہ جو نظر آتا ہے کیشو[1]! وہ فقط شر ہے

بھلا کیونکر میں اپنوں کو مٹا کر سرخ رو ہوں گا
ملے گو فتح سے دنیا کی دولت، میں نہیں لوں گا

بھلا گووند کیا رکھا ہے ملک و مال و دولت میں
یہ ہوتی جن کی خاطر سے، کھڑے ہیں دو طرف دیکھیں!

یہ مانا لوبھ کے مارے ہیں سفاکی پہ یہ مائل
نہ ہوں یہ حفظِ جانِ دوستاں کے، ہم تو ہیں قائل

---

[1] کیشی راکشس کو مارنے والا۔ شری کرشن کا لقب۔

مٹے کبنے تو مٹ جائے گا قصّہ ریت رسموں کا
ہے مشکل اگلی نسلوں سے نبھانا دھرم کرم اپنا

اگر کنبہ ادھرمی ہو، تو بگڑیں بیویاں بہوئیں
اور ایسی بیویاں جنتی ہیں بس بن مانگی اولادیں

بڑھے جب ایسی آبادی تو گھر گھر پھیلے نادانی
نہیں دیتے ہیں بگڑے لوگ پُرکھوں تک کو اَن پانی

بگڑتا ہے سماجی دھرم وضعِ خاندانی بھی
نہیں رہتی روایاتِ مقدّس کی نشانی بھی

سُنا ہے کرشن میں نے اپنے استادوں کو فرماتے
مٹانے والے گھر کی ریت کو ہیں نرک[1] میں جاتے

عجب ہے گر ہمیں اکسائے حسرت شادمانی کی
کہ تہمت سر پہ لیں غارت گری کی خوں فشانی کی

گوارا ہے مرا سر کاٹ لیں دسرت کے پوت اگر
میں خم کر دوں گا سر لیکن نہیں کرنے کا وار ان پر

---

[1] دوزخ

براج کومل

# اُداس لوگ

تبسّموں، حسین قہقہوں کے درمیاں
لوگ آج رک گئے
خموش ہو گئے
کہ جیسے ان کے جسم و جان کو
کوئی موجِ تیز گام
کاٹ کر گذر گئی
یہ لوگ جی رہے تھے اس خیال سے
کہ ابتدا و انتہا کے درمیاں
وہی تھے، موجِ حرفِ نو، شرارِ نو
انہی کے دم سے تھا ثبات
کائنات میں
وہی تھے، آخری فسانۂ نجات
یہ لوگ اب اداس ہیں
عجیب تیرگی امڈتی آرہی ہے، چار سو فضا میں دور دور تک
میں جی رہا ہوں، میرے ساتھ کون جی رہا ہے کون مر رہا ہے؟
میرا نام، میرا گاؤں، میرا گھر کہاں
یہ لوگ کیوں اداس ہیں؟
یہ لوگ کیوں خموش ہیں؟
ان کا اپنا نام، ان کا اپنا گاؤں ان کا گھر کہاں؟

سلیم کوثر

# جلتے ہُوئے شہر میں گریہ کی شب

دل عجب شہر تھا، اس شہر میں آبادی تھی
ہنسنے اور بولنے کی کس قدر آزادی تھی
موسم جبر میں بھی پھول کھلا کرتے تھے
اور خوشبو کی طرح لوگ ملا کرتے تھے

دل!
شہنشاہ محبت تھا اور اسکے اطراف
کہکشاں رقص کیا کرتی تھی
اس کے آنگن میں ستاروں سے بھرے موسم کی
سلسلہ وار کمک آتی تھی
کشتیاں اس کے سمندر پہ بہت نازاں تھیں
نشۂ وصل میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوا
کیسے اتراتی ہوئی چلتی تھی
کتنے بچھڑے ہوئے قدموں کے نشاں
ساحلی ریت کے دامن میں کہیں
آنے والوں کے لیے روشن تھے
ہاں! یہی شہر تھا جس میں مرے محبوب غزال!!
آنے جاتے ہوئے آنکھوں میں دھنک کھینچتے تھے
ہم سے آوارہ ہوا بات کیا کرتی تھی

روشنی دیر تلک ساتھ رہا کرتی تھی
رنگ اور نسل کی پھیلی ہوئی تاریکی میں
ننھے بچوں کی ہنسی گیت بنا کرتی تھی
اپنے ہی بوجھ سے دو لخت بہت تھے پھر بھی
لوگ بے چارے تہی دست بہت تھے پھر بھی
کبھی حالات کبھی وقت کے ٹھکرائے ہوئے
اس کی مٹی سے کوئی تازہ افق کھینچنے کو!
ہر نئی صبح کے آغاز پہ جی اٹھتے تھے

اب گزرتے ہیں جو اس شہر کے سناٹے سے
ہر طرف موت کے پھیلے ہوئے وحشی سائے
راستہ کاٹتے ہیں
زندگی مانگنے والوں کا لہو چاٹتے ہیں
روکتے ہیں ہمیں نادیدہ صداؤں کے ہجوم
ٹوکتی ہے ہمیں اک خوف بھری تنہائی
بولتے ہی نہیں بچوں کی ہنسی میں وہ نجوم
جو اسی خاک سے بیدار ہوا کرتے تھے
جگنوؤں کی طرح رستوں میں رہا کرتے تھے

اب ٹھہرتے ہیں جو اجڑی ہوئی گلیوں میں کبھی
پوچھ لیتی ہے دریچوں میں سبھی حیرانی
تم وہی ہو نا ؟
جو راتوں کو پھرا کرتے تھے
اور ہمیں صبح تک آباد رکھا کرتے تھے
کیا بتائیں در و دیوار کی ویرانی کو
سننے والا ہی نہیں نغمۂ گریہ کوئی
رنگ ہیں کس کے چرا کر کوئی لے جاتا ہے
فصل ہے کس کی، اٹھا کر کوئی لے جاتا ہے
جانے کس عدل کے آسیب میں لپٹی ہے فضا
حق کسی اور کا بنتا ہے جتاتا ہے کوئی
فیصلہ سخت ہے اب اہلِ مسافت کے لیے
جاتا کوئی ہے اور راہ بتاتا ہے کوئی
زندگی تنگ ہے خود ساختہ مہمانوں سے
اپنی ہاتھ لٹکتے ہیں سبھی شانوں سے

گھر کے اندر در و دیوار کی وحشت میں رہیں
گھر سے باہر کسی گولی کا نشانہ بن جائیں
بولتے ہیں تو زباں کاٹ دی جاتی ہے یہاں
دیکھتے ہیں تو بصارت سے مناظر چھن جائیں
پاؤں میں حلقۂ زنجیر کھینچا جاتا ہے
ہاتھ اٹھتا ہے کہ شانے سے کٹا جاتا ہے

سانس لیتے ہیں تو بارود کی بُو آتی ہے
بات کرتے ہیں کہ لفظوں کے خزانے اکثر
کبھی معنی سے کبھی لب سے بچھڑ جاتے ہیں
خواب ہی خواب کی تعبیر میں ملتے ہیں یہاں
دن کو آباد ہوئے شب کو اجڑ جاتے ہیں
وہ ہی اندوہِ مسافت، وہی جگ راتے ہیں
ہم کہ مٹی سے محبت کی سزا پاتے ہیں
جیسے ہم ریت پہ تحریر ہوئے ہوں کہ ہمیں
بادِ باراں جہاں جی چاہے بہا کر لے جائے
جیسے ہم پیڑ سے ہم رشتہ نہیں، اور ہوا
خشک پتوں کی طرح ہم کو اڑا کر لے جائے
جیسے اس خاک سے نسبت ہی نہیں کوئی ہمیں
اور منظر میں کوئی رنگ نہیں ہو ہم سے
جیسے ہم جرم کی پاداش میں ہوں سوئے ہوئے
مار دیتے ہیں اسے جو بھی جگاتا ہے ہمیں
جیسے ہم نعرۂ تحسین ہیں دیواروں پر
کوئی لکھتا ہے ہمیں، کوئی مٹاتا ہے ہمیں

سر سلامت ہے نہ دستار سلامت ہے کوئی
امن کے نام پہ اک سیلِ قیامت ہے کوئی
پھول بے رنگ ہوئے آئینے بے آب ہوئے
کیسے منظر تھے ان آنکھوں میں جو نایاب ہوئے

احمد ضیاءؔ

# ڈوبتا ہوا دل

میں سوچتا ہی رہا رات بھر کسی کے لیے
مگر کسی کو مرے حال کی خبر نہ ہوئی
ستارے دور کہیں خواب کے جزیروں میں
طلوع ہوتے رہے ڈوبتے رہے یونہی
بکھرتی رہی رات خوشبوئیں اپنی
پرندے دور درختوں پہ پھڑپھڑاتے رہے
تمام رات عجب درد سا رہا دل میں
فلک پہ چاند بہت دیر تک چمکتا رہا
ہوا بھی تیز تھی برسات کی ہوا کی طرح
کسی کا نام بھی شامل تھا سنسناہٹ میں
کہیں پہ کوئی دکھے دل سے گیت گاتا رہا
گزشتہ رات بڑی کشمکش کے بعد ڈھلی
مگر کسی کو مرے حال کی خبر نہ ہوئی

رحمان خاورؔ

# قلوپطرہ

مری پیاری قلوپطرہ
تم اپنے عہد کے
اس واقعے کو مت بھلا دینا
کہ جب یہ ظلم کا بازار
اتنا گرم تھا
تاریخ ظلم و جبر میں شاید
کوئی اس سے انوکھا اور نرالا واقعہ ہوگا
یہ جب اس عہد کے انسان پر
انسانی کھالوں سے بنے کوڑے برستے ہیں
تو پھر بے کھال جسموں سے
تمھارے عہد کی تاریخ یہ آواز دیتی ہے
کہ حسن و عشق کی سب داستانیں، داستانیں ہیں
فقط ظلم و ستم، جنگ و جدل کے واقعے دہرائے جاتے ہیں

## انجم اعظمی

کرتا ہے عجب بات کوئی مردِ قلندر
مرنے کا ہنر سیکھ کہ جینا ہے گھڑی بھر
زندہ ہوں اُجالے سے دُعا کی طرح ورنہ
ظلمت میں کہیں ٹوٹ چکے خواب کے شہپر
یہ دل کی زمیں ایسی ہی ویران ہوتی ہے
اب کارواں کوئی بھی ٹھہرتا نہیں آکر
اک بحرِ تمنا ہے تلاطم بھی بہت ہے
خواہش کے جہازوں نے اُٹھا بھی دیا لنگر
اے تشنگیٔ شوق ذرا سوئے فلک دیکھ
مہتاب ہے یا ناچ رہا ہے کوئی ساغر
پیمانِ وفا حرف ہے لہجہ ہے ترا حسن
دل درد سراپا، لبِ اعجازِ سخن ور
اُٹھتا ہے دھواں پھر کوئی بستی نہ جلی ہو
آہستہ کہو کچھ نہیں امکان سے باہر

## اختر ہوشیارپوری

بنیادِ حرف و صوت میں میرا لہو بھی ہے
لیکن یہی خرابہ مری آبرو بھی ہے
میں مٹھیوں میں بھر کے اڑاؤں خود اپنی خاک
دیکھوں پھر اپنا آپ کہ ہمراہ تو بھی ہے
اندھے کنوئیں میں ڈوب کے مرجانا ہے مجھے
اور اس کنوئیں کو دیکھنے کی آرزو بھی ہے
جانا ہے جتنی دُور بھی لے جائے رہگزار
مانا کہ راستوں میں مرے خوں کی بو بھی ہے
تہذیبِ شعر ہو گیا جو زخم بھر گیا
فن کا ہوا کمال جو چاکِ رفو بھی ہے
اختر کہ اک حنوط شدہ لاش ہے مگر
اہرامِ جاں میں گرمِ دمِ گفتگو بھی ہے

## اطہر نادر

بام میرے ہیں یہ در میرا ہے
ایسا لگتا ہے کہ گھر میرا ہے

میری مٹی ہے نمو میں شامل
یہ ثمر میرے، شجر میرا ہے

جس کو جس رنگ میں چاہوں دیکھوں
یہ بھی اندازِ نظر میرا ہے

مرحلے پھر وہی مشکل ہوں گے
پھر وہی عزمِ سفر میرا ہے

ہے میری ذات اسی سے منسوب
وہ بہ الفاظ دِگر میرا ہے

میرے غم میں ہو برابر کا شریک
کوئی بھی شخص اگر میرا ہے

لاکھ وہ مجھ سے خفا ہو نادر
آج بھی اس پہ اثر میرا ہے

## بشیر سیفی

ہم صدا کی چاپ سے جب آشنا ہونے لگے
خامشی کے قرض تھے جتنے ادا ہونے لگے

ایسا لگتا ہے نشانے پر خود اپنی ذات ہے
تیر اپنے ہاتھ کے جو سب قضا ہونے لگے

خشک پتا تھا جو شاخِ دل سے وابستہ رہا
جب ہرے پتے درختوں سے جدا ہونے لگے

انتہائی دشمنی کی کوئی صورت جانیے
جب کسی سے دوستی کی ابتدا ہونے لگے

آسماں سے کیوں ستارہ ٹوٹ کر گرتا نہیں
جب زمیں کی قید سے کوئی رہا ہونے لگے

اس رویے کی لچک میں کوئی سازش ہی نہ ہو
جو نہ ہو سکتے تھے میرے ہم نوا، ہونے لگے

مجھ کو سیفی اس گھڑی سے خوف آتا ہے بہت
میرا سایا میرے قد سے جب بڑا ہونے لگے

## شاہدہ تبسم

تیری یادوں سے چھڑالوں خود کو
آج پھر خود سے چرالوں خود کو

اک ہرے بن کا خزانہ مجھ میں
کوئی آئے تو چھپالوں خود کو

اب کی برسات گرا کر گزری
اپنے ملبے سے نکالوں خود کو

ڈس گئے لمس گزیدہ جذبے
اب اسی زہر سے پالوں خود کو

اس روانی میں تو تنکا بھی نہیں
اب کہاں تک میں سنبھالوں خود کو

مل گیا آئینہ ویرانے سے
کیسے میں اس میں سجالوں خود کو

تونے سمجھا کہ یہ کنکر ہوگا
اک ذرا ٹھہر اٹھالوں خود کو

اُس کے رستے میں اجالا ہے نیا
یہی بہتر ہے بجھالوں خود کو

## مناظر عاشق ہرگانوی

ہجومِ حسرت وارماں کا شور برپا تھا
کسے خبر تھی بھرے شہر میں وہ تنہا تھا

کہیں مٹا دے نہ ہر نقشِ رہ کو گردِ حیات
کچھ ایسا تیز وہ جھونکا ہوا کا گزرا تھا

جہاں جہاں سے بھی گزری تھی آگہی کی کرن
وہاں وہاں سے فریبِ نظر بھی گزرا تھا

بڑا عجیب تھا ساحل کے فاصلوں کا حساب
نظر کی حد سے بھی آگے رواں وہ دریا تھا

کچھ اور لے کے غمِ تشنگی وہ کیا کرتا
خود اپنی پیاس میں ڈوبا ہوا وہ صحرا تھا

جسے یہ ترکِ تعلق کبھی بھلا نہ سکا
نظر کی راہ میں ایسا بھی پھول مہکا تھا

## ثنا گورکھپوری

وحشت کو اک اور راہ میں رکھ
صحرا سے نکال، چاہ میں رکھ

آنکھوں میں کھنچی ہوئی ہے جو رُوح
پا بوسیِ جاں پناہ میں رکھ

جھلسی ہے مگر یہ خشتِ بنیاد
آبادیِ نو تباہ میں رکھ

تھوڑی سی یہ راکھ بچ گئی ہے
لے جا کے یہ خانقاہ میں رکھ

دربار ہے مقبرے کی صورت
تجویز حضورِ شاہ میں رکھ

شمشیر نکال، شمع گُل ہے
اور خیمۂ شب سیاہ میں رکھ

## حاصل مرادآبادی

حیاتِ عشق کو اتنا تو پائیدار کریں
مقابلہ ہو اجل سے تو شرمسار کریں

فریبِ راہِ وفا میں جو اپنے یار کریں
اس اعتبار سے ہم کس کا اعتبار کریں

ہمیں تو فکرِ متاعِ حیات لاحق ہے
اور حادثے ہیں کہ چھپ چھپ کے ہم پہ وار کریں

بچھے ہوئے ہیں شبستاں میں ان کے فرشِ گلاب
ہمیں ہے حکم بہاروں کا انتظار کریں

جھلک رہی ہے رفاقت بھی ان کی آنکھوں میں
ہمارے بعد کسے دیکھئے شکار کریں

ہزار وقت کی رفتار مجرمانہ سہی
کبھی ہم اپنی خطاؤں کا بھی شمار کریں

بصیرتیں نہ ملیں گی چراغِ دل کے بغیر
گھروں پہ اہلِ جہاں روشنی ہزار کریں

عجیب موڑ پہ لے آئی زندگی حاصل
ہم اپنے آپ کو چاہیں کہ ان سے پیار کریں

## آثم فردوسی

اس گھر کے دریچے سے بھی جھانکو تو کسی دن
دیوار پہ کیا نقش ہے دیکھو تو کسی دن
ہر گام ترے پیار کی شمعیں ہیں فروزاں
یادوں کے حسیں شہر میں آؤ تو کسی دن
آنچل میں شفق رنگ فضاؤں کو سمیٹے
بادل کی طرح روح میں برسو تو کسی دن
ہر لحظہ نئے درد شبِ غم نے دیئے ہیں
وعدوں کے سمندر میں بھی اُترو تو کسی دن
میں تیری ہی آواز کے گنبد کی صدا ہوں
فرصت میں صدا اپنی بھی سُن لو تو کسی دن
چاہت کی ہواؤں میں عجب سوز ہے آثمؔ
اس درد کے جنگل سے بھی گزرو تو کسی دن

## سرورناز

میں جب بھی اس ستمگر کی کمی محسوس کرتا ہوں
ادھوری رہ گئی ہے زندگی محسوس کرتا ہوں
یہ محرومی کہاں تک آ گئی میرے تعاقب میں
سمندر میں کھڑا ہوں تشنگی محسوس کرتا ہوں
مری آنکھوں سے کس نے چھین لی پہچان کی قوت
گلوں کو شاخ پر بھی کاغذی محسوس کرتا ہوں
رقم کرتا ہوں نغمہ جب بھی تیری بے وفائی کا
سبھی حرفوں کی آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں
مجھے جس نے ڈسا ہے لوگ اس کو سانپ کہتے ہیں
مگر میں ہوں کہ اس کو آدمی محسوس کرتا ہوں
میں باشندہ ہوں برفیلے جزیروں کا مگر پھر بھی
بدن میں آگ سی جلتی ہوئی محسوس کرتا ہوں
مری آنکھوں میں سرورنازؔ کرنیں جھونک دے کوئی
اُجالوں میں بھی اب میں تیرگی محسوس کرتا ہوں

مشرف احمد

# سیّد انور ـــــــــ ایک گفتگو ایک گفتگو

| | |
|---|---|
| اصل نام ـــــــ | سیّد انور علی شاہ |
| والد کا نام ـــــ | سیّد محمد حسن شاہ |
| تاریخ/پیدائش ـــ | ۱۵/فروری ۱۹۱۶ء |
| تعلیم ـــــــ | گریجویشن ( پنجاب یونیورسٹی ) |
| آبائی وطن ـــــ | کوٹلہ اج نیز ( لدھیانہ ) مشرقی پنجاب |
| اولاد ـــــــ | ایک بیٹا ، سیّد ذوالفقار انور ،دوصاحبزادیاں |
| پہلا افسانہ ـــ | "جنگ پر جانے والے جہاز میں " جو نگار لکھنؤ میں شائع ہوا ـ |
| افسانوی مجموعے ـــــ | پہلا افسانوی مجموعہ "، آگ کی آغوش میں "نیاادارہ لاہور کے زیر اہتمام تقسیم سے پہلے شائع ہوا ـ اس کے دو ایڈیشن طبع ہوئے ـ سنہ اشاعت درج نہیں ہے، کل صفحات ۲۰۸ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں ـ |

۱) فساد کے دنوں میں (۲) اعتراف ( پہلے اس افسانے کا نام جہاد تھا (۳) اندھیرا (۴) بادلوں کے پیچھے (۵) شاعری پیغمبری (۶) جنگ پر جانے والے جہاز میں (۷) چراغ کے نیچے (۸) آغاز (۹) تڑپ (۱۰) خـــون (۱۱) افق کے زینے پر ـ

دوسرا افسانوی مجموعة ـــــــ منزل کی طرف ناشر مکتبۂ اردو ـ لاهور ـ پہلاایڈیشن سنہ اشاعت درج نہیں هے ـ درج ذیل افسانے شامل هیں ـ کل صفحات = ۲۰۴ ـــــــ

۱) شاہراہ (۲) کلوپیٹرا (۳) استوا کے قریب (۴) جنت کےدروازے پر (۵) فرہاد (۶) انگاروں کے اوپر (۷) میری (۸) جب چڑیاں چگ گئیں کھیت (۹) دس سال کے بعد (۱۰) کاٹھیا واڑمیں (۱۱) لغزش (۱۲) ظلمت (۱۳) اور جنگ ختم ہوگئی ـ

تیسرا افسانوی مجموعة { سورج بھی تماشائی ـ یہ نام اقبال کے ایک شعر سے ماخوذ هے ـ

ناشر ـــــــ گلڈ پبلیشنگ هاؤس کراچی لاهور ، ڈھاکہ کل صفحات = ۳۳۲ سنہ اشاعت بار اول ـ جون ۱۹۶۱ء اس مجموعے میں درج ذیل افسانے شامل هیں ـ

۱) جس اور جینٹش (۲) کمند (۳) انتخاب (۴) زرنگار (۵) صبح کرنا شام کا .... (۶) کالی انگلی (۷) سحر هے پایاب مجھے (۸) رہگذر (۹) دل کی گہرائیوں میں (۱۰) طوفان (۱۱) بیروں کا هار ـــــ (۱۲) سرواں ـ

## ناول

ایک اور سومنات ( تجربہ کے پس منظر میں لکھا هوا ناول ـ کل صفحات ۳۹۲ سنہ اشاعت ستمبر ۱۹۷۹ء ناشر = پاکستان فاؤنڈیشن ـ ۲۵ ـ شاہراہ قائداعظم لاهور ـ خوشبو کا خون ( ناولٹ ) زیر طبع هے ، یہی ناولٹ اس سے پہلے ادبی جریدے نقوش لاهور میں "مقدس مریم " کے نام سے شائع هوچکا هے ـ

## ایک یادگار فلیپ

"آگ کی آغوش" میں ایک دلچسپ فلیپ شامل هے ، جو یہاں درج کیاجارها هے ـ

ادب لطیف کے ایڈیٹر نے کہا ـ "لودھیانے کی پیداوار پنجاب یونیورسٹی کا گریجویٹ ، تیز ، تیکھا ، تلخ طاقتور یہ انور هے ـ"

نیا دور کے ایڈیٹر نے کہا ۔

نگار کے ایڈیٹر نے کہا ۔
ساقی کے ایڈیٹر نے کہا ۔

ادبی دنیا کے ایڈیٹر نے کہا ۔
اور انور نے کہا ۔

سوال :۔

انور صاحب گذشتہ ایک برس سے کراچی کے ادبی حلقوں میں آپ کی غیر موجودگی کو بڑی شدّت سے محسوس کیا جارہا ہے ۔ آپ کی علالت نے بہت طول کھینچا ۔ حسنین کاظمی صاحب کی خواہش تھی کہ آپ جیسے سینئر افسانہ نگار کا انٹرویو کیا جائے ۔ ان دنوں بفضل خدا وندی آپ خاصے بہتر ہیں ۔ میرے خیال میں آج آپ سے کچھ باتیں ہوجائیں مگر اس سے پہلے ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ کی علالت نے اتنا طول کیوں کھینچا ۔

جواب :۔

جی ہاں ؟ مشرف احمد صاحب آپ ٹھیک فرماتے ہیں ۔ میں اپنی علالت کی وجہ سے ادبی حلقوں سے محروم رہا ہوں ۔ آپ کی عنایت ہے کہ آپ وقتاً فوقتاً مجھے ملتے رہے ہیں اور ایک انٹرویو کا تقاضا بھی کرتے رہے ہیں ۔ آپ ان ادیبوں میں سے ہیں جن کا ادب میری آنکھوں کے سامنے پروان چڑھا ۔ میں آپ کو بہت پیار کرتا ہوں ۔ ۲۸ جون

"انور ایک شعلہ ہے ۔ ایک طوفان ہے ۔ ایک زلزلہ ہے ۔"
"مشرق میں بھی ایک برنارڈ شا ہے ۔ انور
"انور خیالات کا افسانہ نگار ہے جذبات کا نہیں ۔"
"میں انور کی تحریر کا مدّاح ہوں ۔"
مجھے نہیں معلوم ۔ میں نے انور کو کبھی نہیں دیکھا ۔ میں انور کو بالکل نہیں جانتا ۔"

۱۹۸۸ء کو میری علالت کی سالگرہ تھی ۔ اس دن میں یرقان کے عارضے میں ہسپتال میں داخل ہوا تھا ۔ اب تک میں چھ مرتبہ ہسپتال میں جاچکا ہوں ۔ لیکن میری بیماری یرقان کو پوری طرح سے افاقہ نہیں ہوا ۔ اور میں دبلا ہو کر بالکل کانٹا ہوگیا ہوں ۔

۲۸/جون کو میری بیماری کی سالگرہ کے دن محترمہ بہن ہاجرہ مسرور صاحبہ کا ٹیلی فون حسب معمول میری صحت کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے آیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ آج میری علالت کی سالگرہ ہے ۔ وہ ہنس پڑی تھیں ۔ اور کہا تھا کہ آپ اپنی بیماری سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آئے ۔ دوسرے دن سحاب قزلباش اور فردوس حیدر کے ساتھ میری عیادت کو آئی تھیں اور میری صحت یابی کے لئے صدقہ میرے سر کو چھو کر دے گئی تھیں ۔

میرا یہ مرض ان دنوں میں شروع ہوا جب کراچی میں یرقان کے مرض کی وبا پھیلی ہوئی تھی ۔ میں اپنی زندگی

میں روزانہ ورزش اور جوگنگ کا عادی رہا ہوں ۔ لیکن یرقان ہونے کے بعد میری ورزش اور جوگنگ بند ہوگئی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے (OBSTUCTIVE JAUNDIC ) ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میری گیال بلیڈر ( پتے ) میں پتھری ہے ۔ جس کی وجہ سے یہ یرقان ہوتا ہے ۔ اور ختم ہوجاتا ہے اور پھر ہوجاتا ہے ۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جب تک گیال بلیڈر کا اوپریشن نہیں ہوگا اور اس میں سے پتھری نہیں نکال لی جائے گی میرا یرقان ٹھیک نہیں ہوگا ۔ لیکن اس دوران میں بہت کمزور ہوگیا ہوں اور اوپریشن کے قابل نہیں رہا ہوں ڈاکٹر اس چیز کا انتظار کررہے ہیں کہ مجھ میں طاقت آئے اور وہ میرا آپریشن کریں ورنہ میرے ساتھ صورت حال یہ ہے کہ میں محسن گورکھپوری ، ابوالفضل صدیقی اور جمیلہ ہاشمی کے بعد اللہ کو پیارا ہونے کا امیدوار کھڑا ہوں۔ اس دوران میں آپ مجھے ملتے رہے ہیں ایک ملاقات آپ سے پی ، ایں ، ایس شفا میں بھی ہوئی تھی ، جب آپ نے پروفیسر حسنین کاظمی صاحب کی اس فرمائش کا ذکر کیا ۔ اور میں نے دل و جان سے تعاون کا اقرار کیا ۔ لیکن آپ نے خود یہ دیکھ کر کہ میں بہت کمزور ہوں انٹرویو کسی اور وقت کے لئے چھوڑدیا تھا ۔ اب جبکہ میری حالت کچھ بہتر ہے میں آپ سے اپنا وعدہ پورا کررہا ہوں ۔

سوال :۔

اور صاحب خدا کرے گا کہ آپ بہت جلد اچھے ہوجائیں گے ۔ میرے خیال میں سب سے پہلے اپنی زندگی کے بارے میں بتائیں ۔

جواب :۔

میرا بچپن چھ سال کی عمر تک لدھیانے کے نزدیک ایک گاؤں میں گذرا اس کا نام تھا " کوٹلہ اچ بیر "۔ میرا خاندانی ماحول علمی ادبی نہیں تھا ۔ مذہبی تھا ، میرے دادا سید جنت علی شاہ ، اس علاقے کے مشہور پیر تھے ۔ وہ عربی ، فارسی کے عالم تھے ۔ اس لئے میرے ماحول میں اردو کا چرچا نہیں تھا ۔ میرے دادا سرسید کے کٹر مخالفوں میں سے تھے ۔ انھوں نے اپنے دو بیٹوں کو اس لئے اونچی تعلیم سے محروم رکھا کیونکہ بڑی کلاسوں میں انگریزی کی تعلیم کا رواج تھا ۔ میرے والد صاحب اور چچا اس لئے زیادہ تعلیم حاصل نہ کرسکے ۔ لیکن وہ ذہنی طور پر پیری مریدی کے مخالف تھے ۔ اس لئے جب موقع ملا وہ بھاگ کر شہر میں آگئے اور پیری مریدی کا کاروبار میرے دادا کی وفات کے بعد ٹھپ ہوگیا ۔ اس طرح میں ایک تنزل یافتہ مذہبی ماحول میں پیدا ہوا ، اور علم و ادب کی طرف میرا قطعاً کوئی رجحان نہیں تھا ۔

سوال :-

آپ کا ڈرامہ "کش مکش" شائع بھی ہوا تھا ؟

جواب :-

- نہیں وہ صرف اسٹیج ہوا تھا لیکن قلمی صورت میں وہ میرے پاس ابھی تک موجود ہے ۔

سوال :-

آپ نے اپنا پہلا افسانہ کب لکھا؟

جواب :-

وہ زمانہ علامہ نیاز فتح پوری اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا تھا ۔ میرے خیالات بہت پرجوش اور باغیانہ تھے ان دنوں میں اس قسم کے لکھنے والوں کو اینگری ینگ مین کہا کرتے تھے ۔ چنانچہ اس انداز میں میرا پہلا افسانہ " جنگ پر جانے والے جہاز میں" کے عنوان سے نگار لکھنؤ میں چھپا ۔ یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے میں کالج سے فارغ ہوکر رائل انڈین نیوی میں ایجوکیشن آفیسر کے طور پر شامل ہوگیا تھا ۔ میرے افسانے کی اسپوٹ علامہ نیاز فتح پوری اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی اسپوٹ سے ہم آہنگ تھی ۔ نیاز فتح پوری نے جو جواب مجھے دیا اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کے خیالات برنارڈشا کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں ۔ اس وقت ان کا ایک ڈرامہ سیزر اور قلو پطرہ نگار میں ترجمہ ہوکر چھپ رہا ہے ۔ اگر وہ نہ چھپ رہا ہوتا تو میں یہ افسانہ اسی ماہ نگار میں دیدیتا ۔"

(اس جگہ برنارڈشا کے ڈرامے کے نام کے سلسلے میں انورصاحب سوچ میں پڑگئے پھر انھوں نے کہا اس ڈرامے میں برنارڈ شاہ ،نے سیزر کی پیروڈی لکھی تھی ۔ انھوں نے شیلف سے دو ضخیم جلدوں میں برنارڈشا کا کلیات نکالا ۔ جو ٹائمز آف انڈیا کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا ) گفتگو جاری رکھتے ہوئے انور صاحب بولے ۔"یہاں سے میرے ادبی کیریر کا آغاز ہوا ۔ نگار میں میرے دو افسانے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے ۔ علامہ نیاز فتح پوری کا میرے افسانوں میں تبدیلی کرنا مجھے پسند نہ تھا ۔ مثلاً انھوں نے جنگ پر جانے والے جہاز میں " کا عنوان تبدیل کر کے "جنگی جہاز "کردیا تھا اب یہ دیکھئے کہ جنگی جہاز تو کوئی بھی ہوسکتا ہے ، لیکن جنگ پر جانے والے جہاز میں وہ جہاز ہے جو اب جنگ کے محاذ پر روانہ ہورہا ہے ،اس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ جب جہاز جنگ پر جاتا تھا تو نیوی کا سارا عملہ کھڑا ہوکر اس کو الوداع کرتا تھا ۔

دوسری تبدیلیوں کی طرف بھی اشارہ کردوں کہ میں نے نگار میں لکھنا کیوں بند کردیا ۔ انھوں نے میرے افسانے کے ایک لفظ سیلر کو ملاح کردیا تھا ۔ اب ملاح اور سیلر میں فرق ظاہر ہے ۔ ملاح

تو ایک عام سی کشتی پر کسی بھی دریا
میں مسافروں کو آر پار لیجانے کاکام
کرتا ہے ۔ اور عام ماہی گیری کرتاہے
جبکہ سیلر خالص جنگی مقاصد کے ساتھ
ایک مسلح بحری جہاز پر جنگ کے لئے
مختص ہوتا ہے ۔

ایک تیسرا لفظ جس کو انہوں نے
بدلا وہ تھا " اٹھارہ انچ کی بندوق "
( EIGHTEEN INCHESGUN ) کا ترجمہ
ہے گن کے معنی رائفل کے طورپر استعمال
ہوا تھا ، علامہ صاحب نے اس کا ترجمہ
توپ کردیا تھا ۔ جس سے رنجیت سنگھ
کے زمانے کی توپیں یاد آتی ہیں ۔

سوال :-

مگر اٹھارہ انچ کی بندوق میں
بھی ایک التباس ہے ۔ اور ہم لوگ تو
جہازوں میں سب اس اسلحے کو توپ ہی
سمجھتے ہیں اور شاید عام آدمی بھی ۔
اٹھارہ انچ قطر کی بندوق کو تو توپ
ہی سمجھا جائیگا ۔

جواب :-

ہاں مگر یہ ایک اصطلاح تھی ـــ
علامہ نیاز فتح پوری کے اس ادارتی رویئے
کی بناء پر میں نگار سے ساقی دہلی
کی جانب متوجہ ہوا ۔ جو اس وقت بک
اسٹالوں پر ایک ماڈرن ترقی پسند
رسالے کے طور پر نمایاں ہوتا تھا ۔
اور اس کے مقابلے میں نگار بہت سادہ
اور نولکشوری انداز رکھتا تھا ۔

سوال :-

آپ نے ہمیشہ انور ہی کے نام سے
لکھا ۔

جواب :-

شروع زمانے میں انور کے نام سے
لکھتا تھا ۔ جو تقسیم ملک تک برقرار
رہا ۔ اس کے بعد سید انور کے نام سے
لکھ رہا ہوں ۔

سوال :-

انور صاحب ، نیاز صاحب کے علاوہ
ادبی حلقوں سے بھی آپ کو اپنی مذکورہ
کہانی کا کوئی ( RESPONSE ) ملاتھا ۔

جواب :-

ترقی پسندوں کی طرف سے ہوا ، بنّے
بھائی ( سجاد ظہیر مرحوم ) نے میرے
ایسے ہی افسانے پڑھنے کے بعد ایک
پروگریسو رائٹر کے طور پر میرے ساتھ
ربط رکھا تھا ۔ جس کا ذکر روشنائی
میں بھی موجود ہے ۔

سوال :-

آپ رائل انڈین نیوی میں تھے پھر
ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں سے آپ کا
ربط و ضبط کیا آپ کے لئے کسی پریشانی
کا باعث نہیں بنا ؟

جواب :-

وہ ایسا زمانہ تھا کہ انجمن

ترقی پسند مصنفین کے سیاسی رجحانات اور بعد میں کمیونسٹ کہلائے جانے کی صورت حال ابھی پوری طرح ( DEFINE ) نہیں ہوئی تھی ـ بعد میں اس کا اظہار پوری شدت کے ساتھ ہوا ، جس سے اس میں نفاق پیدا ہوگیا ـ اس وقت یہ تحریک خالص علمی ادبی محسوس ہوتی تھی اور میں اس ماحول میں گھومتا پھرتا تھا ـ لیکن میرے ڈیپارٹمنٹ کو اس کا کوئی علم نہ تھا ـ میں نے اپنا نام بھی کیموفلاج کر کے صرف انور اسی لئے رکھا تھا ـ

سوال :ـ

آپ اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفیں کے اجلاسوں میں کب تک جاتے رہے ، کون کون سے افسانے وہاں پڑھے ، اس کے علاوہ کچھ اور یادیں اس وقت کی بیان فرمائیے ؟

جواب :ـ

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاسوں میں میرا آنا جانا اس وقت ہوا جب میرے لدھیانے کے دو دوست ساحر لدھیانوی مرحوم اور حمید اختر بمبئی میں آگئے ، یہی میرے روابطہ کا ذریعہ بنے ـ اجلاسوں میں خالص روشن خیال علمی ادبی ماحول ہوتا تھا ـ جس میں میں نے بھی تین چار افسانے پڑھے، جن میں سے ایک مجھے اچھی طرح یاد ہے ـ اس کا عنوان " دس سال بعد " تھا ـ ایک دو اور افسانوں کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہے ـ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیاسی رجحان ۱۹۴۲ء کی QUIT INDIA تحریک کے بعد ظاہر ہوا ـ جو بعد میں اس تحریک کے تنزل کا باعث بنا ـ ان جلسوں میں جوش ملیح آبادی اور اسرار الحق مجاز بھی آتے رہتے تھے ـ جوش صاحب ان دنوں پونا میں تھے ـ ایک خاص واقعہ جو مجھے یاد ہے جب وہ وہاں تھے ـ وہ کیفی اعظمی کی شادی کا تھا ـ کیفی اعظمی کی شادی شوکت کے ساتھ ایک جلسے کے بعد ہوئی ـ جس میں جوش صاحب گاڈ فادر تھے ـ اور جلسے کے حاضریں سارات کے طور پرشریک ہوئے ـ شوکت ایکٹریس تھیں اور ان کا بڑا شدید عاشقانہ رابطہ کیفی اعظمی سے تھا ـ شوکت نے اپنے ماں باپ کی مخالفت کے باوجود یہ شادی کی تھی ـ بعد میں وہ پرتھوی راج تھیٹرز میں شامل ہوکر اسٹیج ڈراموں میں حصّہ لیتی رہی ـ شادی کے دن صرف تین عورتیں تقریب میں شامل تھیں ـ رضیہ آپا ( سجاد ظہیر کی بیگم ) سلطانہ ( سردار جعفری کی بیوی ) اور میری بیوی ـ شادی کے بعد میں نے کلابے میں جہاں میں رہتا تھا ـ ویڈنگ پارٹی بھی دی تھی ـ جس میں بدقسمتی سے کیفی اعظمی اور بیگم شوکت اعظمی شامل نہ ہوسکے تھے کیونکہ دلہن کو شدید بخار ہوگیا تھا ـ یہ تو ایک خاص واقعہ تھا جو مجھے یاد آتا ہے ـ ویسے میرا رابطہ انجمن ترقی

پسند مصنفین کے ساتھ تقسیم کے بعد
تک رہا ۔ میں نے انجمن کے اجلاسوں
میں عصمت چغتائی کو کبھی نہیں دیکھا
کرشن چندر کو بارہا دیکھا ۔ خدیجہ ،
ہاجرہ اوپندر ناتھ اشک بمبئی آکر
انجمن کے جلسوں میں افسانے پڑھتے تھے
(ذرا ٹھہر کر) بمبئی کے حالات اتنے
لمبے چوڑے ہیں کہ اس کے لئے ایک کتاب
چاہئے جو میں لکھنے کا ارادہ کر رہا
ہوں ۔ اس کی ایک قسط اردو ڈائجسٹ میں
چھپ چکی ہے ۔ اس قسط میں ہم ابھی
بمبئی نہیں پہنچے ، دوسری قسط میں
بمبئی پہنچنے والے ہیں ۔

سوال :-

"خوشبو کا خون" کے نام سے آپ
کا جو ناولٹ شائع ہونے والا ہے ، اس
کا موضوع کیا ہے ۔

جواب :-

یہ ناولٹ مقدس مریم کے نام سے
نقوش میں چھپا تھا ۔ اس میں میں نے
ولنڈ ہمتی ازم نو اور وہ مسائل جو
ہمارے پاکستانی تارکین وطن یورپ اور
امریکہ میں اپنی اولاد خصوصاً اپنی
جوان بچیوں کے بارے میں محسوس کرتے
ہیں اس میں یہ پرابلم ڈسکس کیا ہے ۔

سوال :-

آپ کا بیک گراؤنڈ دیہات کا رہا
ہے کیا آپ نے دیہاتی زندگی کے بارے
میں کبھی کوئی افسانہ لکھا ۔

جواب :-

نہیں یہ غلط فہمی ہے ، میرا
تعلق زیادہ دیہاتی زندگی سے نہیں رہا
میں شہری زندگی کو دیہاتی زندگی کے
مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ محسوس
کرتے ہوئے شہری ماحول میں رہنا زیادہ
پسند کرتا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود
جو تھوڑی بہت میری زندگی دیہات میں
گزری ہے اس کا ذکر دیہات کے پس منظر
میں میری کچھ کہانیوں میں ہوا ہے ۔
ایسی ایک کہانی تڑپ تھی ۔ اور ایک اور
کہانی جو مجھے یاد آرہی ہے پچھلے دنوں
فنون میں چھپی تھی ، جس کا نام جگنو
کی روشنی تھا میں نے دیہاتی زندگی کو
اس طرح سے اپنے افسانوں میں ڈسکس
نہیں کیا جس سے اندازہ ہو کہ میں
دیہاتی زندگی کا ایک FAN ہوں ۔ اور
دیہاتی زندگی کو باقی تمام چیزوں پر
ترجیح دیتا ہوں ۔ یعنی دیہاتی زندگی
کا پروپیگنڈہ کرتا ہوں ۔ کیونکہ اردو
کے کسی نقاد نے دیہاتی زندگی کے بارے
میں ایک لکھنے والے کے بارے میں کہیں
یہ لکھ دیا تھا کہ وہ دیہاتی زندگی
کے مطالعے اور مشاہدے میں بہت اہمیت
رکھتے ہیں ۔ جس کی تقلید اور جوش و
خروش میں ادیب دیہاتی زندگی کے مقابلے
میں باقی زندگی کے تمام رخوں کو بھول
گئے تھے ۔ اور چند ایک ادیبوں کا
دیہاتی زندگی کا موضوع ان کے ادب کا

طرّہ امتیاز بن گیا ۔ مثلاً کچھ افسانہ نگار، دیہات کے تناظر میں پھل پھول اور گایوں اور چوپایوں کے بچوں کو افسانے میں پیش کردیتے ہیں ، اور گاؤں کے اصل آدمی دیہاتی کو اور جو سیاسی و معاشرتی حالات اس کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں اس کو نظر انداز کردیتے ہیں حالانکہ دیہاتی زندگی میں فرد کو اس کے نفسیاتی پس منظر کے ساتھ بیان کیا جانا چاہئے ۔ دیہاتی سیٹ اپ میں جن افسانہ نگاروں کا تذکرہ ہوتا ہے، مثلاً پریم چند، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ ۔ دیہاتی پس منظر کو صحیح فنکار کی حیثیت سے ڈسکس کرنے والا سب سے بڑا ادیب بلونت سنگھ تھا ۔ پریم چند نے دیہاتی زندگی کو مشن کے طور پر استعمال کیا ۔ ان کی سب کہانیاں آرٹ کی مطلوبہ بلندیوں پر نہیں ہیں ۔ قاسمی صاحب کی دیہاتی زندگی کے موضوع پر لکھی ہوئی کہانیاں ان کے اٹھان کے زمانے کی کہانیاں ہیں ۔ جب انھوں نے پنجاب میں اردو ادب کی توجہ دیہاتی زندگی کی طرف مبذول کرائی ۔ لیکن بلونت سنگھ ، نے اپنی کہانیوں میں اردو ادب میں کوئی مقصد حاصل کرنے کے لئے دیہاتی پس منظر کو استعمال نہیں کیا ان کے ہاں یہ بہت فطری ( SPONTANEOUS ) اور ان کے خون میں رچا بسا موضوع ہے۔

سوال :۔

میرے خیال میں آخر الذکر خوبیوں کے حوالے سے ابوالفضل صدیقی صاحب مرحوم کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ آپ نے ان کی کہانیاں پڑھی ہوں گی ۔ آپ کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے ؟

جواب :۔

یقیناً ابوالفضل صدیقی کا نام اور مقام دیہاتی زندگی کو پیش کرنے میں بہت بلندی پر ہے ، مجھے اس کا پہلے ہی ذکر کرنا چاہئے تھا ۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کو خصوصاً روہیل کھنڈ کے ماحول کو بہت خوب صورت اور فطری انداز میں اردو داں طبقے تک متعارف کرایا ہے ۔ ان کے ادب میں اور اس موضوع کے حوالے سے دوسرے ادیبوں کے ادب میں یہ فرق ہے کہ وہ دیہاتی زندگی کو ایک نہایت شریف الطبع اور انسانی ہمدردی میں سموئے ہوئے اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل جاگیردار کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ لیکن کہیں بھی جانب داری کا شائبہ نہیں ہوتا ۔ ہوتا ہے تو اس طرح کہ جاگیردار اپنی رعیت کے ساتھ بہت ظلم و ستم کا سلوک کرتا ہے ۔ اس طرح ان کی کہانیوں میں دیہات کی وسعت کے ساتھ ساتھ بڑا گہرا اصلاحی عنصر آگیا ہے ۔

سوال :۔

آپ نے کہانی کے فن کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور برتا ہے ؟

---

جواب :۔

میں کہانی کے آرٹ کو اس کسی کائناتی وسعت کے تناظر میں دیکھتا ہوں ۔ ادب کے کسی مخصوص نقطہ نظر کو جس میں ادیب کسی کہانی کی وجہ سے اتفاقاً فورفرنٹ ( FOREFRONT )میں آجاتا ہے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ۔ میں تمام موضوعات کو برابر کی اہمیت دینا پسند کرتا ہوں ۔ مثال کے طور پر کچھ ادیب بیوروکریسی اور ہماری زندگی کے ریڈلائٹ ایریا کی طرف زیادہ زور دیتے ہیں ۔ کیونکہ ان کو اس موضوع سے شہرت حاصل ہوئی ۔ اور وہ اسی کے ہورہے ۔ انھوں نے دوسرے موضوع بھی ڈسکس کئے لیکن اپنے خاص موضوع کی شدت کے ساتھ نہیں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں تمام انسانی زندگی کے ہر شعبے کو جو میرے ساتھ ( CONTACT ) میں آنے کے بعد مجھ پر اثرانداز ہوتا ہے ، پوری تفصیل کے ساتھ ڈسکس کرنا پسند کرتا ہوں ۔

مثال کے طور پر میری پہلی کہانی جنگ میں جانے والے جہاز میں"جو نگار لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی ، اس میں ایک سیلر جہاز کے عرشے پر اٹھارہ انچ کی بندوق کے پاس کھڑا ہوا چاند کی روشنی میں اس وقت کے برصغیر کی زندگی کو پیش کرتا ہے ۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میرا رجحان جو تھا وہ ( VRIETY OF SUBJECTS ) پر تھا ۔

میں نے اپنے افسانوی آرٹ میں اس وقت کے افسانوی آرٹ کے تناظر میں کچھ نئے رجحانات کو لانے کی کوشش کی تھی ۔ ایک تو میرے افسانوں میں ایمگری ینگ مین کا تصور ابھرتا ہے ،یہ اصطلاح اس زمانے میں شروع ہوئی تھی ، لیکن میرا ایمگری ینگ مین انتقامی جذبات کے بجائے اپنے طنزیہ و مزاحیہ لہجے سے اپنے مخالفین سے مخاطب ہوتا ہے ۔ اس طرح سے مجھے افسانے کے مرّوجہ ٹریٹ منٹ میں تبدیلی کرنا پڑی ۔ مثلاً عام طور سے افسانے میں ( DISCRIPTON )سے بہت کام لیا جاتا تھا ۔ میں نے اپنے افسانے میں ( DISCRIPTION ) کو کم سے کم مقدار میں استعمال کیا ، اب میں اپنے افسانے کی سب سے زیادہ اسٹرائیکنگ فورس ( STRIKINK FORCE ) کی طرف اشارہ کروں گا اس زمانے میں اور اب بھی میرا افسانہ ڈرامائی تکنیک استعمال کرتا تھا ۔ میں اکثر و بیشتر افسانے کو ڈائیلاگ میں اور کرداروں کے ( STAGE ) پر آنے اور جانے کے ڈرامائی تاثر کو خاص طور پر اہمیت دیتا تھا۔ اس سے قارئین کی توجہ بڑی شدت کے ساتھ میری طرف مبذول کی ۔ اگر اس وقت یا آج بھی ادیبوں میں میری کوئی لابی ہوتی تو میرے افسانے کو اردو ادب میں ڈرامائی کہانی کا آغاز کے طور پر ( DECLAIRE) کیا جاتا ۔ اس طرح میرا افسانہ جملہ ہائے معترضہ کی بھرمار سے دور رہا ۔ میں افسانے میں ٹو دی پوائنٹ بات کرنے والا افسانہ نگار ہوں ۔

میرے افسانے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ میں اس کے ساتھ ہی انگریزی کے الفاظ کو اردو ادب میں اپنی ORIGINAL شکل میں استعمال کرنا چاہتا تھا ۔ کیونکہ میرا اس وقت بھی اور اب بھی یہی خیال ہے کہ انگریزی زبان اس وقت ساری دنیا کی زبان ہے ، اس لئے اس کے الفاظ اپنے ادب میں استعمال کرتے ہوئے اپنے ادب کو وسعت دیتے رہیں ۔ ہمیں انگریزی زبان سے اس طرح استفادہ کرنا چاہئے جس طرح یورپین لوگوں نے کسی وقت عربی زبان سے کام لیا تھا ۔

میں اپنے افسانے کو اصلاحی حیثیت بھی دیتا ہوں ۔ لیکن اس طرح کہ میرا افسانہ ایسا محسوس نہ ہو جیسے کوئی اسکول ماسٹر باتیں کررھا ہو ۔ میں خالص فن کارانہ انداز میں اصلاحی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہوں ۔ میرے بہت سے قارئین کا کہنا ہے کہ میرے افسانے کے کردار پریچنگ( PREACHING ) کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اس طرح ان کے خیال میں افسانہ اسکول ماسٹر کی حیثیت سے بھی گر کر کسی مشنری پادری کی سطح پر آجاتا ہے ۔ مگر قارئین کی اس رائے سے میں اپنی ساری کہانیوں کے بارے میں متفق نہیں ہوں ۔ البتہ کہیں کہیں ایسا بھی ہوجاتا ہے ۔

سوال :۔

انور صاحب دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح آپ کی جانب بھی اردو کے نقادوں نے توجہ نہیں دی ۔ اور آپ کی کہانیوں کے انفرادی خصائص کی طرف توجہ نہیں کی گئی البتہ قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ممتاز شیریں مرحومہ نے آپ کی کہانیوں کا خاصا تذکرہ کیا ہے ۔ اردو فکشن کی جانب نقادوں کے اس رویئے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب :۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اردو کے نقادوں کا کوئی قصور نہیں ہے ۔ دراصل میرا اپنا رویہ میرے اپنے ادب کی طرف یوں تھا کہ اگر میرے ادب میں طاقت ہوگی تو اردو ادب کے نقاد خود بخود میری طرف متوجہ ہوں گے ۔ میری تمنا یہ بھی رہی ہے کہ میں جو کچھ بھی لکھوں اچھا لکھوں ۔ اس لئے میری تخلیقات میں وقفہ بہت آجاتا تھا ۔ جس کی ایک وجہ میری بیوی کی ملازمت بھی تھی ۔ اپنی تخلیق مکمل کرنے کے بعد میں اس کو قارئین کے سامنے پیش کردیتا تھا ۔ میں نے ادیبوں کا وہ رویہ اختیار نہیں کیا جو ان کو ادبی حلقوں سے متعارف کراتا ہے ۔ اب میں اس چیز کو محسوس کرنے لگا ہوں کہ یہ ادیب کا حق ہے اور یہ رویہ صحیح ہے ، میں نے جو سوچا تھا کہ میرے ادب میں طاقت ہوگی تو وہ خود لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے گا ، یہ ایک قسم کا غرور تھا جس سے مجھے احتراز کرنا چاہئے تھا ۔

البتہ ادب کی طاقت کے خیال میں بھی سچائی ہے ۔ جو اس طرح ظاہر ہوئی کہ اردو ادب میں اتنا تھوڑا کام کرنے کے باوجود میں زندہ رہا ۔ اور جب میں ریٹائر ہوکر ادب کی کھلی فضا میں آیا تو اردو ادب کے قارئین نے میرا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا ۔ ترقی پسند مصنفین کے اجلاسوں میں جانے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ سب اردو لکھنے والے مجھے جانتے ہیں ۔ خصوصاً مجھے یہ معلوم ہونے کے بعد خوشی ہوئی کہ افسانہ نگار ہاجرہ مسرور نے مجھے خط لکھے ایڈیٹر ساقی کی معرفت ،جو ایڈیٹر نے مجھے نہیں بھیجے ۔ اس کے ساتھ ہی محترمہ ممتاز شیریں نے میرے ادب کو سب سے پہلے قابل توجہ سمجھا اور اپنے رسالے نیا دور بنگلور میں میرے متعلق لکھا ، جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا ۔ اس کی سب کاپیاں انہوں نے ایڈیٹر ساقی کی معرفت مجھے FORWARD کی تھیں ۔ لیکن انہوں نے نیادور کی وہ کاپیاں مجھ تک نہیں پہنچائیں ۔

سوال :۔

انور صاحب آپ ایک طویل عرصے سے لکھ رہے ہیں ۔ مگر آپ کی تخلیقات کی تعداد بہت تھوڑی ہے ۔ تینوں مجموعوں کے کل افسانے چالیس کے قریب ہوں گے۔ کیا ان کے علاوہ اور کہانیاں بھی آپ نے لکھی ہیں ؟

جواب :۔

میرے افسانوں کا ایک اور مجموعہ زیرطبع ہے ۔ اس میں پچیس افسانے شامل ہیں ۔ یہ لاہور کا ایک ادارہ شائع کر رہا ہے ۔ اس کے علاوہ ایک درجن کے قریب اور افسانے ہیں جن کو کتابی صورت میں لانا باقی ہے ۔

سوال :۔

آپ نے ایک ناول "ایک اورسومنات" بھی تو لکھا ہے ۔ جو بحری زندگی پر اردو کا پہلا اور تادم تحریر آخری ناول ہے ۔ یہ ناول خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہوا تھا ۔ اور ایک حلقے کی جانب سے آپ پر طرح طرح کے الزامات بھی عائد کئے گئے تھے ۔

جواب :۔

میرا ناول ایک اور سومنات موجودہ امریکی ادبی تکنیک میں لکھا گیا تھا اس تکنیک میں ناول نگار اپنے ناول میں دنیا کے انتہائی سنجیدہ مسائل اصلی کرداروں کے نام کے ساتھ لکھتا ہے ۔ چند ایک ایسے ناول تھے جن کے نام مجھے اب یاد نہیں آرہے ایسے ناولوں میں ایک ناول میں ایران کے سابق بادشاہ رضا شاہ پہلوی کو اس کے اصل نام کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔یا اس طرح کا ایک ناول اور ہے جس میں ہنری فورڈ کا کردار اس کے اصل نام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ ایسے ناولوں

میں واقعات ناول نگار کی تخلیق ہوتے ہیں ۔ اور کرداروں کے اصل نام ناول کو ( STRIKING ) بنانے میں مدد دیتے ہیں ۔ چنانچہ ایک اور سومنات اسی انداز پر لکھا گیا ہے ۔

اس ناول کے بارے میں ایک بنیادی خیال میرے ذہن میں تھا ، وہ یہ تھا کہ میں نیوی میں بہت عرصہ کام کرتا رہا ہوں ۔ اس لئے میں نیوی کی زندگی کے بارے میں تفاصیل دینے کے لئے ایسا ناول لکھنا چاہتا تھا ۔ میں بتانا چاہتا تھا کہ جہاز پر اور نیوی میں عام طور پر زندگی کا انداز کیا ہے ، عام طور پر زندگی کا انداز کیا ہے ، عام طور پر زندگی کا انداز کیا ہے ، عام طور پر راشٹر سے جس قسم کی زندگی بسر کی ہو اس کے بارے میں عام پبلک کو معلومات مہیا کرنے کی تمنا ہوتی ہے ۔

نیوی کے موضوع پر اردو ادب میں یہ پہلا ناول ہے ، نیوی سے میرا مطلب باقاعدہ ( FIGHITING FORCE ) کی زندگی کے چھپے ہوئے گوشے سامنے لانے کی کوشش ہے کسی ناول میں ابھی تک نیوی کو ایک ( FIGHTING FORCE ) کے طور پر پیش نہیں کیا گیا ۔ تجارتی بحری جہازوں کے بارے میں تو ادب ترجمے کی شکل میں یا تخلیقی طور پر موجود ہے ۔ لیکن نیوی کو ( FIGHITING FORCE ) کے طور پر صرف اس ناول میں پیش کیا گیا ہے ۔ اس ناول میں دو سطحیں ہیں ۔ ایک تو ہماری قومی سطح جس میں ہماری نیوی ہندوستان کے مقابلے میں اپنے جنگجویانہ کارناموں کا ذکر کرتی ہے ۔ اس لئے ہماری نیوی اپنے پورے انتقامی جذبے اور بہترین صلاحیتوں سے کام لے کر دوارکا پر حملہ آور ہوتی ہے ۔

اس قومی سطح کے ساتھ ناول ایک بین الاقوامی سطح کا پیغام بھی دیتا ہے ، جس میں یو این او کے منشور کے مطابق مختلف ممالک کے تنازعے جنگ کے بجائے افہام و تفہیم سے انجام پانا چاہئیں ۔ اس طرح پر ہماری عام زندگی سے بلند ہوکر ناول کی ہیروئن ایک جگہ پر کہتی ہے کہ دیکھو انڈیا تمہارا دشمن نہیں ہے ۔ تمہارا دشمن جنگ ہے تمہیں چاہئیے کہ جنگ کے خلاف جنگ کرو ۔ اس طرح یہ ناول بنیادی طور پر بین الاقوامی پیغام کے ساتھ ایک عالمگیر امن کا پیغام بن جاتا ہے ۔

سوال :۔

اخبارات میں اس ناول کے خلاف اس قدر شور کیوں مچایا گیا ؟

جواب :۔

اس کتاب کے خلاف پروپیگنڈے کی جو وجوہات اخباروں میں آئیں ان کے تین زاویے تھے (۱) اس ناول میں ہمارے مجاہدوں کو شرابیں پلائی گئی ہیں ۔ (۲) انڈیا کے ساتھ جنگ سے ایک مخصوص ترقی پسند ذہن کے زاویہ نگاہ سے نفرت دلانے کی کوشش کی گئی ہے ، اس لحاظ

سے یہ بےہودہ اور لچر کتاب ہے"(انھوں نے بھی لفظ استعمال کئے تھے ۔" ننگ اسلام اور ننگ پاکستان ") درپردہ اس ناول کے خلاف اس کو ( BAN ) کرانے کی کوشش ہوتی رہیں اور عام پبلک کی جانب میرے پبلشر ریاض انور اور ان کے کتب خانے پر حملہ کیا گیا اور میری کتاب کی جو رونمائی لاہور اور کراچی میں ہونے والی تھی وہ نہ ہوسکی ۔ اور اس کتاب کو ( BAN ) کرنے کی کوششوں کے سلسلے میں یہ بات کام آگئی کہ اس کو میرے پبلشر ریاض انور نے جو لاہور کے ایک بڑے ایڈوکیٹ ہیں چھپنے سے پہلے حکومت کے سنسر کے شعبے سے سنسر بھی کرالیا تھا ۔ اور تمام اعتراضات کا زبانی جواب اشاعت سے پہلے ہی دے کر مطمئن کردیا تھا ۔

اس ناول میں جب شراب نوشی کی بات ہوتی ہے تو میرے مخالفین کو یہ یادرکھنا چاہئے کہ ۱۹۶۵ء میں جب دوارکا پر حملہ ہوا تو یہ اس وقت ممنوع نہیں تھی ۔ ویسے اس کتاب کو اس زمانے کی نیوی کا مکمل نمائندہ ہونے کے لئے نیوی کے تمام شعبوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ ہوا ۔ مثلاً جہازوں میں افسران کے طبقے کو شراب پینے کی اجازت ہوتی تھی ۔ ورسیلرز اسی اپنی دل پسند کارروائیوں میں مشغول نظر آتے تھے ۔ سیلرز قرآن شریف کی تلاوت کرتے بھی نظر آتے تھے ۔ نمازیں پڑھتے تھے ۔ اور ( RECREATION ROOM میں بیٹھ کر شطرنج اورکیرم وغیرہ سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ گویا یہ ناول اس چیز کی کوشش تھی کہ اس میں ، بحریہ کے ہر شعبے اور ہر طبقے کی زندگی کو پیش کردیا جائے ۔ جہاں تک اس کتاب کے نام میں سومنات کے لفظ کو بطور علامت استعمال کئے جانے کا تعلق ہے ۔ وہ اس طرح ہوا کہ دوارکا پر جو حملہ ہوا اس کا آفیشل نام " ۔ اوپریشن سومنات " تھا سومنات کا لفظ اس لئے آیا کہ سومنات کا مندر جس پر محمود غزنوی نے سترہ حملے کئے تھے سومنات دوارکا سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے کاٹھیاواڑ میں اور اس لفظ سے اس ناول کی نچلی سطح میں نیوی کے عملے کو محمود غزنوی کے سترہ حملوں کی طرف اشارہ کر کے جنگجویانہ جذبات ابھارنے کی کوشش ہے ۔

سوال :۔

آپ قیام پاکستان کے فوری بعد سے کراچی میں ہی مقیم ہیں ۔ کراچی کے ادبی ماحول اور اہل قلم سے اپنے روابط کے بارے میں کچھ فرمائیں ۔

جواب :۔

ہاں ! میں ۱۹۴۷ء سے اپنے ریٹائر ہونے تک اور ریٹائر ہونے سے اب تک کراچی میں مقیم ہوں ۔ میں نے یہاں ادبی ماحول کے بہت سے رنگ دیکھے ہیں سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ مجھے یہاں

درختوں پر چڑھنا گاؤں کے قدرتی تالابوں میں تیرنا نہانا میرا مشغلہ تھا ۔ اتفاق سے میرے والد کی طرح میرا رجحان بھی شہری زندگی کی طرف تھا ۔ اور میرے والد صاحب جو باہر سرکاری ملازمت میں شامل ہوگئے تھے ۔ ان کے ساتھ لدھیانے اور لاہورجانے کا خواہش مند رہتا تھا ۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میں پڑھنے لکھنے میں اچھاتھا اور ایک ذہین طالب علم ، شمارہوتا تھا ۔ ہمیشہ کلاس کا مانیٹر رہا اور میری یہ ذہانت میری درسی کتابوں تک اور امتحانوں میں اچھے نمبروں کے ساتھ پاس ہونے تک موجود رہی ۔ گھر میں کوئی ادبی اور علمی کتاب نہیں تھی ۔ والد صاحب ان مشغلوں سے دور بھاگتے تھے لیکن آخرکار میں اردو سے اردو کے رسالوں کے ذریعے متعارف ہوا ۔

میں چھوٹی سی عمر میں ہی ایک رسالہ "شباب اردو " پڑھنے لگا تھا جو لاہور سے نکلتا تھا ۔ اور ایسے ہی چند اور رسالے جن کو میں خرید تو نہیں سکتا تھا ۔ لیکن ادھر ادھر سے لے کر پڑھتا رہتا تھا ۔ جس نے مجھے اردو لکھنے کی طرف راغب کیا دوسری چیز جس نے مجھے اردو کا دلدادہ بنایا اسٹیج ڈرامہ تھا ۔ ان دنوں میں بمبئی اور کلکتہ کی تھیٹریکل کمپنیاں مختلف شہروں میں تماشے دکھاتی پھرتی تھیں ۔ لدھیانے کے ڈرامیٹک اسٹیج پر میں آغا حشر کے مترنم نظم اور نثر سے متعارف ہوا ۔ اسٹیج کے ڈرامہ نویسوں میں آغا حشر کی اور اسٹیج کے ایکٹروں میں ان دنوں ماسٹر رحمت بہت مقبول اور مشہور تھے ( ماسٹر رحمت ہمارے ممتاز شاعر صہبا اختر کے والد تھے ۔ جو خود بھی ڈرامے لکھتے تھے اور شاعری کرتے تھے ) ان دو شخصیتوں نے اور ڈرامے کے زرق برق ماحول نے مجھے بڑی شدت کے ساتھ اردو کی طرف راغب کیا ۔ میں اردو ادب میں پہلے شاعری کے ساتھ داخل ہوا ۔ یہ ۱۹۲۴/۲۵ء کا زمانہ تھا ۔ اس وقت میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا لیکن جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا اور میرا مطالعہ وسیع ہوا میں نے دفعتاً محسوس کیا کہ مجھے بھی اس دنیا میں کچھ لکھنا ہے ۔ بعد میں انگریزی ادب خصوصاً برنارڈشا اور ہنرک ابسن کے ڈرامائی ادب کو پڑھنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ شاعری میرے اپنے خیالات کے اظہار میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے ، چنانچہ میں نثر کی طرف متوجہ ہوا اور جب میں لدھیانہ کے انٹرمیڈیٹ کالج میں میٹرک کی کلاسز میں تھا تو میرا پہلا ڈرامہ "کش مکش " کے نام سے اسٹیج ہوا ۔ لدھیانہ گورنمنٹ کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کی طرف سے ۔ لیکن ڈرامہ ان دنوں بیک گراؤنڈ میں جارہا تھا اور کہانی آگے آرہی تھی ۔ ڈرامہ فلموں کی وجہ سے بیک گراؤنڈ میں جا رہا تھا ۔ چنانچہ میں نے اپنا ذریعہ اظہار افسانے کو بنایا ۔

---

وہ ادیب دوست ملے جن سے میرا کوئی تعارف نہیں تھا۔ کوئی خط و کتابت نہیں تھی اور جن سے کبھی نہیں ملے تھے ان سے اب ملے ۔ ان میں (صمدشاہین ممتاز شیریں ) حسن عسکری ، شوکت صدیقی ، ممتاز حسین ، غلام عباس ، ابن انشاء ، ابراھیم جلیس اخترحسین رائے پوری اور ن ۔ م راشد سے بھی جب وہ کراچی میں ہوتے تھے ۔ ملاقاتیں ہوتی تھیں ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ـــــ (کراچی شاخ ) کی ادبی محفلیں بندرروڈ کی ایک دو منزلہ بلڈنگ کے ایک کمرے میں ) جس کو بک لینڈ کہتے تھے ، ہوا کرتی تھیں ۔ میرا ان جلسوں میں آنا جانا تھا ۔ وہاں مجھے شوکت صدیقی ممتاز حسین ، رفیق چوہدری، ریاض روفی حبیب جالب ، ابن انشاء ، ابراھیم جلیس پہلی دفعہ ملے تھے ۔ پھر ادبی محفلیں حلقہ ارباب ذوق میں ہونے لگیں ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیاسی انداز کی بناء پر اس کو نظرانداز کردیا گیا ۔ اور ہفتہ وار ادبی جلسے حلقہ ارباب ذوق کے زیراہتمام ہونے لگے جس میں ضیاجالندھری اور الطاف گوہر زیادہ فعال تھے ۔ ان ادبی جلسوں میں ان ادیبوں کے علاوہ جن کا پہلے ذکر ہوچکا ہے دوسرے ادیبوں سے بھی میرا تعارف ہوا ، پھر یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیاء ہوا ۔ اور اس افتتاحی جلسے کی صدارت محمودکورکھپوری سے کی ۔

مجھے کراچی کی ادبی و ثقافتی زندگی ہمیشہ بڑی بھرپور اور پررونق محسوس ہوئی ۔ ادبی محفلوں کے علاوہ ادیب اکثر شام کو صدر کے کافی ھاؤس میں بھی ملتے تھے ۔ کافی ھاؤس کو باقاعدہ ادبی کلب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا وہیں میری پہلی ملاقات مرحوم ابوالفضل صدیقی سے ہوئی ـــــ مجھے یاد ہے مجھے دیکھ کر انھوں نے کہا تھا میں نےتمھیں پہچان لیا ہے۔ کیا تم نے مجھے پہچانا "؟ یہ کہہ کر انھوں نے اپنی سیاہ مخملیں روپہل کھدی ٹوپی پہنے ہوئے میرے سامنےکئی پوز بنائے ۔ میں خوشی سے قہقہہ مارتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھا اور اس سے بغل گیر ہوتا ہوا بولا " ابےہندوستان کے اتنے بڑے ادیب ابوالفضل صدیقی کو کون نہیں پہچانے گا ۔" اس وقت سے لے کر ان کے انتقال تک ہمارے خاندانی تعلقات قائم رہے ، آج میری آنکھیں ان کے لئے آبدیدہ ہیں ۔ ( اتنا کہنے کے بعد انور صاحب کی ہچکی بندھ گئی کچھ دیر کے بعد جب وہ پرسکون ہوئے تو بولے ) ان کے انتقال کے بعد ایک روز ڈاکٹر جمیل جالبی اور صدیقی صاحب کے بھتیجے نذرالحسن صدیقی میری عیادت کو آئے تھے ۔ مجھے صدیقی صاحب ایک مرتبہ پھر یاد آگئے تھے ۔ اور میری شدت غم سے چیخیں نکل گئی تھیں ۔"

(پاکستان کی چالیسویں سالگرہ کے حوالے سے)

ملبوس کی اک سلوٹ نہ گئی زلفوں سے نہ پیچ و خم نکلے
زندوں کی طرح جینے کے لئے چالیس برس بھی کم نکلے
آنگن میں چٹکتی ہیں کلیاں جلتے ہیں چراغ منڈیروں پر
کچھ کھوئے ہوؤں کی تلاش میں پھر میں آوارگی کے موسم نکلے
رشتوں کی لرزتی دیواریں پہلی ہی دھوپ کی نذر ہوئیں
خود سے بھی کوئی ناتا نہ رہا جب تیری گلی سے ہم نکلے
تہذیب کے نام پہ خود ہم نے ویران کھنڈر کی کھدائی کی
ملبے کو ہٹا کر دیکھا تو کہیں تم نکلے کہیں ہم نکلے
کاغذ پہ یہ عکس کا دھبا سا میں بھی ہوں مرا ہمزاد بھی ہے
یہی اک تصویر دکھانے کو ہر روز کئی البم نکلے

حسنین کاظمی

# پاکستان اور تحریکِ پاکستان

حصول پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ ہماری قومی زندگی کا انتہائی قیمتی سرمایہ ہے ـ حالانکہ ہم نے اب تک اپنی اس تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے لیکن اس عدم توجہی سے اس دور کی روشنی میں کمی نہیں ہوئی ہمارا اپنا حافظہ ضرور دھندلا گیا ہے فکری انتشار اور بے یقینی کی یہ دھندلاہٹ دور کرنے کی ہم جتنی کوشش کریں گے اسی نسبت سے ہم اسی تاریخ کی روشنی میں آزادی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل ہوں گے۔

تحریک پاکستان کی تاریخ خود پاکستان کے وجود کا جواز ہے ، اسے ہم جس قدر دیانت اور تفصیل کے ساتھ محفوظ کریں گے نئی نسلوں کے ذہنوں میں پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت اتنی ہی واضح ہوگی ، اور اگر ہم غور کریں تو اندازہ ہوجائے گا کہ اسی عمل میں پاکستان کا استحکام بھی پوشیدہ ہے ، پاکستان سے دشمنی کے لئے خارجی عوامل کی مضبوطی ضروری نہیں ـ پاکستان کی فکری اور نظریاتی بنیادیں جتنی کمزور ہوں گی ، مخالفوں کی آرزوئیں پوری ہونے کے امکانات اتنے ہی واضح ہوتے چلے جائیں گے ـ

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے جذبہ ایثار کی جغرافیائی وضاحت ہے ـ اس ملک کی سرحدیں پہلے ہمارے قرطاس یقین پر اور ہمارے دل و دماغ پر بنی ہیں ـ اس کے بعد انھوں نے دو ملکوں کے درمیان حد فاصل کی صورت اختیار کی ہے ـ ایک بات جسے ہمیں بہت اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئیے یہ ہے کہ پاکستان برعظیم کی جدوجہد آزادی میں ایک ذیلی مقصد کے طور پر حاصل نہیں ہوا۔ اور پاکستان کی تحریک کسی وقتی یا جذباتی انتشار کا نتیجہ نہیں تھی صدیوں کا تاریخی تسلسل اس جدوجہد کی

تصدیق کررہا تھا ۔ مسلمانوں کا یہ کہنا تھا کہ اپنی تاریخ ، مجموعی تعداد ، نظریات اور فکر و عمل کے انداز کے اعتبار سے وہ برعظیم میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی اس حیثیت کو کثرت کے سیلاب میں غرق ہوتا ہوا دیکھیں ۔

مسلمانوں کا یہ خیال کہ آزادی کی صورت میں ان کی اپنی علیحدہ حیثیت ہونی چاہئیے ، بالکل جائز خیال تھا اور برعظیم کی اکثریتی قوم کے لئے اس سلسلے میں مخالفانہ رویہ اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا برصغیر میں ہندو اور مسلمان دونوں صدیوں سے آباد تھے اور تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر ان دونوں قوموں میں سے کوئی بھی دوسرے پر حکومت کی اجارہ داری کا حق نہیں رکھتا تھا ۔ تاریخی حقائق کا اگر کوئی اشارہ تھا تو یہ تھا کہ انگریزوں نے برعظیم کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی لہذا حکومت ان ہی کو ملنی چاہئیے ۔ لیکن مسلمان آزادی کی جدوجہد میں انصاف کے طالب تھے اور وہ یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ انگریز سے حکومت ان کو واپس ملنی چاہئیے ، وہ صرف انصاف کے طالب تھے اور انصاف کی بنیاد پر ہی پورے برعظیم کے مسلمان حصول پاکستان کے لئے فرد واحد کی طرح متحد ہوگئے ۔ اس انداز میں مسلمانوں کا متحد ہوجانا ہی ان کے مطالبے کی سچائی کی دلیل ہے کیونکہ مسلمان کسی غیر منصفانہ مطالبے پر اس قدر تاریخ ساز ، انداز میں متحد نہیں ہوتے ۔

یہاں ضروری ہے مسلمانوں کی تاریخ کی ایک عالمگیر حقیقت کی طرف توجہ کی جائے۔ مسلمانوں نے بے مثال فتحمندیوں کے بعد بین الاقوامی تعلقات کا ایک نیا انداز قائم کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ پر نظر کی جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی فتحمندی دوسری قوموں کی غلامی کا سبب نہیں بنی اور مسلمانوں نے عموماً دوسرے ملکوں میں استحصالی انداز حکومت اختیار نہیں کیا ۔ ہندوستان پر بھی مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی لیکن یہ حکومت انھوں نے باہر سے آئی ہوئی ایک غالب قوم کی حیثیت سے نہیں کی ۔ وہ برعظیم میں آئے تو پھر یہیں کے ہورہے ۔ ان کی حکومت عموماً رواداری کشادہ دلی اور وسیع النظری پر قائم تھی ۔ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ پہلو بطور خاص قابل غور ہے کہ انھوں نے برصغیر کے قدیم باشندوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے ان پر حکومت نہیں کی بلکہ یہاں کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے افکار اور اعمال سے متاثر کیا۔ انھوں نے یہاں کی دولت اپنے آبائی وطن نہیں بھیجی بلکہ اسی سرزمین کو اپنی آخری آرمگاہ بھی بنالیا ــــــ ان تاریخی حقائق سے بھی مطالبہ پاکستان کی صداقت کی تصدیق ہوتی ہے ۔

مسلمانوں کی تاریخ کی ان امتیازی

صفات کے ادراک کے لئے ان کے ضابطۂ فکر و عمل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا اپنا جو نظریۂ حیات ہے اس کے عدل اجتماعی کی مثال دنیا کے کسی دوسرے نظریۂ زندگی میں نہیں ملتی اور وہ عدل اجتماعی ایک حقیقی نظام کی صورت دورِ رسالت و خلافت میں تشکیل پاچکا ہے ۔ مسلمان جب بھی اجتماعی نظام کے بارے میں کوئی تصور قائم کرتے ہیں ۔ ان کی نگاہیں اسی معیاری دور عدل تک پہنچتی ہیں یہ جو مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار میں بڑی ترقیوں کے باوجود کسی ایک کمی کا احساس ملتا ہے ، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ایک ایسی معیاری حقیقت عدل اجتماعی موجود ہے کہ وہ اپنی انتہائی ترقی یافتہ معاشرتی کیفیت کا جب بھی اس معیار سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان کو اپنے دور میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں ، جن قوموں کے سامنے کوئی تاریخی آئیڈیل نہیں ہے وہ تو معروضہ ترقی کی راہ پر ہر قدم کو ارتقاء قرار دے سکتی ہیں لیکن مسلمانوں کے لئے ایسا دعویٰ ممکن نہیں کیونکہ ان کے پیش نظر تاریخ کی مکمل روشنی میں ظہور پذیر ہونے والا ایک آئیڈیل ہے جو ان کے وجود کے تاریخی تسلسل کا جواز بھی ہے اور ان کے لئے ارتقاء کا ضامن بھی ۔

برعظیم کے مسلمانوں کا عالم اسلام میں بڑا منفرد کردار رہا ہے ۔ دور غلامی میں بھی انھوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا اور گزشتہ ڈھائی تین سو سال کے دوران اسی میں انتہائی بلند پایہ دینی مفکر پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام میں روح عصر کی بیداری کے لئے عملی جہاد کئے ۔ برعظیم کے مسلمانوں کی دردمندی اور فکری بیداری ہی تھی جس نے انھیں انگریزی کی ظالمانہ اور غاصبانہ حکومت کے انتہائی نامساعد زمانے میں بھی اپنے قومی وجود کے شعور سے محروم نہیں ہونے دیا اور اپنے اسی اجتماعی وجود کے تحفظ کے لئے انھوں نے برعظیم کی آزادی کی صورت میں اپنے لئے ایک آزاد خطۂ ارض کا وجود ضروری قرار دیا ۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ برطانوی استعمار کے اثرات نے ہماری نفسیات کو متاثر کیا ہے اور اسی وجہ سے مغرب کی علمی ، فنی اور تکنیکی ترقیوں سے ہم متحیر بھی ہوئے اور مرعوب بھی ، اس وجہ سے ہم نے ان کے فلسفۂ زندگی کو بھی جوں کا توں قبول کرلیا ہے ۔ عملاً اس وقت حالت یہی ہے کہ ہم زندگی کے مسائل کے بارے میں مغرب کے ان افکار کو بھی درست سمجھے ہوئے ہیں جو افکار خود اہل مغرب کی معاشرتی زندگی میں بہت سے سنگین مسائل پیدا کرچکے ہیں اور جن کا حل تلاش

کرنے کے لئے مغرب دانشور مسلسل فکری کوششوں میں معروف ھیں ۔ مغرب نے انسانی زندگی کو مختلف الگ الگ شعبوں میں تقسیم کردیاھے اور جن شعبوں میں مسائل پیدا ھوتے ھیں ، وہ ان مسائل کو صرف اسی شعبے سے متعلق سمجھ کر ان کا حل تلاش کرتے ھیں ۔ لیکن کسی ایک شعبے کے مسائل کا حل خود اپنی جگہ دوسرے شعبے میں مسائل پیدا کرنے کا باعث بن جاتا ھے اور اس طرح اہل مغرب دراصل مسائل تجربات اور ان کے حل کے دائروں میں گردش کررھے ھیں ـــ اس گفتگو سے مغرب کی علمی اور فنی ترقیوں کی تنقیص مقصود نہیں لیکن علمی اور فنی ترقیوں کے وسیلے سےجب انسان خودگزیدگی کو اپنا شعار بنالے اور ایسے بم ایجاد کرنے میں مصروف ھوجائے جو عمارتوں کو تو صحیح سلامت رکھیں لیکن عمارتوں میں رہنے والے ہلاک ھوجائیں تو اس ذہنی گمرھی کی ذمہ داری ان کے فلسفۂ زندگی پر ھی ڈالی جاسکتی ھے ۔ علامہ اقبال نے مغرب کی اسی مجبوری کی نشاندھی کیھے ، جب انھوں نے کہا ع

ڈھونڈنےوالاستاروں کی گزرگاھوں کا
اپنے افکار کی دنیامیں سفرکرنہ سکا
اپنی حکمت کے خم وپیچ میں الجھاایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کرنہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتارکیا
زندگی کی شب تاریک سحرکرنہ سکا

یہی وہ مرحلہ ھے جہاں انسانی زندگی میں نظریے یا آئیڈیالوجی کی حقیقی اھمیت واضح ھوتی ھے ۔ انسانی زندگی کے لئے آئیڈیالوجی لازمی ھے ـ ناگزیر ھے ، انسان کے سامنے اگر صحیح نظریہ نہیں ھوگا تو وہ غلط نظریہ قبول کرلے گا ۔ اور پھر نسل در نسل اس کا خمیازہ بھگتے گا ۔ انسانی قلب خالی نہیں رہ سکتا ، اس میں اللہ پر ایمان کی روشنی نہیں ھوگی،تو تشکیک اور توہمات کا غلبہ ھوجائے گا ، وہ بت پرستی کرنے لگے گا ۔ پتھر کے بت نہیں بنائے گا تو خواہشات مفادات اور تعصبات کے بت دل میں بٹھالے گا ۔ یہ ایک اھم بات ھے۔قومی زندگی کی سطح پر نظریہ حیات کی اھمیت اسی نسبت سےبڑھ جاتی ھے ۔

یہ ھے وہ پس منظر جس میں ھمیں پاکستان کے قیام اور اس کے وجود کی اھمیت پوری طرح سمجھنی چاہئیے ـــ پاکستان کے وجود میں انفرادیت کاعنصر اسی وجہ سے ھے کہ یہ ایک نظریے کی معاشرتی تشریح کے لئے قائم ھوا ھے ، یہی وہ پس منظر ھے جس میں ملی اعتبار سے مسلمانوں کا عالمی وجود بھی بہت منفرد بن جاتا ھے ۔ اسلام نے ایمان کی بنیادوں پر جو دائمی اور عالمگیر انسانی رشتوں کاتصور قائم کیا ھے ، وہ بالکیہ محو نہیں ھوسکتا ۔ ھم اسے بھولیں گے تو نقصان ھمارا ھوگا ـــ کیونکہ اجتماعی اعتبار سے اپنی حیات نو کے لئے اسلام کی ضرورت ھمیں ھے ۔

اسلام اپنی اثر پذیری کے لئے ہمارا محتاج نہیں ہے۔ اسلام کے لئے پوری عریض و وسیع دنیا میں پھیلی ہوئی انسانیت موجود ہے۔ اسلام انسانیت کو فلاح کی راہ دکھانے آیا ہے۔ اسلام ان قوانین قدرت کا نتیجہ ہے جو انسانیت کی بھلائی کی ضمانت دیتے ہیں اور اس حوالے سے مسلمانوں کی ذمہ داریاں دو گونہ ہوجاتی ہیں اور ان پر دو ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں۔ پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ ایک عادلانہ معاشرے کا قیام کریں اور دوسری یہ کہ وہ عالم انسانیت کی بھلائی کی نگرانی کریں۔

قرآن پاک میں امت مسلمہ کی ذمہ داریوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے اور اس کی اہمیت بھی متعین کی گئی ہے سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے۔

"ہم نے تم (مسلمانوں کو) امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم عالم انسانیت (کے اعمال) پر شاہد بنو اور (تمہاری تربیت سے امین رسول تمہارے اعمال پر شاہد رہیں۔"

سورہ آل عمران میں ہمارے اجتماعی فریضے کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"تم دنیا میں ایک ایسی بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان عمل میں لایا گیا ہے تم لوگوں کو موثر طور پر نیکی کی راہ دکھاتے ہو اور بدی کی راہ سے روکتے ہو اور یہ اس لئے کہ تم اللہ کی ذات پر حقیقی ایمان رکھتے ہو۔"

انسان کی گذشتہ چودہ سو سال کی تہذیبی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ فرائض صدیوں تک بہ حسن وخوبی انجام دیئے۔ اور ان ہی ذمہ داریوں کے احساس کے پیش نظر برعظیم کے مسلمانوں نے دور حاضر میں اپنے نظریہ حیات کی معاشرتی صداقتوں کی تصدیق کے لئے قیام پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسے حاصل کرلیا۔ پاکستان کا حصول ہمارے قومی وجود کے لئے ایک نئے انداز کی آزمائشوں کی ابتدا تھی اور ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ آزادی لاقانونیت کا نہیں بلکہ ذمہ داریوں کے احساس اور ان کی حتی الامکان تکمیل کا نام ہے۔

برعظیم کے مسلمانوں نے ۱۹۴۰ء میں اجتماعی طور پر حصول پاکستان کو اپنی منزل مقصود قرار دیا تھا اور ملکی اور بین الاقوامی حالات نے صرف سات سال کے عرصے میں پاکستان کا قیام ممکن بنادیا۔ اس کے لئے جدوجہد کے دوران جس فکری اور عملی کام کی ضرورت تھی تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے اس وقت اس کا موقع نہ دیا۔ لہذا پاکستان کے قائم ہونے کے بعد پوری منصوبہ بندی کے ساتھ اس نظری اور علمی کام کی جانب توجہ کی ضرورت تھی ضرورت اس بات کی تھی کہ اس برعظیم میں مسلمانوں کے صدیوں کے تمدنی اور

تہذیبی اور ثقافتی کارناموں کو تحقیقی انداز میں پیش کیا جاتا اور کوشش یہ کی جاتی کہ نئی جغرافیائی سرحدوں کو برصغیر کے مسلمانوں کی پھیلائی ہوئی علمی تہذیبی اور ثقافتی روشنیوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنایا جائے کیونکہ یہ سرحدیں ان ہی روشنیوں کے تحفظ کے لئے قائم کی گئی تھیں ۔ اس انداز میں علمی کام نہ ہونے سے ہمارے درمیان بے یقینی اور ذہنی انتشار پیدا ہوا ہے ۔

ہمیں اپنی نئی نسلوں کو دراصل بتانا یہ تھا کہ پاکستان کا قیام کسی حادثاتی واقعے کا نتیجہ نہیں، پاکستان برطانوی حکمت عملی کے نتیجہ میں قائم نہیں ہوا ۔ پاکستان اس لئے بھی نہیں بنا تھا کہ قائداعظم گورجنرل کے عہدے کے کروفر کی خواہش رکھتے تھے ۔ — قائداعظم کو قیام پاکستان سے بہت پہلے متحدہ ہندوستان کا تا حیات وزیر اعظم بننے کی پوری سنجیدگی سے پیشکش کی گئی تھی جسے انھوں نے نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اصل بات یہ ہے کہ " فکر ہر کس بقدر ہمت اوست " یعنی ہر شخص اپنے ہی رجحانات اور اپنی ہی علمی اور فکری سطح کے مطابق سوچتا ہے اور جب وہ بولتا ہے تو اسی سطح کا اظہار ہوجاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر ہم نے اپنے تاریخ اپنے رہنماؤں اور یہاں تک کہ خود اپنے دین کی تشریح کے سلسلے میں غیر ذمہ داری کی روش اختیار کر رکھی ہے — یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا فکری انتشار کم نہیں ہوا ۔ بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا ہے ۔

سچی بات یہ ہے کہ پاکستان اس لئے بنا کہ برعظیم کے مسلمان یقین رکھتے تھے کہ اس کے سوا ان کی حقیقی آزادی کی کوئی دوسری صورت ممکن نہیں اور وہ اس پر سمجھوتہ نہیں کر سکے ۔ ۱۹۴۶ء کا کیبنٹ مشن پلان برعظیم کے چھ صوبوں میں قیام پاکستان کی پہلی منزل کے طور پر قبول کیا گیا تھا ۔ اس پلان کو برطانیہ کی مرضی سے کانگریس نے ناکام بنادیا ۔ یہ بات اب دستاویزی ثبوت کی صورت میں ساری دنیا کے علم میں آچکی ہے کہ انگریز من حیث القوم اور ماؤنٹ بیٹن صاحب ، ذاتی اعتبار سے پاکستان کے مخالف تھے اور دنیا اس حقیقت سے بھی واقف ہے کہ قیام پاکستان میں برعظیم کے ان مسلمانوں نے بھی بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا جنھیں خود یقین تھا کہ وہ پاکستان کے شہری ہونے کی سعادت کبھی حاصل نہیں کرسکیں گے ۔

حصول آزادی سے قبل برصغیر میں تین فریق تھے۔

* انگریز تھے جو اقتدار کے غاصب اور مسلمان دشمن تھے۔
* ہندو تھے جنھیں انگریزوں نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے ان کے اپنے اجتماعی تشخص کی بازیافت کی راہیں دکھائی تھیں اور جو انگریزوں کی سرپرستی میں داخلی خود مختاری

پرپوری طرح راضی تھے ۔

٭ مسلمان تھے جو برعظیم کی حکومت سے محروم کئے گئے اور نسل در نسل براہ راست انگریزوں کے عتاب کی زد پر رہے اور خود بھی کسی صورت انگریزوں سے مفاہمت پر آمادہ نہیں تھے ۔

یہ ان تین فریقوں کا اجتماعی کردار تھا۔ بعض انگریزوں سے مسلمانوں سے ہمدردی کی لیکن اس سے ان کا کردار قومی نہیں بدلا۔ بعض مسلمانوں نے انگریزی اقتدار سے مفادات کے معاوضے میں ان کی غلامی قبول کرلی لیکن اس سے مسلمانوں کے آزادی پسند قومی کردار میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ ہندوؤں میں بہت سی نہایت قابل قدر حریت پسند شخصیتیں پیدا ہوئیں لیکن اس سے ان کا وہ قومی کردار متاثر نہیں ہوا جو انگریزی اقتدار کے قیام کے بعد حالات کے رخ کا اندازہ کر کے اسھوں سے متعین کرلیا تھا ۔

پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ کو اس پس منظر میں اگر سمجھا 'ورسمجھایا جائے تو قومی فلاح کا باعث ہوگا ۔ اس آئینے میں بعض شخصیتوں یا گروہوں یا طبقات کے چہرے تو دل پسند نظر نہیں آئیں گے لیکن اس میں غلط تاریخی حقائق کے آئینوں کی نہیں بلکہ اس میں خوش نما نظر نہ آنے والی شخصیات کے کردار کی ہے ۔ ان شخصیتوں کی بدنمائی کے اندیشے سے تاریخی سچائیوں کے آئینے اگر توڑ بھی دیئے جائیں تو اس سے حقائق نہیں بدلیں گے بلکہ ہوگا یہ کہ تاریخ مسخ کرنے کے عمل سے برصغیر کی مسلمان قوم اس وسیلے سے محروم ہوجائے گی جس سے اسے تحریک آزادی اپنے قد و قامت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے اور یہ زیادہ بڑا اجتماعی نقصان ہوگا ۔

تحریک پاکستان حقیقی معنوں میں عوامی تحریک تھی اور برصغیر کی آزادی کی تحریک تھی ۔ اسے میں برصغیر کی آزادی کی حقیقی تحریک اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انڈین نیشنل کانگریس جس آزادی کا مطالبہ کررہی تھی اس میں ایک بہت بڑی حقیقت کو نظرانداز کیا گیا تھا اور وہ حقیقت تھی برصغیر میں دو قوموں کے وجود کی ۔ وہ حقیقت یہ تھی کہ برصغیر میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں آباد تھیں اور ان دونوں قوموں کے اپنے اپنے اکثریتی علاقے تھے ۔ کانگریس نے جس آزادی کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ پورے برصغیر پر ہندو اکثریت کی مرکزیت کا غلبہ ہوجائے اور مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے حقیقی آزادی کے ثمرات سے محروم رہیں ۔ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی حکومت سے جتنے خطرات تھے ان کی بنیاد محض بدگمانیوں پر نہ تھی ۔ مسلمانوں کو جو خطرات بھی محسوس ہوئے تھے حقیقی تھے ۔ آزادی کے بعد بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ عموماً اور مسلمان اقلیت کے ساتھ خصوصاً جو سلوک ہوا ہے وہ سب کے

سامنے ہے ۔ بھارت میں اس وقت بھی مسلمانوں کی تعداد ۱۲ اور ۱۵ کروڑ کے درمیان ہے لیکن وہ مرکزیت کی بالادستی کی وجہ سےدکھاوے کی سکولر ازم کے باوجود آزادی کی نہیں بلکہ جبر کی زندگی بسر کررہے ہیں اس کے بالکل برعکس پاکستان میں گذشتہ ۳۰ برس میں سیاسی اور سماجی اعتبار سے بہت سی خرابیاں رونما ہوئی ہیں اور ہم نے پاکستان میں "سیکولرازم " کے وہ نمائشی اعلانات بھی نہیں کئے جن کو بھارت نے اپنے لئے طرۂ امتیاز بنایا ہے لیکن پاکستان میں ساری اقلیتیں اس وقت بھی محفوظ تھیں جب بنگلہ دیش قائم نہیں ہوا تھا اور اب بھی ہیں ۔ لہذا میں یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ برصغیر کی آزادی کی حقیقی جدوجہد کی ابتداء میں بھی مسلمان ہی پیش پیش تھے اور اس جدوجہد کے آخری دور میں بھی مسلم لیگ ہی نے وہ موقف اختیار کیا جس سے مغرب کے وضع کردہ جمہوریت کے اصولوں کے تحت برصغیر میں بسنے والی دونوں بڑی قوموں کو آزادی حاصل ہوسکی ۔

انگریزوں نے پورے برصغیر کو اپنے غاصبانہ اقتدار کے تحت یکجا کرلیا تھا اپنے اقتدار کو علاقائی علامت میں منتقل کرنے کے لئے انھوں نے برصغیر کی جغرافیائی وحدت کا نعرہ لگایا تھا اس نعرے سے انھیں ہندو قیادت کو یہ شہ دینی مقصود تھی کہ وہ انگریزی حکومت کی جانشین بننے کی تیاریوں میں مصروف ہوجائے ۔ ایک بات ہمیں کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اقوام مغرب میں بعض قوموں کی قیادت اور ان کے طرز فکر میں وہ کیفیت رچی بسی ہوئی ہے جسے ہم استعماریت کا انداز کہتے ہیں اس انداز کو جس قوم نے کُھلے کُھلے اپنایا ہے وہ انگریز قوم ہے اور برصغیر میں ہمیں واسطہ اسی قوم سے پڑا تھا ۔ افریقہ اور مشرق بعید میں فرانسیسی اور ولندیزی حاکموں نے اپنی اپنی استعمار پسندی کے جوہر دکھائے ہیں لیکن انگریزوں کا رویہ برصغیر میں ہماری جانب خصوصاً معاندانہ اس لئے رہا کہ ہم مسلمان تھے اور ہم اپنے اس تشخص کو قائم رکھنے کے خواہش مند تھے اور انگریز سیاست دانوں کے لئے یہ بات قابل قبول نہیں ہوسکتی ۔ وہ مسلمانوں کے تشخص کو اور مسلمانوں کے ملی اتحاد کو صدق سے قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوسکتے ۔

مسلمانوں کی جانب انگریزوں کے معاندانہ رویہ کی پوری ایک ہزار سالہ تاریخ ہے جس کا سلسلہ صلیبی جنگوں سے شروع ہوتا ہے ۔ ان جنگوں اور اس تاریخ کو انگریز آج تک نہیں بھولے۔ اس کا ایک بہت واضح ثبوت اس صدی کے ابتدائی دور میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر مہیا ہوا ۔ اس جنگ میں سلطنت عثمانیہ کو جو جرمنی کے حلیف اور مسلمانوں کے عالمی اتحاد کی علامت تھی

شکست ہوئی اور اس کے نتیجے میں ترکی کو ایک شرمناک معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا جسے معاہدہ سیورے کہا جاتا ہے اور جس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں نے تحریک خلافت چلائی ۔ وہ جنگ انگریزوں سے ترکوں کے خلاف صلیبی جنگوں کے جوش و جذبے کے تحت کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے برطانوی وزیراعظم ، مسٹر لائڈ جارج نے بیت المقدس میں کامیابی حاصل کرنے والے برطانوی جنرل ایلنبی کے استقبال کی تجویز پیش کرتے وقت برطانوی دارالعلوم میں ایک پرجوش عیسائی جنگجو کی طرح اس فتح کو آخری صلیبی جنگ اور سب سے زیادہ فاتحانہ کہا تھا ۔" یہ واقعہ مسلمانوں کی جانب انگریزوں کے رویئے کی پوری وضاحت کردیتا ہے ۔

انگریز بڑے ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہیں ۔ کم از کم وہ اس بات کا اظہار ضرور کرتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے مزاج کے سیاست داں ہیں لیکن مزاج کی یہ مستقل ٹھنڈک ان کے منافقانہ انداز فکر و عمل کی آئینہ دار بھی ہے ۔ اسی مزاج سے کام لیتے ہوئے انھوں نے بظاہر بہت نرم روی کے ساتھ لیکن پوری مستقل مزاجی کے ساتھ مسلمانوں کو داخلی اور خارجی مسائل اور افتراق باہمی سے دوچار کیا ہے ۔ آپ غور کریں تو اندازہ ہوجائے گا کہ افریقہ ، مشرق وسطٰی اور برصغیر میں مسلمانوں کو جتنے بنیادی مسائل کا سامنا ہے وہ سارے مسائل کم و بیش انگریزی سیاست دانوں کے پیدا کردہ ہیں ۔ برصغیر کی تقسیم میں مسلمانوں کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ انگریزوں نے اختیار کیا ، کشمیر کا مسئلہ انگریزوں نے پیدا کیا ، اسرائیلی ریاست انگریزوں کے سیاسی ذہن کی پیداوار ہے ۔ افریقہ کے مسلمان ملکوں کے مسائل کے پس پردہ انگریزوں کی حکمت عملی کارفرما ہے ۔ اور یہ بات بھی ان کی حکمت عملی ہی کا حصّہ ہے کہ من حیث القوم مسلمانوں سے دلی نفرت کے باوجود چند مسلمانوں کو انفرادی طور پر مفادات کی پیشکش کی گرفت میں لیکر ان سے بڑی اپنائیت کا سلوک کیا ان کی عزت و توقیر کے بڑے اہتمام کئے ہیں ۔ ان کو اپنا بناکر پیش کیا تاکہ ایک تاثر یہ پیدا کیا جائے کہ مسلمانوں کی اہم شخصیتیں انگریزوں کی ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہیں اور اس طرح ان شخصیتوں پر اور ان کے حوالے سے مسلمان قوم پر آزادی کی جدوجہد سے بے نیازی اور برطانیہ کے اقتدار لوگوں سے ساز باز کرنے کا الزام آسانی سے عائد کیا جاسکے ۔ اور اس طرح جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کے اصل اور حقیقی کردار کی اہمیت نگاہوں سے چھپانے کی کوشش کی جائے ۔

برصغیر میں انگریزوں کے اقتدار کی ابتدا سے لیکر اس کے خاتمے تک کی تاریخ پر جس کی نگاہ ہے وہ جدوجہد آزادی میں من حیث القوم مسلمانوں کے

مجاہدانہ کردار سے انکار نہیں کرسکتا اسی جدوجہد کے اختتامی مراحل میں مسلمانوں نے جب یہ محسوس کیا کہ برطانوی حکومت اور ہندو قیادت کے مابین داخلی افہام و تفہیم کے نتیجے میں برصغیر سے برطانوی حکومت کے اقتدار کے خاتمے کے بعد بھی مسلمانوں کو ایسی آزادی میسر نہیں آسکے گی جس میں ان کا اجتماعی تشخص برقرار رہے تو انھوں نے اسی جمہوری اصول کے تحت جس کا تجربہ انگریزوں نے برصغیر میں شروع کیا تھا اپنے اکثریتی علاقوں میں اپنی ایک آزاد حکومت کا مطالبہ کیا اور یہ مطالبہ مسلمانوں کے اجتماعی تشخص کے تحفظ کے لئے کیا گیا تھا اور اس میں علاقائی ، گروہی یا فرقہ ورانہ مفادات کے حصول کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا لہذا مسلمان اس مقصد کے لئے فرد واحد کی طرح متحد ہوگئے یہ اتحاد ایک سچے اور اچھے مقصد کے لئے تھا اس لئے مخالفین کی کثرت اور ظاہری قوت کے باوجود مسلمان اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد ہمیں حصول پاکستان کے لئے کی جانیوالی جدوجہد کو جتنی تفصیل سے جمع کرنا چاہئے تھا اور ہمارے اکابر کو اور ہماری حکومت کو اور ہماری سیاسی اور سماجی جماعتوں کو اور علمی اور تحقیقی اداروں کو اس سلسلے میں جو کچھ کرنا چاہئے تھا وہ بوجوہ نہ ہوسکا ۔ کبھی مصلحتیں ، کبھی مفادات ، کبھی تعصبات اور کبھی لاعلمی اس راہ میں حائل رہے تحریک پاکستان کے قائدین کو اور ان تمام شخصیتوں کو جنھوں نے اس میں بھرپور حصّہ لیا ، اپنی یاد داشتیں اور تحریک سے متعلق اپنے تاثرات اور افکار تحریری صورت میں آنیوالی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک سلسلہ قائم رکھنا چاہئے تھا لیکن ان میں سے بھی بہت کم افراد نے اس سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک آزادی میں برصغیر کے مسلمانوں کا عدیم المثال کردار اور پھر حصول پاکستان کے لئے ان کا تاریخ ساز اتحاد اور حیرت انگیز کامیابی کے حقائق ہماری نئی نسلوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے ۔ یہ ایک بڑی کوتاہی ہے جس کا ارتکاب بہر حال ہوا ہے اور اس کے ازالے کی تمام ممکنہ کوششیں کی جانی ضروری ہیں ۔

قیام پاکستان کے لئے تحریک کا دور اور نتیجے میں پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لئے ایک تاریخ ساز واقعہ ہے وہ عالمی قوتیں جو اسلام کی شاندار تاریخ اور اس کی بے مثالی اور لازوال تعلیمات اور عالم انسانیت پر ان کے اثرات کی وجہ سے اسلام کی اور مسلمانوں کی مخالف ہیں، قیام پاکستان ان کے لئے بھی حیران کن تھا ۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال اور خلافت کی صورت میں عالم اسلام کی مرکزیت منتشر کرلینے میں کامیابی کے بعد انھیں

اس بات کی توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ اس زوال اور انتشار سے گزرنے کے بعد صرف ربع صدی کے اندر ہی اندر پاکستان کے قیام کی منزل آجائے گی جو عالم اسلام میں بیداری کا نقطہ آغاز بنے گی اور پھر انڈونیشیا سے مراکش تک مسلمانوں کی آزاد ملکوں کا ایک سلسلہ بن جائے گا ۔ اور اسلام کے حوالہ سے مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کا ایک نیا دور شروع ہوجائے گا ۔ آج عالمی طاقتیں اپنے سارے مادی وسائل کے باوجود مسلمانوں کی یکجہتی اور اسلامی تعلیمات پر عمل کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہوجانے والی امکانی توانائی سے غافل نہیں ہیں اور وہ اس سلسلے میں اپنے اہل علم اور علمی اداروں کے ذریعے مطالعہ کررہی ہیں اور ان مطالعوں کی روشنی میں وہ مسلمانوں کو بہ حیثیت ایک عالمی طاقت غیر موثر بنانے کے لئے اپنی حکمت عملی تیار کررہی ہیں ۔

مسلمانوں کی چودہ سو برس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفوں کے انداز فکر و عمل میں ایک بنیں فرق رہا ہے ۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اصل قوت محرکہ ، جو ہمیشہ ان کی کامیابی کی ضمانت بنی ، ایمان ، اتحاد اور تنظیم کا مطمح نظر رہا ہے ۔ مسلمان مادی اعتبار سے بھی طاقتور رہے ہیں اور مادی اعتبار سے طاقتور ہونا ضروری ہے اور قرآن پاک سے بھی اس سلسلے میں احکامات صادر فرمائے ہیں ۔ لیکن مسلمانوں نے مخالف قوتوں پر فیصلہ کن کامیابی کے لئے کبھی بھی صرف مادی طاقت پر بھروسہ نہیں کیا ۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ فریق مخالف پر محض برتر فوجی اور مادی قوت کی وجہ سے فتحمند ہوجائیں گے ۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صرف برتر فوجی طاقت اور مادی بالادستی ان کی کامیابی کا سبب کبھی نہیں بنی ۔ انھیں حیرت انگیز اور مسلسل کامیابیاں ان ہی میدانوں میں ہوئی ہیں جہاں افرادی قوت اور مادی وسائل کے اعتبار سے وہ کمتر لیکن ایمانی اور اتحادی طاقت کے اعتبار سے اپنے مخالف کے مقابلے میں بالاتر رہے ہیں ۔

قدرت کا قانون یہ ہے کہ ایک اعلی اور برتر مقصد سے غیر متزلزل وابستگی انسانوں میں داخلی طور پر ایسی بے خوفی اور توانائی پیدا کردیتی ہے جو صرف مادی طاقت پر بھروسے سے پیدا نہیں ہوسکتی ۔ اعلی انسانی اقدار سے ، جن میں آزادی شامل ہے ، مکمل وابستگی انسان کو ایثار و قربانی کے اس جذبے سے سرشار کردیتی ہے کہ اس میں موت سے مقابلے کی جرأت پیدا ہوجاتی ہے اور جس جماعت کے افراد میں اجتماعی طور پر موت سے مقابلے کا جذبہ پیدا ہوجائے اسے شکست دینا ممکن نہیں رہتا مسلمانوں کی ناقابل یقین کامیابیوں کا

اور میدان جنگ میں فتحمندیوں کا بھی راز تھا جسے سمجھنا ان کے مد مقابل آنیوالی طاقتوں کے لئے ممکن ھی نہیں تھا ۔ اللہ پر ایمان سے وابستگی تو بہرحال ساری توانائیوں کا سرچشمہ ھے لیکن دور حاضر میں بھی ھم نے ویت نام اور بعض دوسرے ممالک میں اس حقیقت کو بے نقاب ہوتے دیکھا ھے کہ قوم میں جب اعلی اجتماعی مقصد سے لگن پیدا ہوئی تو بڑی سے بڑی مادی طاقت بھی اس کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوسکی خود ھماری شمال مغربی سرحد پر گذشتہ آٹھ برس سے اپنے بے پناہ مادی وسائل کے باوجود روسی افواج کو واپسی کا جو فیصلہ کرنا پڑا وہ بھی اس دور میں مسلمانوں کی قوت ایمانی کا ایک اعلٰی مظہر ھے ۔ پاکستان کا قیام بھی اسی قوت کا مرہون منت تھا ۔

جذبہ ایمانی کے تحت جو عمل ہوتا ھے وہ آپ اپنا انعام ہوتا ھے اکثر ایسا ہوتا ھے اس جذبے کے تحت عمل کے نتیجے میں مادی انعامات بھی حاصل ہوجاتے ھیں لیکن خود عمل کرنیوالے کا اصل مقصد ان انعامات کا حصول نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ھے کہ جس طرح ایمان سے وابستگی انسان میں ناقابل تسخیر داخلی توانائی پیدا کردیتی ھے اسی طرح مادی مفادات کا حصول اگر مقصد فکر و عمل بن جائے تو اس سے انسان میں داخلی طور پر بڑی کمزوری پیدا ہوجاتی ھے اور وہ خوف اور بے بنیاد اندیشوں کا شکار ہوکر رہ جاتا ھے ۔ برصغیر کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں اخلاص اور صدق دل سے حصہ لیا اسی لئے مخالف قوتوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں ، ترغیبات اور دھمکیاں کوئی بھی کارگر نہ ہوئیں ۔

تحریک پاکستان میں شریک غالب اکثریت اس وقت نفع و نقصان کا میزانیہ اپنے سامنے رکھے ہوئے حساب کتاب میں مصروف نہ تھی کہ تحریک میں شریک ہونے سے یہ فائدہ ہوگا اور شریک نہ ہونے سے اتنا خسارہ ہوجائے گا ۔ بلکہ اس کے برعکس اس وقت تحریک کی حمایت میں فوری نقصان کے امکانات زیادہ تھے لیکن ان امکانات کے باوجود مسلمانوں نے تحریک کا ساتھ دیا اور نفع و نقصان سے یہ بے خوفی اور بے نیازی ھی تھی بالاآخر ان کی کامیابی کی ضمانت بنی ۔

ایک بات ہمیں برابر یاد رکھنی چاہئیے کہ اجتماعی زندگی میں کامیابی کے لئے انفرادی طور پر ایثاروقربانی کا جذبہ بیدار رکھنا ازحد ضروری ھے جذبات اور خواہشات پر قابو پائے بغیر اور ایثار و قربانی کا جذبہ زندہ رکھے بغیر اجتماعی زندگی میں نہ ترتیب و تنظیم پیدا ہوسکتی ھے ، نہ قانون کا احترام برقرار رہ سکتا ھے اور نہ اجتماعی فلاح کے مقاصد کے حصول میں کامیابی ہوسکتی ھے ۔ تحریک پاکستان

میں ہماری کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ من حیث القوم ہمارے اندر نظم و ضبط قائم اور جذبہ ایثار قربانی بیدار ہوگیا تھا ۔ اس جذبے کی بیداری میں قومی قیادت کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے تحریک پاکستان کے دوران ہمیں ایسی قیادت میسر تھی کہ " ایمان ، اتحاد اور تنظیم" سے پورے برصغیر کی مسلمان قوم کی وابستگی برقرار رہی ... قیام پاکستان کے بعد قومی قیادت کے وسیلے سے اجتماعی زندگی میں ان معائب کا برقرار رکھنا زیادہ ضروری تھا کیونکہ آزادی کے بعد اقتدار اور مفادات کے حصول کی آزمائشوں کا دور آیا اس دور میں فکر و عمل کا توازن برقرار رکھنے اور آزادی کی نعمتوں کو حقیقی معنوں میں عام کرنے کے لئے قومی زندگی میں جذبہ ایثار و قربانی کی بیداری بہت زیادہ ضروری تھی ۔ لیکن افسوس کی بات کہ ایسا ہو نہ سکا ۔ گذشتہ تقریباً ۳۵ برس میں ہم اغراض اور مفادات کی پرستش کے مختلف تجربات اور مراحل سے گزرے ہیں اور ان سے جو نتیجہ حاصل ہوا ہے وہ یہی ہے کہ گروہی اور علاقائی مفادوں پر مفاد پرستی کی روش میں حقیقی فائدہ کسی کا نہیں اور نقصان سب کا ہے ۔ اصل بات وہی ہے کہ معاشرتی زندگی میں خود غرضی کی روش سے فتنہ و فساد کے سوا کچھ اور حاصل نہیں ہوتا اس حقیقت کا ہم جس قدر جلد احساس کرلیں اور اعتراف کرلیں ہمارے لئے اتنا ہی اچھا ہوگا اور مستقبل میں روشنی اور اجتماعی فلاح کے حصول کے امکانات بڑھ جائیں گے ۔ ن گے ۔

اقوام مغرب میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی ہیں ۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم جب ان اقوام کے اتباع کی راہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی خوبیاں نظر انداز کردیتے ہیں اور خامیاں قبول کرلیتے ہیں ۔ ہم اقوام مغرب کی جمہوریت کے نفاذ کا نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن ان کی طرح قانون کا احترام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، ان کی طرح فلاح عام کے کاموں کے لئے اپنے محدود اور وقتی مفادات قربان کردینے پر تیار نہیں رہتے ۔ دور حاضر میں جمہوریت ایک معروف اور مقبول نظام حکومت ہے ۔ مغرب کے اکثر ممالک میں جمہوریت کے نفاذ کے لئے صرف نعرہ سازی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ معاشرتی زندگی کے ہر شعبے کے افراد اس نظام کو قبول کرچکے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں ۔ وہاں کی سیاسی جماعتیں ، وہاں کے سول اور فوجی انتظامیہ کے افراد ، وہاں کے اہل قلم اور اہل علم ودانش وہاں کے عدلیہ اور مقننہ ، وہاں کے اساتذہ طالب علم ، دیگر اہم پیشوں سے متعلق افراد گویا سب کے سب اپنے جمہوری نظام کو توڑتے نہیں ہیں بلکہ اسے قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں ایسا رویہ نہ ہو تو جمہوریت قائم

نہیں رہ سکتی ۔ اس پس منظر میں ہمیں غور کرنا چاہئیے کہ جمہوریت کی حمایت میں بلند بانگ نعروں کے باوجود ہمارے ملک میں جمہوری نظام اگر پروان نہیں چڑھ سکا تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اور اس غلطی کی نشاندھی صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم دوسروں پر الزام لگانے سے پہلے خود اپنی خواہشات ، مفادات اور فکر و عمل کا جائزہ لے لیں ۔

قیام پاکستان کے سلسلے میں ہم نے اپنا مقصد یقیناً یہ رکھا تھا کہ مسلم قومیت کے تشخص کی بناء پر اس ملک میں ہم اسلام کا نظام عدل اجتماعی قائم کریں گے لیکن حصول پاکستان کے سلسلے میں ہم نے جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا وہ جمہوریت کا طریقہ تھا ۔ اگر ہم میں سب کے سب واقعی دل سے اس بات کی خواہش مند ہو جائیں کہ ہم پاکستان میں اسلام کا نظام عدل اجتماعی قائم کریں گے تو اس کے لئیے دور حاضر میں بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہم فرد یا کسی گروہ کی آمریت کے وسیلے کے بجائے اسی جمہوری طریقے کو اختیار کریں جسے ہماری تاریخی اصطلاح میں اجماعِ امت کا طریقہ کہا گیا ہے اور جسے معروف جمہوری مفکر روسو نے رائے عامہ یا (GENERAL WILL) کہا ہے ۔ قیام پاکستان کے وقت ہمارے درمیان جو طبقاتی تقسیم قائم تھی اور جس کے مراعات یافتہ طبقے نے اپنے تحفظ کے لئیے کبھی علاقائی اور لسانی تقسیم کی اور کہیں قانون شکنی کے رجحانات کی سرپرستی کی ہے ، یہ ساری تقسیمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قطعاً قابل قبول نہیں ہیں ۔ ہم نے حصول پاکستان کے لئیے جس طرح انگریزوں اور ہندووں کی بالادستی قبول کرنے سے انکار کیا اسی طرح استحکام پاکستان کے لئیے ہمیں اس طبقاتی اور متعصبانہ اندازکی علاقائی اور لسانی تقسیم بھی قبول کرنے سے انکار کرنا چاہئیے کیونکہ ۔

" تمیز بندہ آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں "

---

مشرف احمد

# کرفیو سے پہلے

کرفیو کے علاقے میں جانے والی وہ آخری بس تھی۔

شام کے تین چار بجے سے بسوں میں رش ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ان دنوں میں لوگ کہیں آ جا نہیں رہے تھے اور ہر ایک کو جلد از جلد گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی تھی۔ لہٰذا آخری بس میں اور کرفیو نافذ ہونے کے آخری لمحوں تک صرف بےفکرے یا مجبور لوگ ہی سفر کرتے تھے۔

شہر بھی اُجڑا اُجڑا اور خاموش خاموش لگ رہا تھا ادھر سے آنے والی بس میں خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بس والے کو بھی جلدی ہے۔ کنڈیکٹر عام دنوں میں بس میں رش ہو جانے کے بعد ہر اسٹاپ پہ دیر لگایا کرتے ہیں۔ لیکن اس روز وہ جلدی میں تھا۔ کیونکہ ٹرپ پورا کر کے اسے کرفیو والے علاقے سے واپس آنا تھا۔

وہ بس کی آخری لمبی سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ جس پر ایک ساتھ چھ آدمی بیٹھ سکتے ہیں اور بس کی تیز رفتاری اور کنڈیکٹر کی عجلت کی بنا پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کیونکہ اس کی منزل درمیان میں ہی تھی۔ لوگ عموماً بسوں میں باتیں کرتے ہوئے جاتے ہیں اور بعض مرتبہ تو ایسی پتے کی باتیں بھی سننے میں آتی ہیں جنہیں غائبانہ میں زبانِ خلق خدا کا نام دیا جا سکتا ہے۔

لیکن اب بہت دنوں سے وہ بسوں کے سفر کے دوران یہ محسوس کر رہا تھا کہ لوگ خاموش خاموش ہو گئے ہیں اور کیسی ہی قیامت کیوں نہ گزر جائے وہ خاموش ہی رہتے ہیں۔ ایسی لاتعلقی اور خاموشی میں اسے یوں لگتا تھا جیسے لوگ کوئی چیز چھپا رہے ہیں اور اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے کہ وہ بھی بہت کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ شاید ایسا انہوں نے شعوری طور پر کیا ہو، وہ یہ سمجھنے لگے ہوں کہ ان میں سے ہر آدمی ہر بات جانتا ہے۔

اسٹاپ آیا تو بس کنڈیکٹر نے کھڑے ہوئے مسافروں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا "آجاؤ آجاؤ پیچھے کوئی بس نہیں آنے والی یہ آخری بس ہے۔" چند مسافر بس کے اندر آ گئے۔ کنڈیکٹر نے بآواز بلند ڈرائیور سے گاڑی ذرا دیر روکنے کو کہا اور سیٹ پہ بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر مسافر سے سخت لہجے میں بولا۔

"ابے چل اتر جا۔"

یہ فقرہ سن کر اس نے اور دوسرے کئی مسافروں نے اس جانب دیکھا۔ وہ ایک مفلوک الحال اور پاگل لگ رہا تھا۔ لباس میلا کچیلا اور چہرہ بھی میل اور گندگی سے بھرا ہوا۔ کنڈیکٹر کے فقرے کو سن کر اس نے آں آں کیا اور پھر ہنس کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

ایک مسافر نے کنڈیکٹر سے کہا "بیٹا اسے زبردستی اُتار دے کہیں پھنس پھنسا نہ جائے۔"

یہ سن کر اسے اس پاگل آدمی سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے اپنے برابر والے آدمی سے جس کی گود میں ایک چھوٹی سی بچی سو رہی تھی پوچھا "کیا بات ہے؟" "بے چارہ پاگل ہے، اپنی مرضی سے اتر جائے گا۔" اسے کنڈیکٹر کا یہ سلوک عجیب سا لگا۔ کیونکہ آج تک اس نے کسی کنڈیکٹر کو کسی ایسے مسافر کو اتارتے نہیں دیکھا تھا۔

"بھائی صاحب وہ بھی صحیح کہہ رہا ہے کہیں کرفیو والے علاقے میں جاکر نہ پھنس جائے۔" اس آدمی نے جواب دیا۔

"واقعی عجیب سی بات ہے۔" اس نے سوچا۔ بس کے سب مسافر تو اپنے گھروں کو جا رہے ہیں تھوڑی دیر بعد کرفیو لگ جائے گا، یہ پاگل کہاں جائے گا؟

کرفیو والی بستی کچھ اور نزدیک آگئی تھی۔ کنڈیکٹر دو نئے مسافروں کو ٹکٹ دے کر پائیدان پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگلا اسٹاپ آنے والا تھا اور وہ نئے مسافروں کی تلاش میں بھی تھا۔ پائیدان پر ہی کھڑے کھڑے اس نے ایک مرتبہ پھر اس پاگل کا کالر پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"ابے میرے باپ کہاں جائے گا؟" جواب میں اس کے چہرے پر ایکدم غصے کی لہر پیدا ہوئی۔ پھر وہ آں آں کرنے لگا اور اس کے بعد ہنس دیا۔ گویا غصہ اسے کبھی آیا ہی نہ ہو۔

"یار عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ نہ اترتا ہے نہ بولتا ہے۔ کرفیو میں کہاں چھپے گا؟" کنڈیکٹر نے باآواز بلند اپنے آپ سے کہا۔

"ہاں بھئی ہاں سچ کہہ رہا ہے۔" ایک بڑے میاں بولے

"واقعی فکرمندی کی بات ہے کرفیو میں یہ کہاں رہے گا؟"

"ارے تو بھائی اس کو اتار کیوں نہیں دیتے؟" ایک آواز آئی۔

"بھائی! کنڈیکٹر کب سے کوشش تو کر رہا ہے وہ اترے بھی۔" دوسرا بولا۔

"ابے دو دے پٹ، مار سالے کے کیسے نہیں اترے گا!" ایک تنومند آدمی بولا۔

"ہاں ہاں میاں گولی سے وہ تھپڑ اچھے ہیں۔" پہلے والا آدمی بولا۔

اب کنڈیکٹر نئے مسافروں کو ٹکٹ دینے میں مصروف ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سواریوں کو چڑھاتے اتارتے اور ٹکٹ دینے کے درمیان اس پاگل سے بے خبر ہو جاتا ہے اور جب دوبارہ اندر جھانکتا تو اسے اس پاگل اور کرفیو کا دھیان آجاتا اور وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ اس مرتبہ کنڈیکٹر نے پھر اس پاگل کو مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

"پاگل کو کون مارے گا؟" تو کاہے کو فکرمند ہو رہا ہے۔" ایک شخص بولا۔

"مگر انہیں یہ کون بتائے گا کہ یہ پاگل ہے؟" دوسرے نے گویا دلیل دی۔

اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے آدمی سے جس کی گود میں بچی سو رہی تھی پوچھا "آپ بھی وہاں رہتے ہیں؟"

"جی ۱۹۶۰ء سے رہ رہا ہوں۔" اس وقت نیا نیا علاقہ آباد ہو رہا تھا۔ پہلے میں نے پلاٹ پر قبضہ کیا۔ جھگی ڈالی پھر پکا کرایا۔"

"فساد میں پریشانی تو بہت ہوتی ہوگی، چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ۔" اس نے کہا۔

"ہاں جی ہوتی تو ہے پر اپنے علاقے کی طرف خدا امن رہتا ہے۔ پھر بھی حالات خراب ہوتے ہی بال بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے یہاں چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "مگر سب لوگوں کے رشتے دار تو امن وامان کی جگہ نہیں رہتے۔"

"مگر اب تو تم شاید بچوں کے ساتھ ہی جا رہے ہو۔"

"نہیں جی بس یہ گود کی بچی ہے ضد کرتی ہے یوں لے آیا ہوں۔ باقی سب بچے وہیں ہیں رشتے داروں کے پاس۔"

"تو بھائی اس ایک بچی کو بھی لے کر کیوں جا رہے ہو؟"

"کیا کروں جی مجبوری ہے، تین دن بعد جا رہے ہیں گدھا

سبھی بجھ گیا ہوگا اس کا دانہ گھاس بھی کرنا ہے۔"

اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ دھوبی ہے اور پرائیویٹ ہسپتالوں کے کپڑے اور چادریں تولیے دھوتا ہے۔ اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اگر گھاٹ میں پانی ہوا تو رات بھر کپڑے دھو کر شام تک استری کر کے کرفیو لگنے سے پہلے پہلے گدھا گاڑی پر لادی لے کر نکل لے گا۔

اب کنڈیکٹر دوبارہ اس پاگل کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیٹ سے اٹھا لیا اور دروازے تک لے گیا۔ مگر پاگل نے دل چھاڑنے والے انداز میں رونا شروع کر دیا۔

ایک بڑے میاں نے کنڈیکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اسے پچکارتے ہوئے کہا "بیٹھنے دے بیٹا رہنے دے نہ جانے کس بہروپ میں ہے۔"

"میں تو اس کے بھلے کی کہہ رہا ہوں چاچا" کنڈیکٹر نے کہا۔

"بیٹا تو نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب باقی کی دوسروں پر چھوڑ دے۔" انہی بڑے میاں نے نرم لہجے میں کہا۔

شہر میں اتنا خون بہہ چکا تھا مگر ایک فرد کے بارے میں فکر و تشویش کا یہ انداز اسے عجیب سا لگا۔ اس نے سوچا اس شہر میں کونسی ایسی بستی ہے جہاں لوگ راتوں کو فٹ پاتھوں پر نہیں سوتے۔ کرفیو میں وہ سب لوگ کہاں جاتے ہوں گے؟ شاید اندر کی گلیوں میں رہتے ہوں۔ اسے یہ بات اچھی لگی کہ وہ اتنے مہربان ہیں کہ کرفیو کے باوجود لوگوں کو اندر گلیوں میں گھومنے پھرنے دیتے ہیں۔ لیکن وہ تو پاگل ہے کسی بھی شاہراہ پر نکل سکتا ہے۔ وہ اسے رکنے کا حکم دیں گے اگر وہ نہ رکا تو ....."

اگلے اسٹاپ پر وہ اتر گیا مگر پاگل آدمی بس میں دوسرے مسافروں کے ہمراہ تھا۔ تھوڑی دور جا کر بس نے موڑ کاٹا اور کرفیو والے علاقے میں داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اگر وہ پاگل کسی حادثے کا اتفاقاً شکار ہو بھی گیا تو شاید انہیں معلوم بھی نہ ہو سکے گا کہ وہ تو پاگل تھا۔ مرنے والوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے مگر مرنے والوں کی دماغی کیفیت کے بارے میں تو کچھ تفتیش نہیں ہوتی۔ لاش کے بارے میں تو زیادہ سے زیادہ وارث یا لاوارث کا پتہ چلتا ہے اور کچھ نہیں۔

شاید یہ بھی ایک ایسی ہی خبر ہو جس کے بارے میں کبھی کچھ معلوم نہ ہو سکے گا۔ اس نے سوچا اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

---

شاہ نواز قریشی

# روشنی تیز ہے

میرے شہر کے ماحول میں بڑا ٹھہراؤ ہے۔ فضا میں ایک سکوت سا ہے۔ اسی سکوت اور اسی ٹھہراؤ کے ماحول میں، میں نے زندگی کرنا سیکھا۔ یہیں آنکھیں کھولیں اور خواب دیکھے۔

میرے یہ خواب میری اپنی ہی ذات تک محدود نہیں تھے۔ ان کا تعلق دوسروں سے بھی تھا۔ میرے گرد و پیش سے بھی تھا۔

لوگ کہتے ہیں اس طرح کے خواب دیکھنا ایک فیشن ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ فیشن رہا ہو۔ میں یہ نہیں جانتا کہ میرے خواب اس فیشن کا حصہ تھے یا نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے خواب میرے نہیں ہیں۔ بکھر ضرور گئے ہیں اور یہ بکھراؤ مجھے دس سے پانچ بجے تک کا قیدی بنا گیا ہے اور اب میں اسی قید کے سہارے جی رہا ہوں۔ میں اب بھی اس کوشش میں رہتا ہوں کہ اپنے بکھرے خوابوں کو بچا اور محفوظ کر لوں تاکہ یہ کبھی ٹوٹنے نہ پائیں۔ میں نہیں جانتا میرے خوابوں کی تعبیر کیا ہے؟ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ یہ بکھرے خواب بھی میرا ساتھ نہ چھوڑیں۔

لیکن دوست، تمھارے خواب تمھیں اس شہر سے بہت دور لے گئے ہیں۔

تم نے بھی اسی شہر میں، ٹھہراؤ اور سکوت کے اسی ماحول میں زندگی کرنا سیکھا تھا۔ یہیں آنکھیں کھولی تھیں اور خواب دیکھے تھے۔

تم نے بھی دس سے پانچ تک کی قید کے سہارے برسوں زندگی کی ہے اس شہر میں بھی اور وہاں بھی جہاں تم اب ہو۔

لیکن جہاں تم اب ہو وہاں نہ دن ہوتا ہے نہ رات نہ شام "وہاں تو لینسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے"۔ جہاں تم ہو وہاں سب نے اپنی آنکھوں کو سروں کے خول سے نکال کر جیبوں میں ڈال لیا ہے اور وہاں کیا ہے! کھوے ہیں، کولھے ہیں، پنڈلیاں ہیں، ٹانگیں ہیں اور ..... فائیو اسٹار ہوٹل، نائٹ کلب، آرکسٹرا اور کانوں کو پھاڑ دینے والی چیختی موسیقی اور زمین پہ رینگتے بے حس سمندر۔ عمارتوں کو نگلتی عمارتیں اور ان سب کے بیچ تم نے ایک دن دس سے پانچ تک کی قید سے رہائی حاصل کر لی اور ایک ایسے طویل راستے پر چل پڑے جہاں دور دور تک کوئی شجر سایہ دار نہیں ہے جو تمھیں تیز اور چلچلاتی دھوپ سے بچا سکے۔

خوابوں کا سفر..... ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو تک..... دوسرے اسٹوڈیو سے تیسرے اسٹوڈیو تک، اس طرح یہ سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ تیز اور چلچلاتی دھوپ میں بھی خوابوں پر تھکن نہیں آئی۔ لیکن دیکھو، روشنی اتنی تیز ہے کہ کیمرے اندھے ہو گئے ہیں.....

تم اس بے شجر راستے پر اتنے آگے جا چکے ہو کہ اب لوٹ نہیں سکتے۔

اور نہ تمہیں لوٹنا چاہیئے۔ لیکن تمہیں اپنی آنکھیں محفوظ رکھنا ہیں...... کیا محفوظ رکھ پاؤ گے؟

ہو سکتا ہے کل کی کوئی ساعت تمہیں بھی اپنی آنکھوں کو سر کے خول سے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لینے پر مجبور کر دے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کل کی کوئی ساعت تمہیں اپنے گرد و پیش کے ریتیلے بے حس سمندر کا ایک حصہ بنا دے تو کل کی ان ساعتوں سے خود کو بچا پاؤ گے؟

فائیو اسٹار ہوٹل' نائٹ کلب' آرکسٹرا' کانوں کو پھاڑ دینے والی چیختی موسیقی۔ خوبصورت چہرے' اجلی اجلی چمکتی' رنگا رنگ پوشاکیں' ڈسکو اور دور دور تک گلابوں کے چمن..... کیمرے اندھے ہو گئے ہیں۔ کیمروں کو بینائی دے سکو گے؟

یہ دیکھو میرے گھر کے پاس ایک چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھری میں' ایک سلونی عورت اپنے دو بچوں اور بوڑھی ماں کے ساتھ اپنی آنکھوں میں روشن خواب سجائے جانے کب سے زندگی کر رہی ہے۔ یہ عورت اپنے گرد و پیش سے بے نیاز اپنی کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھی کسی کی راہ تکا کرتی ہے۔ اس کے روشن خوابوں اور اس کے انتظار نے اس کے بدن میں موتی جیسی کشش پیدا کر دی ہے لیکن کوئی کیمرہ اس طرف نہیں دیکھتا۔ کیمرہ ہی کیوں ہم بھی تو اس طرف نہیں دیکھتے۔

اور دیکھو' اس ادھیڑ اور نحیف و لاغر عورت کو' جسے جینے کے لیے چھوٹے برتنوں کا سہارا لینا پڑا۔

یہ خاموش عورت جس کی آنکھیں مجھے ہمیشہ لبریز نظر آئیں۔ میں نہیں جانتا جانے کب سے چھوٹے برتنوں کے سہارے زندگی کر رہی تھی۔

ایک دن بس اتنا جان سکا کہ نسوں میں دوڑتی ندی راستہ بدل کر اس کے منہ سے جاری ہو جاتی ہے اور.....

پھر..... ایک دن نسوں میں دوڑتی ندی بے آب ہو گئی اور اسے چھوٹے برتنوں کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

لیکن اسے بھی نہ کوئی کیمرہ دیکھ سکا' نہ ہم.....

روشنی اتنی تیز ہے کہ کیمروں کے ساتھ ہماری بینائی بھی شاید جاتی رہی ہے۔

یہ روشنی کم ہو جائے تو شاید کیمروں کے ساتھ ہماری بینائی بھی واپس آ جائے؟ کیا یہ روشنی کم کر سکو گے؟

لیکن یہ سب کیسے کر سکو گے؟ بلندیوں سے نیچے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ "آدھا رشِلا" کا کہانی کار کتنی بلندی پر نظر آیا تھا۔ لیکن جب اُسنے آنکھوں کو سر کے خول سے نکال کر جیب میں ڈال لیا تو تمہیں یقیناً یاد ہوگا کہ کشمکش کی جگہ اس کے چہرے پر کیسا ٹھہراؤ اور کیسا اطمینان آگیا تھا۔!!

لیکن "آدھا رشِلا" کا کہانی کار ہوا تم ہو یا میں..... کیا ہم سچ مچ بلندی پر ہیں؟ سچ مچ آدرش وادی ہیں؟.....

پر چاہے کتنی ہی بلندی پر ہوں' کتنا ہی آدرش وادی ہوں۔ یہاں ہوں یا وہاں ـــ سچائی یہ ہے کہ ہم سب کل کی ان ساعتوں کے منتظر ہیں جب ہمیں اپنی آنکھوں کو سر کے خول سے نکال کر جیبوں میں ڈال لینے کا فن آجائے اور پھر ہماری آنکھیں جیبوں ہی میں پڑی رہیں۔

ثاقبہ رحیم الدین

# زندگی یادوں کا ایک سلسلہ

سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

یوں لگتا ہے کہ یادوں کی دنیا کا بھی کچھ یہی حال ہے یادیں جب تک سینوں میں دھڑکتی رہیں، سانس لیتی رہیں اور راتوں میں آنکھوں کی پلکوں پر جاگتی رہیں تو سمٹے ہوئے کنول کے پھول کی طرح ہوتی ہیں۔ اس کنول کی خوشبو پانی کی سبک لہروں کے ذریعے بس آس پاس ہی رہتی ہے۔ اگر کبھی یہ خوشبو آنکھوں سے رنگ اور ہونٹوں سے بول بن کر اُبھرے تو پھر رکتی نہیں پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ یادوں کی یہ خوشبو زمانہ میں بدل جاتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فن کی انتہا انسان کی سوئی ہوئی یادوں کو جگاتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آرٹ کی تخلیق کے سوتے دل کی گہرائیوں سے پھوٹا کرتے ہیں اور دل ہی تو وہ مسکن ہے جہاں انسان کی سچی محبتیں اور یادیں آبادیاں بساتی ہیں۔ ہمارا ہر گزرا ہوا دن ایک یاد ہے۔ وہ آج جو ابھی بیت رہا ہے، کل ایک یاد میں بدل جائے گا۔ اسی طرح مستقبل کے ہر آنے والے شب و روز یادوں کی محفل سجاتے چلے جائیں گے یہ تو ہم انسانوں کی بھول ہے جو اتنا نہیں جان پاتے کہ ماضی، حال اور مستقبل، ادلتی بدلتی صرف یادوں کی کڑیاں ہیں یادوں کی مسلسل کڑیاں ہماری کل زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

یادوں کی ان مسلسل کڑیوں کی داستان بھی بڑی عجیب ہے۔ جب انسان کے پاس کامیابیوں اور مسرتوں کے ڈھیر ہوتے ہیں تو وہ گمان کرنے لگتا ہے کہ اس نے ان کڑیوں کو توڑ دیا ہے۔ وقت تھم گیا ہے۔ لمحے امر ہو گئے ہیں۔ یہی وہ دھندا اور فریب ہے جس کی بدولت انسان ڈگمگا جاتا ہے اگر ہماری نگاہوں میں بیتی یادوں کی پرچھائیں رہے اور ہم زندگی کی گزری ہوئی راہ کا ہر نشان محفوظ رکھیں تو ہمارے دلوں پر تاریکی کبھی نہ چھائے۔ جس طرح خوشیوں کی سرشاری انسان کو بے خوف کر دیتی ہے، بالکل اسی طرح دکھوں کی آنچ جلا کر بے جان کر دیتی ہے۔ پھر دکھی انسان اس سوچ میں گم ہو جاتا ہے کہ یہ پل اور یہ لمحہ کبھی نہ بیت سکے گا۔ گویا یہ

سماں ختم کر رہ جائے گا۔ یہی غم کے اندھیرے کا پہلا وار ہے جو انسان کے دل و دماغ پر کبھی چوٹ اور کبھی زخم ڈالتا ہے۔ بہرکیف دکھ ہو یا سکھ سب بیت جاتا ہے جیسے کہ زندگی گزرتی رہتی ہے اور یادوں کا کارواں ہر لمحہ ہر آن رواں دواں رہتا ہے۔

جب یادوں کا ذکر چلے تو اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ماضی پرستی کی علامت ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یادوں کو دہرانے رہنا۔ انسان کے شکست و زوال کی داستان کی طرح ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یادوں کی کائنات بڑی وسیع ہے یہ ہماری زندگی کے کینوس سے بڑی ہے۔ یادوں کی دنیا تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔ روشن و تابناک بھی ہے اور تاریک و درد انگیز بھی۔ لہٰذا یادوں کا ذکر بذاتِ خود نہ ماضی پرستی ہے۔ اور نہ حال سے فرار کی علامت۔ یادیں تو انسانی حیات کا لامتناہی سلسلہ ہیں۔ یاد قافلہ زیست کے ساتھ چلنے والی بادِ صبا ہے۔ جس طرح درخت کی پہچان اس کے بیج پر بڑی حد تک منحصر ہے اس طرح یادیں ہمارے ہر زمانے کی بنیادیں ہیں۔ ہم انسانوں کے وجود کا خمیر یادوں سے گندھا ہے۔

اگر ہم یادوں کی روشنی کی صرف ایک کرن کی بات کریں تو یہ نکتہ منور ہو جاتا ہے کہ ہماری شخصیت کی جلا اور ارمانوں کی دنیا یادوں کے سہارے زندہ ہے۔ وہ حال جو گزر رہا ہے ہمارے لیے قابلِ قدر اس لیے ہے کہ ہمیں یاد ہے کہ ہماری تمنائیں کیا تھیں۔ کون سی آرزوئیں ہمارے دلوں کا مرکز تھیں۔ ہمارے کیا شوق تھے اور ہماری کیسی حسرتیں تھیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ حال ماضی سے کٹ کر رہ گیا ہو۔

مادی اور دنیاوی لحاظ سے شاید کبھی حال اپنے ماضی سے کچھ مختلف ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں زمانوں میں، انسان کے جذبات اور دل کی نگری ویسی کی ویسی آباد رہتی ہے ہم شاذ و نادر حال کو ماضی کی اگلی سیڑھی قرار دے دیتے ہیں یا حال کو ماضی کے درخت کی زیادہ پھیلی ہوئی ٹہنی کہہ دیتے ہیں وقت چاہے کتنا ہی بدل جائے، یادیں، ہم سب کی جڑیں اور اصل زمین ہیں۔

یہ ہنگامہ پرور شب و روز، یہ تیز رفتار زمانہ اور یہ ترقی کے لیے جہدِ مسلسل، سب سورج کے ڈھلتے ہی ایک یادمیں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شام ہوئی اور دن ڈھلا تو دن بھر کے کام اور باتیں، بھولی بسری یادیں بن کر رہ گئے۔ جس طرح آسمان کی سیاہی کے ساتھ ساتھ، اپنے رین بسیرے کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں بھی زمین کے چراغوں کے مدھم ہوتے ہی یادوں کی بستی روشن ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ خواب جاگ اٹھتے ہیں اور ہماری تھکن کو سلا دیتے ہیں۔ دن بھر کی ہل چل اور فکریں بھی ہمیشہ کے لیے یادوں کو اوجھل نہیں کر پاتی ہیں۔ خاص کر تنہا اور خاموش گزرتا ہوا وقت تو پورے کا پورا یادوں کے دامن میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ یادوں کے طویل سفر میں ہمارے جیون کی کل کہانی چھپی ہوئی ہے۔ انسان کی ابتدا اپنے خالق و محبوب کی یاد میں رو رو کر ہوئی۔ انسان جدائی میں شدتِ محبت کے تحت آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اتنا رو یا کہ سارے نشیب لبالب سمندر بن گئے۔ اور ویران میدان جل تھل میدان سے گھنے جنگل ہو گئے۔ گرچہ اب انسان

کا ذہن اور شعور بیدار ہو کر مسلسل جاگ رہا ہے اور وہ نئی خواہشوں اور مقاصد کے چمکتے تاروں میں الجھا رہا ہے، مگر اس کی روح یادوں کے بے شمار انبار تلے دبی ہے۔ انسان کے لیے اپنے پیارے اور اپنے محبوب کی یاد تو متاعِ حیات ہے اور کل زندگانی کا رس ہے آخر اسے خود بھی تو ایک دن مٹی میں مٹی ہو کر ایک یاد میں ڈھلنا ہے۔ ہر ایک کی انتہا اور ابتدا محض ایک یاد ہے۔

نا جانے کیوں زندگی کی چاہتوں اور محبتوں کی بات چلے تو دور دور تک صحرا نگاہوں میں پھر جاتا ہے۔ اپنوں کے بخشے ہوئے زخموں میں وہ ٹیسیں اٹھتی ہیں کہ گہرے ناسور بن جاتے ہیں پھر یادوں کے ناسور کبھی کبھار کھرنڈ سا آجاتا ہے اور کبھی یہ رسنے لگتا ہے۔ واقعی ناسور کبھی نہیں بھرا کرتے مگر خدا جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ یہ زندگی کو نئی اور روشن سمت اور سوچ کو اجالا دیتے رہتے ہیں۔ اس بات میں سچائی ہے کہ انسانوں سے عشق اور لگاؤ نہ ابدی ہوتا ہے اور نہ لازوال۔ جیسے یہ دن رات آتی جاتی ہے چاہتیں اور مروتیں بھی چڑھتی، ڈھلتی اور گھلتی رہتی ہیں۔ ہماری وہ محبت جو ہماری زندگی کی ضامن ہوتی ہے، وقت کے دھارے میں ذرہ ذرہ کر کے ٹوٹتی اور بکھرتی ہے محبت کبھی اپنے مرکز کو بدلتی اور کبھی رخ کو موڑتی رہتی ہے۔ محبت تقاضوں اور مصلحتوں کے ایندھن میں تپتی اور ایک یاد بن کر جیتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ محبت کی محرومیاں انسان میں بلا کی شدتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ جب وہ کسی کو چاہتا ہے تو اس حد تک چاہتا ہے کہ خود ٹوٹ کر مٹتا ہے۔ اگر وہ کسی سے نفرت کرتا ہے تو اس طرح سے کرتا ہے کہ خود کو اور محبوب کے وجود کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ ابتدائی زندگی کی ویرانیاں اور خالی پن انسان کی شخصیت کو خام اور نامکمل رہنے دیتے ہیں۔ ہماری ذہنی دنیا کی بے ساختگی اور انتہائی جذباتی کیفیات اکثر و بیشتر ہماری ناکامیوں کا باعث بنتی ہیں۔ اگر اس زندگی کے گزرتے شب و روز میں، یادوں کے انگارے جلتے رہیں تو بڑا ہی اچھا ہو بس یوں ہو کہ نہ یادوں کے انگارے تیز ہوا سے بھڑک اٹھیں اور نہ یادوں کو رات کی اوس بجھا کر ٹھنڈا کر دے، یادیں صرف دھیمے دھیمے سلگتی رہیں۔ پھر انسان نہ کسی خوشی سے ناچ اٹھتا ہے اور نہ کسی دکھ کے بوجھ سے گھائل ہو کر زمین میں دھنس جاتا ہے وہ یادوں کی سلگتی آنچ کے قریب بیٹھا، ایک مسکراہٹ و امید کے ساتھ، زندگی کے بہتے پانی کو دیکھتا رہتا ہے۔

یادیں تو ہوا کی لہریں ہیں جنھیں نہ کسی نے دیکھا، نہ تھاما اور نہ چھوا ہے۔ میرے ہر طرف یادیں بکھری ہیں مگر کچھ نہیں معلوم کہ کہاں کہاں سے اور کیسے آئی ہیں۔ ہوا کی لہروں کو دیکھنا ہو تو صحرا کی ریت پر نقش دیکھو، سمندر کی موجوں کا رقص دیکھو، تاروں کی جھلملاہٹ دیکھو اور پیڑوں کا جھومنا دیکھو۔ آخر یہ ہوا ہی تو ہے جو سب کو مست کر رہی ہے یادوں سے ان کا جذب و مستی کا عالم کوئی بھلا چھین تھوڑی سکتا ہے۔

ازل سے دل انسان کی ساری کائنات ہے۔ یہی کائنات ہمیشہ سے جلوے دکھا رہی ہے۔ اگر دل میں یادوں کے لیے رہنے کی جگہ تنگ ہوتی چلی جائے تو یہ آہوں میں بدل

جاتی ہیں۔ آہیں جب سرد مہر اور بے تعلق آسماں سے ٹکرا کر پسیجتی ہیں تو بوند بوند آنسو بن جاتی ہیں۔ کبھی یہ آنسو صرف پلکوں کو نم کرتے ہیں، کبھی ٹپاٹپ موتی بوندوں کی طرح برستے ہیں اور کبھی خون بہاتی ندیوں کی طرح سیلاب بن جاتے ہیں۔ بہرکیف ہر طرف یادوں کے کھیل ہیں، چاہے من کے سارے دریچے کھول کر دیکھو یا آدھ کھلی آنکھوں سے سوچو۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رب جمیل نہ صرف چھپا ہوا حسین خزانہ تھا بلکہ اس کائنات سے پہلے اور ازل سے بھی پہلے بے حد وحساب یادوں کی دولت لیے بیٹھا تھا۔ فیاض مولیٰ نے سوچا کہ دولت لٹا دی جائے۔ شاید یادوں کا کھیل اسی سے شروع ہوا۔ اور پھر کس کس طور سے چلتا رہا، کچھ نہیں معلوم جب کہ ہم سب اور جس کا ازل و ابد صرف وہی سب کچھ جانے۔

میں جدھر بھی دیکھوں تو یادوں کے ڈھیر ہیں گٹھڑیاں ہیں، کچھ بندھی ہوئی، کچھ کھلی ہوئی اور کچھ ٹوٹی پھوٹی۔ کہیں عمر رفتہ کی باتیں قطرہ قطرہ بن کر ایک پیالے میں جمع ہو گئی ہیں، کہیں حسرتیں گرمیوں کے حبس میں سست رفتار نالے کے مانند رینگ رہی ہے۔ کہیں بیتے زمانوں کے ارمان پل بھر کو پہاڑی چشموں کا سا شور مچا دیتے ہیں۔ آخر میں ساری یادیں مل ملا کر خاموش سناٹا طاری کر دیتی ہیں جیسے گہری رات میں سمندر سائیں سائیں کرتا ہے۔ مجھے خبر نہیں کہ میں نے اس سمندر میں کیا کھویا کیا پایا۔ اب یہ آگے کو امڈتا اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جس لمحہ سمندر کے کنارے ٹوٹے تو سانس کے بادبان بھی ڈوبے۔ مگر کون جانے کہ کب۔ اللہ جی کا بڑا احسان ہے کہ میری انمول تنہائیاں اور گہری یادیں ایسے خزانے ہیں جو دل اور آنکھ کو یوں بھر دیتے ہیں کہ کسی بات کی فکر نہیں رہتی، کسی غم کا سایہ نہیں پڑتا، کوئی تمنا سوئی نہیں چبھاتی، بس دنیا سے جی بھر جاتا ہے۔ چار سو سکھ ہی سکھ اور چین ہی چین۔ اور پھر عجیب خوشبو کے جھونکوں سے میرا وجود کھل اٹھتا ہے۔ فضا بس جاتی ہے۔

خاص کر جب زندگی کی سہ پہر ہو چلی ہو تو ہمیں آنے والے ایک لمحے کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ نہ اب ہماری زندگی میں سویرے کے سمے کا نور اترے گا اور نہ دوپہر کے سورج کی چمک اور تپش پھیلے گی۔ یہ تو بھلی سی شام بھی نہیں کہ شفق سے بادل گلابی ہو جاتے اور ایک تارا جھلک دکھلاتا۔ یہ تو زندگی کی چپ چاپ سہ پہر ہے جو کچھ گدلی اور کچھ دھندلی ہے۔ درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں، پرندے سوچ میں پڑے ہیں اور ہر طرف بڑا سناٹا ہے۔ ہم ہاتھوں میں یادوں کا کشکول تھامے کھڑے ہیں۔ ابھی یہ کشکول شاید منہ تک بھرا نہیں ہے۔ ہمیں تو ہمیشہ ہر بات کی جلدی رہتی ہے، ہم تو اسے کبھی کا انڈیل کر چل دیتے۔ پھر اس کے ٹکڑوں سے اور بہت سے کشکول بن جاتے جن میں سرے سے انسانی دلوں کی محبتوں، حسرتوں اور تنہائیوں کی یادیں گھل مل ہوتیں۔ سچ ہے کہ ہمارے جینے کا سفر تھوڑا اور تنہا اور یادوں کا سلسلہ طویل اور طویل تر ہے۔

---



ایم - ایم - حسن

# وی آئی پی

کسی سیانے نے کہا تھا کہ بعض لوگ پیدائشی بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ بعض اپنی محنت سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن پر بڑائی ٹھونسی جاتی ہے۔ موجودہ مادّی دور میں نظریۂ ضرورت کے تحت اس قول میں اضافہ کی شکل میں ایک ترمیم ضروری ہوگئی ہے۔ آپ جیسا کہ جانتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب ہر انسان بغیر کسی خوبی کے راتوں رات بڑا آدمی بننا چاہے تو اس کی اس ضرورت کی تکمیل کے لئے رشوت ایجاد ہوئی ہے جو بڑائی کا چوتھا سرچشمہ ہے۔

پیدائشی بڑے آدمی وہ لوگ نہیں ہوتے جو پیدائش کے وقت بڑے تھے ورنہ اپنا عالم چنّا دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہوتا۔ پیدائشی بڑے آدمیوں سے ہمارے ہاں راجہ، نواب، میر، پیر قسم کے انسان مراد لئے جاتے ہیں، جو بڑی منّت مرادوں کے بعد اس جہان میں آتے ہیں۔ یہ لوگ بغیر ہاتھ پاؤں مارے اپنی خاندانی روایات کے بل پر بڑے آدمیوں کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔

محنت سے عظمت حاصل کرنے والوں میں ایک طرف تو سائنسدان، ادیب، علما وغیرہ ہیں جو اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں تو دوسری طرف صنعت کار و تاجر ہیں جو اپنا دین و دنیا جدا کرتے ہیں۔

وہ حضرات جنہیں چھپّر پھاڑ کر بڑائی نصیب ہوتی ہے ایسے معصوم لوگ ہوتے ہیں جن کا بڑائی کے اکتساب میں خود کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ کسی اور بزرگ و برتر شخصیت کے حسن انتخاب کا شاہکار ہوتے ہیں۔ یہ بالکل چاند کے مانند ہوتے ہیں جو سورج کے عطا کئے ہوئے نور کا منّت پذیر ہے۔ یہ چمک دمک انہیں کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے دی جاتی ہے اور جب وہ سورج چاہتا ہے اسے گہنا دیتا ہے۔

جہاں تک کہ بڑائی کی اضافی صنف کا تعلق ہے تو جیسا کہ عرض کیا گیا تھا کہ یہ تائیدِ غیبی کا ثمر ہے۔ دستِ غیب اپنی کارفرمائیاں دکھاتا ہے۔ اس عظمت کے اجزاء ترکیبی دولت اور انتخاب ہیں۔ خواہ وہ دولت چوری، ڈکیتی یا اسمگلنگ کے ذریعہ حاصل کی گئی ہو۔ اس کے بے دریغ استعمال سے انتخاب عمل میں آتا ہے اور امیدوار کو منتخب روزگار بنا کر آئندہ فکرِ روزگار سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ان بیان کردہ مختلف راہوں سے بڑائی تو نصیب ہو جاتی ہے مگر وی۔ آئی۔ پی بننا ہر بڑے آدمی کا مقدر نہیں ہوتا ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

وی۔ آئی۔ پی کی اکثریت ایک چور دروازے سے داخل ہوتی ہے اور یہ کسی لحاظ سے بڑے آدمی نہیں ہوتے گو لحاظ میں لوگ بڑا آدمی کہہ دیتے ہیں۔ ان برگزیدہ ہستیوں کو اچھے وقتوں میں افسر شاہی اور بُرے وقتوں میں نوکر شاہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس مخلوق کے چند خصوصی کوائف مندرجہ ذیل ہیں۔

**مسکن :-** یہ عام طور سے اسلام آباد میں پائے جاتے ہیں۔ دو چار کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں مگر یہ بھی بالآخر اسلام آباد کا رخ کرتے ہیں کیونکہ وہی مقام ان کا آخری ٹھکانا ہے۔ ان میں آپس میں بڑا اتفاق پایا جاتا ہے۔ ہر وقت ایک دوسرے کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔ غیروں سے میل جول زیادہ پسند نہیں کرتے۔ یہ سیاسی گھٹن کی فضا میں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ آمریت کا دوران کو بے حد راس آتا ہے مگر جمہوریت کے ماحول میں جہاں احتساب کا تصور ہو یہ پروان نہیں چڑھتے۔

**ازدواجی زندگی :-** ان کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار ہوتی ہے چونکہ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہوتی اور تمام اہم امور میں فیصلہ شریک حیات بلا شرکت غیرے خود فرماتی ہیں۔ انگریزی کی ایک کہاوت ہے کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ ہمارے ان وی۔ آئی۔ پی حضرات پر بھی یہ قول صادق آتا ہے مگر یہاں یہ عورت پیچھے نہیں ہوتی بلکہ ہر وقت ان کی گردن پر سوار ہوتی ہے شاید ان کے متعلق ہی کسی شاعر نے کہا تھا کہ

مرد بیچارے پے عورت ہے سوار

**حُلیہ :-** گنجی چاند، ماتھے پر بل، کان پر عینک، ناک چڑھی ہوئی، منہ میں پائپ، گردن اکڑی ہوئی، پیٹ بڑھا ہوا۔ ان کے ماتھے پر بل دیکھ کر مشتاق یوسفی کا ایک کریکٹر یاد آتا ہے جو رات کو سوتے وقت بھی ماتھے پر بل ڈال لیتا تھا تاکہ صبح کے وقت غصہ کرنے میں سہولت ہو۔ یہ تیور صرف ماتحتوں اور پبلک کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔

**لباس :-** انگریزی لباس پسند ہے۔ محض مجبوری کی حالت میں قومی لباس زیب تن کرتے ہیں۔

**زبان :-** بدزبانی . . .
. . . . .

**مرغوب غذا :-** مال حرام

**عادات و اطوار :-** وی۔ آئی۔ پی بذاتِ خود وی۔ آئی۔ پی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اہل و عیال بھی یہ استحقاق رکھتے ہیں اور یہ رتبہ خواہ حضر ہو یا سفر سدا قائم رہتا ہے ہر محفل میں یہ اگلی نشستوں کے دعویدار ہوتے ہیں۔ اگر کہیں بھول چوک ہو جائے تو منتظمین کی شامت آجاتی ہے۔

وی۔ آئی۔ پی اپنے آپ کو تمام قاعدے قوانین سے بالا سمجھتا ہے۔ وہ جہاں چاہے اپنی کار کھڑی کر سکتا ہے۔ وہ ٹریفک کی لال بتی کو بھی کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر کوئی سر پھرا پولیس والا اس کا چالان کرنے کی جرأت کرے تو الٹی اس کی نوکری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ایئرپورٹ پر یا دیگر ممنوعہ علاقوں میں اس سے شناختی کارڈ طلب کرتا ہے تو وہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اسی قسم کے ایک وی۔ آئی۔ پی کسی بگڑے دل پرائیویٹ ڈاکٹر کے مطب جا پہنچے۔ مطب کے باہر کثیر تعداد میں مریض انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے اپنی باری کے منتظر تھے۔ وی۔ آئی۔ پی کے لئے تو عام مریضوں کی طرح انتظار کرنا کسر شان تھا انہوں نے اپنے عہدے کے زعم میں فوری ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر اس مرد قلندر نے کہلوا بھیجا کہ چونکہ وہ وی۔ آئی۔ پی ہیں اس لئے بجائے ایک کرسی کے دو کرسیوں پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کریں۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ بعد میں اس ڈاکٹر کا کیا حشر ہوا۔ خود غرضی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس

کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ع

وہ اپنے ہی اپنوں کے کام آنے والا

بلا مطلب کے ایک گلاس پانی پلانے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔

**پانی :۔** جائیداد بنانا

**پسندیدہ کھیل :۔** توڑ جوڑ

**پسندیدہ موسیقی :۔** راگ خوشامدی

**خوبیاں :۔** ویسے تو حصولِ اقتدار کے ساتھ ہی ان کی ذات تمام خوبیوں کا مجموعہ بن جاتی ہے مگر لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی جو انہیں قدرت نے ودیعت کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعبدہ باز ہر حکومت کو خواہ وہ ان کی کتنی ہی مخالف ہو چشم زدن میں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی مراعات میں کمی ہوئی۔ ان اپنے جھنڈے گاڑنے والوں کے جھنڈے چھن گئے، بڑی گاڑیاں جاتی رہیں، کوٹ پتلون اُتروا دیئے گئے مگر ان عقاب صفت انسانوں کے پائے ثبات کو مطلق لغزش نہیں ہوئی یہ پُریقین سوچتے رہے۔ ع

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

اور واقعی ایسا ہوا بادِ مخالف کے جھونکے کبھی ان کی اڑان پر اثر انداز نہیں ہوئے اور وہ اونچی سے اونچی تر ہوتی چلی گئی۔

انہیں عقاب سے تشبیہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اپنے تحفظ مفادات کے لئے عقابی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی دور رس نگاہ پیشگی ہی ذاتی نفع ونقصان کا اندازہ لگا لیتی ہے اور یہ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔

یہ لوگ ہر فن مولا ہوتے ہیں۔ اگر شعر وادب کا دور دورہ ہے تو ان سے بڑا شاعر اور مضمون نگار ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ یہی ادبی محفلوں کی مسندِ صدارت پر ہر طرف رونق افروز نظر آتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام اور دوسری تصانیف کی تقاریب رونمائی قابل دید ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں ان کے عہدے کے طفیل اتنی مقبول ہوتی ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ چھ ایڈیشن چھپنے تک نوبت پہنچتی ہے۔ سیرت کے جلسوں میں بھی یہی لوگ پیش پیش نظر آتے ہیں اور سیرتؐ مبارکہ پر وہ دھواں دھار تقریر کرتے ہیں کہ حاضرین عش عش کر اٹھتے ہیں۔ ان کے تقوے اور پاکبازی کا چرچا ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ نماز کی امامت ان کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

دوسری طرف جب مجرا کلچرل شو کے روپ میں مشرف بااسلام ہو جاتا ہے تو وہاں بھی میر مجلس آپ انہی ذات شریف کو پائیں گے۔

اگر سربراہِ مملکت یا وزیر اعظم شکار کا شوقین ہوتا ہے تو موصوف بھی اللہ کا نام لے کر بندوق اُٹھا لیتے ہیں۔ ہمت مرداں مددِ خُدا۔ نشانے کی خرابی ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ منتظمین دلجوئی کا پورا بندوبست رکھتے ہیں۔

کھیل کی دنیا میں بھی یہ صاحب کمال حضرات اپنا سکّہ بٹھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کرکٹ ہو یا ہاکی، فٹ بال کا میدان ہو یا ٹینس کورٹ ہر جگہ انہی کا عمل دخل ہوتا ہے گو کہ یہ ان کھیلوں کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ اگر حسنِ اتفاق سے ٹیم جیت جاتی ہے تو یہ ان کے حسنِ انتظام اور حسنِ انتخاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں دوسرے قصوروار ہوتے ہیں۔

**خامیاں :۔** ان مُقربین بارگاہ کی خامیاں ریٹائرمنٹ کے بعد ظاہر ہونا شروع ہوتی ہیں جب کُرسی چھن جاتی ہے۔ ان کے جیون کا سب سے بڑا روگ ریٹائرمنٹ کی گھڑی ہے۔ اس کے قرب کے تصوّر سے ہی ان کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اگر

کسی طرح اس گھر میں کوشاں نا ممکن ہو تو اس کی خاطر یہ اپنا سب کچھ تج دے سکتے ہیں کیونکہ مرا ہاتھی تو پھر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے مگر یہ سفید ہاتھی تو زوالِ اقتدار کے بعد دو کوڑی کے بھی نہیں رہتے۔

ماہرینِ لسانیات نے تحقیق و تدقیق کے بعد اس وی آئی پی دنیا کی ایک لغت مرتب کی ہے جس کی چند جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں۔

**باس**:- بیوی۔

**ڈیڈی**:- خسر۔

**ممی**:- خوشدامن۔

**بابا لوگ**:- نٹ کھٹ بچے۔

**اسکول**:- وہ انگلش میڈیم ادارہ جہاں گراں فیس کے عوض تعلیم و تربیت کے سوا ہر چیز سکھائی جاتی ہے۔

**علی الصباح**:- دن کے دس بجے کا وقت۔

**وقت کی پابندی**:- مقررہ وقت سے کم از کم ایک گھنٹہ تاخیر۔

**ہوا خوری**:- پالتو کتے کو ٹہلانا۔

**احباب**:- وہ حضرات جن سے کوئی مادی فائدہ حاصل کرنے کی توقع ہو۔

**احمق**:- دیانت دار رفیقِ کار۔

**ضروری میٹنگ**:- احباب کے ساتھ بند کمرے میں چائے کا دور۔

**مری کی میٹنگ**:- بیوی بچوں کے ہمراہ گرمیوں میں پکنک منانا یا جاڑوں میں برف باری کا منظر دیکھنا۔

**پشاور کا دورہ**:- بیگم کو شاپنگ کے لئے باڑہ مارکیٹ لے جانا۔

**عمرہ**:- بیٹی کے جہیز کی تیاری کے لئے جدہ کا سفر۔

**لندن کانفرنس**:- پاکستان اور انگلستان کی ٹیموں کے درمیان کرکٹ ٹیسٹ میچ دیکھنے کا صحیح طریقہ۔

**فائل**:- ردی کا پلندا۔

**تضیعِ اوقات**:- دفتر کا کام کاج۔

**عدیم الفرصت**:- ذاتی کام میں مشغولیت۔

**جیب خرچ**:- تنخواہ۔

**جھونپڑا**:- دس کمروں کا ذاتی مکان۔

**جنت کا پروانہ**:- گرین کارڈ۔

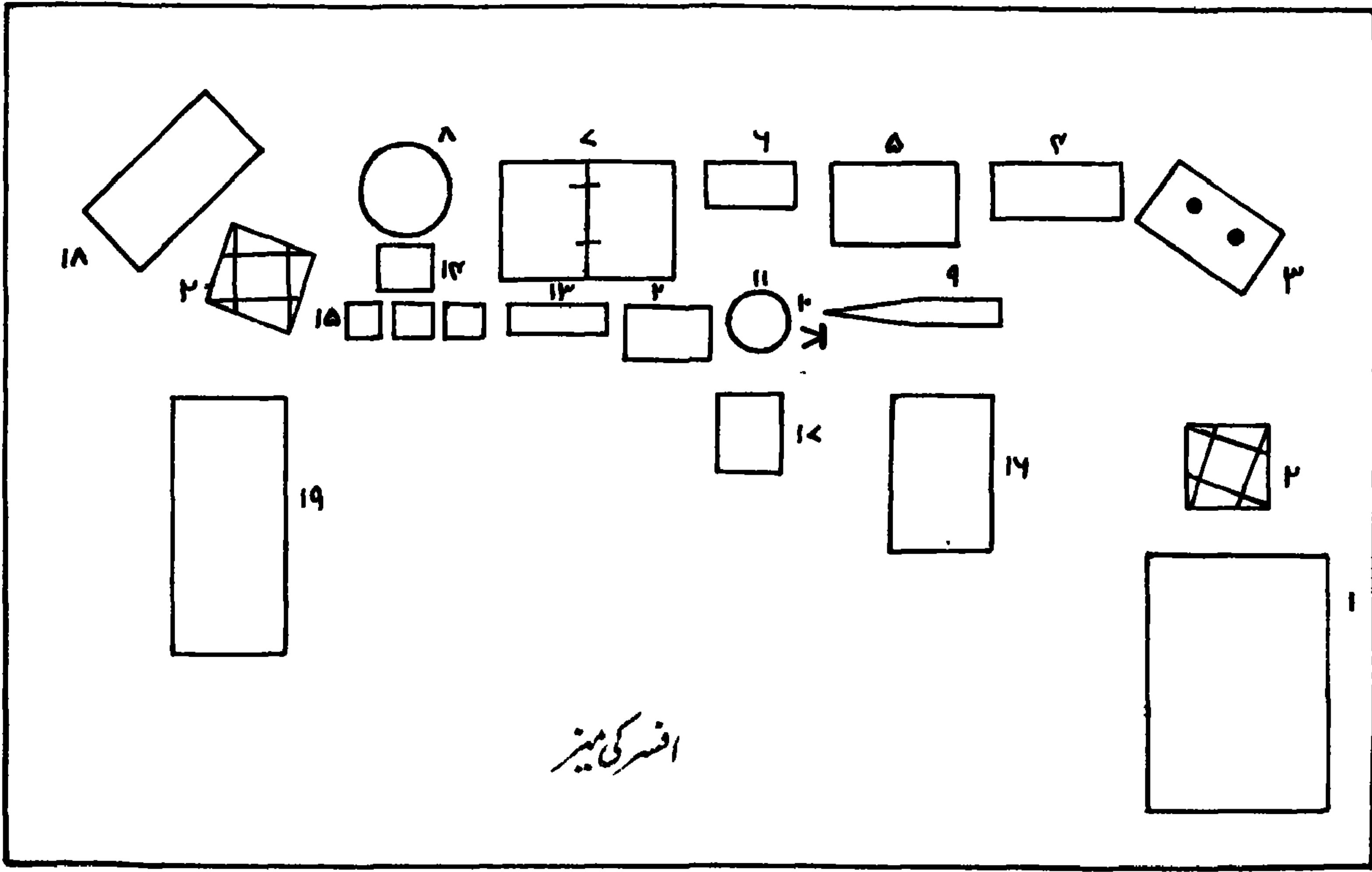
**مسائل**:- بغیر کسی سفارش کے ملاقات کا خواستگار۔

الغرض یہ اصحابِ کیف اقتدار کے کیف و مستی میں چور بڑی پُر اسرار شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں کسی نے یہ سچ کہا ہے کہ ؎

یہ افسر یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
یہ پُر اسراریت میں تو شل کو اکب کے ہوتے ہیں
ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

اور ذوقِ خدائی اس بلا کا رکھتے ہیں کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو اپنے حضور سر بسجود دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

---



۱۸
۲۰
۸
۱۲
۱۵
۱۳
۷
۲
۶
۱۱
۱۰
۵
۹
۴
۳
۱۹
۱۷
۱۶
۲
۱
افسر کی میز

## میز کا صفحہ

ابن نیاز

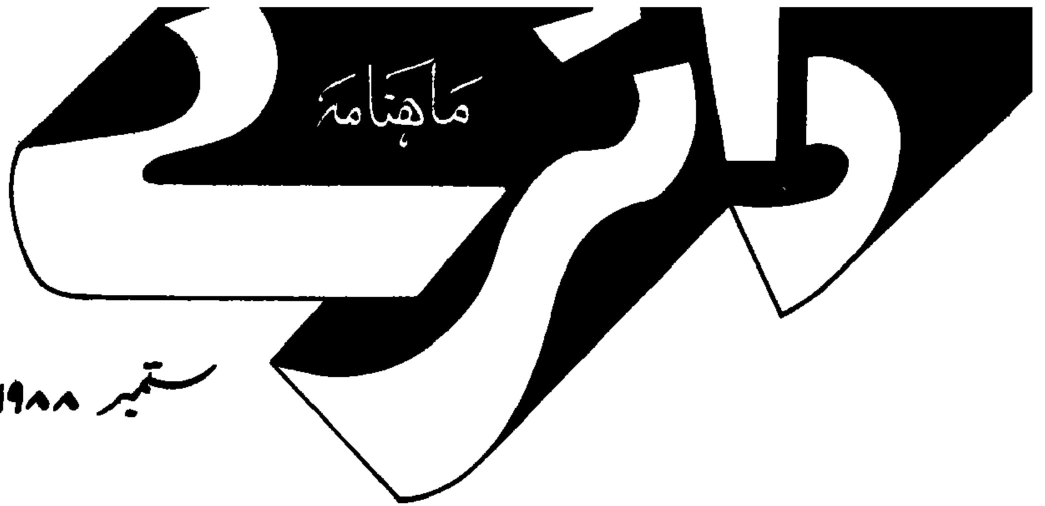
یہ تو لغت کے ماہرین ہی بہتر جانتے ہوں گے کہ اردو کا لفظ افسر فارسی کے "افسر" سے نکلا ہے کہ انگریزی کے "آفیسر" سے۔ مگر اس لفظ کی ابتدا سے قطع نظر جو حقیقت مسلّمہ ہے وہ یہ کہ افسر کو بہر حال شان و شوکت سے مزین ہونا چاہیئے۔

آج کل بادشاہوں کے افسر تو ناپید ہو گئے ہیں مگر اس کمی کے ساتھ ساتھ دوسری قسم کے افسروں میں اسی قدر سے اضافہ ہوا ہے۔ افسروں کے سلسلے میں ایک اور نمایاں تبدیلی بھی واقع ہوئی ہے اور وہ یہ کہ مہنگائی کے اس دور میں "افسر" کی آرائش کے لئے جب ہیرے جواہرات دستیاب نہیں ہیں تو مجبوراً سامان آرائش میں بھی تبدیلی ہو گئی ہے۔

ہمارے ایک دوست نے جو مرکز کی اعلیٰ ملازمتوں کی دوسری سیڑھی پر کھڑے ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں اپنے سامنے رکھی ہوئی مسند سرکار (جسے عرف عام میں میز کہتے ہیں) کو مختلف انواع واقسام کی متفرقات سے سجایا ہوا ہے (ہمارے ایک اور دوست نے میز کے لئے انگریزی لفظ ٹیبل کی مناسبت سے ان متفرقات کو میزی ظروف یا TABLEWARE قرار دیا ہے) ان تمام اشیاء کو اپنے سامنے جمع کر کے اس اعلیٰ مرکزی ملازم صاحب نے مرکز کے ادنیٰ ملازمین کی مشکل آسان کر دی ہے۔ اب ماتحتوں کو نہ تو خط چاک کرنے کا آلہ رکھنے کی ضرورت ہے نہ ہی کاغذات کو آہنی تار میں منسلک کرنے والے آلے کی۔ یہ صاحب اپنا کام خود کرنے کی اعلیٰ روایت برقرار رکھتے ہوئے کاغذات میں مثل بندی کے لئے سوراخ بھی خود کر لیتے ہیں اور ان کو خود چسپاں ہونے والے فیتے سے جوڑ بھی لیتے ہیں۔ مگر اہم بات تو یہ ہے کہ وہ مال عرب پیش عرب کی مثل کے مطابق تمام سامان اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ان شاید صاحب نے یہ ضرورت اس لئے بھی محسوس کی ہو کہ یوں وہ اپنے دیوان خاص میں آنے والے تمام لوگوں کو بغیر زبان ہلائے یہ باور کرا دیتے ہیں کہ میرے پاس دفتری ضروریات کی تمام اشیاء موجود ہیں پہلی نظر میں اس سارے عمل میں ایک قباحت محسوس ہو کر لوگ کمرے میں داخل ہو کر افسر سے زیادہ ان کی میز پر نگاہیں مرکوز کر لیتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ بڑا افسر اپنی میز کی شان سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ بھی اس میز کی آرائش اور ان اشیا کی فہرست ملاحظہ کریں۔

---

۱۔ سرکاری مثل
۲۔ راکھ دان (ایش ٹرے)
۳۔ قلم دان
۴۔ میزی جنتری (کیلنڈر)
۵۔ مغربی بیڑی دان (سگرٹ کیس)
۶۔ کاغذاتی پرچی دان (سلپ ہولڈر)
۷۔ سالانہ تحریری جنتری (ڈیسک ڈائری)
۸۔ جمع دان برائے آلات تحریر
۹۔ غیر خودکار خط چاک کرنے کا آلہ (پیپر نائف)
۱۰۔ آہنی منسلکی کے تاروں کو نکالنے کا آلہ
۱۱۔ مقناطیسی ذخیرہ دان برائے آہنی اشیائے منسلکی کاغذات (مقناطیسی پن ٹرے)
۱۲۔ کاغذات میں سوراخ کرنے کا آلہ منسلکی کاغذات (ہول پنچ)
۱۳۔ کاغذات کو آہنی تاروں سے منسلک کرنے کا آلہ (اسٹیپلر)
۱۴۔ گولی ذخیرہ دان۔
۱۵۔ اوزان برائے کاغذات (پیپر ویٹ)
۱۶۔ خودکار کتاب برائے نوشت مندرجات (آٹومیٹک ایڈریس بک)
۱۷۔ خودکار الکٹرانکی آلہ برائے حساب (کیلکولیٹر)
۱۸۔ خودکار آلہ برائے چاک لفافہ جات خطوط (الیکٹرانک پیپر کٹر)
۱۹۔ کتاب برائے تحفظ ملاقاتی پرچہ جات (وزیٹنگ کارڈ ہولڈر)

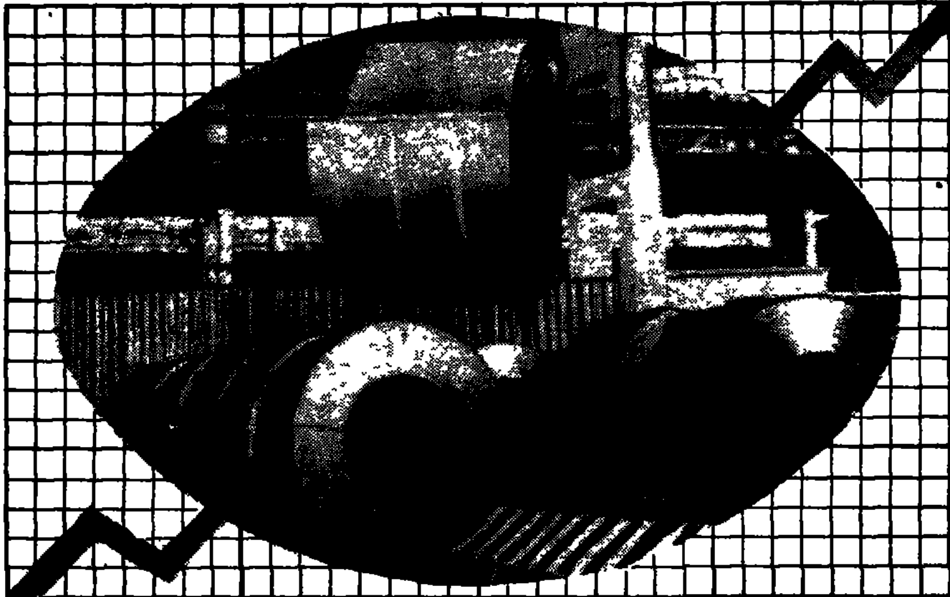



ستمبر ۱۹۸۸ء

مدیر
حسنین کاظمی

# پاکستان اسٹیل

## ترقی کی راہ پر گامزن



### سرمایہ کاروں کے لئے سنہری موقع

انجینئرنگ کا ساز و سامان تیار کرنے والی صنعتیں درآمد کردہ مشینری/آلات پر کسٹم ڈیوٹی سے استثنیٰ اور یکم جولائی ۱۹۸۶ء سے ۳۰ جون ۱۹۸۹ء تک ۵ سال ٹیکس کی چھوٹ کی مستحق ہیں۔

اس غرض کے لئے پاکستان ڈاؤن اسٹریم انڈسٹریل اسٹیٹ بن قاسم میں قائم کی گئی ہے جہاں پاکستان اسٹیل کی تیار کردہ مصنوعات / ضمنی مصنوعات سے انجینئرنگ کا ساز و سامان تیار کرنے والی ڈاؤن اسٹریم صنعتیں لگانے کے لئے بہترین سہولتیں فراہم ہیں۔

- ترقی یافتہ زمین — پلاٹ کا عام سائز ۵ ایکڑ بحساب ۱۵۰ روپے فی مربع میٹر
- زمین کے بدلے پاکستان اسٹیل کی ... کا اختیار۔
- نیشنل ہائی وے سے ملانے والی سڑکوں کا جال
- پلانٹ کی بن قاسم اور کراچی ریلوے اسٹیشن سے قربت۔
- موجودہ نظام کے ذریعے عام نرخوں پر پانی کی فراہمی۔
- پاکستان اسٹیل کے نکاسی آب کے موجودہ نظام سے استفادہ۔
- کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کے ذریعے الیکٹرک پاور کا کنکشن۔
- مناسب قیمتوں پر مصنوعات اور ذیلی مصنوعات کی یقینی فراہمی۔
- نقل و حمل کے خرچ میں بچت اور ڈیلیوری کرنے کی کم سے کم مدت۔
- مناسب نرخوں پر تشکیل، تعمیر، اسمبلنگ، میٹریل ہینڈلنگ اور تربیت کی سہولتیں۔

ڈائریکٹر (پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ) پاکستان اسٹیل، بن قاسم، کراچی، پاکستان سے رابطہ فرمائیے۔

آپ کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو پاکستان اسٹیل کے سرگرم ماہرین کی مدد سے آپ یقینی طور پر اعلیٰ معیار حاصل کر سکتے ہیں۔

بات معیار کی ہو تو پاکستان اسٹیل کی مصنوعات کا مقابلہ دنیا میں فولاد کی بہترین اشیاء سے کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس نہ صرف فولاد سازی کی جدید ترین ٹیکنالوجی موجود ہے بلکہ ہمیں افرادی قوت کی خدمات بھی حاصل ہیں جو اس ٹیکنالوجی کو مؤثر طریقے سے استعمال کرنا جانتی ہے۔

آج پاکستان اسٹیل کی مصنوعات میں کوک، پگ آئرن، بلٹس، ایچ آر کوائلز اور شیٹس، سی آر کوائلز اور شیٹس، فارمڈ سیکشنز، گیلوینائزڈ مصنوعات اور گیلوینائزڈ پائپس کے علاوہ کول تار، گرینولیٹڈ سلیگ، ہارڈ سلیگ اور امونیم سلفیٹ شامل ہیں۔

تفصیلات کے لئے رجوع فرمائیے: پاکستان اسٹیل، بن قاسم، کراچی، پاکستان۔
ٹیلیفون: ایکسچینج ۲ — ۴۱۰۲۲۱ — ٹیلیکس نمبر 20401,24387 PSMC PK
کیبل: PAK STEEL
دفتر رابطہ: پاکستان اسٹیل، اسٹیٹ انٹرپرائز ہاؤس، ۵ — اے، کانسٹی ٹیوشن ایونیو، اسلام آباد، پاکستان۔ ٹیلیفون: ۸۲۳۳۸۸ — ۸۲۰۹۹۳ — ۸۲۰
ٹیلیکس: 5816 PSMC PK
علاقائی دفتر: پاکستان اسٹیل، الجنت بلڈنگ، بینک اسکوائر، شاہراہ قائد اعظم، لاہور، پاکستان۔ ٹیلیفون: ۶۳۹۹۹۹ — ۶۳۸۲۳ — ٹیلیکس: 44870 PSMC PK

**پاکستان اسٹیل**
فولاد — مضبوط پاکستان کی بنیاد

PID (Islamabad)

سنجیدہ اور فکری ادب کا نمائندہ




کراچی

جلد: ۲ ———— شمارہ ۱۴

ستمبر ۱۹۸۸ء

چیئرمین ریڈرز پبلیکیشنز ———— عبداللہ دادا بھائی

مدیر ———— حسنین کاظمی

مدیر معاون اعزازی ———— ممتاز مرزا

معاون اعزازی ———— مشرف احمد

| | |
|---|---|
| عام شمارہ | ۱۰ روپے |
| سالانہ | ۱۱۰ روپے |
| ششماہی | ۵۵ روپے |
| بیرون ملک | سالانہ ۲۵ پونڈ یا ۴۰ ڈالر |

پتہ : ماہنامہ "دائرے" شاہین چیمبرز ۴ - کمرشل ایریا
بلاک ۷، ۸ کے ۔سی ۔ایچ ۔ایس ۔کراچی ۔ٹیلیفون نمبر ۴۲۵۸۰۴

پرنٹر وسیم احمد صابری نے شیخ سلطان ٹرسٹ پریس ۲۵ سول لائنز ۱۰ بیومنٹ سے چھپوایا
اور سید محمد فضل پبلشر نے ریڈرز پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی کی جانب سے شائع کیا۔

# ارشاد قرآنی

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے ۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔" انہیں خوشخبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی۔ اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔"

(ترجمہ: سورۂ بقرہ آیات ۱۵۵، ۱۵۶)

## صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق

اور ان کے محترم رفقاء کی شہادت پر

قوم کے غم میں شریک
داداابھائی فاؤنڈیشن

# شمارہ نما

## اداریہ

# پہلی کرن

۱۷ / اگست ۱۹۸۸ء پاکستان کی تاریخ کا سب سے المناک حادثہ رونما ہوا۔ جس میں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق اور پاکستان کی دوسری انتہائی قیمتی زندگیاں واصل بحق ہوگئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نہایت اعلیٰ انسانی خوبیوں کے مالک تھے۔ انکساری، دردمندی، عفو و درگزر، تحمل اور رواداری کے ساتھ اسلام سے اپنی قلبی وابستگی کا جس طرح انہوں نے مظاہرہ کیا پوری قوم نے خراج عقیدت پیش کرکے اس کے اعتراف کا ثبوت دے دیا ہے۔ صدر صاحب نے اردو کے نفاذ کے لئے بھی مخلصانہ کوششیں کیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور دیگر جاں بحق ہونے والوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔ ادارہ اس قومی غم میں ہر طرح شریک ہے اور حضور رب العالمین سے دعا گو ہے کہ صدر محترم کے اہل خانہ کو یہ غم برداشت کرنے کی توفیق عطا ہو۔

اس المناک سانحے میں صدر محترم کے ساتھ ملک میں انتہائی اہم فوجی ذمہ داریوں پر فائز شخصیات کا نقصان پورے ملک کے لئے نہایت دل گداز ہے ان جدا ہونے والوں میں ایک نہایت محترم و مکرم علمی ادبی شخصیت برگیڈیئر صدیق سالک کی بھی تھی۔ اس طرح یکایک ان کی جدائی نے علمی اور ادبی حلقوں کے لئے اس حادثے کی المناکی کو شدید تر کر دیا ہے۔ اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ جناب صدیق سالک کے اہل خاندان سے دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔

حسنین کاظمی

ماہ اگست ۱۹۸۸ء میں شامل متین الرحمان مرتضیٰ صاحب کے مضمون "مولوی عبدالحق، تضادات سے بنتا ابھرتا انسان" پر مولوی عبدالحق کے سب سے دیرینہ رفیق محترم جناب حکیم اسرار احمد کریوی نے چند وضاحتوں پر مشتمل ایک مضمون روانہ فرمایا ہے۔ بعض انتہائی ناگزیر مجبوریوں کی بنا پر وہ مضمون اس شمارے میں شائع نہیں ہو سکا۔ ان شاء اللہ ماہ اکتوبر کے شمارے میں اسے پیش کیا جائے گا۔

(ادارہ)

امیر الاسلام

# والعدٰیت

ہے اس کے نام سے آغاز جو اللہ تعالیٰ ہے
بڑا ہی مہرباں ہے اور نہایت رحم والا ہے

صبا رفتار گھوڑوں کی قسم جو ہنہناتے ہیں
چٹانوں میں شرر جو اپنی ٹاپوں سے اڑاتے ہیں
وہی جو صبحدم یلغار کرتے، گرد اڑاتے ہیں !
صفوں میں دشمنوں کی بے محابا جو در آتے ہیں
ہے بیشک اپنے رب کا سخت احساں ناشناس انساں
اِن احسانوں کا شاہد گرچہ خود ہے ناسپاس انساں
بڑی شدت سے مال و زر کی الفت میں گھرا ہے وہ
"مآلِ کار کیا ہوگا، بھلا کب جانتا ہے وہ" ؟
اُسے کیا یہ نہیں معلوم اک ساعت وہ آئے گی
جو مرنے والوں کو قبروں سے باہر کھینچ لائے گی

دلوں کے راز ظاہر کر دیئے جائیں گے سب اُس دن
یقیناً خوب واقف ہوگا اُن سے اُن کا رب اُس دن

سید معراج جامی

# نعت

کیا مزا شاہؐ دیں کی محبت میں ہے
میں بھی راحت میں ہوں دل بھی راحت میں ہے

آپ کی عظمتیں ، آپ کا مرتبہ
ہر رسول و نبی کی شہادت میں ہے

شاد ہیں حشر میں شاہ کے اُمتی
جو بھی ہے سایۂ ابرِ رحمت میں ہے

حکم خالق ہے بھیجو درود و سلام
آپؐ کا ذکر بھی تو عبادت میں ہے

ہوں حصارِ تجلّی میں آیا ہوا
اب نظر محو ان کی زیارت میں ہے

نعت کہتے رہو ، نعت لکھتے رہو
شاعری کی بقا شہہؐ کی مدحت میں ہے

جامؔی بے نوا ، آپؐ تک آگیا
دیکھئے اور کیا اس کی قسمت میں ہے

ڈاکٹر حنیف فوق

# لوک روایات اور اُردو ادب

**لوک** روایات کا معاشرے اور ادب سے گہرا تعلق ہے۔ معاشرے کی سوچ، لوک روایات کے سائے میں پروان چڑھتی ہے اور ادب جس کی جڑیں جمہور کی زندگی میں پیوست ہوتی ہیں، لوک روایات سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ اس توانائی کا سلسلہ اجتماعی، خفی اور جبلی یادوں سے ہوتا ہوا، عصری شعور تک وسیع ہو جاتا ہے۔ لیکن لوک روایات کا ایک تصور تو وہ ہے جو اسے زمانہ قبل تاریخ کے دھندلکوں میں لے جاتا ہے اور اساطیری یادوں، نسلی روایتوں اور شنیدہ الفاظ ہی کو لوک روایات کے دائرے میں شامل سمجھتا ہے اس کے برخلاف دوسرا تصور یہ ہے کہ لوک روایات کا عصری زندگی سے گہرا رشتہ قائم ہے اور اپنے دور کی ادبی تحریروں میں بھی اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

پہلا تصور بڑی حد تک ہمیں اصنامیات کی راہوں میں گم رکھتا ہے اور اس سے علم بشریات کے بعض گوشے تو روشن ہوتے ہیں لیکن بدلتے ہوئے ماحول کا شعور نہیں اُبھرتا اس کے برخلاف دوسرا تصور مافوق الفطرت کہانیوں، حیرت خیز داستانوں اور اخلاقی حکایتوں کے سرمائے سے استفادہ کرتے ہوئے، موجودہ دور کی زندگی کو آئینہ دکھانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس معاشرے میں جہاں صنعت اور سائنس کی ترقی حاوی ہوتی جا رہی ہے تہذیب کی پیچیدہ شکلیں وجود میں آتی ہیں اور ان کے اثر سے تمدنی طور پر ترقی یافتہ سماج کے ادب میں اظہار کا ہنر تخلیقی تجربے اور فنی صورت پذیری کی کئی شکلوں سے گزرتا ہے۔ لیکن اس ترقی یافتگی کے ساتھ ساتھ ہر سماج کی عوامی زندگی میں گھلی ملی، لوک روایات کی زیریں رو بھی موجود رہتی ہے یہی نہیں خود ادبی صورتوں میں بھی اس زیریں رو کے تنوّع کا احساس ہوتا ہے۔ ادب اور لوک روایات کا تعلق، تخیل اور تصور کی سطحوں پر نمودار ہونے کے ساتھ ساتھ خود اظہار کے پیرایوں میں بھی رنگ بھرتا ہے۔ یہ روایات

ہی کسی قوم اور ملک کے ادب میں اس کی امتیازی خصوصیات کو تعین کرتی ہیں لیکن لوک روایات کو محض جغرافیائی، نسلی یا قومی تنگ نظری کے حدود پر مبنی سمجھ لینا بھی غلط ہوگا اس طرح کی کوششیں لوک روایات کے سچ کو جھوٹ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ روایات، قیدِ مقام کی پابند نہیں رہتیں۔ انسانوں کے صرف ایک گروہ سے تعلق نہیں رکھتیں۔ بلکہ ایک خطے سے دوسرے خطوں کا سفر کرتی اور بعد کی نسلوں کو منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں کی لوک کہانیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں مشترک اور متوازی عناصر کی فراوانی ملتی ہے۔ اسی طرح لوک شاعری کا ورثہ جذبے اور احساس کی متعدد وحدتوں کا ترجمان نظر آتا ہے۔ لوک روایات "انسان کے فطرت اور سماج سے دیرینہ رابطوں کی غمازی کرتی ہیں۔ اسی لیے تہذیب کے طویل سفر میں ان کے نشانات حال اور مستقبل کی سمت نمائی کرتے ہوئے۔ مقامی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ، قیدِ مقام سے آزادی بھی بخشتے ہیں۔

لوک روایات، ادبی محرکات کے مطالعے کے لیے ذخیرہ معلومات فراہم کرتی ہیں اور انسانی فطرت کے متعدد گوشوں کا انکشاف کرتے ہوئے اس کے ماحول سے تعلق کی کہانی سناتی ہیں۔ ان سے تاریخ و تمدن کے ارتقائی نقوش واضح ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کی بنیادی انسانیت کو خواب و حقیقت کے امتزاج کی تابناکی ملتی ہے۔ دنیا کے ہر ادب میں لوک روایات کا ورثہ اپنا جادو جگاتا رہا ہے چنانچہ اردو ادب میں بھی لوک روایات کے آثار و نقوش گہری اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے انسان اور فطرت کے مطالعے میں نیا رنگ آیا ہے۔

معاصرانہ زندگی میں صدیوں کے تہذیبی ارتقاء کے نشانات ملتے ہیں۔ اس تہذیبی ارتقاء سے روگردانی نافہمی کی دلیل ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ زندگی نے اپنے پیچ در پیچ صورتوں سے جس انتشار کو فروغ دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں قدیم ابتدائی زندگی کی سادگی بعض اوقات خاطر جمعی کا پیغام دیتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کے ایک اہم نقاد اور شاعر الیٹ نے اپنی کتاب "معرفِ شاعری اور معرفِ تنقید" (THE USE OF POETRY AND THE USE OF CRITICISM) میں ناخواندگی کے مقابلے میں غلط خواندگی اور نیم خواندگی کو شاعری کی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے اپنے لیے ایسے سامعین کی آرزو بھی کی تھی۔ جو پڑھنا لکھنا نہ جانتے ہوں۔ اسی کتاب میں الیٹ نے سماجی طور پر اس شاعری کو سب سے زیادہ مفید قرار دیا جو لوگوں کے ذوق کی ان جکڑبندیوں کو منقطع کر دے جو، شاید، تہذیبی انتشار کی علامات ہیں۔ لیکن خود الیٹ نے اپنی شاعری کو اساطیری روایات تک وسعت دیتے ہوئے، تہذیبی اکتسابات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح اقبال کی شاعری میں برصغیر کے مسلمانوں کے تہذیبی اور فکری حاصلات کا عکس ملتا ہے۔ ان حاصلات میں عرب اور ایران کا سرمایۂ تصورات بھی شامل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں بھرتری ہری، گرو نانک سوامی رام تیرتھ، خوشحال خاں خٹک، محراب گل افغان اور ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کے پردوں سے لوک روایات

کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

خاص طور پر اردو، عربی، فارسی، ترکی اور کُردی زبانوں میں جو ملتا جلتا لوک روایات کا سرمایہ ملتا ہے، وہ ایک وسیع تہذیبی سلسلے کا پتہ دیتا ہے اور اس کے حدود وسیع ہوتے ہوئے کئی دوسرے ممالک کی لوک روایات سے مل جاتے ہیں۔ یہ روایات گھریلو زندگی، تمدنی اثرات اور کاروباری تعلقات کے مختلف گوشوں پر محیط ہیں لیکن ان میں حکومت، قانون اور مذہب کے نمائندوں سے زیادہ عام انسانی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں — خود ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں معارف پروری کی جو روایت قائم ہوئی تھی، اس میں لوک سرمائے کا حصہ بھی تھا۔ ان لوک روایات نے خانقاہوں میں بھی اپنا عمل جاری رکھا تھا۔ اس طرح اردو، جس نے برصغیر کی ذہنی فضا سے اپنی زندگی حاصل کی تھی، جہاں اس فضا کے تہذیبی اکتسابات کی حامل ہے، وہاں لوک روایات کے ورثے کی بھی امانت دار رہی ہے۔

اردو کے ابتدائی دور کے بڑے شاعر خسرو سے لوک روایات اور ادب کے جس تعلق کا سراغ ملتا ہے، وہ آج بھی دوہوں اور گیتوں کی شکل میں ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ پھر لوک گیت، لوری، شادی بیاہ کے گیت، پیدائش کی مبارکباد کے گیت (جہانگیر کی پیدائش کے جشن میں تان سین کے بول "کھیلن کو مانگے چاند — انوکھا لاڈلا")، پہیلی، کتھا، داستانیں، کہہ مکرنیاں، کہانیاں، قصے جو سب کے سب کسی نہ کسی جہت سے لوک ورثے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے۔ ان لوک روایات نے وہ لوک ہیرو بھی دیے ہیں جو اردو ادب کے متعدد شاہکاروں میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں حاتم طائی، رستم، الہ دین اور سند باد جہازی کا نام لے دینا کافی ہے۔ محبت کی داستانوں میں لیلیٰ مجنوں یا شیریں فرہاد کے ساتھ ساتھ قصہ ہیر رانجھا سے اہل درد کو لوٹ لینے کا ذکر بھی اردو شاعری میں ملتا ہے۔ اسی طرح "کچے گھڑے" کا استعارہ اردو شاعری میں جگہ پا گیا ہے۔ پھر سیمرغ، ہما، ققنس، عنقا، جیسی خیالی مخلوقات اور کوہ قاف کے ساتھ ساتھ متعدد خیالی شہروں یا ملکوں کا بیان بھی، اردو ادب میں شعری اور نثری طور پر زیب داستان رہا ہے۔ "اندر سبھا" میں لوک روایات ایک نئی ڈرامائی سطح پر ظاہر ہوتی ہیں اور اسے عوامی تھیٹر کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ جہاں ملفوظات اولیاء میں لوک روایات نے جگہ پائی ہے، وہاں شعری اصناف میں بھی بعض جگہ عقیدے کے ساتھ ساتھ عقیدت کی وہ جھلک مل جاتی ہے جسے عوامی زندگی کا حصہ کہا جا سکتا ہے۔ لوک روایات کے ورثے میں جو تمثیلی اور استعاراتی عناصر ہیں، انہیں تو اردو ادب نے جذب کیا ہی ہے۔ لیکن جہاں براہِ راست بیان کی تیزی اور تازگی ملتی ہے، وہ بھی کہاوتوں، ضرب الامثال، محاوروں، یہاں تک کہ لطائف میں ظاہر ہوئی ہے یا ان کی کرشمہ سازی معلوم ہوتی ہے۔ "باغ و بہار" کا قصہ مستعار ہے لیکن اس کی لافانیت کی بڑی بنیاد، محاوروں اور ضرب الامثال کے ذریعہ لوک روایات کے اجتماعی مرکز تک رسائی ہے۔

اردو ادب کے بعض موضوعات کے ساتھ ساتھ اس کے اسالیبِ اظہار میں بھی لوک روایات کی جو پرچھائیاں

ملتی ہیں۔ وہ قابلِ تحقیق ہیں۔ اردو ادب کی کہاوتیں، محاورے اور ضرب الامثال، دنیاوی دانش، سماجی بصیرت، روحانی تلاش اور انسانیت کے آدرش کی ترجمانی کرتے ہیں اس کے علاوہ خود عالمِ مثال اور عالمِ حقیقت کے جو نقشے لوک روایات میں ملتے ہیں، ان سے موجودہ اردو ادب نے عصری زندگی کو پیش کرتے ہوئے نئی پیکر تراشی کا کام لیا ہے۔

مغرب میں لٹل ریڈ رائڈنگ ہوڈ کی کہانی میں اس کی فطرت سے مطابقت رکھتی ہوئی تعبیر کرتے ہوئے اُسے ڈوبتے ہوئے سورج، بھیڑیے کو کالے بادل اور اس کے دانتوں کو بجلی کے چمکنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اردو میں بر سیاہ کے پیلِ مست، بے زنجیر ہونے کا تصور تو قصیدے تک میں در آیا ہے۔ غزل میں علامات و استعارات نے لوک روایات سے تقویت پائی ہے اور جدید دور میں تیشۂ کوہ کن سے لے کر ضربِ کلیمی تک نئے معجزۂ ہنر بن گئے ہیں۔ عوامی موضوعات کو عوامی لفظوں میں پیش کرنے کی وہ روایت، جس کی داغ بیل، نظیر اکبرآبادی نے ڈالی تھی، اردو ادب میں جمہوریتِ تخلیق کے نئے روپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اردو شاعروں نے کربلا سے کربلائے بیروت تک کا سفر طے کیا ہے۔ لوک روایات کا خاص طور پر عام انسانوں کی زندگی یا زیادہ وسیع معنوں میں زمین سے تعلق ہے۔ لیکن زمین سے تعلق کا مفہوم زمین کے لوگوں سے تعلق ہے اور اس تعلق کو اردو ناول اور اردو افسانے نے بخوبی پیش کیا ہے۔ نئے ناولوں میں جہاں انتظار حسین کا ناول "تذکرہ" اس تعلق کی جامد و متحجر شکل کو پیش کرتا ہے، وہاں رضیہ فصیح احمد نے "صدیوں کی زنجیر" میں اس کی سیّال یا متحرک صورت کی نشان دہی کی ہے۔ جہاں بعض افسانوں میں براہِ راست لوک روایات کا حوالہ مل جاتا ہے اور کچھ افسانوں میں لوک گیتوں کی شمولیت سے، افسانے کی سرحدیں وسیع ہوئی ہیں وہاں چند افسانوں میں زمین یا کسی خطۂ زمین کے اساطیری یا حسرت آمیز ذکر کے بجائے کپاس کے ان پھولوں (احمد ندیم قاسمی) کی کاشت کی گئی ہے جو لوک روایات کو نئی شکل دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض ڈرامائی نظموں میں جہاں لوک روایات کے سُرکی چھایا (ناصر کاظمی) ملتی ہے، وہاں تخلیق کا جمہوری نقطۂ نظر شیشے کی دیوار (میرزا ادیب) کے باہر کے رنگوں اور روشنیوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ معاصر اردو ادب کی بعض تخلیقات میں وہ فنی تشکیل ملتی ہے جو ذہنی اکتسابات کی حیثیت سے جدید ہوتے ہوئے بھی لوک روایات کی عمومی زندگی کے سرچشمے سے اپنا تعلق قائم رکھتی ہے۔

آج جب انسان زندگی اور زندگی کے مسائل کے سامنے شکست خوردہ اور اپنے آپ سے اجنبی نظر آتا ہے۔ لوگ زندگی سے ربطِ تازہ استوار کرنے کی ضرورت زیادہ شدید ہو گئی ہے اردو کے ادیبوں نے درد بھری لے میں گائے ہوئے "ماہیا" کی آواز پر کان دھرا ہے اور اس کے سُروں کو سمیٹا ہے۔ لیکن شاہ لطیف، سچل سرمست، بلھے شاہ، سلطان باہو، رحمان بابا، جام درک اور خواجہ غلام فرید جیسے عوام سے تعلق رکھنے والے شاعروں کے یہاں جو محبت اور آزادی کا پیغام ملتا ہے، اس سے تخلیق کے نئے چراغ روشن ہو سکتے ہیں کہ ادب کے بدلتے ہوئے نئے

موسموں اور تاثر کی سیال لہروں، سب پر عوام کی حکمرانی ہے۔
لوک روایات سے نقشِ تازہ بنانے کے لیے پیچھے جانے کی نہیں، آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہی وادیٔ سندھ کی "ماروی" زندگی کی ایک نئی علامت بن سکتی ہے معلوم سے نامعلوم کا سفر لوک ادب کی اہم خصوصیت رہی ہے اور اسی لیے لوک ادب کی استعاریت، زندگی کی پیچیدہ صورتحال اور ادب کی ارتقائی کوششوں میں انسان کی بین الاقوامی بہتر زندگی کی جدوجہد کا اشارہ بن کر نمایاں ہو سکتی ہے۔ لوک روایات کے سرمائے سے جو نفل کی کلیاں اور ہنر کے شگوفے کھلتے ہیں، ان کی خوشبو سے استفادہ کرتے ہوئے، اس خطرے کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ بعض حالات اور بعض ممالک میں لوک روایات کو وسیع تجارتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بھی بنایا گیا ہے اور بعض مفادات اور بعض گروہوں نے ان کے ذریعے جغرافیائی تنگ نظری کا پرچار بھی کیا ہے چنانچہ معاصرانہ شعور سے الگ ہو کر ادب کو صرف لوک روایات کا چربہ بنانا بھی صحیح نہیں ہے اور ادب کو ان روایات سے منقطع رکھنا بھی، اس وسیع سرچشمے سے محرومی و دوری کی دلیل ہے جو انسان کے سب آنسوؤں اور سب تبسموں میں جاری و ساری ہے۔ ادب اور لوک روایات کے باہمی تعلق ہی سے سکھ اور دکھ کی دیواروں کے بیچ انسان کا لازوال چہرہ نظر آتا ہے اور فن کو زندگی کی پہچان عطا ہوتی ہے۔

---

# مشرقی بنگال کا ایک قدیم اُردو ڈرامہ

ڈاکٹر کلیم سہسرامی

جیسا کہ اردو ادب کی تاریخوں میں مذکور ہے، واجد علی شاہ والئی اودھ کے زمانے سے اردو ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے اور ۱۸۵۶ء میں ان کے مٹیا برج منتقل کئے جانے کے بعد لکھنؤ میں اس کا زوال ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ صنف بمبئی کے پارسیوں کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہے۔ لیکن آج تک کسی مورخ ادب نے اس کی طرف توجہ نہ دی کہ مشرقی بنگال کے مرکزی شہر ڈھاکے میں بھی اردو ڈرامے کے نقوش پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے عشرت رحمانی صاحب نے اپنی کتاب "اردو ڈراما ـــــ تاریخ و تنقید" میں مشرقی بنگال میں اردو ڈرامے کے اسٹیج سے متعلق ایک خصوصی باب میں تفصیلات بیان کیں اور ڈرامے کے ناقدین نے انہی کے بیان کو پیش نظر رکھ کر اپنے الفاظ میں یہ باتیں دہرائیں۔ یہیں سے میری تلاش وجستجو کی راہیں کھلتی ہیں، میں نے اپنے طور پر مواد کی فراہمی جاری رکھی اور ساتھ ساتھ مطالعے کا سلسلہ بھی آگے بڑھتا رہا، کئی سال کی محنت وکاوش کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا اس کی تفصیل و توجیہہ آئندہ صفحات میں آئے گی، یہاں صرف اس قدر بیان کردینا مقصود ہے کہ لکھنؤ اور بمبئی کے دوش بدوش ڈھاکے میں بھی اندرسبھائی دور میں اردو ڈرامے اسٹیج ہوتے تھے، چنانچہ لکھنؤ میں اردو ڈرامے کے زوال کے بعد یہ روایت بمبئی کے بجائے ڈھاکے منتقل ہوگئی، مقامی ڈرامانگاروں کے علاوہ غیرمقامی ڈراما نویس حضرات نے بھی ڈرامے لکھے، اس طرح ڈھاکے میں اردو ڈرامے اسٹیج کئے جانے لگے، آپس میں حسد و رقابت کے باعث تھیٹریکل کمپنیاں ٹوٹنے لگیں اور اس سے منسلک ڈراما نویس بکھرنے لگے، ان میں چند

اپنی تخلیقات کے ساتھ تلاش معاش میں بمبئی پہنچے ، چنانچہ انھیں کی بدولت اردو کے طبع زاد ڈرامے وہاں اسٹیج کئے گئے ، بمبئی میں ۱۸۸۰ء سے پہلے اردو کے طبع زاد ڈرامے اسٹیج ہونے کی شہادت نہیں ملتی ، جب کہ ڈھاکے میں ابتدا ہی سے صرف اردو ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے ، اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے بمبئی میں تھیٹریکل کمپنیاں تھیں لیکن ان میں اکثر و بیشتر ڈرامے گجراتی زبان میں پیش کئے جاتے تھے ، اردو میں جو ڈرامے پیش کئے گئے وہ سب کے سب غیر زبانوں کے ترجمے تھے ، ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ اس دور کے پارسی حضرات جن کے نام سے اردو ترجمے موسوم ہیں خود ڈراما نگار نہ تھے ، بلکہ اپنی دولت و ثروت کی بناء پر منشیوں سے ڈامے لکھوا کر مصنف بنے ہوئے تھے۔

میرا یہ نظریہ تاریخ ادب کے مسلمہ نظریات سے ایک جرأت مندانہ انحراف ہے ، اسی لئے بعض کانوں کو اس سے اجنبیت محسوس ہوگی ، اور بعض قارئین اس کے مطالعے کے بعد اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے ، جہاں تک اردو ڈرامے کے اسٹیج کا تعلق ہے تاریخ کی اس حقیقت اور صداقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ کے بعد ڈھاکہ اردو ڈرامے کے اسٹیج کا ایک اہم مرکز تھا ۔

## مشرقی بنگال میں اردو ڈرامے کا پس منظر ۔

اردو ڈرامے کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس کے آغاز میں "اندرسبھا" کے ابتدائی نقوش کارفرما نظر آتے ہیں یعنی "اندرسبھا" کی بنیاد پر ہی اردو ڈرامے کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی ، چنانچہ اس کی تصنیف کے تقریباً نصف صدی بعد تک اردو کے بعض ڈراموں میں اس کے اثرات کی جھلک پائی جاتی ہے ، امانت لکھنوی کی "اندرسبھا" کی پیروی میں مختلف ناموں سے بہت سارے ناٹک لکھے گئے اور اسٹیج کی زینت بھی بنے ، گویا ایک مخصوص ذوق اور ماحول کی بناء پر خاص مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا ، اسی لئے اس کو "اندرسبھا" دور سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ "اندرسبھا" کی تصنیف کی ابتداء ۱۲۶۸ ہجری مطابق ۵۱/۱۸۵۲ عیسوی میں ہوئی ۔ ڈیڑھ سال کی مدت میں اس کی تکمیل کے بعد ۱۲۷۰ ہجری (۱۸۵۳ء/۱۸۵۴ء) میں اس کی اشاعت ہوئی ، اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اندرسبھائی دور کا آغاز ۱۲۷۰ھ/۵۳/۱۸۵۴ء سے ہوتا ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ لکھنؤ کے بعد اس دور کا آغاز بمبئی میں ہوا اور پارسی کمپنیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تاریخی نقطۂ نظر سے یہ درست نہیں واجد علی شاہ نواب اودھ کے زوال سے متاثر ہوکر جس طرح بعض شاعر و ادیبان کے ساتھ مٹیا برج ہجرت کر کے چلے آئے ، اسی طرح کانپور سے نواب علی نفیس اور

شیخ پیر بخش ناٹک کمپنیوں کی دعوت پر ڈھاکے چلے آئے ، اور عوام و خواص کے ذوق کی تسکین کے لئے چند ناٹک ترتیب دے کر اپنی فن کاری کا ثبوت پیش کرتے رہے ، پھر جب یہاں ناٹک کمپنیوں کی مالی حالت زوال پذیر ہوئی تو بمبئی میں پارسیوں کے ذریعہ اردو ڈرامے کا آغاز ہوا اگر اردو ڈرامے کے تدریجی ارتقاء کی فہرست مرتب کی جائے تو اس کی ترتیب اس طرح ہوگی :

۱) رہس (واجد علی شاہ نواب اودھ)
۲) اندرسبھا (امانت لکھنوی)

---

۳) شیریں فرہاد (نواب علی نفیس کانپوری) –
۴) ساگر سبھا ( شیخ پیر بخش کانپوری ) –
۵) حسن افروز اور گلشن جاں فزا (حکیم حسن مرزا حرق جہاں گیر نگری ) –
۶) بیمار بلبل (شیخ احمد حسین وامر جہاں گیرنگری ) –
۷) نامعلوم متعدد ڈرامے (مرزا ولی جان قمر جہاں گیرنگری ) –
۸) نامعلوم متعدد ڈرامے (سر احسن اللہ نواب بہادر ڈھاکا ) –

---

جہاں گیرنگر (ڈھاکا ) (۱۸۵۳ء) سے ۱۹۰۱ء تک –

۹) ڈراما بے نظیر بدر منیر ( سیٹھ نوشیروان جی مہربان جی آرام)[ع۱] وغیرہ –

---

بمبئی ۱۸۸۰ء –

اردو ڈراما نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیتے وقت عموماً بنگال کو نظر انداز کردیا گیا ہے ، اس کا سبب یہ ہے کہ بنگال کے اہل قلم نے ہنوز اس ادعا کی کوشش نہ کی کہ یہاں بھی اس فن کا مظاہرہ کیا گیا ہے ، اسی لئے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ پس منظر کے طور پر اس تاریخی حقیقت کی طرف ناقدین و مورخین ادب کی توجہ مبذول کرائی جائے –

مشرقی بنگال کی تاریخ و تہذیب اور تمدن و معاشرت کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن مرحوم کے بقول انیسویں صدی کے وسط ہی سے یہاں اردو ڈراما نگاری کی داغ بیل پڑ چکی تھی ، اس سلسلے میں تفصیل کے لئے ان کی کتاب " ڈھاکا پچاس برس پہلے " ملاحظہ کی جاسکتی ہے ، جس میں یہاں کی قدیم تہذیب و تمدن کی جھلکیاں بکھری ہوئی ہیں ، حکیم صاحب فرماتے ہیں :

" اسے ( جاترا ) دیکھ کر مسلمانوں نے اپنی زبان میں نقل اتاری اور نیلا کھیلنا شروع کیا ، نیلا لیلا کی بگڑی شکل ہے ، بہرحال مسلمانوں کے اس بڑے حصے نے جو اردو کے سوا بنگلہ نہیں سمجھتا ہے ، اس نیلا یا لیلا کا پرتپاک خیرمقدم کیا ، سب سے پہلے اندرسبھا کھیلا گیا ، اور

---

ع۱) عشرت رحمانی : اردو ڈراما – تاریخ و تنقید " صفحہ ۲۰۹ –

پھر مقامی شاعروں نے بہت سے کھیل تیار کئے ، اور ہر محلے میں تقریباً یہ آگ بھڑک اٹھی کچھ روز تک ان جاتروں اور نیلاؤں کا خوب زور شور رہا کہ کہ اچانک تھیٹر کی طرف لوگ متوجہ ہوگئے ، اس میں بھی ہمارے ہندو ہم وطن پیش پیش رہے ، تعجب ہے کہ اس بنگلہ ناٹک نوازی میں محلہ فرانس گنج کی مشہور سوداگران ضامن اکمل و یوسف خان بھی جان‌ومال سے شریک تھے ، اس زمانے میں کانپور کے رہنے والے‌شیخ فیض بخش نے جو یہاں بس گئے تھے اور یہیں پیوند زمین بھی ہوئے عجیب و غریب جدت سے کام لیا یعنی فرحت افزا کمپنی کے نام سے تھیٹر کمپنی قائم کی ، اسی زمانے میں ہندوستانی طوائفیں زیادہ تر اور مقامی کم تر بہت کثرت سے یہاں موجود تھیں ، شیخ جی نے صرف ان طوائفوں کی‌یہ منڈلی بنالی ، یعنی عورت کے پاٹ کے علاوہ مردانہ پاٹ بھی یہ طوائفیں کرتی تھیں ، اس کے لئے کانپور سے نواب علی‌نفیس مرحوم بلائے گئے ، انھوں نے متعدد ناٹک لکھے اور تقریباً چالیس کھیل تیار کئے ، او ر تیس کے قریب اسٹیج ہوئے او ر دو کھیل کتابی شکل میں چھاپے گئے ، کانپور کے شیخ پیر بخش بھی آئے اور ان کا ناگر سبھا کھیلا گیا ۔ شہر اور اطراف کے رؤسا اس کمپنی کے سرگرم سرپرست تھے ، اور آخریہ سرپرستی رشک و رقابت بن کر رنگ لائی ، اور چار برس کے اندر اندر یہ کمپنی ٹوٹ گئی

لیکن سارے شہر میں اپنا دیرپا اثر چھوڑ گئی چنانچہ اس کمپنی کی موجودگی ہی میں محلہ امام گنج والوں نے حسن افروز کے نام سے ایک کھیل اسٹیج کیا ، اس میں بھی وقت کے مناسب‌گانے رکھے گئے تھے ، یہ کھیل بہت ہی مقبول ہوا ، چنانچہ آج تک یہ غزل جو بہاگ میں گائی جاتی تھی لوگوں کی زبان پرھے یعنی :

بیتابی رہی ہے کہ جلوۂ یار میں
سیماب کی تڑپ ہے دل بے قرار میں

اس کے بعد پھول بڑیہ والوں پوتو بابو اور روتو بابو دو ہندو رئیسوں کی سرپرستی میں گلشن جان فزا اسٹیج ہوا ،اسے بھی حکیم حسن مرزا حرق تخلص ہی نے ، حسن افروز کی طرح لکھا تھا ، اسی طرح محلہ محاوت ٹولی والوں نے ماسٹر احمد حسین

واقر تخلص کا بلبل بیمار[۲۴] اسٹیج کیا جو چھپ بھی گیا ہے ، اور اب نایاب ہے ، یہ یہاں (کا) پہلا ناٹک ہے جس میں کسی قدر ڈراما کی شان ہے ورنہ سب کے کے سب اوپیرا تھے ، پھر تو ناٹکوں کا ڈربہ کھل گیا اور کم ایسے محلے ہیں جہاں یہ بیماری نمودار نہیں ہوئی — جن محلوں میں کوئی کھیل میسر نہیں ہوا وہاں اندرسبھا اسٹیج ہوا حتی کہ شہر سے تیس میل دور جیب پور جہاں اردو کا رواج برائے نام ہے ، یعنی صرف خاندان ریاست میں لوگ ہندوستانی بولتے اور سمجھتے ہیں وہاں بھی اندرسبھا اسٹیج ہوا ، اور :

"جوگن آتی ہے پری بن کے پرستان کے بیچ"

کی سریلی صدا گونجنے لگی ۔ نواب سر احسن اللہ مرحوم نے بھی چند مختصر ڈرامے لکھے اور ان کے خاندانی اسٹیج میں کھیلے گئے ، مگر حضرات خواجگان میں مرزا والی جان قمر اردو کے سوا فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے ، انھوں نے بہت سے ڈرامے لکھے اور کھلوائے تھے[۲۵]

حکیم صاحب کے بیان سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

۱) ڈھاکے میں چالیس ناٹک مرتب ہوئے
۲) تیس کے قریب ناٹک اسٹیج ہوئے ۔
۳) دو کتابی صورت میں چھاپے گئے (یعنی "حسن افروز" اور گلشن جان فزا ")۔
۴) ناٹک "ساگر سبھا" اسٹیج ہوا ۔
۵) دو ڈرامے "حسن افروز" اور گلشن جان فزا" اسٹیج کئے گئے ۔
۶) واقر کا ڈراما "بیمار بلبل" اسٹیج کیا گیا اور زیور طباعت سے آراستہ کیا گیا ۔
۷) نواب احسن اللہ نے چند ڈرامے لکھے جو اسٹیج کئے گئے ۔
۸) مرزا ولی جان قمر نے بھی ڈرامے لکھے جنھیں اسٹیج کیا گیا ۔

ڈھاکے میں اسٹیج ڈراما یا ناچ گھر کی آخری یادگار محلہ اسلام پور میں "لائن سینما" اب تک موجود ہے جس کا قدیم نام لائن تھیٹر ہے ، اور جہاں مقامی صاحب ذوق حضرات سنگیت ناٹک اسٹیج کیا کرتے تھے ، چنانچہ ۱۹۲۰ء تک ڈھاکے میں یہ سلسلہ جاری رہا ۔

"بیمار بلبل" مشرقی بنگال کا ایک قدیم اردو ڈراما ہے جو ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا لیکن اس سے بہت پہلے اسٹیج کیا گیا ۔ اس کے نام کے متعلق جناب

---

۲۳) حکیم حبیب الرحمن : "ڈھاکا پچاس برس پہلے" صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۷

۲۴) صفحہ کتابت معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ کتاب حکیم صاحب کے کتب خانے میں ہے ۔

عشرت رحمانی کے بیان سے بڑی غلط فہمی پھیلی ، اور دوسرے مورخوں اور ناقدوں کو بھی لے ڈوبی ۔ رحمانی صاحب فرماتے ہیں :"

۱) "ماسٹر احمد حسین وافر نے ایک نیا ڈراما " بلبل بیمار " لکھا .... انھوں نے مکالموں میں سلیس و شستہ نثر کو شامل کیا ۔ یہ تقریباً ۱۸۵۶ء کے اوائل کا دور تھا ۔"ع۴

ع۴) عشرت رحمانی :"اردو ڈراما — تاریخ وتنقید"صفحہ ۱۳۹ ۔

۲) پروفیسر وقار عظیم صاحب لکھتے ہیں "۱۸۵۶ء کے اوائل میں ماسٹر احمد حسین وافر نے ایک ڈراما "بلبل بیمار" لکھا ، بقول عشرت رحمانی انھوں نے ..... مکالموں میں سلیس و شستہ نثر کو شامل کیا ۔"ع۵

۳) پروفیسر فصیح احمد صدیقی کا خیال ہے :"

طالب بنارسی .... نے .... اندرسبھا کی تقلید کے بجائے احمد حسین وافر کی "بلبل بیمار " کی پیروی کو بہتر سمجھا ۔ "ع۶

۴) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے یوں تذکرہ کیا ہے :"

وافر — مولوی احمد حسین ۔ "بلبل بیمار " ۱۸۸۰ ء " ع۷

۵) ڈاکٹر ملک حسن اختر لکھتے ہیں:" "خورشید کے بعد ہمیں ڈھاکے میں لکھے گئے ۔" بلبل بیمار " کا پتہ چلتا ہے ، اسے احمد حسین وافر نے تصنیف کیا .... عشرت رحمانی صاحب نے اسے تقریباً ۱۸۵۶ء کی تصنیف بتایا ہے مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ سن ( سنہ ) کہاں سے

ع۵) پروفیسر وقار عظیم :"آغا حشر اور ان کے ڈرامے " صفحہ ۵۷ ۔

ع۶) پروفیسر فصیح احمد صدیقی :" اردو کا یک بابی ڈراما "(جلد دوم)صفحہ ۱۰۶

ع۷) ڈاکٹر عبد العلیم نامی:"ببلوگرافیا اردو ڈراما( جلد اول ) ۔

دریافت فرمایا " ع۸

۶) ڈاکٹر انجمن آرا اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں لکھتی ہیں :"

الف) ایک کمپنی بنائی جس نے"گلشن جاں فزا " ناٹک پیش کیا جو حکیم حسن مرزا برق نے لکھا "ع۹

ب ) اس کے بعد ماسٹر احمد حسین وافر نے ایک نیا ناٹک "بلبل بیمار " لکھ کر ڈراما نویسی کو ایک نیا موڑ دیا ۔" ع۱۰

بنگال میں اردو ڈرامے اور تھیٹر کے ماخذ کے حوالے کے استفسار پر عشرت رحمانی صاحب موصوفہ کے نام ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں :"

ج) "مشرقی بنگال کے اردو ڈرامے پر میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ڈھاکا یونیورسٹی ، راجشاہی میوزیم اورنوا بان ، ڈھاکا کا اہل خاندان نیز شمس

الاطبا حکیم حبیب الرحمن کے کتاب خانوں سے استمداد اور استفادہ کر کے معلومات فراہم کی ہیں " ۔ ۱۱ع

مندرجہ بالا بیانات سے اس امر کی بہ خوبی توضیح ہوتی ہے کہ جناب عشرت رحمانی کی تحریر پر تمام ناقدوں اور مورخوں نے اعتماد کیا اسی لئے

---

۸ع) ڈاکٹر ملک حسن اختر : "تہذیب و تحقیق صفحہ ۱۳۱ – ۱۳۲ –

۹ع) ڈاکٹر انجمن آراء : "آغا حشر اور اردو ڈراما " صفحہ ۳۶ –

۱۰ع) ایضاً صفحہ ۳۹ —

۱۱ع) ایضاً حاشیہ ۳۴ – صفحہ ۳۵ —

اس سے غلطی ہوئی ۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب عشرت رحمانی نے ڈاکٹر انجمن آراء کو خط میں ڈرامے کے ماخذ کے حوالے کئے سلسلے میں ادبی و تحقیقی دیانت کے بجائے غلط بیانی سے کام لیا ، کیوں کہ رحمانی صاحب کے قیام ڈھاکے کے زمانے میں حکیم حبیب الرحمن صاحب کا کتب خانہ یونیورسٹی میں منتقل نہ ہوا تھا اس لئے ڈھاکا یونیورسٹی سے استفادہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا ، حکیم صاحب کی رسائی کا امکان ہے جس کا تذکرہ ضروری تھا ، رہا راجشاہی میوزیم تو اس میں اردو کی ایک کتاب بھی نہیں اور نہ بنگال میں اردو ڈرامے سے متعلق مواد ہے ، میں ۱۹۶۰ء سے مقامی اور ذاتی طور پر میوزیم کے کتب خانے سے واقف ہوں ، مزید یہ کہ رحمانی صاحب نے حکیم حبیب الرحمن صاحب کو اپنی طرف سے "شمس الاطبا " کا خطاب عطا فرمادیا ، یہ بھی درست نہیں ، حکیم صاحب کو "شفاء الملک " کا خطاب ملا تھا ۔

د) اب آئیے ایک اور محقق کے بیان کا جائزہ لیا جائے ، ڈاکٹر محمد صدر الحق نے وافر کا تین جگہ تذکرہ کیا ہے جس کی تفصیل یوں ہے : "

الف) شعرائے ڈھاکا کے تحت ـــــ" "محمد حسین وافر" ۱۲ع

---

۱۲ع) ڈاکٹر محمد صدر الحق : "نساخ۔ حیات و تصانیف" صفحہ ۲۵ –

ب) تلامذہ نساخ کے ضمن میں ۱۳ع "سید احمد حسن نام اور تخلص وافر تھا"

ج) مصادر وماخذ (۲) کے باب میں ۱۴ع بیمار بلبل" محمد حسین وافر" ۱۵ع

ڈاکٹر محمد صدر الحق نے لکھا ہے کہ ڈراما "بیمار بلبل " ان کی نظر سے گزرچکا ہے ۔ اگر صحیح ہے تو انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ان کے بیان میں تضاد بھی ہے اور غلطی بھی انھوں نے دو جگہ وافر کا نام "احمد حسین " کے بجائے " محمد حسین "لکھا ہے اور ایک جگہ "سید احمد حسین " کہ وہ خود اپنے آپ کو شیخ احمد حسین لکھتے ہیں ۔

۸) پروفیسر اقبال عظیم صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"وافر مرحوم کو شعر و شاعری کے علاوہ ڈرامے لکھنے کا بھی بہت شوق تھا ، چنانچہ "بہار بلبل" ان کا مشہور ڈراما ہے جو ڈھاکا اور اس کے نواح میں قبول عام حاصل کرچکا ہے"[۱۶ع]
ڈرامے کی تمہید میں خود مصنف لکھتا ہے -" فقیر اس ناٹک مسمّٰی بہ

۱۶ع) احمد حسین وافر: "بیمار بلبل" صفحہ ۲ -

بیمار بلبل کو لکھ کر استادی کا دم نہیں بھرتا "[۱۶ع] اس کتاب میں جو تاریخیں درج ہیں ان سے بھی ڈرامے کے نام کی وضاحت ہوتی ہے مثلاً -

۱) لکھا تھا برگ گل کے حاشیے پر

*

مجرّب نسخہ "بیمار بلبل[۱۷ع]

۲۰ + ۱۲۷۷ = ۱۲۹۷ ھ

۲) خوب تاریخ مسیحی کی رقم

*

شاہد شیرین ہے یہ مضمون دل[۱۸ع]
۱۸۸۰ء

اردو میں عام طور پر یہ مثل مشہور ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے ، اس طرح گویا بعد کے ادیب و ناقد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اپنے پیش رو

۱۳ع) ڈاکٹر محمد صدر الحق: "نساخ — حیات و تصانیف" صفحہ ۱۳۶ -
۱۴ع) ایضاً صفحہ ۳۶۹ -
۱۵ع) پروفیسر سید اقبال عظیم: "مشرقی پاکستان میں اردو" صفحہ ۱۰۲ -

کے تناسب کے لحاظ سے چراغ کی لو کو کچھ ترقی دے کر روشنی میں اضافہ کرے گا - لیکن بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصل حقیقت پر پردہ ہی پڑا رہتا ہے اور تاریک گوشوں کی نقاب کشائی نہیں ہوتی ، بدقسمتی سے "بیمار بلبل" کے بارے میں بھی یہی ہوا ، بہرکیف اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حکیم حبیب الرحمن صاحب ، مرحوم کے علاوہ جن کے ذاتی کتب خانے میں یہ کتاب

(بیمار بلبل) تھی ، مذکورۂ بالا ناقدوں اور مورخوں میں سے کسی نے خود کتاب نہیں دیکھی ، صرف ایک دوسرے کے بیان پر اعتماد کر کے زیرنظر ڈرامے کے متعلق اپنی رائے لکھ دی اور مسلسل غلطیوں کی تکرار ہوتی رہی - اب ذیل میں ڈرامے کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے

## ڈرامے کا خلاصہ

ایک بوڑھا "لال خان" جس کی عمر اسّی نوّے سال ہے ، ایک پندرہ سولہ سال کی حسین و جمیل خاتون سے جس کا نام "ماہ لقا عرف "بیمار بلبل" ہے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کو اس کے والدین سے اس شرط پر لے آتا ہے کہ ایک مہینہ اپنے یہاں رکھ کر اس کی چال

۱۶ع) احمد حسین وافر: "بیمار بلبل" صفحہ - ۲
۱۷ع) ایضاً صفحہ ۳۸ -
۱۸ع) ایضاً صفحہ ۲۰ -

چلن کا معائنہ اور محاسبہ کرے گا، اگر وہ اس معیار پر پوری اتری اور اس سے بھی لال خاں کو پسند کیا تو وہ اس سے شادی کریگا ، ورنہ خاتون کو اس کے والدین کے سپرد کردے گا، اور ہرجانے کے طور پر بیس ہزار اشرفیاں اس کے والدین کو ادا کرے گا ۔

لال خاں کا حبشی غلام "پنبے" اور اس کی ملازمہ "عظمت بی" دونوں اس خاتون کی نگرانی پر متعین کئے جاتے ہیں تاکہ وہ لال خاں کے مکان سے فرار ہونے نہ پائے ۔ لیکن ماہ لقا، لال خاں کو پسند نہیں کرتی کیوں کہ وہ کافی بوڑھا ہوچکا ہے ، دراصل اس کا تعلق ایک نوجوان فرہاد سے ہے جو اس پر عاشق ہے ۔ لال خاں ایک رات کے لئے گھر سے کہیں باہر سفر میں جانا چاہتا ہے ، عظمت بی کو بلاکر ہدایت کرتا ہے کہ ماہ لقا کی بڑی شدت کے ساتھ نگرانی کرے ۔ اس کے بعد اسے مکان کے تمام دروازوں کی کنجیاں حوالے کرتا ہے تاکہ انہیں بند کردیا جائے ۔ عظمت بی کی وفاداری پر شبہ کرتے ہوئے لال خاں اپنے غلام پنبے کو ہدایت کرتا ہے کہ رات کے وقت وہ مکان کے صدر دروازے پر ایک بڑا سا تالا لگا کر ہوشیاری سے پہرہ دے ، تاکہ کسی اور شخص کا یہاں گزر نہ ہو ، واپسی کے بعد وہ پنبے کو انعام دینے کا وعدہ کرتا ہے ، اس پر پنبے خوش ہوکر اپنے مالک کا حکم بجا لانے کی حامی بھرتا ہے ۔

لال خاں کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاکر فرہاد ایک گویئے کا بھیس بدلتا ہے ، ایک آنکھ میں پٹی باندھ کر اندھا بن جاتا ہے اور ایک پاؤں سے لنگڑاتے ہوئے ، سارنگی لے کر لال خاں کے مکان پر پہنچ جاتا ہے، پنبے سے خوشامد کے لہجے میں کہتا ہے کہ وہ اس کو گانا سناکر محظوظ کرنا چاہتا ہے اس کے بعد شامپین ( شراب کی ایک قسم) کی ایک بوتل پنبے کے حوالے کرتا ہے ، پنبے اس سے بہت خوش ہوتا ہے ، عظمت بی گویئے سے کہتی ہے کہ وہ یہاں سے چلا جائے کیونکہ اس کے آقا کا حکم نہیں ہے کہ کوئی اجنبی یہاں آئے ، لیکن اس کی ظاہری شکل و صورت دیکھ کر عظمت بی کو اس پر ترس آجاتا ہے اور وہ اسے اس شرط پر یہاں ٹھہرنے کی اجازت دیتی ہے کہ گانا سنا کر عظمت بی کو خوش کرے ، اس کے بعد عظمت بی ماہ لقا سے کہتی ہے کہ بی بی تم یہاں سے چلی جاؤ اس اجنبی کے سامنے رہنا مناسب نہیں ، ماہ لقا گھر کے قیدوبند سے عاجز آکر عظمت بی کی اجازت سے ملحقہ باغ میں سیر کے لئے چلی جاتی ہے گویّا بھی عظمت بی اور پنبے کی رضامندی سے جالی کے اندر سے باغ میں داخل ہوجاتا ہے ، عظمت بی کی خوشامد کرکے گویّا ( فرہاد ) ماہ لقا سے ملاقات کرتا ہے ، پھر سب مل کر باغ میں گانے میں مگن ہوجاتے ہیں ، یک بیک لال خاں واپس آجاتا ہے اور باغ میں سارنگی کی آواز

سن کر پنبیے سے دریافت کرتا ھے کہ یہ آواز باغ سے کیوں آرھی ھے ، وہ جواب دیتا ھے کہ وھاں ماہ لقا اور فرہاد موجود ھیں ، لال خاں جب باغ میں داخل ہوتا ھے تو عظمت بی اور فرہاد اسے دیکھ کر ڈر جاتے ھیں ، وہ فرہاد سے پوچھتا ھے کہ وہ کون ھے اور کیسے یہاں داخل ہوا ، اور اس کی متاع خاص پر اس نے دست درازی کا ارادہ کیوں کیا ؟ فرہاد اپنی تقصیر کی معافی چاہتا ھے ، لیکن لال خاں برہم ہوجاتا ھے اور فرہاد کا ہاتھ پکڑ کے کہتا ھے کہ وہ اسے یہاں آنے کا مزا چکھائے گا یک بیک غیب سے آواز آتی ھے کہ اس نوجوان ( فرہاد ) پر ظلم و ستم نہ کر اپنی عاجزی اور معافی کے پیش نظر یہ قابل رحم ھے ۔ پھر لال خاں اپنی جہالت اور حماقت پر افسوس کا اظہار کرتا ھے کہ اس نے اسّی نوّے سال کی عمر میں ایک نوجوان خاتون سے شادی کا جو ارادہ کیا وہ سراسر غلط ھے ، اس کے بعد لال خاں نادم ہوکر فرہاد کے ھاتھ میں ماہ لقا (بلبل بیمار) کا ہاتھ دے کر اسے فرہاد کے حوالے کردیتا ھے اس طرح دونوں بچھڑے دلوں کی آرزو پوری ہوتی ھے اور ڈرامے کا اختتام ایک خوشگوار فضا میں ہوتا ھے ۔

### مطبوعہ نسخے کی کیفیت

"بیمار بلبل" کا موجودہ نسخہ جس کی تقطیع ۸ ½ × ۵ ½ انچ ھے اور جو نئی ترتیب و حاشیہ کے ساتھ اشاعت کی منزل میں ھے ۔ دراصل شفاء الملک حبیب الرحمن صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانے کا واحد نسخہ ھے جو اب منتقل ہوکر ڈھاکا یونیورسٹی کے حبیب الرحمن کلیکشن (۲۰۰۰۰۹) میں آگیا ھے ——— عشرت رحمانی صاحب نے پہلی بار اپنی کتاب " اردو ڈرامہ —"تاریخ وتنقید" میں جب اس کا تذکرہ کیا تو میرے ذہن میں ایک خلش پیدا ہوئی ، چنانچہ تلاش بسیار کے بعد یہ مطبوعہ نسخہ دستیاب ہوا تو رحمانی صاحب کے مذکورہ نسخے سے مختلف نظر آیا ، پھر حکیم حبیب الرحمن صاحب کے "ثلاثۂ غسالہ" کی تلاش شروع ہوئی جو کئی سال بعد ڈھاکا یونیورسٹی میں منتقل ہوکر آگیا تو اس کی ورق گردانی کی اور اس کی روشنی میں پروفیسر اقبال عظیم صاحب کے بیانات کو سامنے رکھا جس کا تذکرہ انہوں نے " مشرقی " بنگال میں اردو" میں کیا ھے یہ بات قابل توجہ بھی ھے کہ رحمانی صاحب نے ڈرامے کے کئی ایکٹ کا جو متن اپنی مذکورہ کتاب (صفحہ ۳۵۳ سے ۳۶۵ تک ) میں پیش کیا ھے، وہ موجودہ متن سے قطعی مختلف ھے ، نام کا اختلاف تو خیر ھے ھی لیکن رحمانی صاحب کے یہاں متن بھی تفصیلی ھے ، کچھ غزلیں نئی ھیں اور ان کا ادبی و فنی معیار نسبتاً بہتر ھے ، اس میں ایکٹ اور سین کی تقسیم بھی کی گئی ھے اور دو کردار بھی زیادہ ھیں مثلاً گل رو ، اور گل

رخ ، عظمت بی کی جگہ عظمت ماما اور فرہاد کے بدلے دل فریب کا کردار ڈرامے کی زینت ہے ، لال خاں کی عمر سو اسو سال بتائی گئی ہے جب کہ مطبوعہ نسخے میں لال خاں کی عمر اسّی نوّے سال ہے۔ معلوم نہیں رحمانی صاحب کو یہ متن کس سے ملا ؟ لیکن ان کا متن ، موجودہ متن سے ہر لحاظ سے بہتر ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی شستہ ، شگفتہ اور جاذب توجہ ہے ، اس لحاظ سے اندرسبھائی دور کے ڈراموں میں نہ صرف نثری مکالموں بلکہ دیگر خصوصیات کے لحاظ سے بھی اسے امتیازی حیثیت حاصل ہے گمان غالب یہ ہے کہ کسی نے اس پر نظرثانی کے سلسلے میں کافی حذف و اضافہ کیا ہے ، چنانچہ اسی کی ترقی یافتہ صورت یقیناً اس کی مقبولیت میں اضافے کی ضامن ہوسکتی ہے ۔

زیرترتیب متن کلکتہ والے لوہا ٹائپ میں " محمدی پریس "ڈھاکے سے شائع کیا گیا ہے ، کمپوزیٹر کی کم توجہی کی وجہ سے بعض الفاظ اس طرح چھپے ہیں کہ ان کا پڑھنا دشوار ہے اور بعض الفاظ اس طرح ملا کر لکھے گئے ہیں کہ سیاق و سباق اور قرینے کی وجہ سے ان کا پڑھنا مشکل نہیں ، معروف اور مجہول کا فرق بھی ٹائپ میں ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے ۔ اس ڈرامے کی ایک زیر اکس کاپی راجشاہی یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔

## ادبی و فنی تجزیہ

لکھنؤ کے قرب و جوار کی ہندو معاشرت میں جس طرح رہس کا رواج تھا اور اس کے زیر اثر واجدعلی شاہ کا رہس قیصر ،باغ میں اسٹیج کیا گیا اور امانت کی " اندرسبھا" کی تخلیق عمل میں آئی ۔ اسی طرح ڈھاکے میں ہندوؤں کے معاشرتی اور مذہبی تہواروں میں رقص و موسیقی اور ان میں مسلمانوں کی دوش بہ دوش شرکت اردو اسٹیج کی ترتیب و تنظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ، وافر جہاں گیرنگری کے بیمار بلبل کا تعلق اندرسبھائی دور سے ہے ، اس لئے کہ ڈھاکے کے ادبی اور معاشرتی ماحول میں ڈرامے اسٹیج کرنے کا سلسلہ انیسویں صدی کے وسط سے ہی شروع ہوچکا تھا جس کی تفصیل مشرقی بنگال میں ڈرامے کے آغاز و ارتقاء کے پس منظر کے تحت اوپر آچکی ہے ، "بیمار بلبل" کا ادبی اور فنی تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلے ہماری نظروں کے سامنے یہ غزل آتی ہے جسے ڈرامے کے آغاز میں ایک نغمہ سرا نے پیش کی ہے :

تماشا صاحبو !کچھ آج تو دیکھئے بھلا
عجب اک محفل سرور ہے اور ہوش ربا

کھیل تو بلبل بیمار کا ہوگا یارو
جس میں پیروں کی ہیں ثابت محبوجوں ہوا

بعد تشویش کے بوڑھوں کو ہوا سوچ خطر
بھلا پیدا انہیں کچھ جن کو ہوا خوف عطا

حاشیہ عسرت ہے، محبتّو ہے ضعیفی، درپیش
عیش پیری کو کرو ترک، جیو سحہ خدا

لال خاں کی طرح کیجو نہ خطا پیری میں
ورنہ افسوس کروگے تو پھر اے اہل ذکا

قول و اقرکا نہیں، قول ہے دانا‌ؤں کا
چاہیئے ساتھ میں لانا محبتّو! صدق وصفا

اس غزل کے مطالعے کے بعد ڈرامے کے مرکزی خیال کی وضاحت کسی قدر ہوجاتی ہے ، البتہ قاری اس کی تفصیل کا متقاضی ہوتا ہے لیکن ڈرامہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس سے قاری کے ذہن میں کوئی کش مکش پیدا نہیں ہوتی جسے کسی ڈرامے کی نمایاں خصوصیت تصور کیا جاتا ہے ۔

"بیمار بلبل "کے کردار ہماری آپ کی دنیا میں رہنے والے اشخاص ہیں ان کی گفتگو اور ان کا سلوک ہمارے ہی جیسے انسانوں کی طرح ہے ، ان کے کردار کا نفسیاتی پہلو بھی انسانی فطرت کی عکاسی کرتا ہے ، لیکن "بیمار بلبل " اس نوعیت سے "اندرسبھا" کے مقابلے میں مختلف ہے کہ اس میں دیو پری اور فوق فطرت عناصر نہیں پائے جاتے اور نہ کہیں مجلس رقص منعقد ہوتی ہے ، اگرچہ پوری کتاب منظوم مکالموں سے بھری پڑی ہے لیکن منثور مکالمے بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اندرسبھائی دور کے ڈراموں میں شاید یہ پہلا ڈراما ہے جس میں نثری مکالمے سب سے زیادہ اور نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں ۔ "اندرسبھا" میں محض چند مقامات پر نثری مکالموں کا استعمال ہوا ہے جسے "بیمار بلبل" کے مقابلے میں برائے نام کہا جاسکتا ہے ۔

زبان و بیان میں روانی ، شگفتگی نہیں جس کا سبب بعض جگہ غلط الفاظ و محاورات کا استعمال ہے جس کی وضاحت مصنف نے کتاب کے دیباچے میں کردی ہے کہ ایسا دانستہ طور پر کیا گیا ہے ، البتہ لال خاں کے جتی غلام (پنبیے) کی گفتگو کے انداز میں مسخرا پن ہے اور جو الفاظ اس کی زبان سے جس طرح ادا ہوئے ہیں ، مصنف نے تحریر میں ضبط کرتے وقت اسی طرح اس کا اہتمام کیا ہے ، پھر یہ کہ جتی غلام سے شستہ اور سلیس زبان کی توقع بیجا ہے مثلا لال خاں جب کہتا ہے کہ میں سفر کو جاتا ہوں ، آج شب کو نہیں آؤں گا تو اسکی گفتگو کا لب و لہجہ ملاحظہ ہو ۔ وہ کہتا ہے :"

پنبیے: مت آؤ چاب
لال خاں: ارے گدھا دیکھ مکان .. میں ہوشیاری سے رہنا ،کوئی اندر آنے نہ پاوے ۔
پنبیے: چوٹی آوے چاب تو

لال خان: ارے کیا بکتا ھے
پنمبے: ھاتی آوے تو
لال خان: آنکھیں لال کر کے ( اور بعد توقف کے ) دیکھ ہوشیاری سے رہنا ، دروازے پر چوکی دینی پھر کل تجھ کو میں خوب سا انعام دوں گا ، نہیں توتیرا سر اور میری جوتی ۔
پنمبے: بہت سا انعام دوگے جاب ، اگر ہوشیاری سے نہ رھوں جاب تو تمرا چیر اور میرا حوتی ۔

پنمبے کے کردار کا یہ پہلو مضحکہ خیز ھی نہیں ، دلچسپ بھی ھےکہ وہ گانا بھی انگریزی دھن میں گاتاھے مثلاً ۔

صاحب کا اپنے میں خریدہ ہوں غلام
کرتا ہوں کام ۔ بھرتا ہوں حام
صبح سے تا شام
اپنی خصال سے کھاتے ہیں حوتی ہم
رکھتے قوم ۔ ساز سے بہم
بھرتے دم بہ دم

منظوم مکالموں کے طور پر جو غزلیں ، مستزاد اور دیگر اصناف سخن میں پیش کی گئی ہیں ، انھیں شاعرانہ نقطۂ نظر سے معیاری نہیں کہاجاسکتا ہر صنف سخن سے پہلے شاعرنے چوں کہ موسیقی کی دھن ، راگ اور تال کی طرف خصوصیت کے ساتھ اشارے کردئیے ہیں جس سے پتہ چلتا ھے کہ یہ منظومے اسی ھدایت کے مطابق موزوں کئے گئے ہیں اور اسی کے پیش نظر ترنم سے ادا بھی کئے جاتے ہیں گویا یہی معنی ڈرامے میں غنائی پہلو کو ترجیح دی گئی ھے ، اسی لئے زبان و بیان تمام تر موسیقی کے تابع ہوگئے ہیں ، اور شاعری کا فن بھی ادبی معیار کے نقطۂ نظر سے ابھر نہ سکا ھے ۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ھے کہ ڈرامے کی ابتداء سے انتہا تک جتنی غزلیں پیش کی گئی ہیں ان کا تعلق ڈرامے میں پیش آنے والے واقعات و حادثات اور کردار و گفتار سے کہاں تک مطابقت رکھتا ھے ، اس سلسلے میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ غزلوں کی زبان اگرچہ ناہموار ھے اور ان میں تصنع بھی پایا جاتا ھے لیکن کہیں بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا ، آغاز سے انجام تک محل و قوع سے ان اشعار کی نوعیت اور مطابقت اپنی جگہ برقرار رہتی ھے ، اور کرداروں کی ذہنی کیفیت کا ان سے اظہار ہوتا ھے ، مثال کے طور پر لال خاں کی گفتگو ہو یا فرہاد کا مکالمہ یا کسی اور کردار کی زبانی جو غزلیں ادا ہوئی ہیں ، ان میں واقعات و حالات کا اظہار بھی ہوتا ھے اور مطابقت و صراحت بھی پائی جاتی ھے

اردو شاعری میں مخاطبت مرد کی طرف سے ہوتی ھے لیکن اس ڈرامے کی ہیروئن ماہ لقا ( بیمار بلبل ) ۔ نے جہاں اپنے دلی جذبات و خیالات کی کیفیت پیش کی ھے ، اس سے صاف ظاہر ہوتا ھے کہ اظہار عشق عورت کی طرف

باقی صفحہ ۱۳۰ پر

# سوچئے تو!

مختار زمی

ایسا مشرقی صفت، طرفہ طبیعت، تحفۂ انسان بھی خاک کے پردے سے کم نکلتا ہے۔ پیدائش ایک معمولی تاجر کے گھر میں ہوئی، تعلیم لندن میں، پیشہ وکالت، لباس سوٹ بوٹ دیکھو تو عین یبن انگریز ـــ اصولوں کے معاملے میں فولاد کی سی سختی مگر ٹھکرائے ہوؤں کا معاملہ آئے تو دل میں نرم گوشہ، مخالفین سامنے ہوں تو شمشیر براں، ڈرائینگ روم میں پرائیویٹ محفل دوستاں ہو تو لطیفوں کی پھلجڑیاں ـــ ایسی شکل وصورت، عادت وخصلت ایمان واصول، نفاست ولیاقت کا آدمی اس صدی میں دور دور تک نظر نہیں آتا ـــ مگر قدرت کے بھید کون جان سکتا ہے۔ عجیب ماجرا ہے کہ اللہ میاں نے کسی بجتے، قبّے والے صاحب ریش و بروت، مخزن علوم دینی مولوی کے بجائے اسی "مسٹر" کہلانے والے شخص یعنی بیرسٹر محمد علی جناح کو منتخب کیا کہ وہ اس کرۂ عظیم پر عظیم اسلامی مملکت پاکستان کا قیام عمل میں لائے چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو جب سورج طلوع ہوا تو اس کا لمبی لمبی انگلیوں والا ہاتھ کروڑوں آدمیوں کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ چکا تھا ـــ کانگریس جیسی طاقتور، منظم اکثریتی پارٹی اور برطانیہ جیسی باجبروت، تجربہ کار، سامراجی طاقت کی مخالفت کے باوجود آزاد پاکستان کا وجود میں آنا اس صدی کا سیاسی معجزہ ہے۔ لیکن جس شخص کے ہاتھوں یہ کام سرانجام پایا اس کی شخصیت بھی معجزے سے کم نہیں۔ اس کی قیادت کا سورج طلوع ہوا تو فرقہ واریت، صوبائی عصبیت اور نسب ونسل کے دیئے بجھ گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پہلی دفعہ تمام مسلمان صرف بحیثیت مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ جو کام بڑے بڑے عالم نہ کر سکے تھے وہ اس نے کر دکھایا۔ ع

جو کام کیا اُس نے وہ رستم سے نہ ہو گا۔

پُرانے پُرانے گھاگ سیاست داں، علماء واتقیا اور دس کروڑ مسلمان اس کے پیچھے تھے اور پاکستان ان کی منزل تھی حالانکہ ان میں سے آدھے یہ جانتے تھے کہ پاکستان ان کے رہنے کے لئے نہیں بن رہا بلکہ ان کے مغربی ومشرقی بھائیوں کے لئے بنے گا۔

مسلمان بھی عجیب قوم ہیں۔ مٹھی بھر تھے جب اس برصغیر میں وارد ہوئے۔ یہاں کے غیر مسلم مسلمان ہوئے تو وہ بھی اس برادری میں شامل ہو گئے۔ اپنی زبانیں عربی، فارسی، ترکی چھوڑ کر ایک نئی زبان کی بنیاد ڈالی تاکہ مقامی لوگوں سے رابطہ قائم ہو۔ لباس بدلے، رہن سہن، کھانے پینے کے طریقے بدلے، میل جول سے ایک نئی تہذیب کی داغ بیل پڑی۔ اس میں چپقلش بھی ہوتی رہی لیکن رہے پھر بھی مسلمان اور اپنا الگ تشخص قائم رکھا۔ ایک مغربی مورخ نے لکھا کہ ہندوستان ایک عظیم الشان کڑھاؤ کی طرح ہے جو آیا اس میں گر گیا، اُبلتا رہا، پکتا رہا۔ یہاں تک کہ سب پک کر یک جان ہو گئے ـــ صرف مسلمانوں نے مدغم ہونے سے انکار کر دیا۔ ہندو سماج چاہتا تھا کہ وہ اپنا تشخص بھول جائیں۔ بعض نے تو

یہاں تک کہا کہ اچھا تم اپنا اللہ کو پوجتے رہو، اپنے رسول کو مانتے رہو، ہمارے یہاں بھی کوئی کالی کو پوجتا ہے کوئی پاربتی کو مگر تم ہندو بن جاؤ ہم تمہیں "محمدی ہندو" کہیں گے۔ چلو ایک ذات کا اضافہ اور سہی۔ لیکن چاہے ترک ہو، چاہے عرب، ایرانی ہو یا افغانی۔ کوئی بھی اس اپنے گڑھاؤ میں گرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ بس سارے جھگڑے کی بنا یہی تھی کہ مچھلی، مگرمچھ کے پیٹ میں جانے کو تیار نہ تھی۔ ہاں ساتھ رہنے کو تیار تھی ۔۔۔ انگریز آیا تو اس نے مسئلہ کو سامراجی آنکھ سے دیکھا کہ یہاں لڑاؤ اور حکومت کرو کا اصول خوب چل سکتا ہے ۔۔۔ اصل مسئلہ اس وقت ابھرا جب انگریز نے قسطوں میں آزادی دینے کا فیصلہ کیا۔ کچھ حقوق ۱۹۰۹ء میں دیئے کچھ ۱۹۱۹ء میں اور ۱۹۳۵ء میں تو صوبائی حکومتیں تک بنانے کا موقع آگیا۔ اگر ہندوستان کی پوری جنتا انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتی اور بغاوت کرتی تو شاید ہندو مسلمان ساتھ ساتھ لڑتے، فتح حاصل ہو جاتی تو پھر اقتدار و طاقت کی تقسیم میں حصہ بناتے۔ لیکن گاندھی جی بے حد دور بین آدمی تھے۔ ہتھیاروں سے لڑنے کا معاملہ ہوتا تو مسلمان آگے آگے ہوتے اس لئے انہوں نے اہنسا، قانونی، آئینی، عدم تشدد والی لڑائی کا ڈھول ڈالا۔ بساط سیاست پر شطرنج کا کھیل شروع ہوا۔ اب تلواریں نیام سے نکالنے کا سوال ہی نہ تھا اس لئے مسلمانوں کو بھی اپنی الگ سیاسی جماعت بنانی پڑی۔ بساط پر کھیل ہوتا رہا۔ گاندھی جی نے شہمات دینے کے لئے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ مگر قدرت نے ان سے نمٹنے کے لئے ہمیں بھی ایک ماہر کی خدمات ارزاں فرما دیں۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ جنگ عظیم دوم کے بعد انگریز کمزور پڑ رہا ہے تو نعرہ لگا دیا کہ "ہندوستان چھوڑ دو ۔۔۔" قائداعظم نے ترنت سے جوابی نعرہ لگا دیا کہ "چھوڑ دو لیکن تقسیم کر کے چھوڑ دو۔" اب آپ

ذرا مڑ کر تاریخ پر نظر ڈال لیجئے تو معلوم ہوگا کہ قائد ہمارے لئے کتنی بڑی نعمت مترقبہ تھے۔ عمر کی آخری منزل صحت جواب دے چکی ہے۔ ان کے سامنے کانگریس اور برطانوی سامراج کے انتہائی تیز طرار، تجربہ کار اور لائق مخالف ہیں اور وہ تقریباً تنہا۔ ان حالات میں انہوں نے جس طرح اپنے عزم و ہمت سے مخالفوں کو مات دی وہ انہیں کا کارنامہ ہے۔ کوئی اور ہوتا تو خون تھوک دیتا۔ ایک ایک نکتے ایک ایک لفظ پر بحث ہو رہی ہے اور صدارت کی کرسی پر نہرو کا دوست، پاکستان کا مخالف ماونٹ بیٹن بیٹھا ہے۔ اب ذرا تاریخ کو غور سے دیکھئے۔ اگر قائد نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ بے شک ہندوستان آزاد ہوتا۔ مگر انگریز سارا اقتدار گاندھی جی اور نہرو جی اور پٹیل کو سونپ کر چل دیتا۔ بے شک جمہوریت قائم ہو جاتی۔ مگر کیسی جمہوریت؟ مسٹر جناح سے ایک دفعہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ "آپ ہمارے بھائی ہیں۔" مسٹر جناح نے جواب دیا "ہاں بھائی تو ضرور ہیں مگر فرق یہ ہے کہ "بھائی" گاندھی کے پاس تین ووٹ ہیں اور میرے پاس صرف ایک۔" عام جمہوری اصول ہے کہ جس کے ووٹ زیادہ ہیں وہی حاکم ہوگا۔ بڑا خوبصورت اصول ہے۔ مگر برصغیر کے پس منظر میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو ہمیشہ ہمیشہ حاکم رہیں گے اور مسلمان قیامت تک حکومت کی کرسی حاصل نہ کر سکیں گے۔ اس لئے کہ اس جنوبی ایشیا میں تو الا ماشاء اللہ ہندو ہندو کو اور مسلمان مسلمان ہی کو عموماً ووٹ دیتے ہیں۔ اسی لئے تو جداگانہ انتخاب اور مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کا اصول ضروری ہوا۔ یہاں عام معنوں میں جمہوریت کا اصول برگ و بار نہیں لا سکتا۔ جمہوریت تو وہاں چلتی ہے جہاں اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں سیاسی حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ آج ٹوری پارٹی کی حکومت ہے تو کل لیبر کی حکومت آسکتی ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے معاشرہ ایک قوم یا ایک جیسی

قوم پر مشتمل ہو۔ جس قوم نے گڑھاؤں میں گرنے سے انکار کر دیا اور تقریباً ۸۰۰ برس سے الگ ہے۔ دوستی اور بھائی چارے کی چند مثالوں کے باوجود آپس میں نہ شادی بیاہ ہو سکتا ہے نہ ساتھ کھانا پینا ممکن ہے، نہ مذہب ایک، نہ رسم و رواج صدیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود ایک ہوئے اس معاشرے میں ایک آدمی ایک ووٹ والی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے؟ لہٰذا جب سیاسی اقتدار میں حصہ داری کا سوال اٹھا تو ثابت ہو گیا کہ مسلمان الگ قوم ہیں اور الگ قوم ہیں تو انہیں بھی ایک خطۂ زمین ملنا چاہیئے۔ جہاں ان کی اپنی حکومت ہو، وہ خطۂ زمین کہاں سے آئے؟ حسن اتفاق یہ کہ مشرق و مغرب میں ان کی اکثریت تھی۔ لہٰذا جواب ظاہر ہے کہ جہاں جس کی اکثریت ہے وہ اپنا اپنا ملک سنبھال لے۔

قائداعظم نے بتدریج منطقی سیاست کا یہ انداز اختیار کیا کہ پہلے تمام مسلمانوں کو بلا تفریق نسل و صوبہ و فرقہ ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ پھر ان کے الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر اس قوم کے لئے الگ ملک بنانے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ یہ قوم والا قصہ جھوٹ ہے کل جن کے باپ دادا ہندو تھے انہوں نے آج کلمہ پڑھ لیا تو وہ الگ قوم کیسے ہو گئے۔ یہ تو ہمارے ہی لوگ ہیں۔ قائد کی طرف سے جواب آیا کہ "آپ ہی نے تو الگ کیا۔ جہاں کسی نے کلمہ پڑھا آپ نے اسے ذات باہر کر دیا۔ اس سے شادی بیاہ تو درکنار چھوت چھات کی دیوار کھڑی کر دی۔ پھر وہ آپ کے لوگ کہاں رہے؟ اب وہ اپنا الگ ملک مانگتے ہیں تو کون سا گناہ کرتے ہیں۔ اس الگ قوم کی بنیاد تو اسی دن پڑ گئی تھی جس دن پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔

مگر کانگریس کے پاس پیسہ تھا، ہزاروں ورکر تھے۔ وہ آسانی سے کیوں مان لیتے کہ قائد کا دعویٰ انصاف پر مبنی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ دعویٰ غلط ہے اور قائداعظم اور ان کی لیگ صرف چند مفاد پرستوں کی جماعت ہے۔ قائد نے کہا کہ اچھا تو پھر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ الیکشن کرا کے دیکھ لو۔ اگر مسلم اکثریت کہے کہ وہ پاکستان چاہتی ہے تو منظور کر لو۔ اگر مخالف ووٹ زیادہ ہوں تو ہمارا دعویٰ کالعدم۔ انگریز نے کہا کہ ہاں یہ ترکیب ٹھیک ہے اور منصفانہ بھی ہے۔ چنانچہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں الیکشن ہوئے تو معلوم ہوا کہ قائداعظم کا دعویٰ سو فیصد درست ہے۔ الیکشن میں کس طرح عظیم الشان، دولت مند اور تجربہ کار کانگریس پارٹی سے مقابلہ ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا تو کس طرح امیر و غریب مسلمانوں اور خصوصاً مسلمان طالب علموں اور نوجوانوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بڑے بڑے بتوں کو سرنگوں کیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ووٹوں کے زور پر پاکستان بن گیا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ یہ ایک سیاسی عمل کا نتیجہ تھا۔ اس میں فتح نہ فوج کی گولی سے ہوئی نہ کسی بیرونی طاقت کے بل پر بلکہ مسلمانوں نے قیادت کے پیچھے چل کر منزل کو پا لیا۔ پاکستان کے بنانے میں ان مسلمانوں کی محنت اور خون پسینہ بھی شامل ہے جو اقلیتی علاقوں میں رہتے تھے۔ اور جہاں پاکستان بننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اگر وہ ووٹ نہ دیتے تو قیامت تک یہ ملک نہ بن سکتا تھا۔

قائداعظم نے بطور گورنر جنرل ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مجلس آئین ساز میں جو خطبہ دیا وہ ایک شاہکار سیاسی دستاویز ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے اسے بھلا رکھا ہے۔ آیئے ہم صرف چند نکات کو دہرائیں جن پر قائداعظم نے زور دیا تھا۔

انہوں نے کہا: آپ بے شک مجھ سے اتفاق کریں گے کہ حکومت کا پہلا فرض لا اینڈ آرڈر برقرار رکھنا ہے تاکہ لوگوں کی زندگی مال و اسباب اور مذہبی عقائد کا اسٹیٹ کی طرف سے پورا دفاع کیا جا سکے۔ دوسری لعنت جس کی زد میں پورا ہندوستان بصورت شدید

اور بے ایمانی ہے۔ یہ دراصل ایک زہر ہے۔ اس کا خاتمہ سختی سے کرنا چاہیئے۔ چور بازاری تیسری لعنت ہے جو سماج کے خلاف ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اس "جن" کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ چوتھے اقربا پروری اور بدعنوانی ایسی سخت برائیاں ہیں جنہیں کچل دینا لازم ہے۔ انہوں نے فرمایا "میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ میں کسی قسم کی اقربا پروری، بے ایمانی، براہ راست یا بالواسطہ اثر یا دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ پاکستان کو خوشحال بنانے کے لئے عوام الناس اور خصوصاً غریب آدمیوں کی فلاح کے لئے کوششیں کرنا ضروری ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خواہ آپ کا رنگ، ذات، مذہب کچھ بھی ہو آپ سب پاکستان کے شہری ہیں۔ آپ سب کے حقوق برابر ہیں۔ انہوں نے ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی، پنجابی، پٹھان، بنگالی، مدراسی اور اسی قسم کی دوسری گروہ بندیوں سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کی تقریر کا آخری حصہ سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ "آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں اور مسجدوں یا جو بھی آپ کی عبادت گاہ ہو وہاں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ ہم اس بنیادی اصول کے مطابق آغاز کار کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک اسٹیٹ کے شہری ہیں جن کے حقوق برابر ہیں۔"

یہ اس کے خیالات کا مجمل خاکہ ہے جس نے ہمارے لئے یہ گھر تعمیر کر کے ہمیں دیا تھا۔ مگر ہم نے کیا کیا؟ ہم نے بڑی تن دہی سے باری باری اور باضابطہ طور پر اس خیال و عمل کی جڑ کاٹی جو قائد نے سکھائے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ لا اینڈ آرڈر یا نظم و نسق قائم کرنا حکومت کا اولین فرض ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں کراچی میں ذرا ہی سا جھگڑا ہوا تھا کہ ان کی حکومت نے اسے پوری سختی سے کچل ڈالا مگر اب یہاں صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ نہ کسی کی پگڑی سلامت ہے نہ جان، نہ مال۔ ڈاکو، لٹیرے اور قاتل دندناتے پھرتے ہیں اور ان کا کوئی کچھ

نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ کہتے تھے کہ عقائد کا تحفظ ضروری ہے۔ یہاں فرقہ وارانہ فساد، مسجدوں کے بٹوارے اور ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے اصول زندگی بن چکے ہیں۔ دین کی باتیں بڑی اونچی آوازیں سن لو مگر عدل و اخلاق کے خلاف وارداتیں روز کا معمول ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اقربا پروری، بدعنوانی، سفارش کے دباؤ باطل ہیں۔ ہم نے سماج کی بنیاد ہی بدعنوانی اور بے ایمانی پر رکھ دی۔ وہ کہتے تھے کہ سب شہری برابر ہیں۔ صوبائی عصبیت یا گروہ بندیاں غلط ہیں۔ ہمارا رویہ یہ ہے کہ گروہ در گروہ بٹتے چلے جا رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ، لسانی، نسلی، صوبائی، قبیلوں اور طبقوں کی باقاعدہ جماعتیں بن رہی ہیں۔ بلکہ اب تو ملکی سیاست کا یہی چلن قرار پایا ہے کہ عامۃ الناس کی سیاسی اور اقتصادی بہبود کے بجائے اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راج ورنہ تاخت و تاراج کہاں کی قوم، کیسی ملت، بس لوٹتے پیٹتے، بانٹتے چلے جاؤ۔ آئندہ چل کر شاید یہ بھی سننے میں آئے تو تعجب نہیں کہ "یہ ملی مجلس طویل القامتاں ہے" اور وہ "ادارۂ ریش درازاں" ادھر "آل پاکستان جمعیت کوتاہ آستیناں ہے۔ ادھر قومی جماعت دراز دستاں ہے" جب قوم کو تقسیم ہی کرنا ہے اور شیرازہ بکھیرنا ہی مقصد حیات ٹھہرا تو ریزہ ریزہ کرنے کے سو بہانے اور ہزار طریقے موجود ہیں۔ یہ حقیقت نظروں سے اوجھل ہوتی چلی جا رہی ہے کہ پاکستان ایک عظیم ملک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شروع شروع میں اس نے دنیا کی سیاست عربوں اور فلسطینیوں اور نو آبادیاتی ملکوں کی آزادی کے لئے کارہائے نمایاں کئے۔ اگر قائد کے اصولوں پر چلا جائے تو عوام کا معیار زندگی کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا اور اخلاقی اقدار سیاست کی بنیاد بن جائے گی۔ ہر صوبے کے ہر آدمی کو جب برابر کے حقوق ملیں اور ترقی کے راستے سب کے لئے کھول دیئے جائیں۔ رشوت اور اقربا پروری کا خاتمہ ہو جائے تو پھر سندھیوں، بلوچیوں یا دوسرے گروہوں کو

کیوں شکایت ہوگی ؟ سارا جھگڑا تو اسی لئے پیدا ہوا کہ زمیندار اور نوکر شاہی کا گٹھ جوڑ ہے اور چند لوگ پیر تسمہ پا کی طرح لوگوں کی گردن پر سوار ہیں۔ ہمارے پاس وسائل بھی ہیں، آبادی بھی کافی ہے، باقی بھی بہت ہیں سر بھی بہت۔ بالغ رائے دہی، نیم جمہوری، نام کی جمہوری ہر طرح کی حکومتیں آزمائی جا چکی ہیں۔ اب خدا دس پانچ سال کے لئے ان عوام کو بھی موقع دیا جائے جن کے لئے یہ ملک بنا تھا۔ عدالتوں کو اور پریس کو آزاد رکھا جائے تو کیا حرج ہے۔ اگر سب یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ کاروبار حکومت میں ہر جگہ عوام کا بھی حصہ ہے بلکہ سب کچھ انہیں کے لئے انہیں کے ہاتھوں ہوگا تو شاید نیا سورج طلوع ہو کر داغ داغ اجالے کے داغوں اور مفاد پرست بد معاشوں کا صفایا کر دے۔ ضروری نہیں کہ جمہوری حکومت بہت اچھی لائق و فائق حکومت ہو مگر صرف یہی حکومت قابل قبول ہے اس لئے کہ عوام اسے جب چاہیں بدل سکتے ہیں۔ غلطیاں بھی کریں تو عوام ہی کریں گے اور صحیح راستے پر چلیں تو وہی چلیں گے۔ اس لئے کہ ذمہ داری انہیں کی ہونی چاہیئے۔ علامہ مرحوم فرماتے تھے کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مگر ذرا مٹی کو بھائیوں کے خون سے تو نم نہ کیجئے، محنت کے پسینے سے نم کیجئے۔ تب کہیں جا کر زرخیز ہوگی ورنہ بنجر بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔ چین کی بانسری تو اسی وقت بجائی جا سکتی ہے جب پہلے بانس مہیا کیا جائے۔ ایسا تو نہ ہونا چاہیئے کہ نہ رہے بانس نہ باجے بانسری۔ سوچیئے تو بنجر میں بانس کہاں ؟

---

## بقیہ : مشرقی بنگال کا ایک قدیم اردو ڈرامہ

سے کیا جارہا ہے ، یعنی اردو شاعری کی روایت کے برخلاف ایسی پیش کش ہندی شاعری کے زیر اثر وجود میں آئی ہے ۔

یہ ڈراما جس زمانے میں لکھا گیا اس کا واحد مقصد ادب سے زیادہ موسیقی کی مجلسوں کو ترتیب دینا ، سامعین کو راگ ، راگنیوں سے محظوظ کرنا ، ذہنی تفنن اور تفریح طبع کے اسباب فراہم کرنا تھا ، گویا فن کار انہیں باتوں کو فنی محاسن یا کمال فن سمجھتا تھا اس نقطہ نظر سے اسے سنگیت ناٹک کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اگرچہ اس کی تحریر و تخلیق پر ایک صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن ڈرامے کے فنی لوازم کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ڈرامے کی قدیم روایات یعنی وحدت زمان و مکان ، وحدت عمل ، اور وحدت تاثر یہ تمام خصوصیات موجود ہیں اور اس کا مجموعی تاثر غربت و افلاس ، دولت و ثروت اور پیری و جوانی کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے ۔

---

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

# عکسِ ایام



کل پاکستان ادبی کانفرنس سکھر کا ایک یادگار گروپ فوٹو (۱۹۶۱) مظہر جمیل ۔ سید انور ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، اختر انصاری اکبر آبادی، منظور حسین شور ۔ منظر ایوبی ۔ تابش احمد دہلوی ۔ آفاق صدیقی ۔ اجرہ مسرور ۔ غلام عباس ۔ وقار عظیم ۔ صبا لکھنوی حمایت علی شاعر ۔ حسن حمیدی ۔ سرور بارہ بنکوی اور شیخ ایاز



آفاق صدیقی ۔ مشتاق یوسفی ۔ شوکت عابدی اور پروفیسر عبداللہ جاوید



پروفیسر ممتاز حسین



ڈاکٹر خان رشید



بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ اسلامیہ کالج سکھر
کی ایک ادبی تقریب۔ (۱۹۶۸ء)



غلام عباس۔ آفاق صدیقی۔ ہاجرہ مسرور اور مظہر جمیل (۱۹۶۱)

جمیل ملک

# استاد

وہ ہمارے عہد کا استاد ہے
دوپہر ہو شام ہو
دستکیں دیتا ہے وہ اونچے گھروں کے پھاٹکوں پر
جن گھروں کا کوئی دروازہ نہ دل
لیکن اس کا کام اتنا مستقل
کوئی ناغہ کوئی وقفہ اس کی قسمت میں نہیں
فرصتوں کا لطفِ بے پایاں
محبت میں تو ہے لیکن ضرورت میں نہیں
اس کی مجبوری
کہ کوئی شہر آزاداں کا حاتم

اس کے اندھے علم کے طوطے کو چوگا ڈال دے
اس کو زر دے، مال دے
اس کی خواہش
اس کا بھی شاہوں، رئیسوں، حاکموں میں نام ہو
اس کو اس سے کیا غرض
اس کاروبارِ علم میں وہ نیک یا بدنام ہوا
اس کے استادوں کے نیچے تو زمین کا بوریہ تھا
اور اوپر آسماں کی شال تھی
کیا یہ کم ہے !
اس کے نیچے جگمگاتی کار ہے
وہ صبا رفتار ہے !!

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

# واپسی

سڑکوں، چھتوں، منڈیروں پر
چیلیں ہی چیلیں
ہانپتے کانپتے
ساحل یاب ہوا
شوریدہ سر موجوں کے
نرغے میں
کشتی
اک نقطہ
معدوم ہوئی!

احتشام ادیب

# صدا بہ صحرا

راہ چلنا محال ہے بابا
اک دیئے کا سوال ہے بابا
اک دیا جو اندھیری راہوں پر
ایک بے آسرا مسافر کا
ہمسفر بن سکے رفیق بنے
راہ کے پیچ و خم سجھاتا چلے
راہ سنسان و پُر خطر، تاریک
ہر طرف وحشتوں کا ڈیرا ہے
آ رہی ہے صدا درندوں کی
جسم شل ہے دماغ ہے ماؤف
رقص کرتے ہیں آنکھ کے آگے
انگنت زرد رنگ کے نقطے
سینکڑوں سرخ آتشیں حلقے
پھاڑ کر آنکھ دیکھتا ہوں مگر
ایسا لگتا ہے بند ہیں آنکھیں
کتنا گمبھیر یہ اندھیرا ہے
اس اندھیرے میں راہ پالینا
ایک خواب و خیال ہے بابا
اک دیئے کا سوال ہے بابا

انور صابر

# زمستانی ہواؤں کا نوحہ

سرد راتوں کے چہرے پہ پچھلے پہر
نرم لہجوں کی شبنم اترتی رہی ،
بھیگی نیندوں میں ڈوبی ہوئی چاندنی
زرد خوابوں کے کہرے میں ڈھلتی رہی
میں کہ ماحول کی خامشی اوڑھ کر
اپنے سندر سویروں کا غم چھوڑ کر
سوچ کی سرخ پوروں کو ملتا ہوا
موسموں کی تھکن کا لہو چاٹتا
اپنے آسیب جاں میں اترتا گیا

تیرگی کے لبوں پر مرا نام تھا
یا کہ جھیلوں کے پانی میں مرغابیاں
ہنستے نیلم کے پھولوں کے منہ چوم کر
اپنے سندر جزیروں کو جانے لگیں
اپنے آسیب جاں میں سمانے لگیں

افسر ماہ پوری

کیوں زلف بکھرتی ہے یہ کون سمجھتا ہے
کیوں زلف سنورتی ہے یہ کون سمجھتا ہے
چہرے پہ بشاشت ہے، ہونٹوں پہ ہنسی لیکن
کیا دل پہ گزرتی ہے یہ کون سمجھتا ہے
محفل میں حقارت سے مسموم نظر اُن کی
رگ رگ میں اترتی ہے یہ کون سمجھتا ہے
اِک طرفہ تماشا ہے یہ کشتِ تمنّا بھی
شعلوں سے نکھرتی ہے یہ کون سمجھتا ہے
وہ بزم میں اوروں سے جو بات بھی کرتے ہیں
کیوں مجھ کو اکھرتی ہے یہ کون سمجھتا ہے
معروف ہیں دنیا میں ہم جس کے حوالے سے
اپنی یہی دھرتی ہے یہ کون سمجھتا ہے
سرگوشیاں پھولوں سے کرتی ہے صبا افسرؔ
کیا کان وہ بھرتی ہے یہ کون سمجھتا ہے

استاد رشید انجم لکھنوی

کتنا روشن ہے تصور تیری انگڑائی کا
راستہ روک دیا ہے مری بینائی کا

میں سمندر ہوں کہیں ڈوب نہ جانا مجھ میں
تم کو اندازہ نہیں ہے مری گہرائی کا

اپنے زخموں کا مداوا تو میں کر لوں گا مگر
وہ کہاں ہیں جنھیں دعویٰ تھا مسیحائی کا

اب تماشہ جو بنا ہوں تو یہ احساس ہوا
ایک مدت سے گنہگار ہوں تنہائی کا

میں تجھے شہرۂ آفاق بنا سکتا ہوں
کوئی احسان اٹھا لے مری رسوائی کا

مکتبِ فکر میں آ، اپنے قبیلے سے نکل
بات کر مجھ سے اگر زعم ہے دانائی کا

زندگی بیت گئی شہر بتاں میں انجمؔ
اب فرشتوں سے ارادہ ہے شناسائی کا

مظفر حنفی

افق تک دھوپ کے خنجر برہنہ
مظفر پا برہنہ، سر برہنہ

بہت حساس، بے حد نرم دل تھا
بھٹکتا ہے وہ سڑکوں پر برہنہ

نہیں ہیں ہاتھ فنکاروں کے محفوظ
یدِ بیضا ابھی مت کر برہنہ

ہر اک آئینہ ہے حیران و ششدر
کھڑی ہے فکرِ شیشہ گر برہنہ

سرِ منبر جسے دیکھو پیمبر
سبھی حمّام کے اندر برہنہ

تری آنکھوں پہ پٹی مصلحت کی
مرا لاشہ لہو میں تر برہنہ

کھنچا ہے بیچ میں حرمت کا پردہ
نظر بے باک، پسِ منظر برہنہ

سہیل اختر

غموں میں آس کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
کہ تیرگی ہو تو جگنو نکل ہی آتے ہیں

ہزار گھات میں ہو وحشتِ دل کی تنہائی
تمھاری یاد کے آہو نکل ہی آتے ہیں

ہزار جبر ہو، اک روز دہشتوں کے اسیر
کفن بدوش سرِ کُو نکل ہی آتے ہیں

ہزار حبس ہو، کچھ شعر ذہنِ شاعر سے
مثالِ موجۂ خوشبو نکل ہی آتے ہیں

اگرچہ ترکِ تعلق کو اِک زمانہ ہوا
کبھی کبھی مگر آنسو نکل ہی آتے ہیں

کبھی تو آ مرے اشکوں کی سمت بھی اے دوست
کبھی تو لوگ لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

سہیل بے سر و ساماں کی سمت بھی اکثر
سفیرِ نکہتِ گیسو نکل ہی آتے ہیں

## امتیاز ساغر

وارفتگیٔ شوق اگر حد سے گذر جائے
دیوانہ انا الحق کے سمندر میں اتر جائے

میں رنگوں کی دنیا ہوں سبھی رنگ ہیں مجھ میں
میں بکھروں اگر، گیسوئے عالم بھی بکھر جائے

کشکولِ دل و جاں میں لئے دید کی حسرت
وحشی ترا وحشت میں اِدھر جائے اُدھر جائے

اتنا ہے فقط کاکلِ ہستی کا فسانہ
بکھرے ہے کبھی اور کبھی خود ہی سنور جائے

ہر رنگ میں ہر روپ میں، ہر سینۂ گل میں
جز میرے یہاں کوئی نہیں کس پہ نظر جائے

پھر چھیڑ ذرا نغمۂ ہُو بربطِ دل پر
میں رقصاں رہوں اور یوں ہی عمر گزر جائے

لے تیز ہوئی جاتی ہے زنجیر قفس کی
ایسا نہ ہو تنہائی گزیدہ کہیں مر جائے

میخانۂ عالم سے گذر آیا ہوں ساغر
اب اپنی تمنا ہے اَنا جائے کہ سر جائے

## لیاقت علی عاصم

کیا صرف اسی لئے تھا سارا سفر ہمارا
آدھا شجر تمہارا آدھا شجر ہمارا

اندر سے جیسے کوئی خیمہ اکھڑ گیا ہو
باہر سے خوبصورت لگتا ہے گھر ہمارا

دستار چاہتا ہے، تلوار مانگتا ہے
ہر ایک ہاتھ اپنا ہر ایک سر ہمارا

جائے کوئی کہاں تک کیا سات آسماں تک
اے گرد بادِ ہجرت پیچھا نہ کر ہمارا

کچھ بیڑیاں ہیں خالی کچھ پاؤں بے سکت ہے
فی الحال کیا بتائیں رخ ہے کدھر ہمارا

سہمی ہوئی رفاقت پہروں یہ سوچتی ہے
جو ہاتھ شانہ کش ہے کھینچے نہ سر ہمارا

کس کام کا یہ جینا ٹھنڈا پڑا ہے سینہ
آنکھیں لہو سے خالی دل بے بصر ہمارا

**نسیم سحر**

بن کر تو سائبان کسی اور کا رہا
دل کو ہمیشہ دھیان کسی اور کا رہا

بچھ کر رہی زمین سدا اس کے پاؤں میں
مغرور آسمان کسی اور کا رہا

میری حمایتیں تھیں کسی اور کے لئے
لیکن میں ہمزبان کسی اور کا رہا

کر دی ہے صرف عمر کی پونجی مکان پر
پھر اُس میں خاندان کسی اور کا رہا

بے اعتبار عہد میں کس پر کریں یقیں؟
اپنے پہ بھی گمان کسی اور کا رہا

یوں بھی سمندروں سے بغاوت سی کر گئی
کشتی پہ بادبان کسی اور کا رہا

کچھ اس لئے بھی فاصلے اتنے رہے نسیم
اک نام درمیان کسی اور کا رہا

**ظفر اقبال (فتح پور انڈیا)**

صحرا کی طرف ہے نہ سمندر کی طرف ہے
رُخ ساری بلاؤں کا مرے گھر کی طرف ہے

دشمن نے لگائی ہے مرے سر کی وہ قیمت
ہر تیغ کا رُخ آج مرے سر کی طرف ہے

ٹکرا کے کبھی جس سے یہ سر زخمی ہوا تھا
پھر اس کا اشارہ اسی پتھر کی طرف ہے

دیکھا ہے جہاں تم نے رواں خون کا سیلاب
وہ سلسلۂ راہ مرے گھر کی طرف ہے

جو کعبۂ امید کو ڈھانے پہ تُلا ہے
یلغارِ ابابیل اسی لشکر کی طرف ہے

## پیرزادہ عاشق کیرانوی

آوارگانِ کوئے بتاں غور سے سنو — کیا کہہ رہی ہے عمرِ رواں غور سے سنو

آسودۂ بہار دنوں کی تلاش میں — ہم آ گئے کہاں سے کہاں غور سے سنو

نازو نیاز گردشِ حالات کے سوا — اپنا کوئی نہیں ہے یہاں غور سے سنو

فریاد کر رہا ہے سکوتِ سخن شناس — تحسین ناشناس یہاں غور سے سنو

یکساں رہا نہ دور کسی شہریار کا — یہ نغمۂ بہار و خزاں غور سے سنو

کس کس کے گھر جلے ہیں خود اپنے چراغ سے — اپنی تباہیوں کا بیاں غور سے سنو

ایک ایک کر کے جا ملے سب راہزنوں کے ساتھ — یہ داستانِ راہبراں غور سے سنو

تم بھی نہ بچ سکو گے زمانے کے وار سے — غارتگرانِ بزمِ جہاں غور سے سنو

ہر شخص جل رہا ہے غموں کے الاؤ میں — ہر شے ہے مثلِ آبِ رواں غور سے سنو

یارانِ میکدہ کا لہو بیچ بیچ کر — کیا چاہتا ہے پیرِ مغاں غور سے سنو

کیا چاہتا ہے آپ سے وہ ربِ ذوالجلال — ہر ایک حرف و صوتِ اذاں غور سے سنو

دنیائے آرزو میں درِ یار کے سوا
عاشق قرارِ جاں ہے کہاں غور سے سنو

ڈاکٹر یونس حسنی

# برسے بادل کی بجلیاں

برصغیر کی مسلم ریاستوں میں ریاست ٹونک کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا ۔ اس ریاست میں اسلامی قوانین نافذ تھے ۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اسلامی قوانین مکمل طور پر نافذ تھے مگر یوں بھی نہ تھا کہ محض نکاح و طلاق کے امور شریعت کے سپرد کر کے زندگی کے اکثر امور انگریزی قانون کے حوالے کردیئے گئے ہوں ۔ البتہ زندگی کے اکثر امور پر شرعی قوانین کا اطلاق ہوتا تھا ۔ دیت و قصاص ، چوری اور زنا تقسیم وراثت ، حق شفع ، بیع وہبہ عوض معاملات حساب کا بڑا حصّہ قوانین اسلامی کے تحت تھا البتہ انگریزی قوانین ایک خاص حد میں اور بہ امر مجبوری نافذ ضرور تھے ۔

ریاست میں ان قوانین کے نفاذ اور عمل درآمد کے لئے شرع شریف کا محکمہ قائم تھا جس کا چیف جسٹس قاضی و مفتی ہوتا تھا اور ناظم شرع شریف کہلاتا تھا ۔ ایک کورٹ آف اپیل بھی ہوتا تھا جس میں دو مفتی اور حکمران وقت شامل ہوتا ۔ اس کا سربراہ نواب نہیں مفتی ہوتا تھا ۔

اس چھوٹی سی ریاست کے عہد آخرین میں نواب محمد سعادت علی خاں کی شخصیت بڑی جاذب نظر اور پرکشش تھی ۔ وہ ایک خوش رو ، سادہ لباس ، عالم دین اور رحم دل حکمران تھے ۔ اپنی رعایا سے ان کی محبت و مواسات مثالی چیز تھی ۔ ریاست ٹونک کا دارالخلافہ محمد آباد ٹونک ہر چوتھے سال پابندی سے ہیضہ کی وبا کا شکار ہوتا ۔ ہزاروں افراد لقمۂ اجل ہوجاتے ان مواقع پر نواب صاحب کی پریشانی اور پریشاں حالی قابل دید ہوتی تھی ۔ گھر گھر جاکر لوگوں کی خیریت دریافت کرتے ڈاکٹروں ، حکیموں اور معاون عملے کے ساتھ دن رات شہر کا گشت کرتے اور فوری طبّی امداد فراہم کرتے ۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم کے دوران کی قحط سالی میں انتہائی گراں قیمت پر غلہ خریدتے اور سب سڈیری کے ساتھ ارزاں رعایا کو فراہم کرتے اور خود بھی اسی کفایت سے غلہ خرچ کرتے جس کی توقع وہ اپنی رعایا سے کرتے تھے ۔

ان کے عہد حکمرانی میں قاضی محمد عرفان صاحب ناظم شرع شریعت اور مفتی عبدالرحیم صاحب کورٹ آپ اپیل کے سربراہ تھے ۔ راقم الحروف نے مفتی

صاحب کو اپنے لڑکپن میں دیکھا اور آج اس "دیکھنے" کو بڑے اعزاز کے طور پر بیان کررہا ہے ۔ ایک بوڑھے خمیدہ کمر بزرگ عصائے پیری کے سہارے قافلہ کی مسجد میں نماز کے لئے جاتے اور نماز پڑھ کر پھر گھر میں داخل ہوجاتے — گاڑھے کا کرتا ، لٹھے کا شرعی پاجامہ سردیوں میں میل خورے رنگ کی صدری جس پر میل نمایاں ہوجایا کرتا ۔ ان کی "سماجی زندگی " اس زمانے میں بس یہی تھا ۔ مسجد سے گھر اور گھر سے مسجد میں نے انھیں بارہا دیکھا مگر اس وقت یہ احساس ہی نہ تھا کہ کیا چیز دیکھ رہا ہوں ۔

لیکن اس ضعف پیری سے بہت پہلے وہ کورٹ آف اپیل کے سربراہ تھے عدالت اپیل کی کارروائی کے کچھ آداب مقرر تھے مثلاً مدعی ، مدعا علیہ اور گواہوں کے لئے لازم تھا کہ وہ صافہ باندھ کر عدالت میں حاضر ہوں ۔ محض رائج ٹوپی کافی نہ تھی ۔ خیال رہے کہ اس زمانے میں محل کے اندر داخل ہونے یا اس کے جوار سے گزرنے کے لئے ٹوپی اوڑھنا لازمی تھا ۔ مفتی صاحب نے عدالت شرعی کے وقار کو شاہی محل سے برتر بنانے کی کوشش کی ۔

گواہوں کے سلسلہ میں شاہد عادل کی جو اسلامی شرط لازم ہے اس کی وضاحت میں مفتی صاحب نے گواہ کے لئے ضروری کردیا تھا کہ باریش ہو ۔ نواب سعادت علی خاں کو خود بھی علوم دینیہ کے فارغ تھے اس شرط کو کسی قدر غیر ضروری خیال کرتے تھے ۔ ایک روز موقع نکال کر انھوں نے مفتی صاحب سے کہا "مفتی صاحب ! بات یہ ہے کہ جب کبھی جرم ہوتا ہے تو موقع پر کوئی باریش گواہ موجود نہیں ہوتا ۔ اس لئے آپ کو مقدمہ کا فیصلہ از روئے مثل کرنا ہوتا ہے ۔ جو درست نہیں ہوسکتا ۔ اس لئے کیوں نہ آپ گواہ کے لئے داڑھی کی شرط ساقط کردیں ۔"

مفتی صاحب نے فرمایا "حضور یہ آپ مجھ سے فرماتے ہیں ۔ آپ با اختیار حکمران ہیں ، شہر میں اعلان کرادیں کہ تمام بالغ مسلمان داڑھی رکھیں ۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ہر موقع پر باشرع گواہ میسر آجایا کریں گے۔" اس مسکت دلیل کے بعد نواب صاحب کے پاس کہنے کو کیا رہ گیا تھا ؟

اس واقعہ کے کچھ دن بعد مشہور عالم دین مولانا عبدالعلیم صدیقی جو عالم اسلام خصوصاً افریقی ممالک میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے بہت مشہور تھے ٹونک تشریف لائے ۔ وہ افریقہ کے دورے سے واپس آئے تھے ۔ اور ہزاروں افراد کو مشرف بہ اسلام کرنے کے مدعی تھے نواب صاحب نے انھیں ڈنر پر مدعو کیا اور ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر وہی گفتگو چھیڑ دی نواب صاحب نے مہمان سے مخاطب ہوکر کہا "مولانا صاحب ۔ ہمارے مفتی صاحب گواہ کے لئے باریش ہونا ضروری قرار دیتے ہیں ۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ریاست میں باریش افراد اقلیت میں ہیں

اس لئے ارتکاب جرم کے وقت باریش گواہ کا موقع پر موجود ہونا ضروری نہیں ۔ پھر مقدمہ کا فیصلہ صرف واقعات شہادتوں پر ہوتا ہے جس سے قانون کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ۔ اس لئے کیوں نہ گواہ کے اوصاف میں سے باریش ہونے کی شرط کو ختم کردیا جائے ۔"

"یور ہائی نس درست فرماتے ہیں

مہمان عالم دین نے کہا یہ سنتے ہی گویا مفتی عبدالرحیم صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی بڑے تیکھے لہجے میں گویا ہوئے " حضور! آپ کے لئے یہ بڑا آسان ہے کہ آپ مجھے بیک جنبش قلم میرے عہدے سے معزول کردیں ۔ مگر آپ کے لئے اور آپ کے ان مولوی صاحب کے لئے یہ بڑا دشوار ہوگا کہ وہ میرے قلم سے سنت رسول کے خلاف ایک لفظ بھی لکھوا سکیں " سعادت علی خاں جیسے سہم سے گئے ۔ فرمانے لگے "نہیں مفتی صاحب خوانخواستہ میرا مطلب ہرگز یہ نہ تھا۔ یہ تو میری ایک تجویز تھی ۔ اس کو تسلیم کرنا نہ کرنا سراسر آپ کا اختیار ہے ۔"

ایک عرصے بعد حکمران خاندان کا ایک مقدمہ عدالت شرع شریف میں آیا اس وقت ناظم شرع شریف قاضی عرفان صاحب ، تھے قاضی عرفان صاحب انتہائی وجیہہ خوش شکل اور وضعدار بزرگ تھے بڑا سر ، بھرا ہوا چہرہ ، گورا گلابی رنگ ، بھری بھری سفید داڑھی اور زہانت سے بھرپور بڑی بڑی آنکھیں انہیں بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ۔ حسن و پاکیزگی کا زندہ مجسمہ تھے ۔ عدالت شرعی میں بھی گواہی کے وہی شرائط ضرور تھے جو کورٹ آف اپیل کے لئے تھے ۔ اس مقدمہ میں خود نواب صاحب ، ایک گواہ ٹھہرے ۔ موصوف خود بھی داڑھی نہ رکھتے تھے تاریخ پیشی پر حاضر عدالت ہوئے ۔ قاضی صاحب ، نے دیکھا کہ نواب صاحب اپنی معمول کی سبز مخملی رامپوری ٹوپی پہنے ہوئے ہیں ۔ قبل ازوقت ہی کارندے کو ہدایت فرمائی کہ گواہوں کے صافحہ باندھ دیئے جائیں اس غرض کے لئے صافحے عدالت کے دفتر میں بھی رہا کرتے تھے ۔ غرض نواب صاحب عدالت میں پیش ہوئے اور کارروائی شروع ہوئی ۔

"نام"؟

"محمد سعادت علی خاں "

"باپ کا نام"؟

"نواب محمد ابراہیم علی خاں"

"عدالت کے روبرو نوابی قابل احترام ہے نہ لائق ذکر"۔

"جی ۔ حافظ محمد ابراہیم علی خاں "۔

اندراج کوائف کے بعد ہی قاضی عرفان صاحب نے اعلان کیا اور پیش کار کو مخاطب کرکے فرمایا" چونکہ گواہ کے داڑھی نہیں ہے اس لئے اسے مردود الشہادت قرار دیا جاتا ہے۔ دوسرا گواہ پیش کیا جائے "

سعادت علی خان گردن جھکائے عدالت شرع شریف سے باہر آئے ، اپنی جھکڑا سی اسٹیشن ویگن میں سوار ہوئے

اور ندرباغ ( شاهی محل ) کا رخ کیا ۔
قاضی عرفان صاحب هی کی ملازمت کا زمانہ تھا کہ ٹونک میں شدید امساک باراں هوا راجستھاں کے ریگستان میں بارش نہ هونا بڑا قیامت خیز هوتا هے اس کا اندازہ صرف بادیہ نشیں هی کرسکتے هیں ۔ انسان غلہ کو اور جانور چارے کو ترسنے لگے ۔ جانور تو مرهی رهے تھے کبھی کبھی انسانی اموات کی بھی اطلاعات ملنے لگیں سعادت علی خاں دوڑے دوڑے قاضی صاحب کے پاس آئے اور عرض کی کہ آپ میداں میں چل کر نماز استقاء پڑھادیں اور بارش کے لئے دعا فرمائیں ۔
قاضی صاحب نے فرمایا "کیوں نماز میں کیوں پڑھاؤں؟ قحط توحکمرانوں کی بداعمالی سے پڑا کرتے هیں ۔ اس لئے آپ نماز پڑھائیں اور اس طرح کہ برہنہ پاهوں اور چادر الٹ رکھی هو ۔ میں مقتدی کے طور پر نماز میں حاضر رهوں گا ۔ چنانچہ نواب صاحب سے یہی کیا ۔ اعلان هوا کہ مادهو والی کے میداں میں نماز . استسقاء ادا کی جائے گی جس کی امامت حضور پر نور خود فرمائیں گے ۔ ایک خلقت جمع هوگئی ۔ نواب صاحب امامت کے لئے آئے ۔ برہنہ سر اور برہنہ پا اور الٹ کر چادر کندھوں پر ڈالے هوئے ۔ نماز استقاء پڑھائی اور اس کے بعد روتے جاتے اور دعا کرتے جاتے تھے کہ یا اللہ! میرے گناهوں میں میری رعایا کو نہ پکڑ ان پر رحم فرما اور ان کے طفیل مجھے بھی معاف فرمادے ۔ اس نماز کے ترکاء کا بیان هے کہ ابھی لوگ مادهو والی کے میداں سے پوری طرح نکلنے بھی نہ تھے کہ باراں رحمت نے آلیا اور موسلادهار بارش هوئی ۔ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہنوز زندہ هیں اور بہت سے کراچی میں بھی موجود هیں ۔
انھیں سعادت علی خاں کے دو واقعات کا خود میں چشم دیدگواہ هوں ۔ میرے لڑکپن کی بات هے عباد اللہ خاں کی کچھری کے قریب لب سڑک ایک شخص مٹی کے برتن فروخت کیا کرتا تھا ۔ ایک روز سعادت علی خاں کی اشیتن ویگن اس کے سامنے آرکی ۔ حکمراں کو دیکھ کر یوں هی بھیڑ لگ جایا کرتی تھی میں بھی اس بھیڑ میں شامل هوگیا محض نواب صاحب کو دیکھنے کے شوق میں میں گاڑی سے قریب لگا کھڑا تھا ۔ نواب صاحب کی گاڑی کو اپنے قریب رکتا دیکھ کر ظروف فروش کھڑا هوگیا ۔ نواب صاحب ، نے اسے پاس بلا کر آشاگوندھنے کے کونڈے دکھانے کو کہا ۔ اس نے کونڈا حاضر کیا ۔ موصوف نے اسے اپنی انگلی سے اس طرح بجاکر دیکھا جیسے پوری زندگی مٹی کے برتن خریدتے گزری هو اور اس میں مہارت تامہ رکھتے هوں ۔ حکم دیا کہ چار کونڈے گاڑی میں رکھ دے ۔ اس نے تعمیل کی ۔ مگر گاڑی اب چلتی نہیں ۔ اس کے لئے اے ڈی سی کے اشارے کی ضرورت هوتی تھی اور وہ بیچارہ پچھلی نشست پر بیٹھا کونڈے والے سے حجت کررها تھا ۔

نواب صاحب نے پوچھا" ارے بھئی اب چلتا کیوں نہیں "

"حضور اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے دو ۲ پیسے کے کونڈے کے پچیس ۲۵ روپے طلب کرتا ہے "

کونڈے والا لپک کر اگلی نشست کے پاس آیا اور نواب صاحب سے دست بستہ عرض کی " حضور سب کے لئے یہ دو ہی پیسے کے ہیں مگر آپ کے لئے پچیس روپئے کے "

"ارے بھئی دے ، دے پیچھا چھڑا "نواب صاحب نے اے ڈی سی سے کہا مگر وہ بھی کائیاں آدمی تھا پچاس روپئے کے چار میں سودا کیا ۔

دوسری مرتبہ میں نے انہیں سول سپلائز کے دفتر میں دیکھا۔ دوسری جنگ عظیم کا اختتام تھا ۔ ٹونک میں غلہ کی شدید کمی تھی ۔ لوگوں کو غلہ اور شکر وغیرہ راشن سے انتہائی کم مقدار میں ملتی تھی ۔ غلہ گیہوں بوائے سام جو اور جوار وہ بھی سرخ جوار ، نصف بہٹ کے حساب ملا کرتی تھی ۔ شکر کے لئے خصوصی پرچیاں جاری ہوتی تھیں میرے کسی استاد نے حکم دیا کہ شکر کی پرچی اپنے والد سے لاکر دوں ۔ میرے والد سید عبید الرحمن صاحب اس زمانے میں محکمہ سول سپلائز میں انسپیکٹر تھے ۔ اور صاحب زادہ امانت اللہ خاں ، جو رشتہ میں نواب صاحب کے بھائی تھے محکمہ کے سربراہ ۔ میں پرچی لینے کے لئے والد کے پاس کھڑا تھا کہ وہ فارغ ہوں تو حرف مطلب زباں پر لاؤں ۔ باہر لمبی لائن لگی تھی ۔ لوگ بے چین ہوہو کر نعرے لگاتے اور عملہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے ۔ اس لئے یہ لوگ جلد از جلد لوگوں کو نمٹانے میں لگے ہوئے تھے ۔

یکایک دفتر میں ہلچل ہوئی ۔ امانت اللہ خاں ، والد اور وہاں موجود دوسرے ارکان استادہ ہوگئے ۔ نواب صاحب وہی ململ کے کرتے لٹھے کے پاجامے اور رامپوری ٹوپی میں ملبوس تشریف لائے اور صاحبزادے امانت اللہ خاں سے کہا بھئی نذر بساغ کے لئے ایک دو بوری شکر بھجوادو " جی ہاں ضرور بھجوادوں گا" امانت اللہ خاں نے سفاکانہ طنز سے کہا "یہ سنئے یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں ۔ یہ میری ماں بہنوں کو گالیاں دے رہے رہے ہیں ۔ یہ آپ نے مجھے نوکری دی ہے کہ سے عزت کرایا ہے پہلے انہیں دونگا کہ آپ کو ۔ اگر ان سے بچ رہی تو محل میں بھیج دی جائے گی ورنہ معذوری ہے"

سعادت علی خاں مسکراتے ہوئے چل دیئے ۔

ان کے جانے کے بعد صاحبزادہ امانت اللہ خاں نے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ صرف ایک بوری شکر نذر باغ بھیج دی جائے ۔

ان واقعات پر جب کبھی میں غور کرتا ہوں اور بارہا ایسا کیا ہے تو فیصلہ نہیں کر پاتا کہ نواب سعادت علی خاں بڑے آدمی تھے یا مفتی عبد الرحیم ، قاضی عرفان اور صاحبزادہ امانت اللہ خاں ! !

ناصر بغدادی

# بے شناخت

زندگی روشنیوں کے اس شہر میں بہتے ہوئے دریا کی طرح رواں دواں ہے۔ امن و امان کا دور دورہ ہے۔ راتیں جوان اور دن زندگی کی لطافتوں کے ترجمان ہیں۔ آئینوں کی طرح شفاف طویل شاہراہوں پر خوبصورت کاروں کی ریل پیل، مقامی بازاروں میں خریداروں کا جمِ غفیر، ریستورانوں اور ہوٹلوں میں زندہ دلوں کی بھیڑ، پھولوں سے سجے سجائے پارکوں میں اور سمندر کے کنارے گشت کرتے ہوئے لاتعداد نوجوان جوڑوں کی محبت بھری سرگوشیاں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ شہر کی جوانی نقطۂ عروج پر پہنچ کر تھم گئی ہے۔ یہ میرا شہر ہے جو دنیا کے کسی بھی خوبصورت شہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے تابناک حسن کو شرمندہ کرسکتا ہے۔ اسی شہر کی جوانی کا عکس میری سوچوں پر بھی مرتسم ہے۔

اور پھر اسی شہر میں ایک دن جب میرے پڑوسی، میرے بچپن کے دوست نے گوہرِ مقصود کی تلاش میں ایک دورافتادہ ملک جانے کی تیاریاں مکمل کرلیں تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔

"یہ شہر زندگی کے بوقلموں پہلوؤں کا عکاس ہے۔" میں نے اپنے دوست کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم جس شئے کے حصول کے عوض غریب الوطنی کے کرب کو اپنانا چاہتے ہو، وہ شئے، وہ تمہارا آئیڈیل تم کو اسی شہر کے کسی کونے میں مل جائیگا۔"

"میں سکون کے جس گریزپا لمحہ کا متلاشی رہا ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔" اُس کا لہجہ قنوطیت کا مظہر تھا۔

"سکون کوئی گاجر مولی نہیں کہ سبزی کی دکان پر برائے فروخت ہو۔" میں نے اس گمراہ کو راہِ راست پر لانے کیلئے منطق کا سہارا لیا۔ "اگر تلاش کا جذبہ صادق ہو اور انسان اپنا دیدۂ دل وا رکھے تو نروان پیپل کی چھاؤں میں سستاتے ہوئے بھی مل سکتا ہے۔"

اُس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے میں سمجھ گیا کہ میری بات کا اُس پر منفی اثر ہوا ہے۔ میرا کیش خیالِ خاطرِ احباب ہے۔ نازک آبگینوں کو ٹھیس لگانے کا میں قائل نہیں بس میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بات کو مزید آگے نہ بڑھاؤں۔

مگر بات اس موڑ پر پہنچ کر ختم نہیں ہوئی۔ اس کے دل کے زیریں پرتوں میں جو لاوا پک رہا تھا شاید اُس کو باہر نکلنے کے لئے راستے کی تلاش تھی۔ میانہ روی جو اُس کی طبیعت کا خاصہ تھی یکلخت اُس سے جدا ہوگئی اور غصہ اُس سے بغلگیر ہوا تو اس کا چہرہ آگ سے دھل کر پھولی ہوئی شفق کا منظر پیش کرنے لگا۔

"تم جس شہر کی تعریف میں قصیدہ خواں ہو تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اُس پر کون سی بلائیں، کون سے آسیب شب خون مارنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔" میں نے دیکھا کہ اُس کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ "میرے نزدیک تم سب شہر والوں کی

حیثیت غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے خوش نصیب بیوقوفوں سے کم نہیں۔ تم لوگ طوفان سے پہلے کی خاموشی کو سکون کہتے ہو جب بلائیں تمھارے گھروں کو جلا کر ان کی آگ میں تمھارے گھر والوں کو پھینکیں گی تو ممکن ہے اس وقت تمھاری آنکھیں کھل جائیں۔ دیدۂ تماشا کرنے کی ضرورت مجھ کو نہیں تم کو ہے۔"

اب مزید بحث کی گنجائش ممکن نہ تھی۔ بحث برائے بحث خوشگوار دیرینہ تعلقات کو بگاڑ سکتی ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دوستی سے ہاتھ دھو بیٹھوں اس بار مجھے خاموش دیکھ کر اس نے بھی اس موضوع کے دھاگے ادھیڑنے کی کوشش نہیں کی اور یوں بات آئی گئی ہو گئی۔

خدا معلوم وہ کن بلاؤں، کن آسیبوں کے ذکر سے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں ہی اڑتی اڑتی ایک خبر میں نے سن لی تھی کہ اس کے ذاتی مسائل کی پیچیدگیاں اس کے اعصاب پر اثرانداز ہو رہی ہیں۔ شائد یہ بہکی بہکی باتیں اس کے ذہنی حالات کا شاخسانہ تھیں جن کے شکنجے میں پھنس کر وہ ایک زخم خوردہ پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں نے اپنا دستِ تعاون اس کی جانب بڑھانے کی بابت سوچا مگر چونکہ میں اس کی انا پرست طبیعت سے خوب واقف تھا لہٰذا بہتری اسی میں تھی کہ اس کو خول سے گھسیٹ کر باہر نہ لاتا۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ اس کی روح کے پاتال میں اندھیرے جاگزیں تھے۔ وہ اس روشنی کا متلاشی تھا جو اس کو روشنیوں کے اس جگمگاتے شہر میں کہیں نہ مل سکی تھی اور شائد یہی وجہ تھی کہ اس نے وطن عزیز کی مٹی کو تیاگ کر اجنبی ملک کے دور افتادہ گوشے میں سکونت کو ترجیح دی۔ ایک موج کے کم ہونے سے دریا کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ زندگی روشنیوں کے اس شہر میں بہتے ہوئے دریا کی طرح رواں دواں تھی اور رواں دواں ہی رہی۔ میرے شہر کی جولانیاں سب کے لئے نغمات اور خوشبوؤں کی سوغات مہیا کرتی رہیں۔ شروع شروع میں اس کے گھر والوں کی زبانی اس کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی۔ انھیں سے مجھے معلوم ہوا کہ نئے ملک کی نئی فضائیں اس کے لئے نئی زندگی کا آدرش ثابت ہوئی ہیں۔ وہ زندگی کی لذتوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہو رہا ہے اس کی روح پر فرسٹریشن کی جو تلوار لٹک رہی تھی اب وہ مہکتے پھولوں سے لدی ہوئی ایک شاخ بن کر اس پر خوشبوئیں نچھاور کر رہی ہے اس کے اردگرد پھیلے ہوئے دبیز اندھیروں نے دم توڑ دیا تھا اور اس کا گوہرِ مقصود اسے حاصل ہو گیا تھا! دوست کی زندگی کے سنورنے سے کون خوش نہیں ہوتا ہے؟ یوں تو میں بھی بے حد خوش ہوا مگر میری خوشی میں تھوڑا سا دکھ بھی شامل تھا۔ میرے دوست کو سکون کا جو گریز پا لمحہ غریب الوطنی میں ملا تھا کاش وہ اسے اسی شہر کے کسی کونے میں مل جاتا۔ میں نے اس ایک بات کے متعلق سوچا اور بار بار سوچا۔

انھیں دنوں مجھے اس کا ایک خط ملا جس کی ہر سطر میں اس کی بیکراں جذباتی خوشی نمایاں طور پر اچھل کود رہی تھی۔ یہ خط دراصل نئے وطن کے کوائف اور نئے دوستوں سے مجھے متعارف کرانے کی ایک کوشش تھی۔ ایک جگہ اس نے لکھا۔

"نئی زمین سے رشتہ جوڑ کر میں نے جیسے مابعد الطبیعاتی مسرتوں کو اپنایا ہے۔ اب میری زندگی میرے گمشدہ خوابوں کی بازیافت کا ایک مرحلہ ہے۔"

میں نے جوابی خط کے ذریعہ مبارک باد دینے اور اپنی نیک خواہشات پہنچانے کے متعلق متعدد بار سوچا مگر زندگی کے ہنگاموں اور پھر میری سست گام فطرت نے چند سطور

لکھنے کی بھی مجھے مہلت نہ دی۔ اگرچہ میں اس کی خوشیوں سے بھرپور نئی زندگی پر بے انتہا خوش تھا مگر نہ جانے کیوں اُس کے یوں نئی زمین سے رشتہ جوڑنے کے فیصلے نے مجھے ہنوز کوئی تسلی بخش جواز پیش نہیں کیا تھا۔ اور پھر اس بات کو ایک عرصہ گذر گیا۔ کارِ جہاں دراز نے زندگی کو یوں گھن چکر کر دیا تھا کہ میری یادداشت کے شیشے پر اُس کی شبیہہ دھندلی ہوتی ہوئی جیسے مٹ سی گئی

اور پھر ایک دن جب اس شہر کے باسی خوابِ غفلت سے جاگے تو شہر کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ نہ معلوم کس بدبخت کی منحوس نظر اس عروس البلاد کے ساحرانہ حُسن کو لگ گئی تھی کہ اس کے جوبن اور رعنائیوں کو سرِ عام لوٹ لیا گیا۔ ہوا کا رُخ بدلا تو یک بیک باد و باراں کا طوفان موت کا پیامبر بن کر گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے لگا۔ میرا شہر جو شہرِ طلسمات کی مقناطیسی کشش سے مرصع تھا اچانک ایسے قبرستان کی ہولناکیوں کا مرکز بن گیا جہاں بے چین روحیں مسلسل گریہ وزاری میں معروف رہتی ہیں۔ جن فضاؤں میں خوشبوؤں کا جادو جاگا کرتا تھا اب ان میں بارود کی مہلک بو بھی شامل ہو گئی۔ نغمات اور موسیقی نے دم توڑا تو پٹرول بموں کے گھن گرج دھماکے اور شکار کی تلاش میں جھپٹنے والی گولیوں کی سنسناہٹیں ذہنوں میں خوف کی یخ بستگی کا سبب بننے لگیں۔ آگ اور خون کی ہولی دیکھتے ہی دیکھتے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ نفرتوں کا زہر دور دور تک پھیل گیا۔ وہ لوگ جو اس شہر میں محبت اور آشتی کے ساتھ رہتے تھے اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ خون ریز ہنگاموں اور تشدد کا زور بڑھتا گیا۔ نامعلوم مسلح افراد نے آزادانہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ دکانوں اور مکانوں کو نذرِ آتش کر کے زندہ افراد کو آگ کے شعلوں میں پھینکا جا رہا تھا۔ تمام علاقوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ انسان انسان سے خوفزدہ تھا۔ میرا شہر جو کبھی روشنیوں کا شہر تھا اب اس پر ماتمی اندھیرے چھا گئے تھے۔ سڑکوں کی رونق اور چہل پہل ختم ہو گئی تھی اور قبرستانوں کی گہما گہمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن حسبِ سابق جب میری کار آفس کی طرف فراٹے بھر رہی تھی کہ اچانک ونڈ اسکرین بھیانک آواز کے ساتھ پاش پاش ہو گیا۔ شیشے کی بے شمار کرچیوں نے بھوکے گدھوں کی مانند مجھ پر حملہ کر دیا۔ اسٹیرنگ پر میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مگر میں نے بمشکل ہوش و حواس کو رخصت ہونے سے روکا سڑک کے ایک طرف نوجوانوں کا غول بیابانی آتشی ہتھیاروں اور تباہ کاری کے ساز و سامان سے لیس پتھروں کے ڈھیر کے قریب کھڑا اپنی کامیابی پر شاداں و فرحاں نظر آ رہا تھا۔ لمحہ بھر بھی وہاں رکنا ایک مہلک غلطی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے دیکھا عجیب افراتفری اور انتشار کا عالم ہے۔ میرے چاروں طرف شیطانی قوتوں کا مکمل قبضہ تھا۔ سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کو زبردستی روک کر نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ مکانات جل رہے تھے۔ دکانیں جل رہی تھیں اور جہاں تک نظر اٹھتی، دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا بھاگتے ہوئے راہگیروں پر اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ بموں کے دھماکے ہو رہے تھے اور سڑکیں میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔

گھر پہنچا تو محسوس ہوا کہ موت کو دھوکہ دے کر واپس آ گیا ہوں۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا بیوی نے میرا خراشوں سے بھرا ہوا چہرہ اور میری نروس کیفیت کو دیکھا تو سکتے کا شکار ہو گئی۔

"فکر نہ کرو، بس ٹھیک ہوں" میری آواز سُن کر بھی جب

وہ بت بنی گھورتی رہی تو مجھے مزید کچھ کہنا پڑا۔ "بس کوئی خاص بات نہیں۔ میری کار کا ونڈ اسکرین ٹوٹ گیا تھا۔ تم ذرا جلدی سے فرسٹ ایڈ کا بکس لے آؤ۔" چند لمحوں بعد جب میں زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھا تو اچانک میرے ذہن کے اُفق پر ایک خیال شہابِ ثاقب بن کر نمودار ہوا اور دور تک پھلجڑیاں چھوڑتا ہوا معدوم ہو گیا۔ اب میں غیر یقینی حالات کے دوراہے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کس راستے پر چل کر مجھے منزل کا سراغ مل سکتا ہے۔ میری الجھن دو چند ہوئی تب مجھے اپنے اطراف کی ہر شے تصوراتی پیکر کی طرح نامعتبر سی دکھائی دینے لگی۔

فسادات اور بلووں کا زور کم ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ شہر کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور ہر گھر کی چار دیواری بیرونی خطرات سے غیر محفوظ ہو چکی تھی۔ ایک کرفیو زدہ رات کو جب ہم بموں کے دھماکوں کے ساتھ دور سے آنے والی انسانی چیخ و پکار اور کلاشنکوف کی آوازیں سن رہے تھے تو میری بیوی یوں ہمتاط انداز میں گویا ہوئی جیسے ڈر تی ہو کہ ہونٹوں کی جنبش سے الفاظ ٹوٹ نہ جائیں۔

"مجھے لگ رہا ہے جیسے ۴۷ء کی آگ پھر سے بھڑک اٹھی ہے۔" اُس کے لہجے میں نامعلوم خدشات سر اٹھا رہے تھے میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا سہما ہوا چہرہ خوف کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ میں نے چاہا کہ جھوٹی تسلی کے دو بھرنے بول اُس کے کانوں میں اتار دوں۔ مگر باہر سڑکوں پر کھیلی جانے والی آگ اور خون کی ہولی نے مجھے فردوست سے کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ اور میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ سر ہلا کر اس کی بات سے اتفاق کروں۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اگرچہ اُس کی آنکھوں کی تحریر کو میں پڑھنے سے قاصر تھا مگر اتنا ضرور جان گیا کہ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی ہے۔

"ان حالات میں تمہارا تذبذب بے معنی ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "تم بلا روک ٹوک مجھ سے ہر بات کہہ سکتی ہو جو شخص آٹومیٹک کلاشنکوف کی مکروہ زبان تحمل کے ساتھ سن سکتا ہے اس کی سماعت پر کوئی بات گراں نہیں گزر سکتی۔" میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر اس کی گمشدہ جرأت کی بھٹکتی ہوئی رمق لوٹ آئی ہے۔ اب میں اس کی آنکھوں کی اندھیری سرنگوں میں کہیں دور جگنوؤں کی نتھری نتھری چمک کو دیکھ سکتا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے ۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران ہمارے بزرگوں نے کیا قدم اٹھایا تھا۔" اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ میں نے بڑی بے یقینی کے ساتھ اُسے دیکھا۔ اب اُس کی آنکھوں کی تحریر کا مفہوم مجھ پر واضح ہو چکا تھا۔ اچانک میرا چہرہ حیرانی کی آماجگاہ بن گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی ایسی بات سوچ بھی سکتی ہے۔ کہنا تو بہت دور کی بات ہے۔

"تم ترکِ وطنی کی بابت سوچ رہی ہو؟" میں نے تعجب خیز انداز میں پوچھا اور جواباً اُس نے فوری اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"تم زبان سے چاہے کچھ نہ کہو مگر میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ دل ہی دل میں تم بھی یہی کچھ سوچ رہے ہو۔" اس کے لہجے کی قطعیت کو محسوس کر کے میں دنگ رہ گیا۔ میں نے چاہا کہ اُس کی اس بات کی بہ آواز بلند تردید کروں مگر جب میں نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تو پھر نفی میں کچھ کہنے کی جرأت مجھ میں بالکل نہ تھی۔

اپنی زمین اپنی مٹی کو چھوڑنے کا تصور تکلیف دہ ہی مگر انسانی وجود کی طرح بہاتا بھی ہے۔ اپنوں اور غیروں نے جب بھی ستم کے پہاڑ توڑے انسان اس زمین سے رشتہ توڑنے پر مجبور ہو گیا جس کے خمیر کی خوشبو اُس کے خون میں رچی بسی تھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت

ہے جس کی گواہی تاریخ کا ہر باب دے سکتا ہے۔ میری بیوی کا خیال غلط نہ تھا۔ فسادات اور مختلف گروہوں کی مسلسل خونی جھڑپوں نے مجھے سنجیدگی سے نقل مکانی کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں مختلف اقدامات کے علاوہ اپنے بچپن کے دوست کو بھی لکھا تھا کہ وہ میری معاونت کرے۔ میں چاہتا تھا کہ اس بات کو اس وقت تک اپنی بیوی پر آشکار نہ کروں جب تک کوئی خوش آئند نتیجہ سامنے نہ آ جائے۔ مگر اب جب کہ وہ اس موضوع کے چھیڑنے پر تُل گئی تھی تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ہر بات اُس کے گوش گزار کر دوں۔ اگر ان غیر تسلی بخش حالات میں کسی بات سے اس کی تسلی ہو سکتی ہے تو کیا مضائقہ ہے؟

"کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارے دوست اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کریں گے؟" جب وہ میری بات صبر و تحمل سے سُن چکی تو ایک عجیب و غریب سوال سے مجھے متعجب کر دیا۔

"کیوں نہیں؟ وہ یقیناً ہماری مدد کرے گا۔ وہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔" میرا لہجہ یقین سے بھرپور تھا۔ "تمھیں یاد نہیں چند ماہ قبل اُس نے اپنے خط میں مجھے نقل مکانی کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔"

"وہ چند ماہ قبل کی بات ہے۔" میری بیوی تشکیک کی مریضہ بنی ہوئی تھی۔ "اب تو حالات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔"

"اس بات کا حالات بدلنے سے کوئی تعلق نہیں۔ تم تو خواہ مخواہ لوگوں کی نیت پہ شک کرتی ہو۔" مجھے اپنی بیوی کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور میرا موڈ بُری طرح آف ہو گیا تھا۔

"ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "پہلے تم میری پوری بات سن لو ممکن ہے اس کے بعد صحیح صورتِ حال تم پر واضح ہو جائے۔"

"پوری بات! کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو جلدی سے کہو۔ مجھے پہیلیاں بجھوانے سے سخت نفرت ہے۔"

"مجھے بھی پہیلیاں بجھوانے کا کوئی شوق نہیں۔" اس بار اس کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔ "بس سوچ رہی تھی کہ یہ بات تمھیں معلوم کیوں نہیں؟"

"کون سی بات؟ پھر وہی۔ . ."

"بس زیادہ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور بلا تاخیر اصل مطلب کی طرف آ گئی۔

یہ واقعہ میرے بچپن کے دوست سے متعلق تھا جس کی الف لیلوی تفصیل اُس کے گھر کی چند عورتوں نے میری بیوی کے گوش گزار کیا تھا۔ واقعہ کا پس منظر کچھ ایسا ڈرامائی اور پُر اسرار تھا جیسے ازمنہ قدیم کی کوئی ماورائے عقل داستان دہرائی جا رہی ہو۔ اس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔

شروع شروع میں میرا دوست نئے وطن کی عطر بیز فضاؤں میں زندگی کی بیکراں لطافتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ یہاں اس کو اتنا کچھ مل گیا تھا کہ اُسے کوتاہی داماں کی شکایت ہو گئی تھی۔ زندگی گزارنے کا جو تصور اُس کے ذہن میں تھا۔ اس کے ارد گرد کی زندگی اُس سے کہیں زیادہ حیات آفریں تھی۔ چھوٹے بڑے عملی تجربات سے گزرتے ہوئے اُس کے ذہن کا افق وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ نئے دوستوں کی قربت میں وہ پرانے دوستوں کے میٹھے ہوئے غم بھول رہا تھا۔ یہاں ماحول آزاد تھا۔ فضائیں آزاد تھیں اور اُس کی حیثیت ایک آزاد پنچھی جیسی ہو گئی تھی ماضی کی طرح قدم قدم پہ نہ پہرے تھے اور نہ شکاری شکار کی تلاش میں جال بچھائے کمین گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ مختلف علاقوں سے

آئے ہوئے لوگ آپس میں امن و آشتی کے ساتھ رہ رہے ہیں اور سب علاقائی اور غیر علاقائی تعصبات سے بے نیاز ہیں۔

مگر اس کے خوش آئند احساسات کی عمر بڑی مختصر تھی اور پھر یہ معلوم کیا ہوا کہ اچانک نشاط و فور کے یہ جگمگاتے ہوئے دن سراب کا دوسرا روپ ثابت ہوئے۔ اُسے محسوس ہوا کہ زندگی مثبت تبدیلیوں کے روپ میں اُس کے لئے نئی پریشانیوں کا سامان لائی ہے۔ وہ اب تک جو کچھ دیکھتا آیا تھا در اصل سرابوں کا نظارہ تھا۔ اور جو کچھ وہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا شاید وہ بھی دھوکہ تھا۔ ایک نامعلوم خوف تھا کہ پر تسمہ پا بن کر اُس کے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا اس کے ارد گرد رہنے بسنے والے لوگ پُر اسرار منفی قوتوں کی طرح اُس کے اعصابی نظام کو متاثر کرنے لگے اس نے محسوس کیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ شاید اُس کے گھر کی نگرانی بھی کی جا رہی تھی۔ کیوں کہ اُس نے بار ہا چند مشتبہ افراد کو مشکوک انداز میں گھر کے قریب ٹہلتے ہوئے پایا تھا۔ دن میں کئی بار دروازے پر دستک ہوتی اور جب وہ دروازہ کھولتا تو باہر پر چھائیوں اور پُر ہول سناٹوں کے سوا کچھ نہ ہوتا اور پھر کئی بار فون پر نامعلوم افراد نے اُسے موت کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ معلوم یوں ہو رہا تھا جیسے ساری خدائی اُس کی جان کے درپے ہے مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کو کس جرم کی پاداش میں یوں قسطوں میں مصلوب کیا جا رہا تھا۔ زندگی کے نئے معنی سمجھنے میں شاید ایک بار پھر اُس سے سنگین غلطی ہو گئی تھی۔

انسانی مزاجوں کا موسم بدلا تو جیسے سب کچھ بدل گیا۔ نئے دوستوں کی دوستی اور گرمجوشی جیسے گمشدہ وقت کی بھولی بسری کہانی بن کر یاد آنے لگی۔ اب ان کے دوستانہ انداز اور انسانیت نوازخلوص کے پس منظر میں یخ بستہ لاتعلقی کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ معلوم شہر کے مزاج کو کیا ہو گیا تھا کہ اب لوگ فاصلے سے ملتے ہوئے بھی گھبرانے لگے تھے۔ ایک بار کسی مذہبی تقریب کے سلسلے میں جب اس کے علاقہ کے لوگ جمع ہوئے تو اُس نے دبی دبی زبان سے چند لوگوں کے سامنے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات بیان کئے۔ انھوں نے اُس کو بات ختم کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور زور زور سے ہنسنے لگے جب اس نے تحیّر کا اظہار کیا تو ان کے قہقہے وحشیانہ انداز اختیار کر گئے۔ اُس نے چاہا یا تو کسی کا ٹیٹوا دبا دے یا پھر اپنا ہی سر دیوار سے ٹکرانا شروع کر دے۔ مگر اس کی نوبت نہ آسکی۔ ایک جہاندیدہ شخص جس کے چہرے پر گہری متانت کا غلاف چڑھا ہوا تھا اس کو ایک کونے میں لے گیا۔

"یہ تمھاری نہیں ہم سب کی کہانی ہے۔" اس کا لہجہ بھی بے حد سنجیدہ تھا۔

"آپ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے؟" میرے دوست نے استعجاب سے پوچھا۔

"نہ صرف ہو رہا ہے بلکہ ہوتا آیا ہے۔" سنجیدہ شخص بولا۔ "میں پچھلے بیس برسوں سے یہاں ہوں اور مجھے یاد نہیں کوئی دن ایسا بھی گزرا ہو جب مجھے کسی مقامی شخص نے گالی نہ دی ہو یا دھمکی نہ دی ہو۔"

"اور اس کے باوجود آپ بیس برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں؟" میرے دوست کی حیرانی دوچند ہو رہی تھی۔

"کیا مضائقہ ہے؟" "یہاں مجھے وہ سب کچھ حاصل ہے جس کا میں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔" سنجیدہ شخص بے نیازی سے بولا۔ "تمھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مہذب لوگ ہیں صرف گالیاں اور دھمکیاں دیتے ہیں۔ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ان کی عادت نہیں۔" سنجیدہ شخص نے جب دیکھا کہ اس کی باتیں میرے دوست کے سر پر سے گزر رہی ہیں تو وہ ناصحانہ انداز میں اُسے سمجھانے لگا۔

"سنو میرے دوست! ان لوگوں کی حیثیت اُن بھونکنے والے کتوں کی طرح ہے جو کاٹنا بالکل نہیں جانتے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمھیں یہاں زندگی کے نادر تعیشات میسر ہیں۔ اگر کوئی دل جلا تمھیں کچھ کہہ بھی دیتا ہے یا تمھارے باب میں سرد مہری کا رویہ اختیار کرتا ہے تو تمھاری صحت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑنا چاہیئے اور پھر یہاں اچھے لوگ بھی تو ہیں مانا ان کی تعداد کم ہی۔

" مگر میری اپنی پہچان، میرا ذہنی سکون۔ میں یہ چیزیں کہاں تلاش کروں جن کو حاصل کرنے کی خاطر میں نے زمین سے رشتہ توڑا تھا۔"

میرا دوست فلسفہ موجودیت کا بے بس پیکر بنا زندگی کے نئے معانی ومفاہیم تلاش کرنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ارد گرد یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ اُس کے ذہن کا اندھیرا دبیز ہوتا گیا اور اُس کے سامنے کھڑا سنجیدہ شخص اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی بے دال کا بودم ہو۔

جب میری بیوی سارا واقعہ سنا چکی تو مجسم سوال بن کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں؟ جب میری خاموشی کا سلسلہ دیر تک ٹوٹ نہ سکا تو شاید اس نے سمجھ لیا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ گفتگو جاری رکھنے کے لیے وہ گویا ہوئی۔

" تمھارا خیال ہے وہ ان حالات میں بھی تمھارے خط کا جواب دیں گے؟"

اس کا جواب اگلے چند روز میں معلوم ہو جائے گا" میں نے پُرخیال انداز میں سر ہلا دیا۔

اور پھر کوئی دو ہفتے بعد مجھے اس کا رجسٹرڈ خط ملا کافی طویل خط تھا اور اس میں اُس نے وہ سارے حالات تفصیل سے قلمبند کئے تھے جو میں اپنی بیوی سے پہلے ہی سُن چکا تھا۔ اُس کے خط کا لہجہ بڑا افسردہ کن تھا۔ ایک ایسے مضمحل انسان کے احساسات کا عکاس جس نے ناامیدیوں سے ابدی رشتہ جوڑ لیا ہو۔ ایک جگہ اس نے لکھا۔

" پرانی زمین سے رشتہ توڑ کر جیسے میں نے مابعد الطبیعاتی دنیا سے رشتہ توڑا ہے۔ میرے مزاج اور نئی زمین کے باسیوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے اگرچہ اپنی زمین پر میں سکون کے گریزپا لمحوں کا متلاشی تھا مگر وہاں میرا اپنا تشخص تھا۔ اپنی پہچان تھی یہاں میں تلاش کے باوجود سکون کے گریزپا لمحوں کو حاصل نہ کر سکا ہوں اور دوسری اذیت ناک بات یہ ہے کہ انجانے لوگوں کی بھیڑ میں اپنی پہچان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہوں"

اس کے بعد خط میں اُس نے وہ تمام رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات لکھے جو اُس کے ساتھ پیش آتے رہے تھے۔ خط کے آخر میں اُس نے لکھا۔

" نقل مکانی کے جتنے فائدے ہو سکتے ہیں، زمین چھوڑنے کے نقصانات بھی اتنے ہی ہیں۔ یہ ایک ایسا کاروبار ہے جس میں خالص فائدہ نام کی کوئی چیز نہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں تمھیں چھوڑنے کا مشورہ بالکل نہیں دوں گا اگر انجانی زمین پر انجانے لوگوں کے درمیان انجانی بلاؤں سے مقابلہ ایک اٹل حقیقت ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ انسان اپنی زمین پر اپنے لوگوں کے درمیان نامعلوم سمتوں سے آنے والی آسیبی قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ ایسے مقابلے میں ممکن ہے وہ اپنا سب کچھ ہار جائے مگر اس کی اپنی پہچان کو اُس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

باقی صفحہ ۵۵ پر

ناصر قریشی

# ....برجان درویش

ان درویشوں پر قہر تو اسی وقت نازل ہوا تھا جب انہیں اپنے اپنے گھروں سے بے گھر ہونے کا حکم ملا تھا۔ پھر یہ درویش اپنے گھروں اور پیاروں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں آ بسے۔ ان کے عزیزوں نے رخصت کرتے وقت دعا کی تھی کہ اے پروردگار یہ تیرے بندے اس سرزمین کے بیٹے اسی سرزمین کے دور افتادہ علاقے اور بھائی بندوں کی خدمت پر مامور کئے جا رہے ہیں۔ آج تو یہ پیٹھ دکھائے جا رہے ہیں۔ کل انہیں روشن پیشانیوں کے ساتھ واپس بھیجیو۔" اور پھر یہ درویش اپنے معصوموں، اپنے جوانوں، اپنے ضعیفوں، اپنی ہواؤں اور اپنے سکھوں اور دکھوں کو چھوڑ کر اپنے آقاؤں کے حکم کے تحت مختلف سمتوں اور رستوں سے اس وادی میں پہنچے۔ جہاں چاروں طرف خشک اور پیاسے پہاڑ قطرہ، قطرہ بوند کو ترس رہے رہے۔ زمین کا ذرہ ذرہ آنکھیں پھاڑے آسمان کو تکتا ہے۔ بے آسرا ہوائیں چیختی ہیں، چلاتی ہیں اور پہاڑوں سے ٹکراتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔ پھر اسی خاک اور افلاک کی کوکھ سے یہ ہوائیں جنم لیتی ہیں اور یہ بادو آب و گل کا دائرہ چلتا رہتا ہے۔ یہ درویش ایک دوسرے سے اتنے واقف ہیں کہ یہ تک جانتے ہیں کہ ایک شخص دن میں کتنے سانس لیتا ہے۔ کتنی بار آنکھیں جھپکتا ہے۔ کتنی بار کس کے دل سے کتنی ہوکیں اٹھتی ہیں۔ کام کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے کون کتنی بار ان پہاڑوں سے پرے تاکتا ہے اور اس کی نگاہیں بے نیل و مرام لوٹ کر اپنے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ بے بسی کے یہ مجسمے اس بستی کے لوگوں کے لئے عبرت سرائے، دہرنے، نوکیلے، پتھروں سے اٹے رستوں پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے پھرتے ہیں اور بھرے دن میں اپنے گھروں کے خواب دیکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے صدیوں پرانی قبروں کے مردے زندوں میں آن بسے ہوں اور شکر کر رہے ہوں کہ ہم مردے ان زندوں سے بہتر ہیں۔ مگر مسکن اور مامن سے دور شفقتوں کے مارے ہوئے اجنبی ویرانوں میں بھٹک رہے ہیں۔ عجیب ہو کا عالم ہے۔ چڑیلوں کی طرح ہوائیں چیخ رہی ہیں۔ وادی ان چیخوں سے گونج رہی ہے۔ اِس پہاڑ سے اُس پہاڑ تک سیاہ چادر پھیلی ہوئی ہے۔ بھیانک رات جیسے درویشوں کی گھات میں ہو۔ مگر یہ لوگ ایک تاریک کمرے میں بیٹھے اپنی اپنی کہہ رہے ہیں۔ یہ اندھیرے میں غرق اس قدر پرسکون کیوں ہیں؟ اندھیرے کی کوکھ سے آواز ابھرتی ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو تکتے تکتے تنگ آ چکے ہیں۔ ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہو چکے ہیں۔ نفرتیں ان کی پیشانیوں پر تیور بن کر مرتسم ہو چکی ہیں۔ مگر چونکہ یہ آدم کی اولاد ہیں اور بستی کے لوگوں سے کم اور خود اپنے اندر والوں سے زیادہ خائف ہیں۔ ایک دوسرے کی آواز برداشت کر رہے ہیں۔ ہر چند کہ آوازیں بھی وہی نہیں رہیں جو تھیں تاہم آوازیں ہی پہچان کا ذریعہ ہیں۔ ہر آواز ایک شخصیت ہے۔ ہر آواز ایک درویشیت ہے، وحشت ہے، ہیبت ہے اور تاریکی میں تو مجسم خوف! ہر آواز ایک دوسرے سے خائف ہے اور تمام آوازیں اندھیروں سے ڈرتی ہیں۔ اندھیرے جو

انہیں دن میں بھی گھیرے رہتے ہیں۔ جوان کے تن بدن کے بیچ اُتر گئے ہیں۔ جوان کے رگ و ریشے میں سما گئے ہیں ان کی آنکھوں کی سفید پتلیاں بھی سیاہ ہو چکی ہیں۔ اب تو ان کو دن میں بھی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ اندھیرا ان کی زندگی بن گیا ہے۔ اندھیرے میں ٹٹولتے نہیں۔ بلکہ یوں چلتے پھرتے ہیں جیسے جب یہ اپنے گھروں میں تھے تو انہیں دن اور رات کی تمیز تھی، محبت اور نفرتوں کا فرق جانتے تھے۔ اپنوں پرایوں کو پہچانتے تھے اور زندہ تھے۔ البتہ یہ تاریکیوں میں اپنے اپنے لاشے اٹھائے پھر رہے ہیں اور صرف آواز ان کی پہچان رہ گئی ہے اور نفرتوں نے انہیں گھیر لیا ہے۔ محبتوں کے پیاسے نفرتوں کو گھونٹ گھونٹ پی رہے ہیں اور کہنے کو جی رہے ہیں۔ مگر عجیب قہر سے گزر رہے ہیں۔ ہوئے جو درویش!

اندھیرے میں کچھ پتھر لڑھک کر پہاڑوں سے سر پھوڑتے شہاب ثاقب کے ٹکڑوں کی طرح تاریکیوں کو چیرتے نیچے آرہے ہیں۔ اور ان کی مترنم آوازیں تاریک فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر رہی ہیں۔ انہیں آوازوں میں سے ایک ہیولہ اُبھرتا ہے اور درویشوں کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ درویش جو اپنے دکھوں کے الاؤ میں بھسم ہو چکے ہیں۔ آنکھوں کی بجھی بجھی چنگاریوں سے اس ہیولے کو دیکھتے ہیں اور ایک آواز ہو کر پکارتے ہیں۔ "ایک زندانی اور آیا" ہیولے میں سے آواز نکلتی ہے۔ میں زندانی نہیں مفرور ہوں تم شاید سرکار کی قید میں ہو۔ میں سردار کی قید سے بھاگ آیا ہوں۔ گویا صدیوں کی کشاکش کے بعد میں جب زندان میں ڈالا گیا تھا تو مجھے ماں، باپ، بھائی، بہنوں اور بیوی بچوں کے درمیان سے اُچک لیا گیا تھا۔ نہ انہیں رونے کی اجازت تھی نہ مجھے مُڑ کر انہیں ایک نظر دیکھنے کی۔ مجھ پر پتھر پھینکے گئے۔ لہولہان کر دیا گیا اور پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ میری مشکیں کس ڈالی گئیں اور طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے خدا جانے کن جہنم زار وادیوں میں دھکیل دیا گیا۔ جب میں زنداں میں دھکیلا گیا تھا تو میں نوجوان تھا۔ اور اب جب کہ میں زنداں سے فرار ہوا ہوں تو میری ڈاڑھی، مونچھیں، سینے کے بال سب سفید ہو چکے ہیں۔ زنداں کے ہر پتھر پر میری زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک ایک حسرت نقش ہے۔ نہ غار کے دہانے سے چٹان کھسکتی نہ میں باہر آسکتا۔ باہر آ کر اسی رات کی تاریکی میں سب سے پہلے چوری چھپے اپنے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ نہ صرف میرا گھر بلکہ پورا گاؤں صاف کر دیا گیا تھا۔ گویا میرا جرم سب کا جرم ثابت ہوا۔ جو اپنوں پرایوں سب کو لے ڈوبا۔ پیدا کرنے والے کی قسم! میں نے سردربار کہا تھا۔ اللہ ایک، اس نے سربازار کہا میں ہوں اکبر۔ اور پھر مجھے زنداں میں دھکیل دیا گیا۔ ہر چند کہ میرے بیرونی زخم مندمل ہو چکے ہیں لیکن اندر کا گھاؤ الاؤ بن گیا ہے ــــ لیکن تم تو خود اپنے اپنے الاؤ میں بھسم ہو رہے ہو۔ آؤ ــــ ہم سب ایک ہی آگ کے سوختہ ہیں ــــ آؤ ایک دوسرے کے زخموں پر گیلی مٹی کا پھایا رکھیں کہ یہ مٹی بڑی پُرتاثیر ہے۔ اس میں بزرگوں کا پسینہ، غازیوں کی کاوشیں اور شہیدوں کا خون شامل ہے۔ یہ مٹی ہمارے دکھوں کے لئے اکسیر ہے۔

## بقیہ: بے شناخت

زندگی کے باب میں میرا نقطۂ نظر میرے دوست کے نقطۂ نظر سے ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ ماضی میں اُس نے میری تقریباً ہر بات سے اور میں نے تقریباً اُس کی ہر بات سے اختلاف کیا تھا۔ مگر خط پڑھ کر میں نے پہلی بار اُس کے اس مخصوص نقطہ نظر کو قبول کیا اور نقل مکانی کا ارادہ ترک کر دیا۔

نسیم انجم

# بیسویں صدی کے لوگ

وہ بوڑھا بھی بڑا ہی عجیب و غریب تھا ۔ اسکا رہن سہن ، رسم و رواج شہر کے باسیوں سے قطعی مختلف تھے ۔ اسکے طرز معاشرت کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بوڑھا لکیر کا فقیر ہے ۔ صدیوں پرانے چلن میں ذرا سی بھی تبدیلی کرنے کا خواہشمند نہیں ہے ۔ کچھ کا خیال تھا کہ بوڑھا فرسودہ رسموں پر عمل پیرا ہوکر اور زمانے کے دستور سے بغاوت کر کے اپنے آپکو حسب کا حقدار اور بہت بڑا دیندار سمجھتا ہے ۔ جبکہ اسلامی علم سے نابلد ہے ۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ۔ لیکن بوڑھے کو لوگوں کی باتوں کی ذرہ برابر بھی فکر اور پریشانی نہیں تھی ۔ وہ تو بس اپنی ہی دنیا میں مگن اور خوش تھا ۔

بوڑھے نے ابھی زندگی کی نصف سینچری بڑے سکوں اور چین سے بسر کی تھی لیکن چند سالوں سے اسکے شب و روز میں بیچینی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور جب وہ تفکرات کی کشتی میں بیٹھا گھنٹوں سوچا کرتا اور بھنور سے نکل کر کنارے کو پانے کی تمنا کرتا ——— لیکن حالات کی بے رحم موجیں اسے طغیانی کے سپرد کر کے خود اسکا مذاق اڑایا کرتیں ۔

بوڑھے کی اضطرابی کیفیت اور اسکا اصل مسئلہ ملگجے کپڑوں میں لپٹی ہوئی غلیظ گٹھڑیاں تھیں ۔ وہ بھاری گٹھڑیاں کو اپنے ناتواں کاندھوں پر لادے گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھوم رہا تھا تاکہ گٹھڑیاں اصل مالک کے پاس پہنچا سکے ۔ مالک کی تلاش بوڑھے کو بے کل کئے ہوئے تھی ۔ بوڑھا ایک جگہ سے مایوس ہوتا تو دوسری جگہ چلاجاتا ۔ دوسری جگہ سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تو تیسرے راستے پر گامزن ہوجاتا مال کے حقدار کی تلاش میں سر گرداں پھرتا ۔ لیکن سفر کا سلسلہ ہنوز جاری رہتا ۔

دوران سفر جن لوگوں سے ملاقات ہوتی ۔ بوڑھا اپنا مدعا بیان کرتا لوگ بوڑھے کی گٹھڑیوں کا مال دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتے ۔ بوڑھے کو لوگوں کی خواہش ذرا پسند نہ آتی اور وہ آگے بڑھ جاتا ۔

بعض اوقات تھک ہار کر گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا ۔ اور سرد آہ بھر کر کہتا کہ یہی میرے نصیب ہیں ۔ ؟ اے میرے رب جب تونے میرے کمزور

کاندھوں پر بوجھ لاد دیا ۔ تو اس بوجھ کا کوئی اٹھانے والا بھی پیدا کرتا ۔ میں ایام پیری میں کب تک زمانے کی ٹھوکریں کھاتا پھروں گا ۔ آہ میں بھی کسقدر بدنصیب ہوں ۔ خیرکبھی نہ کبھی تو میری کوششیں رنگ لائیں گی وہ اپنے شکستہ دل کو تسلی دیتا اورحقدار کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا ۔

مستقل بھاگ دوڑنے اسے بیمار کردیا تھا ۔ بیماری کی وجہ سے وہ زیادہ تر گھر پر ہی وقت گذارتا —— اسکی مایوسی کو دیکھکر اسکی بیوی اسے اکثر سمجھاتی تم نے اپنیجان کو روگ کیوں لگالیا ہے ؟ اور پھر حالات بھی تو تمہارے ہی پیدا کردہ ہیں —— اس دور میں جبکہ لوگ اپنے گھروں کو بجلی کی روشنی سے منور کرتے ہیں۔تم دیئے کی روشنی پسندکرتے ہو ۔ گھرگھر گیس کے چولہے لگ گئے ہیں ۔ تم لکڑیوں کے چولہے پر پکا ہوا کھانا کھانا اپنی شان سمجھتے ہو ۔

اور ۔ اور عورتیں پہاڑوں کی چوٹیاں سر کررہی ہیں ۔ کیا کہتے ہیں اسے بوڑھے کی بیوی نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا ۔ ہاں یاد آیا کوہ پیمائی اور تم عورت کو کوٹھری سے آنگن تک آنے کی اجازت نہیں دیتے ہو۔ یہ سب باتیں تجھے کس نے بتائیں —— بوڑھے نے خوانخوارنگاھوں سے بیوی کو دیکھا ۔ ایے لو سکھاتا کون ؟ اخبار پڑھتی ہوں۔ اخبار ۔؟ بوڑھے نے حیرت سے بڑھیا کو دیکھا ۔ حیران کیوں ہوتے ہو ۔ ردی پیپر والے سے لے لیتی ہوں۔ تم نے تو بے جا پابندئیاں لگائی ہوئی ہیں ۔ آخری حملہ بڑھیا نے ڈرتے ڈرتے کہا ۔

چپ ہوجا زبان دراز تجھے تو آزادی پسند ہے آزادی ! بوڑھا غصّے سے بولا کیا اپنی غیرت کو نیلام کردوں ۔ اپنی عزت اور خاندانی شرافت کو داؤ پر لگادوں ۔ لیکن زمانہ اور وقت۔ ۔ بیوی ان دو الفاظ کے سوا کچھ نہ کہہ سکی ۔ چونکہ بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھکر اسکے سر پر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔زمانہ اور وقت بوڑھے نے لفظوں کو چبایا ۔ ابھی بوڑھا نہ معلوم کیا کچھ اورکہتا کہ دروازے کی دستک نے تکرار کو ختم کردیا ۔

کون ہو تم ؟ اور کیوں آئے ہو دروازے پرکھڑے ہوئے نوجوان کودیکھکر بوڑھا کرخت لہجے میں بولا ۔

بابا میں تمھاریگھٹٹر ئیاں خریدنا چاہتا ہوں کل میں آؤں گامیرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہونگے ۔ اگرمال پسند آیا تو ضرور خریدلوں گا ۔ ویسے تمھارے محلّے کے کچھ لوگوں نے بتایا ہے مال تمھارا صاف ستھرا اور اچھاھے کس سے سنا ہے ؟ بوڑھا جوش میں آگیا۔ اسے نوجوان کا آخری فقرہ قطعی پسند نہیں آیا ۔ بوڑھے کے تیور دیکھکر نوجوان ڈر سا گیا ۔ پھر جی کڑا کرکے بولا ۔ اسمیں ناراض ہونے کی کونسیبات

هے بابا ؟ "کونسی بات هے" بوڑھے سے نوجوان کی نقل اتاری اور حقارت سے بولا ـ دور هوجا میری نگاهوں سے نہیں بیچنا مجھے اپنا مال ـ

نوجوان کے جانے کے بعد بوڑھے نے گٹھڑیوں کو اپنی جھکی هوئی کمر پر لادا اور دوسرے قصبے میں چل دیا یہاں کے لوگ بوڑھے کی ذہنی حالت سے واقف نہیں تھے لہذا کئی لوگ اسکے ارد گرد جمع هوگئے ـ لیکن بوڑھے کی کڑی شرط سنکر لوگ جلد هی اپنے گھروں کو لوٹ گئے ـ

بوڑھا همیشہ کی طرح شکست خوردہ گھر کی سمت هولیا ـ بیوی نے بوڑھے کو تھکا ماندہ اور پریشاں دیکھا تو تسلی دیتی هوئی بولی ـ هوجائیے گا تمھارا مسئلہ حل نہ ـــــــــے ســـــاجی اپنے آپکو پریشاں کیا هوا هے ـ اور پھر تم شرط کو ختم کیوں نہیں کردیتے هو ـ سوچو تو ـ بساد یکھے کوئی بھی چیز پسند کی جاسکتی هے ـ کسی کو کیا معلوم ؟ تمھارا مال ناقص هے یا اچھا هے اب وقت بدل گیا هے ـ حالات بدل گئے هیں ـ تم صدیوں پرانی رسموں کو اپنائے هوئے هو ـ هم بیسویں صدی کے انسان هیں ـ "هاں تو صحیح کہتی هے ـ" بوڑھے نے کہا ـ هم انسان ضرور بیسویں صدی کے هیں ـ لیکن همارى سوچوں پر همارے آباؤ اجداد کی روحیں ////// رهی هیں ـ لہذا هم کچھ نہیں کرسکتے اور هم کر بھی نہیں چاہتے

هم اپنے بزرگوں کے اصول نہیں بدل سکتے هیں ایسا کرنے سے همارے بزرگوں کی روحوں کو تکلیف پہنچے گی ـ تم نے کس سے کہا کہ انھیں تکلیف پہنچے گی " بوڑھے کی بیوی میاں کو دھیما پاکر هولے سے بولی ـ کہے گا کون ـ ؟ میرا دل کہتا هے ـ مجھے معلوم هے اور پھر برادری والے کب جینے دیں گے تم برادری والوں کی کیوں پرواہ کرتے هو پھر کیا تیری پرواہ کروں ؟ بوڑھے کو غصہ آگیا بوڑھے کی مسلسل تک و دو سے آخر وہ وقت بھی آگیا ـ جسکے لئے وہ مارا مارا پھر رہا تھا ـ دن رات کا چین گنوا بیٹھا تھا ـ

والوں کی کیوں پرواہ کرتے هو پھر کیا تیری پرواہ کروں؟ بوڑھے کو غصہ آگیا بوڑھے کی مسلسل تک ودو سے آخر وہ وقت بھی آگیا ـ جسکے لئے وہ مارا مارا پھر رہا تھا ـ دن رات کا چین گنوا بیٹھا تھا ـ

بوڑھے نے اپنے ذہن کے دریچوں سے ساری گٹھڑیوں کو اٹھاکر پھینک دیا اور آپ وہ اپنے آپکو ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا ـ فتح و کامرانی کا احساس لئے خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا ـ

مہمانوں سے پورا صحن بھرچکا تھا برادری کے معمر بزرگ اور دوسرے لوگ کمرے میں جاچکے تھے ـ

معمر بزرگ نے جو کچھ کہا ـ بوڑھے

باقی صفحہ ۶۶ پر

اظہر حسن صدیقی

# صاحب میٹنگ میں ہیں

"ہیلو! ہیلو! کون صاحب بات کریں گے..... کہاں سے؟ وقفہ..... دیکھئے "صاحب" میٹنگ میں ہیں آپ ایسا کریں اپنا نمبر لکھوا دیں جیسے ہی "صاحب" خالی ہوں گے بات کرادی جائے گی"۔

اگر آپ نے دنیا تیاگ نہیں دی ہے اور گلشن کے کاروبار میں مصروف ہیں اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی رکھتے ہیں تو اس قسم کی گفتگو سے آپ کا روزانہ دن میں حسب ضرورت کم از کم چار پانچ مرتبہ واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ اب اگر کہیں آپ کے ساتھ یہ واقعہ پہلی مرتبہ ہوا ہے تو آپ سچ مچ اس بات کے انتظار میں رہیں گے کہ "صاحب" جونہی خالی ہوں گے یا جیسے ہی انہیں فرصت ملے گی وہ فوراً آپ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے فون کریں گے۔ گھبرایئے نہیں آپ کی یہ خوش فہمی یا غلط فہمی جلد ہی دور ہو جائے گی "صاحب" آپ کو کبھی فون نہیں کریں گے۔

"صاحب" ہونے کے لئے سرکاری یا نیم سرکاری ملازم ہونا شرط نہیں ہے۔ ہر وہ آدمی خواہ وہ ملازم ہو، تجارت پیشہ ہو، وکیل ہو، ڈاکٹر ہو یا جو شخص بھی معاشرے میں ذرا سی اہم جگہ پر پہنچ گیا ہو یا جس سے بھی کسی دوسرے آدمی کا کام پڑ سکتا ہو وہ ہمارے اور آپ کے لئے "صاحب" ہو سکتا ہے۔ اور وہ ایسے وقت میں جب اس کے لئے وقتی طور پر کوئی بیکار آدمی فون کرے تو وہ ہمیشہ میٹنگ میں ہوتا ہے اور یہ میٹنگ کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ "صاحب" کبھی خالی ہوتا ہے اور نہ اسے آپ سے بات کرنے کی فرصت ہوتی ہے ا تو یہ کہ آپ کی خوش قسمتی یا یوں کہیئے کہ "صاحب" کی بدقسمتی سے انہیں آپ سے کوئی کام ہو پھر دیکھئے کہ صاحب کو فرصت ہی فرصت ہو گی اور ایک دفعہ نہیں دسیوں دفعہ صاحب بنفس نفیس۔ اسے اور سیکرٹری کے آپ کو نہ صرف خود فون کریں گے بلکہ آپ کے گھر کا پتہ بھی دریافت کر لیں گے اور وہاں ملنے پہنچ بھی جائیں گے اور اگر اشد ضرورت ہے تو آپ کو اپنا پرائیویٹ نمبر بھی لکھا دیں گے۔

اگر آپ اس بات کی فوراً تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ صاحب موجود ہوتے ہوئے بھی کیوں نہیں ہیں یعنی کہ ـــ ہر چند کہ ہیں نہیں ہیں تو ہم اپنے ساتھ ہونے والے دو واقعات آپ کو سنائے دیتے ہیں آپ یہ نسخہ استعمال کیجئے۔ انشاء اللہ کامیابی ہو گی۔ صاحب سے آپ کی فوراً بات ہو جائے گی۔ بس ذرا اس بات کا خیال رکھیئے گا کہ اگر آپ کو صاحب سے کوئی کام ہے تو اس سے ہاتھ دھو لیجئے اور پھر صاحب کی عمر بھر کی خفگی علیحدہ رہی پہلا قصہ یوں ہے کہ ہمارے جاننے والوں میں ایک صاحب کی ایکدم سے ترقی ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑے آدمی بن گئے اور اس طرح انہوں نے صاحب کا صاحب بننے کے بعد پرانے دوست احباب اور چھوٹے لوگوں سے ملنا جلنا قطعی ترک کر دیا۔ جب فون کیا جاتا یا ملنے کی کوشش کی جاتی وہی گھسا پٹا جواب ملتا "صاحب دفتر میں نہیں ہیں یا میٹنگ میں ہیں فون نمبر دے دیجئے بات کرادی جائے گی" ہمارے اور ان کے ایک

ہا بھی دوست کو ان صاحب کی بہت تلاش تھی کہ کسی طرح ان سے گفتگو ہو جائے۔ ہم سے بھی انہوں نے ایک دن ذکر کیا کہ فلاں صاحب اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ ان سے بات کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے فون ہم ملوائے دیتے ہیں بقیہ نتائج تم خود سمجھنا۔ اتفاق سے ہمارے دوست کا نام اس وقت کے نہایت معروف اور اہم وزیر با تدبیر سے ملتا جلتا تھا۔ چنانچہ ہم نے انہیں فون کیا اور جب پی۔ اے نے نام پوچھا تو وہی نام بتا دیا فوراً موصوف فون پر آ گئے اور فرمایا "یس سر" لیکن جب ہماری آواز پہچانی تو بہت برہم ہو کر گالیاں دینے لگے۔ ہم نے عرض کیا "بتایئے کیا غلط نام لیا ہے۔ ہم نے تو صحیح نام بتایا تھا اب اگر آپ کے اعصاب پر وزیر صاحب سوار ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے یہ خطا البتہ ہوئی کہ یہ معلوم ہو گیا آپ نہ میٹنگ میں ہیں اور نہ مصروف ہیں" ویسے بھی ہم نے آج تک کوئی ایسی میٹنگ نہیں دیکھی جو کبھی ختم نہ ہو یا جس کے بعد انسان فون نہ کر سکے۔

دوسرا واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک دوست کو کسی صاحب سے کوئی کام پڑ گیا اور ہماری یہ بد نصیبی کہ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ صاحب موصوف سے ہماری بھی یاد اللہ ہے۔ بس جناب، ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ ہماری ملاقات کراؤ حسب دستور ہم جب بھی فون کرتے کہ ان کے پاس وقت لے کر جائیں یہ معلوم ہوتا کہ "صاحب" یا تو میٹنگ میں ہیں یا دفتر کے باہر گئے ہوئے ہیں۔ جب ہمیں صاحب کا سنے بہت ہی مجبور کیا تو آخر ہم نے صاحب سے بات کرنے کا طریقہ بھی ڈھونڈ ہی لیا۔ ہم نے "صاحب" کو ان کے بیٹے "صاحب" کے نام سے فون کیا اور حسب توقع صاحب فوراً فون پر آ گئے مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ آج تک ان سے تعلقات دوبارہ خوش گوار نہیں ہو سکے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ ہمیں یاد آ رہا ہے جو بظاہر معمولی نوعیت کا ہے مگر اس قسم کے معاملات میں نہایت اہم قسم کا ہے یہ قصہ ہمیں ہمارے ایک دوست نے خود سنایا جو ایک بہت اہم عہدہ پر فائز تھے۔ کوئی ضرورت مند آدمی ان سے ملنے کی کئی دن سے کوشش کر رہا تھا مگر حسب دستور "صاحب" کا پی اے اسے وہی رٹا رٹایا جواب "صاحب بہت مصروف ہیں یا میٹنگ میں ہیں" والا جملہ سنا کر ٹرخا دیتا تھا۔ آخر روز روز یہ جملہ سنتے سنتے وہ بے چارہ عاجز آ گیا اور پی۔ اے سے زور سے یہ کہتا ہوا جانے لگا "اپنے صاحب سے کہنا کہ ہم بھی جب ہی تک ملنے آ رہے ہیں جب تک وہ مصروف ہیں۔ جب وہ مصروف نہیں ہوں گے تو ملنے بھی کوئی نہیں آئے گا" اتفاق سے یہ گفتگو ہمارے دوست نے بھی سن لی اور وہ اس کی اس بات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اس کو بلا لیا اور اس کی بات نہ صرف سُن لی بلکہ اس سلسلہ میں جو ضروری کارروائی ہونی تھی وہ بھی کر ڈالی۔

"صاحب میٹنگ میں ہیں یا مصروف ہیں" فقرے سنتے سنتے حاجتمند آنے والوں نے صاحب سے گفتگو کرنے یا ملنے کے لئے فون کے علاوہ بھی ذرائع دریافت کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ کہتے ہیں جو یندہ یابندہ حاجت بُری بلا ہوتی ہے اور حاجت مند کو اپنا کام نکالنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں "صاحب" کے منہ چڑھے ملازموں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے پھر ان کے قریبی دوستوں عزیزوں اور رشتہ داروں کی فہرست تلاش کی جاتی ہے اور آخر میں سب سے اہم ذریعہ یعنی بیگم صاحبہ تک پہنچنے کی کوشش ہوتی ہے۔

جو لوگ "صاحب" کی میٹنگ کا شکار ہوتے ہیں وہ اپنے کام نکالنے کے لئے اور صاحب تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ضرورت ایجاد کی ماں ہے کہ مقولہ پر عمل کرتے ہوئے طرح طرح کے طریقے دریافت کرتے ہیں۔ پھر یہ ہتھکنڈے یا طور طریقے ہر ملک کے رواج کے مطابق

ہوتے ہیں کہیں پر ذاتی معالج کا نام لینے سے اور کہیں پر انشورنس کمپنی یا وکیل کے نام سے کام چل جاتا ہے۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک میں پولیس کے محکمہ یا کسی اور اہم محکمہ کے نام سے فون کرنے سے بھی اکثر "صاحب" سے بات چیت ہونے کے امکانات کافی روشن ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں صاحب سے ملنے اور قرب حاصل کرنے اور پھر کام نکالنے کے بھی بہت سے مروجہ قاعدے اور طریقے ہیں اب آپ ان میں سے کونسا آزماتے اور اپناتے ہیں یہ "صاحب" اور ضرورت مند کی عادات اطوار اور خاص طور پر وسائل پر منحصر ہے۔ بعض صاحب لوگ جلسہ یا تقریب کی صدارت سے قابو آجاتے ہیں جب کہ بعض حضرات کو مہمانِ خصوصی بننا زیادہ پسند ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تقریر کر کے خوش ہوتے ہیں۔ کسی کو کھیلوں کی تقریب زیادہ بھاتی ہے۔ شعر و شاعری اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے "صاحب" ایسی تقاریب کی صدارت کو بہت پسند کرتے ہیں۔ پھر کچھ حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں قوالی یا راگ رنگ کی محفلیں زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ ویسے یہ طریقہ واردات ضرورت مند کو کافی مہنگا پڑتا ہے۔ مگر کہتے ہیں مرتا کیا نہ کرتا حاجت روائی کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ سے کیا پردہ ہم نے تو بعض ایسے ضرورت مندوں کو جنہیں ویسے زندگی میں کبھی روزہ نماز کے قریب بھی پھٹکتے نہیں دیکھا۔ "صاحب" کے قرب کے چکر میں عمرہ اور حج کرتے دیکھا ہے اور بڑے بڑے دور افتادہ مزارات تک کے چکر لگاتے دیکھا ہے۔

اس سلسلہ میں ہونے والا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی آپ کو سنادیں جس کے شاہد ہم خود ہیں۔ ہمارے ایک تجارت پیشہ دوست کو کسی "صاحب" سے بہت ضروری کام تھا اور وہ ان سے ملنے کے لئے بہت بے چین تھے مگر ان "صاحب" سے کسی طرح ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ بیچ میں پی۔ اے اور سیکریٹری ظالم سماج کی طرح حائل تھے۔ اتفاقاً ایک شادی میں جہاں ہم دونوں موجود تھے وہ "صاحب" بھی آگئے کیونکہ اس وقت اور کوئی چمچے موجود نہیں تھے انہوں نے سوچا کہ ہم سے ہی گذارا کیا جائے بڑے مربیانہ انداز میں ہماری خیر و عافیت دریافت کی۔ ہمارے دوست نے جو یہ منظر دیکھا تو بس ان کے دل کو لگ گئی، سخت اصرار کہ ہم سے ملاقات کرادیں۔ چنانچہ ہم اپنے دوست کو ان کی طرف لے کر بڑھے اور یہ کہہ کر "سر یہ ہمارے بہت عزیز دوست ہیں" ان سے ملاقات کرادی۔ اس واقعہ کو ہم قطعی بھول چکے تھے کہ کچھ عرصہ بعد ایک شادی میں ہماری ملاقات ہمارے انہی "عزیز دوست" سے ہوگئی وہ بھی ہوٹل میں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے باس جو اکثر ملک سے باہر رہتے تھے آئے ہوئے ہیں اور ہمیں بہت یاد کر رہے تھے۔ ساتھ ہی انہوں نے ہمیں اپنے کمرے پر چلنے کی دعوت دی تھی جو اس ہوٹل میں ان کے مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے محفوظ رہتا تھا۔ ان کے اصرار پر ہم ان کے ساتھ ہو لئے اور جب کمرے میں پہنچے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے "صاحب" کو وہاں پایا جن سے ہمارے دوست اور ان کے باس نہایت بے تکلف ماحول میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہی نہیں مزید حیرت اس بات پر ہوئی جب ہمارے دوست نے ہمارا تعارف "صاحب" سے اسی طرح کرایا جس طرح ہم نے چند روز پہلے ہی ان کا صاحب سے کرایا تھا تو صاحب یہ قطعی بھول چکے تھے کہ ہم ہی ان کا تعارف کرا چکے ہیں۔

جس زمانے میں تمام "صاحب لوگ" فرسٹ کلاس سے ہوائی سفر کیا کرتے تھے۔ ضرورت مند حضرات ایسے لوگوں کا قرب حاصل کرنے کے لئے پگڑی دے کر ہوائی جہاز میں فرسٹ کلاس کی نشستیں حاصل کرتے تھے۔ اس خوشگوار ماحول میں صاحب سے گفت شنید بالمشافہ ہوتی تھی کیونکہ ایسے موقع پر نہ سیکریٹری ہوتا تھا نہ پی۔ اے ہوتا تھا نہ فون ہوتا تھا اور نہ صاحب میٹنگ میں ہوتے تھے۔

مسٹر دہلوی

# مطالعۂ قلم کاری

کہتے ہیں ایک مفلوک الحال شخص دنیاوی جدوجہد میں ناکامی جھیلتے جھیلتے عاجز آگیا تو مر کے رسوا ہونے کی جگہ غرق دریا ہونے پر تل گیا۔ مگر حیات مستعار ابھی باقی تھی، سو ملک الموت صاحب موقعۂ واردات پر بہ نفس نفیس جا نکلے اور مظلوم موصوف کی روئیداد محرومی سن کر چند مشورے ایسے دیئے گئے جن پر عمل پیرا ہونے سے آں ممدوح کی زندگی سنور گئی۔

بے شک ہمارے احباب ہمیں اپنی فرصت و مصروفیت دونوں کے حق میں ملک الموت سمجھتے ہیں اور ہم بھی اس پر پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ

"ہم کس بلا کی شے ہیں، ہمیں جانتے ہیں داغ"

لیکن ملک الموت کی دشمنی مول لینے سے ڈرتے ہیں اس لئے مفت ملنے والی عظمت سے منہ موڑ کر اعلان کرتے ہیں کہ ہم ملک الموت کی خاک پا بھی نہیں اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی منکر نہیں ہیں کہ ہم مشورہ دینے میں مہارت تامہ کے حامل ہیں اور اس گمان پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ دنیا تو دنیا ہے اگر خود ہمیں نے اپنے مشوروں پر خلوص نیت سے عمل کر لیا ہوتا تو آج ہماری حالت وہ نہ ہوتی جو فی الواقعہ ہے۔

بنا بریں ہم سو فیصد یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ آپ کی امید بھی مرنے پر منحصر ہو اور آپ کا حال بھی مذکورہ مرد ناکام جیسا ہو کہ :-

علم آیا ہو نہ حصے میں ترے اور نہ دھن
تجھ کو آتا نہ ہو دنیا کا اگر کوئی بھی فن
تجھ کو گمنامی کا دنیا نے اڑھایا ہو کفن
ملتفت تیری طرف کوئی نہ ہو، مرد نہ زن

تو ہم بھی آپ کو ایک تیر بہ ہدف، سو فیصد مجرب نسخہ یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ دنیا کے دوسرے تمام دھندوں سے کنارہ کش ہو کر صرف ایک پیشہ قلم کاری کے ہو رہیں۔ اور پھر دیکھیں کہ آپ کے ولدّر چند ہی روز میں دور ہو جاتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ وہ دلدّر جب تک دور نہیں ہوتے اس وقت تک اپنے ناسازگار ماحول کو برداشت کر لینا آپ کے لئے آسان ہو جاتا ہے یا نہیں۔

اب آپ پوچھئے کہ قلم کاری ہی کیوں۔ اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی شعبہ کیوں نہیں۔ تو ہم عرض کریں گے کہ قلم کاری ہی دنیا کا واحد پیشہ ہے جس پر ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ رنگ چوکھا آئے کی مثل صادق آتی ہے دنیا کے ہر پیشے کا رہنما اصول یہی ہے کہ جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا۔ مگر پیشۂ قلم کاری میں مٹھاس کا تعلق شکر سے نہیں ہوتا کیونکہ یہ پیشہ ذیابیطس کے مریض کی طرح اپنی شکر آپ بنا لیتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دوسرے ہر پیشے میں علم و عقل اور صفات ظاہری و باطنی کو ریاضت و محنت کی سان پر مستقلاً تیز کرتے رہنے ہی سے کامیابی ملتی ہے اور شہرت و عزت بھی

انہیں عناصرِ ترکیبی کے صحیح امتزاج سے حاصل ہونے والے نتائج کی مرہونِ منت ہوتی ہے اس پر مزید مشکل یہ کہ ان پیشوں میں کامیابی صرف وہی سمجھی جاتی ہے جو غیر معمولی ہو پھر وہ بھی ایک علیحدہ اکائی شمار ہوتی ہے اور اس کے ساتھ بھی رات گئی بات گئی والا معاملہ ہوتا ہے۔ جب کہ پیشۂ قلم کاری میں آدھی پاؤ کامیابی بھی پوری کامیابی گنی جاتی ہے۔ اور ناکامیاں ہزاروں بھی ہوں تو وہ کہنی کی چوٹ سمجھ کر بھلا دی جاتی ہیں۔ بے شک وہ چوٹ جب لگتی ہے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ مگر دس پندرہ منٹ کے بعد یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ ابھی چوٹ لگی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم نے ۱۹۶۵ء میں حملہ آور کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ سو اس کی خوشی منانے کو سالانہ چھٹی آج تک لے رہے ہیں۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں جو کالک ملک و ملت کے منہ پر ملوا دی تھی اس کا ماتم ایک گھنٹے بھی نہیں کرتے اور کسی بڑے سے بڑے قوم پرست کی یہ مجال نہیں جو ہماری توجہ اس بوالعجبی کی طرف مبذول کرا سکے۔

مگر خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو برسبیل تذکرہ آ گیا ورنہ ہماری یہ ہمت کہاں کہ قوم نے جس المیے کو بعد از کوشش ہزار بھلایا ہے ہم اسے یاد دلانے کی جسارت کریں۔ لہٰذا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے پھر شروع کرتے ہیں کہ کامیابی تو اور پیشوں میں بھی مل جاتی ہے۔ اور شاید پیشۂ قلم کاری سے کچھ زیادہ ہی مل جاتی ہے۔ لیکن یہ قلم کاری ہی ایسا پیشہ ہے جس میں ایک دفعہ حاصل کی ہوئی کامیابی برسوں تک بلکہ اکثر حالات میں زندگی بھر قلم کار کے کام آتی رہتی ہے۔ اور قلم کار کبھی پیداواری اضافے میں ممد و معاون ہوئے بغیر ہی قومی معیشت سے فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ آکاس بیل کی طرح جو درخت سے لپٹ کر اس کی توانائی چوستی ہے اور اس طرح نشو و نما پاتی ہے مگر اس درخت کو خود کچھ نہیں دیتی۔

اب آپ یہ مت پوچھئے کہ قلم کاری کاغذی تخلیقات کو پیداواری اضافہ کس طرح کہا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس سے طویل بحث چھڑ جائے گی اور حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اور نہ ایک معمولی کامیابی کے زندگی بھر کام آتے رہنے کی مثالیں طلب کیجئے گا کیونکہ ان میں زیادہ نام ایسے آئیں گے جو ہمارے آپ کے پسندیدہ نام ہیں سو ان کی مثال دینے سے اچھے دل برے ہو جانے کا خطرہ ہے۔ لہٰذا ہم بھی اپنے مرشد اکبر الہ آبادی کی تقلید میں کہتے ہیں کہ

میں نام بنام بات کہتا اکبرؔ
نازک معاملہ ہے مگر کون کہے

اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہ تو ہو گیا کامیابی کے پہلو سے جائزہ اب شہرت کے زاویئے کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی دوسرے شعبوں میں مل جاتی ہے۔ لیکن اوّل تو وہ شہرت دیرپا نہیں ہوتی بلکہ آندھی کی طرح آتی ہے اور طوفان کی طرح گزر کر صاحبِ شہرت کو درسِ عبرت بنا جاتی ہے۔ اس المیے کی بھی لاتعداد مثالیں موجود ہیں لیکن یہاں بھی ہمیں ڈر لگتا ہے کیونکہ ہم نے سن رکھا ہے کہ :-

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی مقدر کہیں مجھ سا نہ بنا دے

دوئم یہ کہ دیگر شعبوں میں حاصل ہونے والی شہرت صرف شہرت ہوتی ہے جب کہ قلم کاری میں شہرت کے ساتھ عزت بھی ملتی ہے۔ مثلاً نورجہاں، مہدی حسن، نیرہ نور وغیرہ نے فیض احمد فیضؔ کے کلام کو اپنی خوش گلوئی سے چار چاند لگا دئے اور اس کے عوض اپنی شہرت میں گراں قدر اضافہ بھی کر لیا لیکن کیا ان میں

سے کسی نے فیض جیسی عزت بھی حاصل کر لی؟ اسی طرح قوالی سے کچے گانے تک کوئی گائک ایسا نہیں جس نے علامہ اقبال کے کلام کو اپنی مقبولیت کا زینہ نہ بنایا ہو۔ مگر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا خود فریب بھی علامہ جیسی عزت کا خواب نہ دیکھ سکا۔

پھر ایک اضافی خوبی اس پیشے کی یہ ہے کہ قلم کار کبھی از کار رفتہ (RETIRED) نہیں ہوتا۔ دوسرے تمام پیشوں میں منظر عام پر جمے رہنے کا دارومدار قوٰی کی توانائی پر ہوتا ہے۔ جو عناصر کے اعتدال سے پیدا ہوتی ہے اور عناصر میں اعتدال کا تعلق عمر کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ عمر میں زیادتی کے باعث اعتدال عناصر گم ہو جائے تو مصور کے ہاتھ میں رعشہ آجاتا ہے۔ گلوکار کی آواز بھرا جاتی ہے۔ بلے باز کو گیند دکھائی نہیں دیتی۔ بولر کا سانس پھول جاتا ہے۔ پہلوان کے عضلات نرم پڑ جاتے ہیں۔ ہیرو کی توند نکل آتی ہے۔ ہیروئن کے چہرے پر کاروانِ عمر کے نقش پا یوں ثبت ہو جاتے ہیں کہ لاکھ میک اپ سے بھی "چھپائے نہ چھپیں" ۔ رنگروٹ کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ افسر سٹھیا جاتا ہے تو ان سب کی خوبیاں بھی عیب بن جاتی ہیں۔ لیکن قلم کار اور شراب ناب کی صفات ایک مانی جاتی ہیں کہ عمر جتنی زیادہ اثر انگیزی اتنی ہی فزوں ۔۔ یعنی محاورے کی زبان میں کہیں تو قلم کار وہ پان ہے جو پکا ہو تو مزا دے اور وہ چاول ہے جو پرانا ہو تو سواد زیادہ لائے۔

پھر سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ کہ عام لوگ اپنے اپنے شعبۂ حیات میں انتہائی کامیابی حاصل کر لینے کے بعد بھی جن نعمتوں کو ترستے ہیں ان میں سے بیشتر ہم قلم کاروں کو اکثر بغیر مانگے اور گاہ گاہ مراحل شہرت طے کئے بغیر ہی مل جاتی ہیں۔ مثلاً عام لوگوں کو جس کام کے لئے قطار در قطار کھڑا ہونا پڑتا ہے اور بیشتر مواقع پر شب ہجراں جیسا طویل عرصہ انتظار کاٹ لینے کے بعد بھی بے نیل و مرام لوٹ جانا پڑتا ہے۔ قلم کار کا وہ کام بالا ہی بالا ہو جاتا ہے اور اتنی جلد ہو جاتا ہے کہ خود قلم کار کو حیرت ہونے لگتی ہے۔

اب آگے چلیں اور یہ بتائیں۔ کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ آپ نہ صرف اندرون ملک ہوائی جہازوں میں اڑتے اڑتے پھریں بلکہ دیگر ممالک بالخصوص یورپ و امریکہ وغیرہ کی خوب سیر کریں۔ FIVE STAR ہوٹلوں میں قیام پذیر ہوں اور POSH ریستورانوں میں کھانا کھائیں۔ ضرور چاہتا ہوگا۔۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے لیکن ایمان سے کہئے۔ کتنے افراد ایسے ہیں جن کی یہ خواہش پوری بھی ہو جاتی ہے۔ باپ کمائی بلکہ پاپ کمائی والوں کے علاوہ کس کی جیب میں اتنا دم ہے جو ہزاروں روپے روزانہ رہائش کے لئے اور سینکڑوں روپے روزانہ کھانے کے لئے نکال سکے۔

اور آگے چلئے۔ کیا آپ کے دل میں یہ خواہش نہیں کلبلاتی کہ آپ کو بھی وی آئی پی سمجھا جائے۔ ہوائی جہاز پر چڑھتے اترتے قطار میں نہ کھڑا ہونا پڑے۔ لاؤنج میں داخل ہوتے وقت جرائم پیشہ افراد کی طرح اپنی اور اپنے سامان کی تلاشی نہ دینی پڑے۔ خود میزبان یا اس کا کوئی معقول نمائندہ ایک تابعدار خادم کی طرح سامنے کھڑا رہے اور آپ اسے اپنے نخروں سے نواز سکیں۔ یقیناً یہ تمام خواہشیں آپ کو بے چین رکھتی ہوں گی۔ اور رکھنا بھی چاہیئے لیکن توبہ کیجئے ہر ایک کے ایسے نصیب کہاں "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

مگر ہم اہل قلم لوگوں کے لئے یہ تمام باتیں روزمرہ ہیں کہ ہم جب کسی وفد کی شکل میں بیرونی ممالک کا دورہ کرتے ہیں تو نہ صرف یہ تمام حسرتیں نکلتی ہیں بلکہ شاپنگ کے لئے نقد نذرانہ اس کے علاوہ ملتا ہے۔

پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اندرون ملک و بیرون ملک اعلیٰ افسروں، وزیروں بلکہ سربراہان مملکت تک سے ملاقات کا جو

موقعہ اہل قلم کو ملتا ہے وہ دوسرے شعبہ ہائے حیات والوں کو نہیں ملتا۔ اوروں کی کیا کہیں خود اپنی بیتی بتاتے ہیں کہ صدر مملکت کے ساتھ آدھے گھنٹے کی بلاشرکت غیرے گفتگو کا موقعہ اسی قلم کاری کے طفیل مل گیا تھا۔ ورنہ کہاں راج بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔

یہ ہمیں بھی تسلیم ہے کہ مذکورہ فیوض و برکات کا بیشتر حصہ صرف معروف قلم کاروں کو ملتا ہے اور غیر معروف قلم کاروں کے حصے میں دور کا جلوہ ہی آتا ہے۔ مگر یہ تفریق خورد و کلاں اور یہ امتیازِ من و تو کس شعبۂ حیات میں نہیں اور اس امتیاز و تفریق کے باعث مال و منال میں کمی زیادتی کہاں نہیں ہے سو ہمارے شعبۂ قلم کاری میں بھی اگر ایسی مثالیں نظر آجائیں تو کیوں قیامت ٹوٹ پڑے۔

اب مثال کی بات آگئی ہے تو شاہ نامے والے فردوسی کا واقعہ یاد کریں کہ اس نے محمود غزنوی کی ہجو کہی اور اس دھڑلے کے ساتھ کہی کہ:۔

چو شاعر برنجد بگوید ہجا
ہجا تا قیامت بماند بجا

لیکن شاعر بڑا تھا۔ لہٰذا بادشاہ کے غیظ و غضب سے محفوظ رہا۔ وہ اس طرح کہ ادھر ادھر کے باج گزار حکمرانوں کے ہاں مہمان رہتا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو خبر ہوجاتی اور وہ اپنے مجرم کو اس حکمران سے طلب کرتا تو فردوسی کسی اور حکمراں کا مہمان بن جاتا تھا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ تا آں کہ درباری اُمراء بادشاہ کا غصہ فرو کرا کے مراسم خسروانہ بحال کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے برعکس ہمارے ہندوستان میں جعفر زٹلی صاحب نے اپنے بادشاہ فرخ سیر کی ہجو میں صرف ایک شعر:۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ پشہ کش فرخ سیر

کہا۔ لیکن شاعر چھوٹے تھے۔ اس لئے کسی کی امان نہ ملی اور فی الفور قتل کر دیئے گئے۔ سو یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ بڑی مچھلی جال کو توڑ کر نکل جاتی ہے اور چھوٹی مچھلی جال میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ باعتبار پیشہ مقام قلم کاری کتنا بلند ہے۔ سو وہ ہم نے دکھا دیا۔ اب آگے جہاں جائیں بتو وہاں جائیں بتو کے نصیب۔

مزید ایک لاکھ روپے والی خوبی پیشۂ قلم کاری کی یہ ہے کہ اس میں اہل قلم کو اپنے اہل و عیال کے مستقبل کی فکر سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ کل تک آپ کی طرح ہمارا بھی پختہ عقیدہ یہی تھا کہ پیشہ کوئی بھی ہو اگر وہ معاشرے کے لئے نقصان دہ نہیں ہے تو وہ حبیب اللہ ہے۔ لیکن ان حبیب اللہ پیشوں میں بھی باہم برتری و کم تری اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ کون سے پیشے میں پیشہ ور کے حال اور اس کے اہل و عیال کے مستقبل کا بہتر تحفظ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ہم بھی عوام کالانعام کی طرح یہی سمجھتے تھے کہ پیشۂ قلم کاری میں یہ بار عظیم اٹھانے کی سکت نہیں اور اسی اتفاقِ یقین کے تحت ہم نے اہل قلم کو یہ نصیحت بھی کر ڈالی تھی:۔

آج کل شاعروں کی رحلت پر
وقت اکثر یہ ہوتی ہے درپیش
وہ رقم چھوڑتے ہیں کم از کم
ہاں مگر شاہ کار بیش از بیش
شعر انمول ایسے ہوتے ہیں
مول لیتا نہیں انہیں کوئی ولیش

فاقے کرتے ہیں بیوہ اور یتیم
ڈونڈی پٹتی ہے جس کی دیش بدیش
کیا گزرتی ہے قلب پر ان کے
اس سے واقف کہاں ہیں زر کیش
ایک تو صدمہ پھر اس پہ یہ تشہیر
زخم پہ مارے جیسے عقرب نیش
کان دھر کے اسے سنیں شاعر
عرض پرداز ہے یہ خیر اندیش
قول وزنی ہے گر شکم پُر ہو
خالی معدے کی سبکی ہوگی ہمیش
فاقہ مستی میں فن شعر و ادب
ہے بہت جاں گداز اور دل ریش
مرگِ ستر سے سیکھئے یہ سبق
خویش پہلے ہے بعد میں درویش

لیکن بقول کسے :۔ "وہ قصہ ہے جب کا کہ احمق تھے مسکر" ورنہ اب تو علم و خبر کے اضافہ نے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ جو لیکھک بھی قلم کاری کی لنکا میں داخل ہو جائے وہ باون گزا یعنی "دانش ور" بن جاتا ہے اور بلا تکلف اعلان کر دیتا ہے کہ

فکرِ دنیا میں سر کھپاؤں کیا
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

اور ہمارا "بن دانش" معاشرہ خوش دلی سے جواب دیتا ہے کہ "سر کھپائیں آپ کے دشمن۔ ہم آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ اگر ہم بھی یہ وبال اپنے سر نہیں لیں گے تو کون اپنے سر لے گا"۔ اب یہ اس دانش ور کی دانش مندی پر منحصر ہے کہ معاشرے سے داد۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے خدمت کس طرح لیتا ہے۔ اور اپنے حال کے ساتھ ساتھ اپنے لواحقین کے مستقبل کا بوجھ اپنے عقیدت مندوں سے کس طرح اٹھواتا ہے۔

## بقیہ: بیسویں صدی کے لوگ

نے توجہ سے سنا ۔ ایکبار پھر اپنی فتح پر مسکرایا ۔ لیکن جواب میں بوڑھے نے جو کچھ سنا وہ اسکے لئے ناقابل یقین تھا ۔ وہ غیظ و غضب میں بھرا اپنی جگہ سے اٹھا ۔ بندوق اٹھائی اور کمرے کی طرف چلایا ۔

آواز اب بھی پورے گھر میں گونج رہی تھی ۔ بابا ہم بیسویں صدی کے انسان ہیں ۔ ہم تمہارے فرسودہ اصولوں پر قربان نہیں ہوسکتے ۔ تم اور تمہاری برادری جہالت کے اندھیرے میں گم ہے ہم تمہاری پسند کے بوڑھے اور اپاہج لوگوں سے شادیاں کر کے اپنی تعلیم یافتہ ماں کی طرح اپنی زندگیاں برباد نہیں کریں گے ۔ ہم دونوں بہنوں نے نکاح کرلیا ہے ۔ عین اسلامی اصولوں کے مطابق ۔

بوڑھے نے نصف کمرے میں پڑے ہوئے پردے کو ہٹانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ۔ کھڑے کھڑے پانچ چھ فائر کردیئے ۔

لوگوں نے لاشوں کو ہٹانے کے لئے پردہ ہٹایا ۔ وہاں صرف ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا ، جو اب چکنا چور ہوچکا تھا ۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

# شاہ لطیف پر تحقیق

شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی ۱۷۵۲ء میں فوت ہوئے تھے۔ اس حساب سے سالِ رواں میں ان کی وفات کو پورے دو سو چھتیس سال ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں ان کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحقیق و جستجو پایۂ تکمیل کو پہونچ چکی ہے۔ کسی مسئلے کی تحقیق کے عموماً دو پہلو ہوتے ہیں۔ اول اس کے متعلق تمام تحقیقی و معلوماتی مواد جمع کرنا۔ دوم اس مواد سے صحیح نتائج کا استنباط اور اس کے ساتھ حیاتِ انسانی اور اس کے مختلف پہلوؤں کا ربط قائم کرنا۔ پہلی شق کے سلسلے میں ضروری ہے شاہ عبداللطیفؒ کے حالاتِ زندگی کو ترتیب دیا جائے اور ان کے مجموعۂ کلام کو مرتب کرکے اس کی شرح کی جائے۔ دوسری شق کا تعلق ان کے کلام کو سمجھنے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اس کا ربط قائم کرنے سے ہے۔

پہلے موضوع پر اس وقت تک کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ میر شیر علی قانع (۱۷۶۷ء) نظر علی بلوچ مصنف "مرغوب احباب" (۱۸۴۵ء) مسٹر رچرڈ برٹن (۱۸۷۱ء۔ ۱۸۵۱ء) باٹل فریئر (۱۸۵۶-۵۹ء) دیارام گدومل سگما (۱۸۸۲ء) میر عبدالحسن خاں سانگی مصنف "لطائف لطیفی" متوفی ۱۹۲۴ء۔ مرزا قلیچ بیگ مصنف "احوال شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی (۱۸۸۷ء) لیلارام وطن مل (۱۸۹۹ء) ڈاکٹر گربخشانی (۱۹۲۳-۳۲ء) ڈاکٹر سورلے (۱۹۴۰ء) مولوی دین محمد وفائی مرحوم (۱۹۵۰ء) بھیرومل لال چند جیٹھ مل۔ ایم۔ ایم گدوانی مسٹر پمنانی۔ محمد صدیق میمن اور لطف اللہ بدوی کی گرانقدر تصانیف میں شاہ بھٹائی کے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں العلماء ڈاکٹر داؤد پوتا۔ جناب عثمان علی خان صاحب اور کئی دیگر حضرات نے مختلف مضامین میں شاہ بھٹائی پر بہت کچھ لکھا ہے۔

دوسرا پہلو ابھی تک تشنہ ہے۔ شاہ صاحب کے کلام کے صرف متصوفانہ پہلو پر نگاہ ڈالی گئی ہے اور ان کے پیغام اور نظریۂ حیات کا بسیط مطالعہ نہیں کیا گیا اس کے لیے بنیادی پس منظر کو واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے جو شاہ بھٹائی کے ماحول، سوانح اور کلام کی بنیادی تحقیق پر موقوف ہے۔ یہ تحقیق اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب یہ جلد از جلد مکمل کر لی جائے۔ کیونکہ شاہ بھٹائی کی وفات سے لے کر اب تک دو سو دو سال کے عرصے میں کتنے ہی حقائق ناپید ہو گئے ہیں دوسرے جو موجودہ نسل آنے والی نسلوں سے پھر بھی شاہ بھٹائی کے زمانے سے

زیادہ قریب ہے۔ موجودہ سندھ اس وقت بھی ایک حد تک وہی سندھ ہے جو شاہ بھٹائی کے زمانے میں تھا۔ "مارو نٹرن" کا ماحول بھی ابھی تک وہی ہے۔ ابھی تک اس ماحول میں کچھ زیادہ سماجی اور معاشی تبدیلیاں نہیں ہوئیں نیز ابھی تک شاہ بھٹائی کے مریدوں اور معہ :، یافتہ سالکوں کے مریدوں کے مرید سندھ میں موجود ہیں اور ان کے کلام کے "سالک" ابھی تک سندھ کے دور دراز گاؤں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان سے شاہ بھٹائی کی زندگی کے حالات۔ ان کا نایاب کلام اور اس کی مختلف روایتیں مل سکتی ہیں۔ بنیادی تحقیق کے یہ سرچشمے ہر نئے محقق کی پیاس بجھا سکتے ہیں اور ان کی تحقیق آنے والی نسلوں کے لیے بنیادی تحقیق ہوگی جس کی بنا پر صحیح نظریے قائم کیے جا سکیں گے۔ آیئے ہم ان امور پر نظر ڈالیں جن کے بارے میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

۱۔ شاہ بھٹائی سے پہلے کا ماحول تشنۂ تحقیق ہے۔ اس وقت کے سیاسی و اقتصادی حالات پر ڈاکٹر سورلے نے اپنی کتاب "شاہ عبداللطیف آف بھٹ" میں خوب روشنی ڈالی ہے لیکن ادبی ماحول واضح نہیں ہوا۔ ڈاکٹر داؤد پوتا کا "میاں عیسیٰ" کے متعلق تازہ مضمون اس تحقیق کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ شاہ بھٹائی کے سوانح حیات پر ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مثلاً (الف) شاہ بھٹائی کی ابتدائی زندگی کے متعلق ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ ان پڑھ تھے یا پڑھے لکھے (ب) ان کے خاندان یعنی متعلوی (مٹیاری) سادات کے شجرہ نسب اور شاہ بھٹائی کے خاص قبیلے پر ابھی تک روشنی نہیں ڈالی گئی۔ ابھی ابھی سید غلام مرتضیٰ شاہ سنائی نے اپنی تصنیف "پیغام لطیف" (قلمی نسخہ) میں اس پہلو پر تفصیلی بحث کی ہے (ج) شاہ بھٹائی کی سیر و سیاحت کے متعلق ہماری معلومات بالکل سطحی ہیں اگرچہ مسٹر ہیرومل نے ایک کتابچہ لکھ کر اس سلسلے میں بہت اچھی ابتداء کی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ بھٹائی نے اپنے کلام میں جن مقامات، علاقوں اور شہروں کا ذکر کیا ہے وہ ضرور وہاں گئے ہوں گے لیکن یہ مفروضہ غیر محققانہ ہے کیونکہ شاہ بھٹائی نے اپنے کلام "سُر سارنگ" میں کتنے ہی شہروں اور ملکوں کے نام لیے ہیں۔ لیکن گمان غالب ہے کہ وہ وہاں کبھی نہیں گئے۔ دوسری طرف روہڑی، سکھر اور ٹھٹھہ میں شاہ بھٹائی کے تکیے موجود ہیں جو ان کے وہاں جانے اور رہنے کی دلیل ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں سکھر، روہڑی اور ٹھٹھہ کا کوئی ذکر نہیں۔ شاہ بھٹائی کی سیر و سیاحت کے بارے میں تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود سیر کر کے شاہ بھٹائی کی گزرگاہوں، منزلوں اور تکیوں کا پتا لگائے اور ایک نقشہ تیار کر کے بتائے کہ اس سلسلے میں کون کون سی انوکھی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

شاہ صاحب سے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں۔ ایک قصہ سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً وہ شاہ بندر ڈویژن (قدیم لکرالہ) میں گئے تھے۔ وہاں کے مقامی لوگوں سے معلوم ہوا کہ "لاڈیون" نامی قصبہ سے تقریباً دس میل جنوب کی طرف "ڈیرے" نامی ایک اجڑی ہوئی بستی ہے جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ یہ بستی شاہ بھٹائی

کے زمانے میں 'کیہر قوم' کی طاقت کا مرکز تھی۔ یہاں کا حکمران بڑا سرکش اور ظالم تھا۔ اگر بیچارے شتربانوں کے اونٹ اس کے علاقے میں آنکلتے تو وہ ان کی دموں اور ٹانگوں میں آگ کے گولے بندھوا دیتا تھا تاکہ وہ جل کر بلبلا اٹھیں ایک دفعہ شاہ بھٹائیؒ ان شتربانوں کے خیموں میں مقیم تھے وہاں کچھ اونٹ چیختے چلاتے آئے شاہ بھٹائیؒ نے اس کی وجہ دریافت کی۔ شتربانوں نے ان کو تمام ماجرہ سنایا اور بولے "حضور! یہ بے زبان جانور آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔" یہ سن کر شاہ بھٹائیؒ کو جانوروں کی حالتِ زار پر بڑا رحم آیا اور انھوں نے فی البدیہہ ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے۔

"غارت ہوں یہ محلات۔ شتربانوں کے خیمے آباد رہیں۔ میں اونٹنیوں کے دودھ کو بھول نہیں سکتا۔ شتربان ہمیشہ آباد رہیں اور ان کو ستانے والے دودھ سے محروم رہیں۔" پھر ان بیچارے شتربانوں کو مخاطب کرکے کہا۔

"بیٹو! جہاں اب کیہر قوم کے ڈیرے یعنی محل ہیں۔ وہاں اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنے گی۔"

کہتے ہیں کہ اس کے بعد بہت ہی جلد "کیہروں" کا یہ قصبہ مٹ کر کھنڈر بن گیا۔ ممکن ہے یہ کہانی صحیح نہ ہو۔ لیکن وہاں کے باشندوں میں اس کی شہرت ہی شاہ بھٹائیؒ کے وہاں جانے پر شاہد ہے۔

"تذکرہ مخادیم کھڑا" سندھ کے مشہور قصبہ کھڑا کے مخدوموں کا لکھا ہوا مستند و معتبر ریکارڈ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شاہ بھٹائیؒ ایک دفعہ قصبہ کھڑا کے باہر آکر مقیم ہوئے۔ انھوں نے حسبِ معمول سازوں پر محفلِ سماع شروع کرائی۔ کھڑوں کے مخدوم بڑے متشرع تھے اور غیر شرعی کام سے باز رکھنے اور غیر شرعی کام کرنے والوں کو سزائیں دینے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں مخدوم میاں محمدی (احمدی؟) اپنے وقت کے بڑے عالم تھے جب انہیں بتایا گیا کہ بھٹ کا ایک بزرگ آیا ہے اور مزامیر کے ساتھ محفل سماع کرارہا ہے تو انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کے بلانے کو ایک آدمی بھیجا۔ شاہ نے اس عالم دین کے حکم کو بسروچشم تسلیم کیا لیکن زیادہ رات گزر جانے کے سبب صبح تک مہلت مانگی اور مشہور ہے کہ شاہ بھٹائیؒ نے ایک ٹھیکری پر کوئلہ سے یہ بیت لکھ کر مخدوم کو بھجوادیا۔

(ترجمہ) "اس وقت تو نہ آؤں گا۔ صبح کے وقت آؤں گا۔ اے دوست! تم اس ذات (یعنی حضرت محمد صلعم) کے ہم نام ہو۔ جو کمزوروں کا بوجھ اٹھانے والے تھے۔"

غرض یہ قصہ بڑا طویل ہے اس کی مزید تائید شاہ کے درازا جانے اور سچل سرمست کو بچپن میں دیکھنے والی مشہور روایت سے ہوتی ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے فقیروں کے متعلق ابھی تحقیق نہیں ہوئی ہمیں ابھی تک صرف تماچی فقیر، تمر فقیر، راول فقیر اور صالح فقیر کے کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ تمر فقیر نے اپنے ساتھی تماچی فقیر سے کہا "بھائی آپ بڑے فقیر ہیں۔ اور مشکل مسائل آپ ہی سمجھاتے ہیں۔ لیکن آپ کے بعد ہم مشکل مسائل کس سے دریافت کریں گے اور روحانی راز ہمیں کون سمجھائے گا؟" تماچی فقیر بولے "مخلص دوستوں اور ساتھیوں کا تعلق روحانی ہے۔ وہ تو ہر حالت میں قائم رہے گا۔ اگر میں نے پہلے انتقال

گیا اور آپ کو جو کچھ دریافت کرنا ہو تو میری قبر پر آ کر پوچھو میں اس کا جواب دوں گا۔"

اتفاقاً تماچی فقیر پہلے فوت ہو گیا اور تمر فقیر ایک دفعہ محویت کے عالم میں تماچی فقیر کے مزار پر پہنچا اور حسب ذیل مفہوم کا ایک بیت پڑھا۔

"میرے بلانے سے آج دوست بھی جواب نہیں دیتے اور نہ ان کی سواریاں ہی کچھ آواز نکالتی ہیں ایسے حادثے اس شہر خاموش میں ہوتے ہیں۔"

تمر فقیر یہ بیت پڑھ کر خاموش ہوا ہی تھا کہ اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کے کانوں میں یہ صدا گونجی۔

"عشق و محبت میں اپنا ساز و سامان قربان کر کے جد و جہد کے راستہ پر کمر بستہ ہو جا اور حسب و نسب کے تفرقات کو ترک کر کے بلوچ (آنحضرت) کا تابع ہو جا۔"

راول فقیر بھی شاہ بھٹائی کا بڑا معتقد تھا۔ ایک دفعہ شاہ صاحب نے اپنے فقیروں کو ہدایت دی کہ وہ ہر قسم کی منشی چیزوں سے پرہیز کریں۔ دوسرے فقیروں نے تو منشیات چھوڑ دیئے مگر راول فقیر جو حقہ کے عادی تھے فوراً حقہ نہیں چھوڑ سکتے تھے وہ کسی گوشہ میں چھپ چھپا کر حقہ پی لیتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ بھٹائی نے انہیں حقہ پیتے ہوئے دیکھ لیا تو انہیں مخاطب کر کے ایک بیت پڑھا۔

(ترجمہ) اگر گڑگڑاہٹ کیے جا رہے ہو اور تم پر تل کے برابر بھی ہدایت کا اثر نہ ہوا۔ سالک کے لیے مرشد کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بہت برا ہے۔ تمہارا جینا بے سود ہے۔

اس طنز کا نتیجہ یہ ہوا کہ راول فقیر پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور وہ اسی حالت میں فوت ہو گیا۔ شاہ بھٹائی کو اپنے اس معتقد کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ جب جنازہ اٹھا تو انہوں نے ایک وائی کہی۔

(ترجمہ) "اے میرے بھائی راول! رات کیوں نہ رہے؟ اے راول رات کیوں نہ رہے؟"

ان فقیروں سے متعلق قصے نہ صرف ادبی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ بھٹائی کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اس سلسلے میں ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ دوسرے کون بڑے فقیر تھے جن کو شاہ بھٹائی کی صحبت اور رفاقت کا شرف حاصل تھا۔

مذکورہ بالا چار فقیر کون تھے۔ وہ کہاں سے آئے ان کا کلام کتنا ہے اور کیسے جمع ہو سکتا ہے؟ چند اور سوال ہیں۔

۴۔ شاہ بھٹائی کے معاصر شعراء۔ صوفیہ اور مشہور شخصیتیں کون تھیں جن سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر گربخشانی اور نظر علی بلوچ نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کام کا سنگ بنیاد ہے۔ مولانا دین محمد وفائی نے بعض قلمی نسخوں میں سے کچھ معلومات اپنی کتاب "لطف اللطیف" میں نقل کی ہیں۔ چند دن ہوئے مجھے گوٹھ پیر جھنڈے کے کتب خانہ سے فارسی کا ایک چھوٹا سا رسالہ الموسوم بہ "رسالہ اویسیہ" ملا جس میں شاہ بھٹائی کی طرف سے مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے لکھے ہوئے خط اور اس کا جواب تحریر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابھی سندھ میں اس قسم کا بہت سا قلمی مواد موجود ہے۔ شاہ صاحب اور ان کے ہمعصر شاہ

عنایت رضوی کے تعلقات پر بھی مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے ۔ اس سلسلہ میں میرے قلم سے "نئی زندگی" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس سے اس تحقیق کا تھوڑا بہت آغاز ہوا۔ عنایت شہید ایک اور صوفی بزرگ تھے ۔ یہ ناممکن ہے کہ بھٹائی جیسے سیلانی بزرگ کی ان سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ مختلف روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ بھٹائی نے ان کی شہادت پر چند فی البدیہہ اشعار کہے ۔

۵۔ شاہ بھٹائی کی موسیقی کے متعلق کافی تحقیق نہیں ہوئی یعنی "رسالو" کے سروں کی وجہ تسمیہ اور ان کی اصلی کیفیت وغیرہ کے بارے میں چھان بین نہیں کی گئی دھنوں میں بھٹ کے فقیر شاہ کا کلام گاتے ہیں۔ ان کا سمجھنا اور مضامین کی کیفیت اور بناوٹ پر غور کرنا ضروری ہے ڈاکٹر گربخشانی نے سروں کی جو تشریح کی ہے اور الحاج اللہ بخش عقیلی کا مضمون "شاہ بھٹائی اور ان کی موسیقی" اس سلسلے کے اب اول قدم ہیں ۔

۶۔ ان فقیروں کے متعلق جو شاہ بھٹائی کی محفل سماع میں گاتے تھے ۔ ہنوز کوئی معلومات نہیں۔ ان کے علاوہ مزار کے کلید بردار فقیروں کے متعلق تفصیلی حالات اور ان کے کلام کے متعلق معلومات بہم پہونچنے سے بہت کچھ مواد فراہم ہونے کا امکان ہے۔

۷۔ شاہ بھٹائی کے بعد ان کے جو طالب اور معتقد گزرے ہیں وہ صوفی ہوں یا شاعر ان کے حالاتِ زندگی اور کلام کی تحقیق اور تحریر و ترتیب اس سلسلے کی چند کڑیاں ہیں ۔

شاہ بھٹائی کے کلام سے متعلق تحقیق کے دو خاص پہلو ہیں ۔ اول ان کا اصلی کلام تمام ذریعوں سے جمع کرکے ایک صحیح مستند دیوان ترتیب دینا۔ دوم ان کے کلام کی صحیح تشریح۔

شاہ بھٹائی کے رسالو کو سب سے پہلے شائع کرنے کا سہرا ایک جرمن مستشرق ڈاکٹرب کے سر ہے اس کے بعد بمبئی سے دو ایڈیشن شائع ہوئے جن میں سے ایک کو محمد صدیق میمن نے حیدرآباد سندھ سے دوبارہ شائع کیا۔ حکومت سندھ کا ایڈیشن اور مرزا قلیچ بیگ، ڈاکٹر گربخشانی، غلام محمد شہوانی ۔ محمد عثمان ڈیپلائی اور مولوی غلام علی کے مرتبہ چند اور ایڈیشن بھی ہیں جو سندھی عوام کی علمی پیاس بجھا رہے ہیں۔ ڈاکٹر گربخشانی نے جس محققانہ کد و کاوش سے اپنا ایڈیشن مرتب کیا ہے اس کے باوجود ایک مستند رسالے کی اشد ضرورت ہے ۔ چنانچہ حکومتِ سندھ کے سندھی بورڈ نے یہ کام ڈاکٹر داؤد پوتا کے سپرد کیا ہے اس سلسلے میں اہل تحقیق کے لیے مطبوعہ مواد کے علاوہ اور بھی کافی مواد موجود ہے ۔ (الف) بلڑائی بھٹ برٹش میوزیم اور کے قلمی نسخے اور بمبئی اور پزگ کے مطبوعہ ایڈیشن اور دیگر قلمی نسخے جو سندھ میں موجود ہیں ان میں سے چند ڈاکٹر داؤد پوتا اور عثمان انصاری کے پاس ہیں۔ مزید جستجو سے سندھ میں اور بھی مفید نسخے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ایسا نادر قلمی نسخہ بھٹ میں موجود ہے جسے "گنج" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے بہت کچھ نیا کلام مل سکے گا۔ (ب) سندھی سگھڑوں کا صدری خزانہ۔ (ج) بہت ممکن ہے کہ بعض مقامی فقیروں یا باہر سے آنے والے سالکوں نے کئی دائیاں اس وقت یاد کرلی

ہوں جو شاہ کے جمع شدہ کلام میں درج نہیں اور ان فقیروں اور سالکوں کے پاس یہ کلام سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہو۔ ان سگھڑوں کی محفلوں میں شاہ بھٹائی کا بہت سا کلام ملتا ہے جو شاہ کے مطبوعہ رسالوں میں نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا بہت سا حصہ شاہ کے بجائے دوسروں کا کلام ہو اور شاہ کے نام منسوب کر دیا گیا ہو۔ ضرورت ہے کہ شاہ کے اپنے اور الحاقی کلام کو جمع کر کے پرکھا جائے اور مستند کلام کو الگ کر لیا جائے۔

اگرچہ مرزا قلیچ بیگ، محمد بخش واصف، ڈاکٹر گربخشانی بھیرومل اور دوسرے ادیبوں نے شاہ بھٹائی کے کلام، ان کے انوکھے الفاظ، اصطلاحوں اور سروں وغیرہ کی شرح کی ہے۔ پھر بھی اس سلسلے میں بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے۔ ابھی تک شاہ بھٹائی کے بہت سے ابیات، تلمیحیں اور اشارے تشریح طلب ہیں۔ فصاحت و بلاغت اور بدیع و معانی کے لحاظ سے بھی شاہ بھٹائی کے کلام پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے محض شاعری یا قصہ طرازی ہی کے لیے شعر نہیں کہے انہوں نے اپنے پیش رووں کی طرح صوفیانہ شاعری کے ذریعہ اپنے خیالات ظاہر کیے۔ لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ تصوف محض نقطۂ نظر یا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ اب شاہ کے کلام کا ایک اور انداز سے مطالعہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہم اس سے حیاتِ انسانی کو سمجھنے میں مدد لیں یعنی اب ہمیں اس کا رُخ بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں شاہ بھٹائی نے سلجھانے کی کوشش کی ہے ان کی کیفیت حسبِ ذیل ہے۔

بنی نوع انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے حصول کے لیے انسان کو انفرادی و اجتماعی طور پر کیسی ترتیب کی ضرورت ہے؟ شاہ بھٹائی کس قسم کے اخلاق کے علم بردار اور کس قسم کے معاشرے کی ترویج کے خواہاں تھے؟ وہ معاشرے کی کن خرابیوں کے شاکی تھے اور کن خوبیوں کے آرزومند؟ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے انہوں نے انسانی جذبات و احساسات کی کس طرح عکاسی کی ہے؟ ان کی نگاہ میں دکھ درد اور مسرت و انبساط کی ماہیت کیا ہے؟ ان کے کلام میں حسن اور ذوقِ جمال کی کیسی جھلک نظر آتی ہے؟ ان تمام مسائل کا حل اور حقائق کا انکشاف آئندہ کی تحقیق کی بنیاد ہے۔ مستقبل کے محققوں اور مفکروں کے لیے شاہ بھٹائی کے کلام میں اگر کوئی نتیجہ خیز تحقیق کا میدان ہے تو ان کے اپنے الفاظ میں یہ کہ:-

"اے پڑھنے والے جس کو تو معمولی اشعار سمجھا ہے وہ آیاتِ ربانی ہیں۔ ان کے مطالعے سے انسانی قلوب اپنے حقیقی محبوب یعنی خالق کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔"

---

## اعتذار

شمارہ اگست ۱۹۸۸ء میں ممتاز افسانہ نگار سید انور کا نام غلطی سے سید انور علی شاہ لکھا گیا ہے۔ ان کا نام سید انور حسین شاہ اور قلمی نام صرف انور ہے۔

اسی طرح مذکورہ شمارہ میں ڈاکٹر ابو اللیث کا مقالہ "آزادی کے بعد اردو دانشوری کا جائزہ" اس وضاحت کے بغیر شائع ہوا ہے کہ یہ ان کے ایک طویل مقالے کی تلخیص ہے، جو انہوں نے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں منعقدہ بین الاقوامی سیمینار میں پڑھا تھا۔

ادارہ دونوں مصنفین سے اس سہو پر معذرت خواہ ہے

پروفیسر وقار عظیم (مرحوم)

# حضرت شاہ لطیف

حیدر آباد سندھ سے کوئی ۲۴ میل دور بھٹ شاہ نام کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ شہری ہنگاموں سے دور اس سیدھی سادی آبادی میں سندھ کے عظیم المرتبہ صوفی شاعر کی آخری آرام گاہ ہے۔ اور اس دور افتادہ گوشہ میں بھی شاہ عبد اللطیف کی یاد کے شیدائی سال کے ہر حصہ میں آتے ہیں اور ان کی روح کو نذرِ عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں ان آنے والوں میں مذہب و ملّت کی کوئی قید نہیں۔ شاہ کے کلام کے جادو نے ہر دل پر اثر کیا ہے ہندو مسلم، پارسی، امیر غریب خواندہ و ناخواندہ سب کے لیے اس شخصیت میں اس ذات کے پھیلائے ہوئے اخلاق میں اور اس کی میٹھی۔ دل میں گھر کرنے والی سچی شاعری میں بلا کی کشش ہے۔ یہی کشش دور دور سے آنے والوں کو سال میں ایک بار اس خاموش بستی میں لاکر اکٹھا کر دیتی ہے۔ فروری کے مہینہ میں لوگ شاہ کا عرس مناتے ہیں۔ میلہ لگتا ہے اور اس میں وہ ساری چہل پہل اور گہما گہمی ہوتی ہے جس سے میلے نشاط آفریں اور رومان انگیز بنتے ہیں .... لیکن اس سالانہ میلے کی سب سے بڑی کشش یہ ہے کہ میلے میں ہر طرف لوگ اپنے اپنے مذاق کی ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر ٹولی میں شاہ عبد اللطیف کا کلام اس خاص طرز میں گا کر پڑھا جاتا ہے جیسے اب سے دو سو برس پہلے خود شاہ کے زمانہ میں۔ کچھ خاص لوگ ہیں جنھیں اس کلام کے پڑھنے کا ملکہ ہے پڑھنے والے پڑھتے ہیں اور سننے والے سر دھنتے ہیں کسی کو کلام کا صوفیانہ تخیل سرمست و سرشار کرتا ہے۔ کوئی اس کے نرم و نازک احساسات سے متاثر ہوتا ہے کسی کو اس کی سادگی بھاتی ہے اور کسی کو اس میں حسن فطرت کے دلفریب جلوے نظر آتے ہیں۔ کوئی تخیل کی باریک بینی کا والہ و شیدا ہے اور کوئی الفاظ کی شیرینی کا۔ شاہ عبد اللطیف کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اسے ہر مذہب و ملت کے ہر طبقے کے اور ہر مذہب کے لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ سندھ کے ہر حصے میں لوگوں کو ان کا کلام زبانی یاد ہے اور بہت سے یاد کرنے والے ایسے ہیں کہ شاہ کے کلام کا ایک ایک لفظ ان کے دلوں کا نقش اور زبانوں کا ورد ہے جو مقبولیت سندھ میں شاہ عبد اللطیف کے کلام کو حاصل ہے اس کا مقابلہ اردو میں کسی حد تک اگر کوئی شاعر کر سکتا ہے تو غالب اور اقبال لیکن غالب اور اقبال کی مقبولیت ایک خاص طبقہ تک محدود ہے اور شاہ عبد اللطیف کی مقبولیت کسی خاص طبقہ یا علاقہ تک محدود نہیں۔

شاہ عبد اللطیف اٹھارہویں صدی کے شروع کے

شاعر ہیں۔ سندھ میں ان کی زندگی کے حالات کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اس کی رو سے ان کا سال پیدائش ۱۶۸۹ء ہے اور سال وفات ۱۷۵۲ء۔

شاہ عبداللطیف حیدرآباد سندھ میں مٹیاری سے قریب ہالا حویلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے والد حبیب شاہ اپنے زمانے کے بڑے باعزت اور صاحب حیثیت بزرگ سمجھے جاتے تھے اور ان کا تعلق علوی سیدوں کے ایک مقتدر گھرانے سے تھا۔ لیکن شاہ عبداللطیف کو بچپن ہی سے دنیاوی جاہ وحشم سے ایک بے تعلقی سی تھی ان کا رجحان دنیا سے زیادہ دین کی طرف تھا۔ عمر کا ابتدائی زمانہ ہالا حویلی میں گزرا کچھ سال بعد ان کے والد ہالا سے ایک قریب ہی کے موضع کوٹڑی جاکر رہنے لگے تو شاہ عبداللطیف بھی ان کے ساتھ ہی گئے اور ان کے شباب کے چند برس کوٹڑی میں بسر ہوئے۔ عمر کے اس زمانے سے ان کا میلان دو چیزوں کی طرف تھا.... ایک تو یہ کہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ صوفی منش بزرگوں کی صحبت میں گزارتے تھے اور دوسرے یہ کہ اپنے فرصت کے اوقات میں ذکر وفکر میں مصروف رہتے تھے۔ تحقیق کرنے والوں نے ان کی عمر کے اس دور کے متعلق بیان کیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں سادگی ان کا شعار تھا۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے کی ساری تفصیلوں میں وہ حد درجہ کی سادگی پسند کرتے تھے۔ محبت، ہمدردی، رحم وکرم، گفتگو میں نرمی اور شیرینی اور ذاتی معاملات میں انکسار و عاجزی ان کے اخلاق کی خصوصیت تھیں۔ کسی جاندار کو تکلیف میں دیکھتے تو ان کا دل تڑپ جاتا اور جس طرح بن پڑتا اس کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے۔ جوانی کی عمر میں دنیاوی جاہ وحشم تک دسترس ہوا اور آدمی اس سے بےنیازی برتے۔ آنی جانی دولت کو چھوڑ کر دولت ایمانی سے اپنا دامن بھرے۔ اپنے ہم جنسوں کے دکھ درد کا شریک ہو۔ خود بڑا ہو کر اپنی بڑائی پر نازاں نہ ہو تو دنیا والے اسے اپنا محبوب بناتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کے ساتھ یہی ہوا لوگ ان کی طرف مائل ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کے پرستاروں کا حلقہ بڑھنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مٹیاری کے سیدوں کا دور ونزدیک بہت اثر تھا۔ مقامی حکمران نور محمد کلہوڑا اس خاندان کے لوگوں کے اثر سے واقف تھا اور ان کی دوستی کے دامن کو ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ مٹیاری کے سیدوں نے شاہ عبداللطیف کی شہرت اور ہر دلعزیزی بڑھتی دیکھی تو انہیں اپنا جاہ وحشم خطرہ میں نظر آنے لگا۔ ان سیدوں نے نور محمد خان کے کان شاہ صاحب کی طرف بھرنے شروع کیے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ نور محمد خان نے مختلف طریقوں سے شاہ صاحب کی دل آزاری شروع کردی لیکن انہیں اللہ کی قوت پر بھروسہ تھا۔ یہی قوت ان کا سہارا بنی اور آخر نور محمد خان کو شاہ صاحب کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

شاہ صاحب نے اپنی جوانی ہی کے دنوں میں اپنے صوفیانہ خیالات کو نظم کا لباس پہنانا شروع کردیا تھا۔ اس نظم میں اس قدر کشش تھی کہ اس نے شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت کو اور بھی وسیع کردیا اور اب دور دور ان کے روحانی نغموں کی گونج سنائی دینے لگی۔ اب تک شاہ صاحب اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے روحانی نغموں کے لیے زیادہ آزاد

فضا کی ضرورت ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے بھٹ نامی ایک مقام پر پہونچ کر اپنے ہاتھ سے اپنا مکان بنانا شروع کیا اور اس مکان کے گرد ایک چھوٹی سی بستی بس گئی۔ اس بستی میں ۱۷۵۲ء میں ۶۳ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور غلام شاہ کلہوڑو نے ان کا مزار بنوایا۔ یہی مزار اب ۲۰۰ دو سو برس بعد بھی مرجع خلائق ہے۔

شاہ عبداللطیف کی حیات کا زمانہ ۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۲ء یعنی سترھوں صدی کا آخری اور اٹھارویں صدی کا نصف اول سندھ کی تاریخ کا بے حد اہم دور ہے۔ یہی زمانہ ہے جب سندھ کی حکومت رفتہ رفتہ مغلوں کے ہاتھوں سے خود سندھی حکمرانوں کے ہاتھ میں آرہی تھیں۔ کلہوڑو خاندان کی قوت بڑھنی شروع ہوگئی تھی اور سندھ نے سیاسی آزادی کی فضا میں سانس لینی شروع کر دی تھی۔ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو عبداللطیف کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ اس کے بعد کلہوڑو خاندان کی قوت بڑھنی شروع ہوگئی اور اس نئی آزادی کے کرشمے شاہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور سندھ کو فارس کا باج گزار بنایا تو شاہ کی عمر ۵۰ سال تھی اس کے آٹھ سال بعد جب احمد شاہ درانی نے دہلی کی دم توڑتی ہوئی سلطنت پر حملہ کرکے سندھ کو کابل کی مملکت کا مطیع بنایا تو شاہ ۵۸ سال کے تھے۔ اس کے پانچ سال بعد شاہ کا انتقال ہوا۔

سیاسی اور تاریخی نقطۂ نظر سے شاہ عبداللطیف کی زندگی کا پس منظر انتشار اور آزادی کا ملا جلا مرقع تھا۔ ان کے گرد و پیش کی زندگی سیدھے سادے دیہاتیوں کی زندگی تھی۔۔۔۔ ایسے دیہاتی جو زرخیز زمینوں میں کاشت کرتے۔ بھیڑوں بکریوں اور بیلوں کے گلوں کی پاسبانی کرتے اور اونٹ پالتے اور اس مرنجاں مرنج۔ آہستہ خرام لیکن جفاکش چوپائے کی طرح صحرا کی تپتی ریت اور سورج کی تیز شعاعوں میں اپنا وقت کام کاج میں گزارتے۔ اپنے کھیتوں میں بیج بوتے اور دریائے سندھ کی بڑھتی گھٹتی رو کے سہارے ان بیجوں میں پانی دیتے اور پھر اللہ کے رحم کے منتظر رہتے کہ وہ ان بیجوں میں سے پودے اگائے اور پودوں میں سنہری بالیں نکلیں۔ ان سادہ لوح دیہاتیوں کی زندگی میں مادیت اور روحانیت ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں تھیں۔ زندگی کی کامیابی اور خوشحالی میں جہاں ایک طرف خود ان کی جفاکشی کا ہاتھ تھا دوسری طرف دستِ مشیت کا سہارا بھی تھا اور اس لیے ان کا ہر قدم گو فطرت کے تقاضے سے اٹھتا تھا لیکن مشیت کی مرضی کا محتاج تھا۔ ان دیہاتیوں کی روزانہ کی زندگی میں طرح طرح کے چوپائے ان کے ہم عنان اور ہم سفر تھے۔ اور مظاہر قدرت ان کے معین و مددگار۔ اس لیے ان کے دلوں میں ان کی محبت اور عزت تھی اور وہ ان کے محبت و عشق میں بھی ان کے ہمراز تھے۔ یہی دیہاتی جب اپنے کاموں سے فارغ ہوتے تو فرصت کے وقت کو اللہ کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت سمجھ کر اس کی قدر کرتے۔ گاتے بجاتے اپنے دیس کی عشق و محبت کی کہانیاں مزے لے لے کر سنتے سناتے۔ ان میں نغمہ کا رنگ بھرتے اور قدیم روایتوں کو حیاتِ جاوید بخشتے۔ فرصت کا ہر وقت اور تہوار کا ہر دن عید، بقر عید، ہولی، دیوالی ان خوشیوں کے لیے وقف تھا۔ اور ان کی زندگی میں لوک گیتوں اور ان لوک گیتوں کی گود

میں رچی ہوئی موسیقی کا بڑا حصہ تھا۔ شاہ عبداللطیف نے اپنی ساری زندگی انہیں دیہاتوں میں گزاری۔ گھروں کے اندر اور گھروں سے باہر ان کی مادی و روحانی اور جذباتی زندگی میں جن چیزوں کی گہری جگہ تھی ان کا مطالعہ کیا۔ ان کی ذہنی سطح اور اخلاقی ضرورتوں کا اندازہ لگایا اور پھر انہی میں رہ کر ان کے لیے خیالات کو نغمہ کے پیرہن میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبداللطیف کی شاعری (جسے اس کی ہیئت اور روح کے اعتبار سے نغمہ کہنا زیادہ موزوں ہے) میں ہر جگہ ان کے دلوں کی دھڑکن موجود ہے۔ اس کا موضوع وہی لوک کہانیاں ہیں جو ان کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ انہی مناظر کا ذکر ہے جو ان کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں وہی اشارے اور تشبیہہ اور استعارے ہیں جو ان کے دلوں سے قریب ہیں۔ انہیں کی سادہ زبان ہے۔ شاعر نے ایک اچھے فنکار کی طرح یہ کیا ہے کہ ان بہت سی بکھری ہوئی چیزوں میں سے صرف ان کا انتخاب کیا ہے جن سے ان کے نغمہ میں سرمستی پیدا ہوتی ہے۔ اس نے تفصیلوں کی جگہ اشاروں سے کام لیا ہے۔ پوری کہانی سنانے کے بجائے صرف اس کے وہ ٹکڑے لے لیے ہیں جن کی کوئی جذباتی اہمیت ہے۔

شاہ عبداللطیف کے کلام کی بنیاد ان کا صوفیانہ انداز نظر ہے لیکن اس صوفیانہ نظر کے لیے انہوں نے سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کی دیہاتی زندگی کے مادی اور جذباتی پہلوؤں کے پیکر سے مدد لی ہے اور اس عہد کی زندگی میں ظاہری اور باطنی، حقیقی اور روایتی جتنے رُخ تھے سب پر نظر رکھ کر اپنے گیتوں کا تانا بانا تیار کیا ہے اس لیے گو ان کے خیالات سرتاسر صوفیانہ ہیں لیکن ان صوفیانہ خیالات میں تصوف کی خشکی کے بجائے ایک صحت مند تازہ، شگفتہ اور سچے عشق کی ولولہ انگیزی ہے اس تصوف میں فلسفہ نہیں۔ رومان ہے اور اس رومان میں وہی سب کچھ ہے جس سے رومان کی داستان سننے والوں کے لیے بھی حیات بخش بن جاتی ہے۔ یہ عشق دنیاوی عشق کی آلائشوں سے پاک، روحانی ہے لیکن حقیقت اور صداقت کی بنیادوں پر قائم۔ شاہ عبداللطیف کی شاعری کا بنیادی جذبہ اسلامی تصوف ہے لیکن انہوں نے اس تصوف کو اپنے عہد کی زندگی اور اس عہد میں پھیلی ہوئی مجوزہ روایات کے قالب میں ڈھال کر اسے عوام کے ذہن سے قریب کر دیا ہے اور سندھی پڑھنے والے اس شاعری کو اپنی حیاتِ اجتماعی کا مرقع گرد و پیش کے مظاہر فطرت کا آئینہ اور شخصی جذبات و محسوسات کا سچا ترجمان سمجھ کر اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ انہیں شاہ عبداللطیف کی ہر بات اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہے اس کے ایک ایک لفظ میں ان کی اپنی مانوس زندگی کی جھلک ہے وہ انہیں ماضی کی یاد دلاتی ہے۔ محبوب لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی دنیا کو سیر کراتی ہے اور پھر اپنی ہی دنیا میں رکھ کر بلند اخلاق کے درس دیتی ہے اس لیے شاہ عبداللطیف سندھ کے سب سے ہر دلعزیز شاعر ہیں۔

لیکن سندھی کے اس صوفی شاعر کے کلام کی ان مقامی خصوصیات میں فن کی لطافتوں کا اتنا متوازن امتزاج بھی ہے کہ اصل زبان نہ جاننے والا ان کے ترجمے پڑھتا ہے تو اس کے دل پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ سندھی زندگی کے جن پہلوؤں کی طرف شاہ کے کلام میں اشارے ہیں اور جن

اخلاقی نکات کی ان اشاروں اور کنایوں میں تعلیم ہے وہ بے حد تصور آفریں ہے اور پڑھنے والے کو ایک واضح ذہنی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ پڑھنے والا تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی پر سر دھنتا ہے اور ایک خاص طرح کے ماحول کا نقشہ بھی اس کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو اس ماحول میں آپ کو زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز دکھائی دے گی اور پھر اس چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ایک وسیع مفہوم ہوگا۔ کبھی جذباتی کبھی اخلاقی اور کبھی سماجی اور معاشی ۔۔۔۔ مثال کے طور پر شاہ کے کلام کو پڑھ کر .بیرونی زندگی کی ایک تصویر بنائے تو اس کا انداز کچھ اس طرح کا ہوگا۔

ریت کے چمکیلے ذروں کی گود میں ایک چوڑا چکلا دریا مچل رہا ہے۔ کبھی جوش میں آتا ہے تو اپنے دائیں بائیں میلوں زمین کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے اور کبھی آس پاس کی زمینیں آس لگائے بیٹھی رہتی ہیں اور وہ بے نیازی سے آگے گزر جاتا ہے کہیں سیدھا چلتے چلتے اپنا رُخ بدل دیتا ہے اور خشک زمینوں میں کھدے ہوئے گڑھے تالاب بن جاتے ہیں۔ ان تالابوں میں گھڑیال ہیں جو دھوپ کھانے کو ریت پر آپڑتے ہیں اور انسان کی جان کے لیے خطرہ کا ایک نیا سامان پیدا ہوجاتا ہے۔ دریا کے کنارے گھاٹ ہیں ان میں رسیوں سے کشتیاں بندھی ہوئی ہیں۔ سوداگر اپنا سامان باندھتا ہے اور اس کشتی میں لاد کر کسی دور کے دیس کو لے جاتا ہے۔ جب وہ اپنا سفر پورا کرکے واپس آتا ہے تو دریا کے کنارے کھڑی ہوئی دوشیزہ اس کے بادبانوں کے رنگ سے پہچان لیتی ہے کہ وہ اس کے محبوب کی کشتی ہے۔

زندگی کی ایک دوسری تصویر بارش لانے والے بادلوں کی آمد سے وابستہ ہے۔ بادل آتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ بوندیں پڑتی ہیں۔ جل تھل ہوجاتے ہیں اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ سب خوش ہیں لیکن بارش کی کثرت نے مہاجن کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اب وہ غلہ پانچ گنے داموں پر کیسے بیچے گا۔ پھر شمال کی طرف سے تلوار کی طرح کاٹنے والی خشک ہوائیں چلتی ہیں اور جھونپڑیوں کے سر پر سیٹیاں بجاتی اور گھاس کے سبز پتوں کی نوکوں کو مرجھاتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔ کبھی ریگستان کی پھیلی ہوئی بے خبر گود میں سورج کی کرنیں اترتی ہیں اور ریت کے ٹیلوں کو آگ کی بھٹی بنا دیتی ہیں اور مہجور دوشیزہ اس تپتی ہوئی ریت میں اپنے محبوب کی تلاش کی سختیاں جھیلتی ہے اور ان مختلف مناظر میں بگلے، کوئے، گدھ اور لوئے اپنے روایتی کاموں میں معروف رہتے ہیں۔

گھر کے اندر کسان آنے والی بارش کے انتظار میں اپنے ہل جوڑ رہا ہے۔ مٹکی میں رکھی ہوئی چھاچھ میں جھاگ اٹھ رہے ہیں اور چرخے کی دھیمی آواز پس منظر کی موسیقی پیدا کر رہی ہے۔ عورتیں چرخہ کاتتی جاتی ہیں اور گاؤں کی باتیں کرتی جاتی ہیں اور گاؤں کے باہر دور سے مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز آرہی ہے۔

سید اپنے فاخرہ لباس میں گھوڑے پر تنا بیٹھا ہے اور عرض مند غریب نے اس کی رکابیں ہاتھ سے پکڑ رکھی ہیں۔ امیروں کے گھروں میں عورتوں نے سروں میں تیل

ڈال کر آنکھوں میں سرمہ لگایا ہے اور ان کے گلے میں طوق اور ہاتھوں میں کنگن ہیں اور غریب عورت کے جسم کا کپڑا سو جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔

شادیاں ہوتی ہیں۔ لوگ جمع ہوتے ہیں۔ گانے بجانے ہوتے ہیں۔ مطرب اپنے ساز کو طرح طرح بجاتا ہے اور اس پر اپنے نغمے گاتا ہے۔۔۔۔ ہر طرف فقیروں کا دور دورہ ہے لوگ ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی دوشیزہ کڑکڑاتے جاڑے کی اندھیری رات میں دروازے سے لگی صبح کا انتظار کر رہی ہے کہ اس کا شوہر صبح آنے والا ہے۔

اس طرح کی پچاسوں تصویریں شاہ عبداللطیف کے کلام میں ہیں جس میں ان کے لیے بھی کشش ہے جو ان تصویروں سے مانوس ہیں اور ان کے لیے بھی جنھوں نے کبھی یہ تصویریں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں۔

شاہ عبداللطیف کا یہ سارا کلام ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب ہو چکا ہے اور شاہ عبداللطیف کے رسالے کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سندھ کے سب سے محبوب شاعر کے کلام کا یہ مجموعہ بازار میں کہیں نہیں ملتا۔ جو تھوڑے بہت نسخے اس وقت تک مرتب ہو کر شائع ہوئے ہیں وہ بھی شاہ صاحب کے کلام سے گہری دلچسپی رکھنے والے گنے چنے علم دوست حضرات کے ذاتی کتب خانوں کی زینت ہیں۔ اب تک جتنے نسخے مرتب و مدون ہوئے ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

(۱) شاہ لطیف کے کلام کا سب سے پہلا نسخہ ان کی وفات کے چالیس سال بعد ان کے ایک مرید نے مرتب کیا تھا۔ یہ نسخہ لوانری والا نسخہ کہلاتا ہے اور رسالے کے سارے نسخوں میں سب سے زیادہ مستند ہے (۲) لوانری والے نسخے کے ۶۰ سال بعد ایک اور نسخہ مرتب ہوا۔ یہ بھٹ والا نسخہ کہلاتا ہے (۳) تیسرا نسخہ سندھ کے شاعر میر عبدالحسین والا مرتب کیا ہوا ہے۔ چونکہ میر صاحب نے جا بجا متروک الفاظ نکال کر مروج الفاظ شامل کر دیئے ہیں اس لیے یہ نسخہ مستند نہیں سمجھا جاتا۔ اس رسالہ کا ایک نسخہ حکومتِ سندھ کے ایماء پر بمبئی میں شائع ہوا۔ اس نسخہ میں شاہ صاحب کا مکمل کلام موجود ہے (۴) ایک نسخہ سنہ ۱۸۶۰ء میں جرمنی میں چھپا۔ اسے ٹرمپ والا نسخہ کہتے ہیں (۶) چھٹا نسخہ تارا چند زوتی رام کا ہے (۷) ساتواں مرزا قلیچ بیگ کا۔ اس نسخہ میں مرزا قلیچ بیگ نے مرتبہ اور مطبوعہ کلام کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل کر دی ہیں جو سینہ بہ سینہ اس زمانہ تک پہونچی ہیں اور شاہ عبداللطیف کے نام سے منسوب ہیں (۸) آٹھواں نسخہ ڈاکٹر گربخشانی کا ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے کلام کی ترتیب و تدوین میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کا مرتب کردہ کلام شاہ کا پورا کلام نہیں۔ (۹) ایک نسخہ عثمان علی انصاری صاحب نے مرتب کیا ہے اس کے تھوڑے تھوڑے حصے سندھی ادب کے مرکزی اڈوائزری بورڈ آف کنٹرول کے رسالہ مہران میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے انسان کو تین چیزوں کے علم اور مہارت کی ضرورت

ہے۔ تسون کا علم سندھی زبان کی مہارت اور سندھی زندگی کی تفصیلات سے پوری واقفیت۔ تصوف کے متعلق میرا علم محض نظری ہے۔ واردات نہیں۔ سندھی زبان کے علم میں میری حیثیت مبتدیوں سے بھی کچھ کم ہے۔ زندگی کی تفصیلات کی واقفیت کے لیے بھی میں دوسروں کے علم کا محتاج ہوں۔ اس کے باوجود شاہ عبداللطیف کی شاعری پر کچھ کہنے کی جسارت صرف اس عذر کی بناء پر کر رہا ہوں کہ اردو والے اب تک سندھ کے اس صوفی شاعر کے کلام سے روشناس نہیں ہیں۔

شاہ عبداللطیف کے کلام کو سمجھنے اور ان کے شاعرانہ محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں یہ چیز ہر وقت ذہن میں رکھنی پڑتی ہے کہ شاہ صوفی شاعر ہیں اور تصوف اور شعر اس حد تک ان کی ذات اور شخصیت کا جزو بن گئے ہیں کہ پڑھنے والے کلام کے کسی حصہ کے متعلق بھی آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ محض تصوف یا محض شعر ہے۔ تصوف اور شعریت ان کے یہاں ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں ان کا ہر خیال اور ہر جذبہ تصوف کے رنگ میں ڈوب کر باہر نکلتا ہے اور شاہ کی شخصیت کا دوسرا عنصر (یعنی شعریت) اسے اپنے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ یہاں ہر جگہ تصوف ہے اور ہر جگہ شعریت ہے دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر غالب نہیں آنے پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ کے کلام کو اگر موضوع کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے تو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ اس تقسیم کا معیار خواہ کچھ بھی ہو تصوف کی چاشنی بہرحال اس میں موجود رہتی ہے اور اس لیے شاہ کے نقادوں نے جب ان کے کلام کی تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے تو انہیں مختلف قسم کی معذرتیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے جس بات پر اکثر نقاد اور شارح متفق ہیں وہ یہ بات ہے کہ ان کے کلام کا ایک حصہ دعائیہ ہے جسے عاشقانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں مروجہ لوک کہانیوں کے ٹکڑے نظم کیے گئے ہیں۔

دعائیہ یا عاشقانہ کلام میں عشق و محبت کے وہی سارے مدارج اور وہی ساری کیفیات ہیں جو عموماً عاشقانہ شاعری میں ہوتی ہیں۔ حسن بے نیاز ہے عشق بے تاب و بے قرار ہے لیکن فرق یہ ہے کہ گو عشق کی ساری علامتیں دنیاوی ہیں لیکن ان کا احساس بلند روحانی احساس ہے۔ اس میں ارضی عشق کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کہیں نہیں۔ محبوب سے شکوہ شکایت کا نام نہیں۔ لہجہ میں سختی، کرختگی، حتیٰ کہ طعن طنز سرے سے مفقود ہے۔ بات چونکہ ہمیشہ عورت کی طرف سے کی گئی ہے اس لیے قدرتی طور پر اس میں ایک طرح کی نرمی نزاکت اور لوچ ہے۔

شاہ کی محبت میں عاشق اور محبوب کے کردار کی دو خصوصیات ہیں اور ان کے ہر عمل میں یہ خصوصیت جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ عشق اپنے آپ کو بدیوں کا مجسمہ جانتا ہے اور حسن اس کی نظر میں مجسم حسن ہے۔ اس بنیادی خیال کو شاہ نے اپنے کئی دوہوں میں ادا کیا ہے۔ دو تین دوہے ملاحظہ کیجیے۔

"میرے محبوب کی پیشانی سے نیکیوں کے
انوار ہویدا ہیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ وہ
مجھ جیسے بداطوار کے پاس آنے سے گریز
نہیں کرتا۔ اسی لیے تو میں اپنے دوستوں
سے کہتا ہوں کہ شمس و قمر میرے محبوب
کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان میں حسن تو
ہے لیکن نیکی نہیں۔"

"میرا محبوب مجسم نیر ہے اس نے یہ بات
بالکل بھلادی ہے کہ وہ نیکیوں سے پُر
ہے۔ اس کی نیکی اور معصومیت کا سب
سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ میرے پاس
آیا۔ لیکن اس نے مجھ سے میرے عیبوں
اور میری کوتاہیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"اے چاند تو میرے محبوب سے مقابلہ
کرتا ہے۔ میں تجھے للکارتا ہوں....
تو چودھویں رات کو جو سنگھار چاہے
کر۔ ساری عمر کا حسن اکٹھا کرلے لیکن
میرے محبوب کے ایک جلوے کی برابری
نہیں کر سکتا۔"

"تم اور تمھارے جیسے ایک سو سورج
نکل آئیں پھر بھی محبوب کے بغیر میرے
لیے اندھیرا رہیگا۔ جاؤ۔ نیچے اُتر
جاؤ.... تمھاری روشنی میں میں
محبوب سے نہیں ملنا چاہتا۔"

یہ تو ہے محبوب کا تعارف.... اب دیکھئے کہ عاشق کے دل میں عشق کے دیئے ہوئے درد کی کتنی محبت ہے۔

"وہ میرے دل میں درد اٹھا کر چلے گئے
اور مجھے یہ درد اس لیے پیارا ہے کہ وہ
محبوب کا دیا ہوا ہے اس لیے مجھے طبیبوں
کی آواز بھی بُری لگتی ہے۔"

"مجھے طبیبوں کے پاس بیٹھنا بھی گوارا نہیں
اس لیے کہ میرا سب سے بڑا دوست
تو محبوب کا دیا ہُوا درد ہے۔"

یہ درد عاشق کو اتنا عزیز ہے کہ محبوب سے استدعا کرتا ہے کہ وہ اسے جس طرح بھی ہو یہ درد دے دیکھئے دو تین دوہوں میں شاعر نے عاشق کی اس تمنا کو کتنے جوش، ولولے اور ارمان کے ساتھ بیان کیا۔

"اے میرے محبوب لگاؤ۔ زور سے لگاؤ
آہستہ لگا کر مجھ پر احسان نہ کرو۔ اس لیے
کہ یہ مجھ پر احسان نہیں۔ میرے لیے تو
عزت کی بات یہ ہے کہ تمھارے دیے
ہوئے زخم سے مر جاؤں۔"

"اے میرے محبوب چوٹ لگاؤ اور جتنے
زور سے ہو سکے لگاؤ۔ تاکہ مجھے تمھاری
جھولی میں گر جانے کا موقع مل جائے۔"

"ان کا دیا ہوا زخم مجھ سے سدا یہی کہتا
رہتا ہے کہ طبیب کے پاس مت جاؤ ورنہ
میں اچھا ہو جاؤں گا۔"

عشق کی دنیا میں تصویر کا ایک رخ تو وہ ہے جس میں شاعر عاشق کی روداد بیان کرتا ہے اور دوسرا وہ جس میں ان لوگوں کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے جو عشق کے میدان میں اس کے مدمقابل اور رقیب ہیں۔ جس عشق کی پرورش بوالہوسی کے گہوارہ میں آتی ہے وہ عشق کی رقابت کی تاب نہیں لا سکتا۔ لیکن جس عشق میں لگاؤ سچا ہے وہ اس تنگ ظرفی کو پاس بھی نہیں آنے دیتا۔ اسے تو ان ہم جنسوں اور ہم چشموں کی صحبت اور بھی عزیز ہوتی ہے جن کے دلوں میں محبوب کا دیا ہوا درد ہے۔

"آؤ چلیں۔ ایک رات ان کے پاس گزاریں
جن کے جسم درد سے چاک ہیں لیکن جب لوگ آتے ہیں
تو ان سے اپنا درد چھپاتے ہیں۔"

شاہ کے کلام میں عاشق کا کردار بہت بلند ہے اس میں ایک طرف حسن کا بہت اونچا نصب العین ہے دوسری طرف عشق کا نصب العین بھی اسی طرح اس سے کم نہیں۔ حسن کی بلندی یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر حسن سے بہتر و برتر ہے ایسے حسن کے لیے عشق بھی ایسا ہی بلند ہونا چاہیئے وہ محبوب کے حسن کا فریفتہ ہے اسے اس میں نیکیوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا اسی کے دیئے ہوئے درد میں باقی ہر چیز سے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے اسے ان عاشقوں کی صحبت میں رہنے کی تمنا ہے جو اس کے رقیب ہیں لیکن اسی حسن کے عاشق ہیں جس کے جلوے اس کی نظر میں سما رہے ہیں اسی نازک رشتہ کی دو ایک کڑیاں اور ملاحظہ کیجیئے۔

"کسی نے پوچھا۔ تمھارا محبوب کبھی تم سے
بات کرتا ہے۔"
"نہیں!"
"پھر وہ محبوب کیسا؟"
"محبوب کا سکوت ہی میرے لیے سلام
ہے۔"
"میری آنکھوں نے مجھ پر احسان کیا کہ میرے
گھر کے سامنے سے ہزاروں انسان گزرتے
ہیں لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھتیں۔"
"میری آنکھیں اگر محبوب کے سوا کسی اور
کو دیکھیں تو اے کاگا ان کو نکال کر
گڑھے میں ڈال دے۔"

یہ ایک جھلک ہے۔ شاہ کے عاشقانہ یا دعائیہ کلام کی۔ کلام کے دوسرے حصہ میں ہمیں سندھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بہت سی دلکش تصویریں نظر آتی ہیں۔ مثلاً بارش کے موضوع پر شاہ نے ایک طرف تو اس عام ذہنی کیفیت کی مصوری کی ہے جو سندھ جیسی بنجر زمین میں بارش ہونے پر ہر ایک دل میں پیدا ہوتی ہے اور پھر اس پھیلی ہوئی زندگی میں سے کچھ خاص کردار چن کر اس تصویر کو مکمل بنا دیا ہے۔

"دیکھو لطیف گھنے بادل نیچے اتر رہے ہیں اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگیں۔ اپنے بیلوں کو باہر نکالو اور میدانوں کا رخ کرو ..... یہ وقت مایوس ہو کر بیٹھنے اور سستی کرنے کا نہیں ..... لو دیکھو۔ پھوار پڑنے

گی"۔

"کل رات پدم جھیل پر بارش کے دیوتا نے گڑھے کے گڑھے انڈیل دیئے لیکن وہ جن کے شوہر پردیس میں ہیں۔ ان بادلوں کو دیکھ کر غمگین ہیں۔"

"وہ موسم آگیا جب لوگ خوش ہو کر باتیں کرتے اور موسیقی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کسان اپنے ہل درست کر رہے ہیں۔ گلہ بان خوش ہیں اور میرے محبوب نے بارش کی خوشی میں اچھے سے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔"

"جو لوگ قحط کے سہارے پر جیتے ہیں اور جو لوگ کنجوس ہیں ان سے کہو کہ چلے جائیں۔ گایوں کے گلے بارش کی خبر لا رہے ہیں...... سب تیری رحمت کو اپنے قریب محسوس کر رہے ہیں۔"

سندھی زندگی کی جن خاص رسموں کو شاہ نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے رسالہ کا ایک باب جس کا نام "سر سامندری" ہے ان رسموں میں سے ایک کے مختلف پہلوؤں کا ترجمان ہے۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے گاؤں میں بہت ہندو آباد تھے۔ یہ سمندر کے راستے تجارت کی غرض سے دوسرے ملکوں کو جاتے تھے۔ رسم یہ تھی کہ جو نوجوان تجارت کے لیے جانے والا ہوتا اس کی شادی روانگی سے ایک ہفتہ پہلے کر دی جاتی تھی اس وقت اس کا جانا سب سے زیادہ شاق اس کی بیوی پر گزرتا تھا۔ شاہ نے اس نئی بیوی کی زبان سے اس کی دلی کیفیات کا جو اظہار کیا ہے اس کے مختلف پہلو سر سامندری میں ہیں۔ کچھ تصویریں دیکھئے۔

"سہیلی نے اس سے پوچھا۔ تم آج سمندر پر نہیں آئیں" اس نے جواب دیا "اے سکھی! اس پردیسی چڑیا نے جو زخم میرے دل پر لگائے تھے وہ ابھر آئے تھے..... کیونکہ صبح کو ایک بادبان نظر آیا تھا۔"

"سہیلی نے اس سے کہا۔ تم نے اس سے یہ کیوں نہیں کہا۔ اگر تمھاری محبت اس کشتی پر سفر کے ساتھ تھی تو پھر مجھ سے یہ ناطہ کیوں جوڑا..... اور اگر اس سے یہ نہ کہہ سکی تو خود اپنے آپ سے کہہ لیتی کہ ان کشتی میں جانے والوں سے محبت نہیں کی جاتی۔"

"اگر تم مجھ سے بھلائے نہیں جا سکتے تو تو اللہ کرے میں بھی تمھیں یاد رہوں۔ کیوں کہ نگینہ تو انگوٹھی کے بغیر بالکل بے کار ہے۔"

"آج پھر ایک جہاز جا رہا ہے۔ میرا جانے والا پریتم۔ میں ہزار روکوں پھر بھی وہ نہ رکے گا۔ اے میری ماں۔ جس کی محبت سمندر کی سیر ہے اسے کہاں تک روک سکوں گی۔ جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ لنگر بھی اٹھا لیا گیا ہے۔"

اس طرح ایک دوسرا باب "سر کاپائتی" ہے۔ سر کاپائتی کے سارے دوہے اس خاص رواج یا پس منظر پیش کرتے ہیں کہ ان دونوں لڑکیوں کے لیے چرخہ چلانا اور سوت کاتنا ایک ہنر کی بات سمجھی جاتی تھی یہاں تک

کہ لڑکیوں میں سوت کاتنے کے مقابلے بھی ہوتے تھے اس سر میں شروع سے آخر تک شاہ کے صوفیانہ تخیل کا بہت گہرا پرتو ہے۔ انہوں نے چرخے اور سوت سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو ایک کنیا کی صورت دے کر بظاہر ایک سیدھے سادے انداز میں تصوف کا کوئی نہ کوئی نکتہ بیان کیا ہے ..... خصوصاً عمل اور حسن عمل کے بارے میں صوفیا کا جو نکتہ نظر ہے۔ اس کی وضاحت اس سر پہ ہر دوہوں میں ہوتی ہے۔

"تمھیں کاتنے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں
تمھیں تو بس سونا چاہیئے اور اپنی ہڈیوں
کے لیے آرام ..... یکایک عید آگئی۔
لوگ نئے کپڑوں سے محروم رہیں گے
خود تمھارے پاس بھی پہننے کو اچھے
کپڑے نہیں ہوں گے۔ جب تمھاری
سہیلیاں تمھیں باہر لے جانے کو آئیں
گی۔"

"اگر انھوں نے اپنے دلوں میں دھوکہ
رکھ کر باریک سے باریک سوت بھی کاتا
تو سوداگروں نے ان کا رتی بھر سوت
بھی نہیں لیا ..... اور انہوں نے دل
میں محبوب کی محبت کو جگہ دی اور موٹا سوت
کاتا تو سوداگر نے ان کا سوت تولے
بغیر ہی قبول کر لیا۔"

"جن کے دلوں میں ڈر تھا جب انھوں
نے سوت کاتا تو ان کے پریتم نے ان کے
برے سوت کو بھی پسند کر لیا۔"

اس پورے سر کا یہی انداز ہے۔ زندگی کی سادگی ہے۔ احساس کا خلوص ہے اور شاعرانہ بیان کی تازگی اور ان سب چیزوں پر چھایا ہوا صوفیانہ تخیل۔ شاہ کے کلام کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے انھیں سندھ کے ہر طبقہ کا محبوب بنایا ہے۔ اس کا پس منظر وہ زندگی ہے جسے انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ احساس ہے جس کی دھڑکن انھوں نے دوسروں سے زیادہ خود سنی ہے زندگی کی ان تفصیلات پر ان کی گہری نظر ہے لیکن وہ اپنے شاعرانہ حسن انتخاب کی مدد سے اس پوری فضا میں سے صرف ایسی چیزیں چنتے ہیں جو ان کے مخصوص طرز تخیل اور ایک اخلاقی نصب العین کی وضاحت میں ممد ثابت ہوتی ہیں اور ان دو چیزوں کے درمیان صحیح امتزاج ہے کہ ایک چیز دوسری کے اثر اور مقصد کو زائل اور فنا نہیں کرتی۔ زندگی کی ایک خاص فضا نظر کے سامنے آجاتی ہے اور ذہن اور اخلاقی نکتہ کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے جو اس فضا میں رہ کر شاعر نے دوسروں تک پہنچانا چاہا ہے۔ .... اس لیے ایک جگہ میں نے کہا تھا کہ شاہ صوفی بھی ہیں اور شاعر بھی اور یہ دونوں خصوصیات ان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہیں اور اس لیے ان کے کلام کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں جس میں ان کی اس ملی جلی شخصیت کا پرتو نہ ہو چنانچہ ان کے کلام کا وہ جزو بھی جس میں سندھ کی مروجہ لوک کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ شروع سے آخر تک تصوف اور شاعری کا ایک بے حد متوازن اور شیریں امتزاج ہے۔ رسالہ میں اس طرح کی پانچ کہانیاں ہیں۔

"سسی پنوں"، "سوہنی مہار"، "لیلیٰ چنیسر"، "مومل رانو" اور "ماروی عمر"۔ لیکن ایک مزے کی بات یہ ہے کہ شاہ نے یہ کہانیاں پوری کی پوری بیان کرنے کے بجائے ان کے وہ ٹکڑے سامنے رکھے ہیں جہاں کہانی اپنے نکتہ عروج پر پہنچی ہے۔ کہانی کا یہ نکتہ عروج عشق کی آزمائش کا سخت ترین لمحہ ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ کو اس نفسیاتی لمحے میں جو شاعرانہ، درمندانہ امکانات نظر آئے ان سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور کہانی کے اس نکتہ پہ پہنچ کر عاشق کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرنے کے علاوہ اس سے اس آفاقی عشق کی راہ دکھائی ہے جس پر چل کر انسانی روح بھی روحانی مراتب حاصل کر لیتی ہے۔ ان کہانیوں میں سوہنی مہار ایسی ہے جو ان کے صوفیانہ مطمح نظر کی سب سے زیادہ صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ اس نظم کے کچھ ٹکڑے پڑھ کر اس کا اندازہ کیجیے۔

"دریا میں طوفان اٹھ رہے ہیں۔
بھیانک گھڑیال۔ ہزاروں بھیانک
گھڑیال منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔ اے
ساحر۔ میرا نازک جسم بغیر تیرے سہارے
کے اس خطرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا...
آ۔ ندی میں آجا۔ اے او۔ جو میرا آقا
اور مجھ پر مہربانیاں کرنے والا ہے۔"

"جب کچا گھڑا ٹوٹ گیا اور ندی کا سہارا باقی نہ رہا تو سوہنی کے کانوں میں اس محبوب جو رہا ہے کی آواز گونجی
......" اے سوہنی سلامتی کے طریقوں کو بھول جا" محبت تیری نگہبان ہے۔ وہ تجھے ان بپھری ہوئی موجوں کے پار لے جائے گی۔ محبت جن کی رہبر ہے وہ تیزی سے گہرے پانی میں سے گزر جاتے ہیں۔ اس گہرائی میں محبت کا سہارا پکڑ۔ چرواہا ان کی ہنر گری کرتا ہے جو اسے تلاش کرتے ہیں۔"

"میں محبت کے خیال کو رد کرنے کی بے لاکھ جتن کرتی ہوں لیکن رد نہیں کر سکتی اس لیے میں اب اپنی جان کی پروا کیے بغیر پانی میں کود جاؤں گی۔ جن کے خیال پر دل ابھی کے ساتھ ہیں انہیں ایسا کرنے کا حق ہے۔"

"سوہنی لوگ دریا کے دوسری طرف کھڑے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں کہ سوہنی آ۔ لیکن دو خطرے ایسے ہیں جو میرے دل کو روکتے ہیں۔ تیز بہتا ہوا گہرا دریا اور یہ کچا گھڑا لیکن جن کے ساتھ سچائی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کبھی نہیں ڈوبتے۔"

سید" تو پھر اللہ کی مدد سے بھروسہ کو اپنی کشتی بنا۔ جو عورتیں۔ ساحر کے کہے پر چلتی ہیں وہ کبھی خطرے میں نہیں .... دیکھو سمجھدار آدمی جب ڈوبنے لگتا ہے تو جھاڑیوں کو پکڑ لیتا ہے لیکن

ذرا دیکھو کہ یہی زندگی جھاڑیاں سہارا
بہنے والے کو کنارے پہنچا دیتی ہیں اور
کبھی وہ ٹوٹ جاتی ہیں اور پکڑنے والا
دریا میں ڈوب جاتا ہے۔"

سوہنی مہار میں اور اسی طرح دوسری داستانوں میں جا بجا شاہ نے عشق کو بزرگی رہبری کے آداب سکھائے ہیں۔ عشق میں سوائے ایک سہارے کے اور سب بے کار ہیں لیکن یہ آداب سکھاتے وقت ان کا لہجہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پڑھنے والا اپنی روزانہ کی زندگی کی نشد اور اس کے بے تکلف ماحول سے دوری محسوس کرے

تصوف اور شاعری دونوں کا پس منظر خالص ارضی اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں بھی مقامی ہے۔ یہاں نازک خیل کی بلند پروازیوں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے جذبات کی صداقت اور زندگی کی سادگی پر تکیہ کرنی ہے اور یہی چیز ہے جس نے دل میں اس کے لیے گھر بنا یا ہے۔

یہ ہے شاہ عبداللطیف کے کلام کا ایک سرسری سا تعارف۔ افسوس ہے کہ اس تعارف میں شاہ کے حسن بیان اور ان کے شاعرانہ فن کا کوئی ذکر نہیں آیا

---

ممتاز مرزا

# سُر سِری راگ اور سامونڈی کا پس منظر

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ابیات سندھ کی تمدنی، تہذیبی، تاریخی اور ثقافتی زندگی کی واضح نشاندہی کرتے ہیں جہاں ان میں تصوف کے باریک نکات ہیں وہاں زندگی کے حقیقی رنگ کے واضح اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ شاہ کی عمیق نظر اپنے ماحول پر پوری طرح سے نظر آتی ہے۔ اور اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اگر شاہ لطیف کے ابیات کا جائزہ لیں گے تو ہمیں علم ہوگا کہ باوجود اس کے کہ وہ ایک خاص مضبوط روایتی شاعری کے پس منظر سے واقفیت رکھتے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے علم و عرفان کی راہیں اپنے طور پر مقرر کیں۔ اور اس میں اپنے ذاتی مشاہدے کو بہت اہمیت دی، نتیجتاً شاہ اپنے فن و فکر کے لحاظ سے سندھی شاعری کے وہ اعلیٰ اور منفرد شاعر قرار پائے۔ جن کی جگہ نہ پہلے کسی شاعر نے بھری اور نہ ہی آئندہ کبھی کوئی شاعر اس مقام کو حاصل کر سکے گا۔

محققین نے شاہ صاحب کے کلام کے ۳۲ سُر (یا داستانیں) متعین کئے ہیں ان میں سے اکثر سُر مختلف مشہور و معروف تاریخی اور نیم تاریخی داستانوں پر مبنی ہیں، لیکن کچھ ایسے سُر ہیں جن کی بنیاد کسی قصے یا داستان پر نہیں رکھی گئی ہے اس کے باوجود ان ابیات میں مشاہدے کی گہرائی اور زندگی کو انتہائی قریب سے دیکھنے کے بہت سے اندرونی شواہد موجود ہیں۔ ان میں سے ایک سُر سامونڈی" سمندر سے متعلق سُر بھی ہے اور دوسرا سُر سری راگ ہے۔ ان دونوں سُروں میں بنیادی طور پر کوئی داستان نہیں ہے۔ اس کے باجود ان ابیات میں جو ہجر و فراق اور سوز و گداز کے انتہائی نازک اور نفیس احساسات واضح طور پر نظر آتے ہیں، وہ کسی دوسرے کی داستان میں اس انداز سے موجود نہیں ہیں۔ اس کی وجوہات پر اگر غور کیا جائے تو ایک طرف یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تصوف کے سفر میں جو تکلیفیں

اور ان کاوٹیں ایک طالب کو پیش آتی ہیں، وہ ان اشعروں کا پس منظر ہے۔ لیکن دوسری جانب ہم اگر شاہ صاحب کی فکر کو عہد جدید کے تقاضوں کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں کچھ اس طرح سے محسوس ہوتا ہے کہ شاہ لطیف نے اس وقت کے سندھ کے سیاسی، اقتصادی اور معاشی حالات کو اپنے اظہار فکر کے لئے منتخب کیا اور اس دور کی بدحالی نے ان کی حساس طبیعت کو شدید طور پر متاثر کیا، اور پھر اس دور کی اس تباہ حالی اور شکست و ریخت کو سر سامونڈی اور سر سری راگ کے مضامین میں اپنے دلی دکھ اور سوز کا اظہار کیا۔

سر سامونڈی تین اور سری راگ چھ داستانوں پر مشتمل ہے، جن میں مندرجہ ذیل نکات کو شاہ صاحب نے بیان فرمایا ہے۔

(الف) ساحل پر اب وہ کشتیاں نہیں ہیں، اور ان سوداگروں کی صدائیں بھی سننے میں نہیں آتیں جو بہت دور چلے گئے ہیں۔ ان گہرائیوں کی طرف سے وہ واپس نہیں آئے۔ میں ان کے انتظار میں ساحل پر کھڑی ہوں موسم آئے اور گئے، شمال کی ہوا چلی، سمندر خاموش ہوگیا لیکن وہ نہیں آئے مجھے اب صرف ان کی باتیں ہی یاد رہ گئی ہیں۔

(ب) سمندروں کے ناخدا آتے ہیں اور پھر جانے کی بات کرتے ہیں پھر روکنے کے باوجود انہوں نے اپنے بیڑوں کے بادبان کھول دیئے اور گہرائیوں کی طرف چلے گئے، ان کا سفر بہت ہی مشکل اور کٹھن ہے۔ پتہ نہیں کب میں ان کو پھر اپنی آنکھوں سے دیکھ پاؤں گی، کیوں کہ وہ دیس پردیس کی بندرگاہوں کو دیکھنے والے ہیں۔ وہ ملبار بھی جاتے ہیں، یہاں اپنے سادہ سودہ لباس میں وہ انمول چیزوں کا سودا کرتے ہیں۔

(ج) یہ سمندری سوداگر سونے کا کاروبار نہیں کرتے ان کی نظر میں بہت اچھی چیزوں کی کسوٹی ہیں، کیوں کہ جب وہ سمندر سے دریائے مہران آتے ہیں تو ان کی نظریں مہران کے موتیوں پر ہوتی ہیں اور وہ جب لنکا (موجودہ سری لنکا) سے آتے ہیں تو ان کی تلاش ایسی ہی انمول چیزوں کے لئے ہوتی ہے۔

سر سری راگ کے چھ ابواب (داستان) میں شاہ صاحب نے یہ نکات بیان فرمائے ہیں۔

(الف) اے سوداگر، ہمیشہ سچائی کے سودے کرتے رہنا جھوٹ کے قریب نہ جانا، خدا کے قائم کردہ قوانین سے دور مت ہونا۔ اپنی نظر کو دور تک رکھنا، اس لئے کہ تمہیں بہت دور کے ممالک میں جانا ہے ایسے سچے سودے کرنے والے اپنے جہاز بھر کر دور کے سفر کو جا رہے ہیں۔ اے میرے خدا، ان کے سفر کو آسان بنانا۔

(ب) سمندر کی لہروں کو غور سے دیکھو، اس میں موتی لعل اور دوسری بہت سی چیزیں موجود ہیں، سچے غواص وہی ہیں جو عمیق گہرائیوں تک جاکر سمندر سے موتی تلاش کرتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ کرنے والا خدا ہی ہے، کیوں کہ انسان کے دل میں جو خواہشیں ہوتی ہیں وہ بغیر اس کے حکم کے پوری نہیں ہوتیں۔

(ج) بادشمال کے بعد یہ سوداگر اپنے جہاز لے کر چلے

گئے ان کی کشتیوں میں وہ سامان ہے جو کبھی پرانا نہیں ہوتا یہ چیزیں دوسرے ملکوں میں بیچتے ہیں یہ سمندر بڑا ہی طوفانی ہوتا ہے، اس لئے اس میں ایسی کشتی کو مت لے جانا جو پرانی ہو، اپنی کشتی کو ہمیشہ صاف ستھرا اور طوفانی لہروں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھ، کیوں کہ اس سمندر میں اگر تم نے اے ناخدا، غفلت سے کام لیا اور راہ دکھانے والے سے دور ہوئے تو فرنگی جو اس میں پھرتے رہتے ہیں اور اگر یہ قزاق تمہاری کشتی پر قابض ہوئے تو سوائے خدا کے اور تمہیں کوئی بچانے والا نہیں۔ اس لئے آنکھیں کھول کر، راتیں جاگ کر اس سفر کو آسان بنا۔

(د) وہ پرکھنے والے چلے گئے، جن کو موتی اور ہیروں کی شناس تھی، ان کے بعد آنے والوں کو تو سیپے کی بھی خبر نہیں ہے۔ ان جگہوں پر جہاں بڑے نازک اور نفیس کام ہوتے تھے۔ وہاں اب لوہار لوہے کوٹتے رہتے ہیں۔ موتیوں کی خبر تو اس کے پرکھنے والے کو ہی ہوتی ہے اگر ایسے لوگ چلے گئے ہیں تو سونے کی بھی قدر نہیں رہی ہے، اسے بھی یہاں سے چلا جانا چاہیئے کیوں کہ اب تو شیشے کو ہیرا سمجھ کر لوگ قبول کرنے لگے ہیں۔ میں اپنی جھولی میں اس سچ کو ٹالنے کے بعد بھی شرمندگی محسوس کرتی ہوں۔

(ہ) اے میرے دوست میں نے تم سے کہا تھا تم ایسی کشتی میں سفر نہ کرنا جو ان طوفانوں کا مقابلہ نہ کر سکے جو سمندر میں اٹھتے ہیں۔ کیوں کہ تمہاری کشتی میں بہت سی نایاب چیزیں ہوتی ہیں۔ الائچیاں، کپڑے موتی اور اس قسم کی چیزیں دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

(و) گہرائی میں تمہیں صرف تمہاری اپنی کوشش کام آئیگی کیونکہ تیراک تو گہرے پانی کو بھی پار کر جاتے ہیں۔ لیکن وہ جو تیرنا نہیں جانتے ہیں، مجھے ان کے حال پر رحم آتا ہے کہ وہ صرف اپنے سروں پر بڑی پگڑیاں باندھ کر پھرتے ہیں۔ اس سفر میں ہوشیاری کی ضرورت ہے کیوں کہ آسمان میں بجلی ہمیشہ اچانک کوندتی ہے۔ اس لئے اگر تمہارے پاس خدا کا نام ہے تو تم ان تکلیفوں کے باوجود اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔

یہ سُر ساموندی کے تین اور سر سری راگ کے چھ ابواب میں شامل ابیات کا مختصر سا خاکہ ہے۔ جس میں سندھ کے ساحل سے جانے والی چیزوں مثلاً موتیوں، کپڑے، گرم مصالحے وغیرہ کا ذکر ہے، اور یہاں کے سمندری جہاز ملبار اور لنکا کی طرف جاتے تھے۔ ایسی انمول چیزوں کا سودا کرتے تھے، جس کے مقابلے میں سونا بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا اس مختصر سے تعارف کے بعد ہم اس داستان کے پس منظر میں سندھ کی اقتصادی صورت حال اور شاہ صاحب کے افکار کا تجزیہ کریں گے تو ہمیں واضح طور پر اندازہ ہو سکے گا ایک صاحب دل اور گہرے مشاہدے کے مالک شاعر کے ان سُروں میں اتنا سوز و گداز کیوں ہے۔ سب سے پہلے لطیف کے دور میں سندھ کے داخلی، خارجی، سیاسی، معاشی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اس سُر کا صحیح پس منظر واضح ہو سکے۔

## شاہ لطیف کے دور کے مشہور تاریخی واقعات

۱۶۸۹ء شاہ لطیف کی ولادت۔

۱۶۹۹ء کیپٹن ہیملٹن کی سندھ میں آمد، پورے سندھ کے سفر کے بعد اپنا سفرنامہ مرتب کرنا۔

۱۷۰۱ء میاں یار محمد کلہوڑا کا مغل شہنشاہ اورنگزیب سے سندھ کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کرنا اور داؤد پوتوں کی شکست۔

۱۷۱۱ء میاں یار محمد کلہوڑا کا اپنی طاقت بالائی سندھ میں مضبوط و مستحکم کرنا۔

۱۷۱۹ء میاں یار محمد کلہوڑا کی وفات، ان کے بیٹے میاں نور کلہوڑا کا "خدایار" کا لقب اختیار کرنا۔

۱۷۳۶ء میاں نور محمد کا سندھ کا صوبہ دار مقرر ہونا۔

۱۷۳۹ء نادر شاہ افشار کا سندھ پر حملہ اور سندھ کے ماتحت ہونا۔

۱۷۵۰ء سندھ کی مملکت احمد شاہ درانی کے ہاتھوں افغان حکومت میں شامل ہوئی۔

۱۷۵۲ء شاہ لطیف کی وفات۔

شاہ صاحب کی ولادت کے وقت، سندھ دہلی کی مغل حکومت میں شامل تھا، اور یہاں مغل حکومت کی جانب سے کوئی نمائندہ یا صوبہ دار مقرر ہوا کرتا تھا۔ ایک بعد دوسرے نمائندے یا صوبہ دار آتے اور واپس چلے جاتے تھے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ صدی (۱۵۹۲ - ۱۷۳۹) تک، سندھ مختلف تاجداروں اور صوبہ داروں کے زیر نگیں رہا۔ اس طرح شاہ کے دور میں سندھ دو حصوں میں تقسیم تھا اور اس کے دو علیحدہ انتظامی صوبہ دار مقرر تھے۔ اس صورت حال میں سندھ کے اقتصادی اور معاشی حالات بتدریج انحطاط پذیر رہے دہلی کی مرکزی حکومت اور سندھ کے صوبہ داروں کے مقرر کردہ محصولات کی حدیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ سندھ کے عوام اس دہری چکی میں پس کر رہ گئے اور اس علاقے کے اقتصادی اور معاشی حالات کمزور سے کمزور تر ہوتے گئے۔

قدرتاً جغرافیائی حالات بھی کچھ اس نوع کے ہوتے گئے جن سے دریائی آمدورفت کے وسائل کو سخت نقصان پہنچا اور جس خطۂ زمین کی تجارتی عظمت کا شہرہ ساری دنیا میں موجود تھا وہ دن بدن کم ہوتا چلا گیا۔ شاہ صاحب کی ولادت سے سترسٹھ اڑسٹھ سال (۱۴۲ - ۱۶۱۴) میں نکولس وتھنگٹن نامی ایک پرتگالی سیاح سندھ میں آیا، اور سندھ کے شہر ٹھٹھہ کی تجارت عظمیٰ سے متاثر ہوکر اپنے سفرنامہ میں لکھا۔

"ہندوستان کا کوئی بھی شہر، تجارت میں ٹھٹھے کے برابر نہیں ہے۔ سترھویں صدی (۱۶۲۵ - ۹۲ء) کے دوران انگریز تاجروں نے بھی سندھ کے اس شہر کے متعلق اپنے روزنامچوں میں کافی معلومات مہیا کی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔ "ٹھٹھے میں کپڑے بننے والوں کے تقریباً تین ہزار خاندان آباد تھے ان میں سے زیادہ تر کھیس" (سندھ کا مخصوص اور مشکل سے بننے والا کپڑا) تیار کرنے والے کاریگر تھے۔ یہ کھیس ترکی اور ایران میں بہت زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ ۱۶۹۹ء میں ایک اور یورپین سیاح ماندین، جس نے دریائے سندھ کے راستے سے لاہور سے ٹھٹھہ تک سفر کیا اور ایک مہینہ ٹھٹھہ میں رہا۔ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ "ٹھٹھہ ایک بڑا صنعتی مرکز اور بڑی بندرگاہ تھا جہاں ہر وقت سمندری جہازوں کی قطاریں موجود رہتی تھیں، یہ جہاز ایشیا اور پرتگال کی جانب، مختلف اقسام کی اشیا لے کر جاتے تھے"۔

اس تجارتی مرکز اور بندرگاہ کے زوال کی ابتدا سترھویں صدی عیسوی کی تیسری چوتھائی (۱۶۵۰ء سے ۱۶۷۵ء) سے شروع

ہوئی۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ولادت کے صرف دس سال بعد ۱۶۹۹ء میں انگریز بیلڈر ہیملٹن سندھ میں آیا اور لکھتا ہے "میرے آنے سے تین سال قبل (۱۶۹۶ء) ٹھٹھے شہر میں طاعون کی ایسی وبا پھیلی جس نے ٹھٹھہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں تباہی مچادی اور صرف ٹھٹھہ شہر کے ریشمی اور اونی کپڑے بننے والے اسی ہزار کاریگر مرگئے۔" اس وبا نے سندھ کو صنعتی طور پر تقریباً برباد کردیا (۱۶۹۷) میں دریائے سندھ کے دہانے پر مٹی جم جانے کی وجہ سے ٹھٹھے کا دریائی کاروبار بھی زوال پذیر ہوا۔ ہیملٹن لکھتے ہیں کہ "ٹھٹھے کی تجارت جو پہلے بہت تھی اب آہستہ آہستہ ختم ہورہی ہے۔ کیوں کہ دریا میں مٹی کی تہہ جم جانے کی وجہ سے وہ بہت خطرناک بنتا جارہا ہے اور دن بدن اس کی گہرائی کم ہوتی جارہی ہے۔ اور جب وہ خود ٹھٹھہ میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کے ٹوٹے پھوٹے مینار اور عمارتوں کے کھنڈرات دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہے۔

دریائے سندھ رخ بدلنے کے لئے بہت مشہور ہے اور سندھ کے لوگ اپنی عقیدت اور محبت کے تحت اس دریا کو انتہائی پیار سے اپنی مرضی والا خودمختار شہزادہ کہتے ہیں اور دریائے سندھ کی اس تبدیلی کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب کی ابتدائی زندگی میں ہی ٹھٹھے شہر کی تجارتی، صنعتی اور اقتصادی عظمت ختم ہوچکی تھی۔ زندگی ویرانے میں گم ہوگئی، جہاں چہل پہل تھی وہاں سکوت طاری تھا جہاں محل اور بڑی عمارتیں تھیں وہاں جھونپڑے اور کھنڈرات بن گئے اور اس لاکھوں کے شہر کی آبادی صرف ہزاروں میں رہ گئی۔ شہر کی شان ختم ہوگئی اور اس کی "قدیم بزرگی کا اعزاز" بھی اس سے چھن گیا۔ سندھ اس سب سے بڑے شہر اور صنعتی اور تجارتی مرکز کی اس طرح تباہی ہر ذی شعور اور وطن سے محبت کرنے والے انسان کے لئے ایک ذہنی عذاب کی حد تک رنج والم کا باعث تھی۔

ٹھٹھے کے بعد دوسری بڑی اور مشہور بندرگاہ "لاہری بندر" تھی، جو ٹھٹھے سے صرف تین دن کے فاصلے پر تھی۔ ابن بطوطہ نے اس بندرگاہ کو دیکھا اور اپنے سفرنامے میں لکھا کہ "لاہری بندر ایک بہت بڑی بندرگاہ ہے جہاں سے یمن اور فارس (عربستان اور ایران) اور دوسرے ملکوں کے لوگ تجارت کے لئے آتے تھے۔ ان آنے والے لوگوں سے تقریباً ساٹھ لاکھ محصول حاصل ہوتا تھا۔ لاہری کی بندرگاہ سترھویں صدی میں ہندوستان میں داخل ہونے کا اہم راستہ تھا۔ یہ بے حد معروف بندرگاہ تھی اور ہندوستان کی بیرونی تجارت اور سندھ کی سمندری تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا جس کی دولت اور خوشحالی کے چرچے پرتگیزوں، انگریزوں اور اقوام کو یہاں پر کھینچ لائے۔ اس بندرگاہ کا ساحل بہت اچھا اور آسان تھا، جہاں دو سو سے تین سو ٹن تک کے سمندری جہاز جو اس وقت بہت بڑے جہاز تصور کئے جاتے تھے تجارتی سامان اتارنے اور چڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔

پرتگالی وقائع نویس انٹیسنولو کا ریو (۱۶۳۱ء) لکھتا ہے کہ "یہ بندرگاہ بہت بڑی تھی، اور اس کی آبادی بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ "گو کہ اس شہر کی ترتیب کچھ اچھی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس کی آبادی بہت بڑی تھی اور ضرورت کی تمام اشیاء وافر مقدار میں موجود رہتی تھیں، اورنگزیب عالمگیر کے ایک ملازم نے "خلاصۃ التواریخ" میں لکھا ہے "لاہری سندھ کی بڑی بندرگاہ ہے، موتیوں اور دوسری اشیاء کے لئے یہ شہر مشہور ہے اس بندرگاہ پر تقریباً چار ہزار جہاز ایک ہی

وقت میں لنگر انداز ہو سکتے ہیں۔

سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دریائے سندھ میں مٹی بھر جانے کی وجہ سے اس بندرگاہ میں جہازوں کی آمد و رفت مشکل ہوگئی اور سندھ کا یہ ایک اور خوشحال شہر اجڑ کر ویران ہوگیا اور اس شہر اور بندرگاہ کی تجارت بالکل ختم ہوگئی۔

سندھ کے یہ حالات شاہ صاحب کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے کے ہیں اور شاہ صاحب کی ابتدائی زندگی میں سندھ کی اقتصادی صورت حال آہستہ آہستہ اور بھی تباہ برباد ہوتی چلی گئی اور جب شاہ صاحب اپنے جوانی کے عہد میں سیاحت کے لئے چلے تو انہیں سندھ کے ان علاقوں کے ماضی کا پوری طرح علم تھا اور اس کی روشنی میں جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ جگہیں دیکھیں جہاں پہلے سنار سونے کے نفیس کام کرتے تھے۔ اور اب ان مقامات پر لوہار کوٹتے نظر آئے تو ان کی حساس طبیعت بہت زیادہ متاثر ہوئی ہوگی۔

ان حالات کے علاوہ اگر ہم شاہ صاحب کے دور کے سیاسی حالات کا جائزہ لیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا، ۱۷۰۱ سے ۱۷۳۹ تک کا دور سندھ کی تاریخ کا ایک عجیب طوائف الملوکی کا دور تھا۔ اس دور میں میاں یار محمد کلہوڑا نے مغل حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خودمختاری کا اعلان کیا تھا، لیکن اس کا پورا وقت جنگوں میں گزرا ان کے بعد ان کا بیٹا میاں نور محمد بھی ایسے ہی حالات سے دوچار رہا جس میں داؤد پوتوں اور قلات کے بروہیوں سے جنگیں قابل ذکر ہیں۔ ۱۷۳۹ء تک سندھ کا یہ ایسا دور جس میں مسلسل جنگیں رہیں نتیجتاً حکمران ملک کے انتظام کو احسن طور پر چلا نہ سکے۔ ان حالات کے اثرات، اقتصادی اور سماجی لحاظ سے سندھ کے عام لوگوں پر براہ راست پڑے اور وہ بھی کسی نہ کسی طور پر تباہ ہوگئے۔ اس کے فوراً بعد نادر شاہ نے سندھ پر حملہ کر دیا اور حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ نادر شاہ کا حملہ سندھ پر ایک عذاب کی طرح آیا اور پورے سندھ کو تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ سندھ پہلے ہی اقتصادی لحاظ سے تباہ ہو چکا تھا، بقیہ کسر اس حملے نے پوری کر دی۔ نادر شاہ کروڑ ہا روپے خراج کے طور پر لے کر چلا گیا۔

اس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو سندھ اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے بد حال ہو چکا تھا۔ اس کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ عوام اور خواص بھوکوں مرنے لگے۔ بڑے بڑے تجارتی شہر تباہ و برباد ہوگئے شرافت اور انسانیت مفقود ہو چکی تھی۔ ذہین لوگ اس علاقے سے ہجرت کرکے دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ بیروزگاری اور بھوک لوگوں پر مسلط ہو چکی تھی امن و امان اور سلامتی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ایسے دور میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی جو حقیقتوں کے ترجمان تھے اپنے ماحول اور دور کے راوی تھے کس طرح ممکن تھا کہ وطن دوست شاعر کا دل ان حالات کو دیکھ کر پریشان نہ ہوا ہو، شاہ صاحب جذبۂ حب الوطنی سے سرشار اور مشاہدہ نگار شاعر تھے۔ لیکن چونکہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے انہوں نے ان حالات کو واضح طور پر بیان نہیں کیا، بلکہ ان کو علامتوں کی صورت میں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے ابھی تک شاہ صاحب کی فکر کے اس پہلو پر سوچا ہی نہیں ہے۔ اب یہ وقت کی ضرورت ہے کہ ہم شاہ لطیف کی فکر کا جائزہ سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی دیکھ لیں۔ تاکہ علم ہو سکے ایک اتنا عظیم المرتبت شاعر کس

طرح سے اپنے ماحول اور حالات سے متاثر ہوتا ہے، اور وہ ان حکم کے احساسات کو کس طرح شاعری کے ذریعہ عام لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کرتا ہے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کو ٹھٹھہ سے عملی طور پر لگاؤ تھا۔ علامہ مخدوم محمد معین ٹھٹوی جیسے پایہ کے عالم آپ کے دوست تھے، ان سے آپ کی خط و کتابت تھی اور شاہ صاحب ان سے ملاقات کے لئے اکثر و بیشتر ٹھٹھے جاتے تھے اور مخدوم معین نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ شاہ لطیف پڑھائیں گے۔ شاہ لطیف نے علامہ محمد معین کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ آج کے بعد ہم پر ٹھٹھہ کے دروازے بند ہو گئے اس کے بعد شاہ صاحب پھر کبھی ٹھٹھہ نہیں گئے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ نے اپنے کلام میں جس چیز کا ذکر کیا اس کا مشاہدہ ضرور کیا اور پھر اس محبت والے شہر ٹھٹھہ اور اس کی عظمت رفتہ سے کس طور غافل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ شاہ لطیف کے پایہ کا شاعر اپنے دور اور ماضی قریب کے حقائق کو نظر انداز کر سکے۔ لہذا اپنے اس دور کو شاہ نے سرسری راگ اور سرسامونڈی اپنے شاعرانہ پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اس ضمن میں سرسامونڈی سے شاہ صاحب کا ایک بیت پیش کرونگا کہ

نڱو چڙ نا تاريون، پڳهه ڪِٽي پنڌ پيا
بندر بانا ٿيون، سيحا سامونڊين وري

یعنی کہ وہ سوداگر اپنی کشتیاں لے کر، بادبان کھول کر چلے گئے ہیں ان کے سوا یہ بازار اور بندرگاہیں سونی ہو گئی ہیں۔

اور سری راگ میں کہتے ہیں کہ

دنيا سي ڏينهار، هيرو لعل وڻندين جي
تيئن سڌا ليو ٿيان، سيجي لهي نه سار
ڪُٿين ڪُتَ لهار، هاٿي انهين پيٽين

وہ موتی اور ہیرے بنانے والے کاریگر چلے گئے۔ ان کے بعد آنے والوں کو تو پیسے کا بھی علم نہیں۔ اب ان مقامات پر لوہار کوٹتے رہتے ہیں۔

ترجمہ: الیاس عشقی

# ابیات لطیف

اوّل خدا علیم، اعلیٰ عالم کا ولی
قادر اپنی قدرت سے قائم خود ہے قدیم
مالک مولیٰ لاشریک، رب رحمٰن رحیم
کرکے کرم کریم نے، پیدا کیا جہان کو
پیدا کیا جہان کو، جس لیے جس آن
مالک محمد کو کیا، جس کی اعلیٰ شان
کلمہ دل میں کریم کا، ظاہر کرے زبان
انا مولاک وانت محبوبی، اسکا نام نشان
دونوں ایک سمان، محب محبوب سید کہے
پیدا کیا جہان کو، عالم ہزدہ ہزار
حامی ہادی ہاشمی، سرور اور سردار
وہ صحبت سرکار کی، وہ اصحاب کبار
چیدہ چاروں یار، ملے حرم میں حبیب سے
وحدہٗ لاشریک لہٗ ہردم لب پر آئے
سنت واجب فرض کچھ، قضا نہ ہونے پائے

توبہ کی تسبیح پڑھ جو دل کا روگ مٹائے
خالی اس کی یاد سے کوئی سانس نہ جائے
دل والو! محبوب کو، دل میں رکھو بسائے
چاہے جی کو جلائے، دوزخ جیسی آگ بھی
وحدہٗ لاشریک لہٗ جس نے کیا اظہار
اسکو مقام محمدی کی منزل نہیں دشوار
سر کی نذر گزار، جھکا نہ آگے غیر کے
وحدہٗ لاشریک لہٗ انس وجن کا کلام
دل سے مقام محمدی، فاصلہ یک گام
ساحل ہے الزام، دل دریا میں ڈوب جا
وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے جس کا ایمان
حرف مقام محمدی، اسکے قلب ولسان
حق کا ہے فرمان، دل کا دریا پار کر
بس ان کی خوراک، عاشق خوشی میں زہر سے
سخت ان کا محبوب ہے، قاتل اور سفاک

ایسوں کو لطیف کیا، سوزِ ہجر نے خاک
دل ہیں ان کے خاک، لب پر لیکن آہ نہیں
پیارے ضبطِ عشق کی سکھ آوے سے آن
چاہے جلے جان، باہر آنچ نہ نکلے
دشتِ وفا سنسان ہے، اہلِ طلب حیران
ایک کو دیکھے بن بورہ ہے اصل نادان
کس کو ہے عرفان، زہد، نہ کثرت نہیں
گونج اور آواز ایک ہے اصل درد پہ ھیں

جو پائے یہ راز، اس کو عارف جانیے
ایک قصر در سینکڑوں دریچے ہزار
دلبر کا دیدار، ہر ہر پل ہر ہر گھڑی
آ بس مجھ پنڈ پیارے آنکھوں میں مری
کروں آنکھیں بند میں دیکھوں نہ دیکھے کوئی
برسیں ساری رات، بادل چھائیں صبح سے
دل میں دلہن کی آنکھوں میں برسات،
کب ہو گی پر برسات، جھڑی نہ پل بھر کو رکے
گھٹا گھری گھنگھور، جل تھل ہونگے ایک سے

ایک سماں برسات کا ہوگا چاروں اور
بادل استنبول سے اٹھے ہیں کرتے شور
تڑپی بجلی چین پر، سمرقند چمکار
گھٹا چلی ہے روم سے کابل اور قندھار
چھائی دلی دکھن پر، پہنچا آگر نار...
جیسلمیر پر برس کر بیکانیر کیا پار
کچھ بھج پر آکر ہوئی بارش کی بھرمار
ڈھٹ سے عمر کوٹ تک ہوا موسلا دھار
کرم سدا کر سندھ پر بڑی تری سرکار
جگ کے پالن ہار، کر آباد سنسار
ناقہ نلکے والے دشمن دیوریس کی کہاں

بیری بن کی تیز ہوا ہے مٹے قدم کے نشان
سورج پانی ڈوب گیا ہے، ہے تاریک جہاں
راہ میں بیری جیل کھڑا ہے کیسے ملے امان
چاند اندھیری رات میں گم ہے بچ نہیں سکتی جان
رو رو ہوئی ہلکان، بن میں ساری پریت کی
تو حاتم داتا رہے میں مسکین محتاج
بگڑے مرے کاج، میں فولاد پارس ہے تو
چھو کر مجھ کو آج، سونے میں تبدیل کر
تھا وہ سماں بھی خوب، مجھ کو ندی میں ڈال کر

ساحل سے محبوب بولا، دامن تر نہ ہو
زخمی ہو نا ملے کرے کٹ کر کرے پکار
اپنوں سے بچھڑے تو وہ روئے زار قطار

ہو گا وہی طبیب میرے دل کے درد کا
چارہ سوز ہجر کا ہے دیدارِ حبیب
ہو گا وہی طبیب میرے دل کے درد کا
دکھیا رے وہ آ ملے ایسے کہاں نصیب
ہو گا وہی طبیب میرے دل کے درد کا
ماری درد فراق کی جلتی رہے غریب
ہو گا وہی طبیب میرے دل کے درد کا
حاذق حکیم لطیف کہے کب ہو دل سے قریب
ہو گا وہی طبیب میرے دل کے درد کا

مجھے غم نے کیا دلگیر الا
میرا بچھڑا ملک ملیر الا
ہوئی خاک پہ دامن گیر الا
کہاں مارو کہاں ملیر الا
ہوئی کیسی بلا میں اسیر الا
مرے پاؤں پڑی زنجیر الا
مجھے غم نے کیا دلگیر الا
میرا بچھڑا ملک ملیر الا
میری آہ میں آئے کہاں سے تاثیر
مجھے ماروں کی ملے کیسے خبر
مجھے دھیان انہیں کا ہے شام وسحر
ہوئی قید میری تقدیر الا

مجھے غم نے کیا دلگیر الا
میرا بچھڑا ملک ملیر الا
ذکر اتنا عمر مجبور مجھے
تیرے عیش نہیں منظور مجھے
ان محلوں سے کر دور مجھے
کوئی ہو تو بنا تقصیر الا
مجھے غم نے کیا دلگیر الا
میرا بچھڑا ملک امیر الا
مجھے قید میں آئی ہے لیکے قضا
جو نہ اپنوں کو آیا خیال مرا
جو ملیر کی سمت سے آئی ہوا
لگی دل پہ میرے جوں تیر الا
مجھے غم نے کیا دلگیر الا
میرا بچھڑا ملک امیر الا
رہے تجھ کو مبارک راج محل
میرے دل کو عمر اک پل نہیں کل
کوئی نیکی کریگا تو پائے گا پھل
ملیں مارو وہ کر تدبیر الا
مجھے غم نے کیا دلگیر الا
میرا بچھڑا ملک ملیر الا
تیرے شکر میں عمر بتا دوں گی
سہے غم جو یہاں وہ بھلا دونگی

مجھے چھوڑ دینا تو دعا دوں گی
وہ دعا جو ہو پُر تاثیر الا
مجھے غم نے کیا دلگیر الا
میرا بچھڑا ملک ملیر الا

کون بتائے پیچ پنہوں کا دیس ہے کتنی دور
الا میاں! پیچ ہے کتنی دور
ناقہ ملتے والے دشمن، بیری ریگستان
قدم قدم پر خطرہ لاحق اور اکیلی جان
کیسے ہو مجھ دکھیاری سے کوہستان عبور
کون بتائے پیچ پنہوں کا دیس ہے کتنی دور
الا میاں! پیچ ہے کتنی دور
دل کی دولت سو کے گنوائی کس کو دوں الزام
جانے ان آنکھوں پر رہیگی کب تک نیند حرام
کیا کیا باتیں سوچ کے اب دل ہوتا ہے رنجور
کون بتائے پیچ پنہوں کا دیس ہے کتنی دور
الا میاں! پیچ ہے کتنی دور
دل کی دنیا سونی سونی، اجڑا دیس بھنبھور
اب نہ ٹھکانہ کوئی کسی کا اور نہ کوئی ٹھور
جنم کی سکھیاں بچھڑ رہی ہیں دل سے ہوں مجبور
کون بتائے پیچ پنہوں کا دیس ہے کتنی دور
الا میاں! پیچ ہے کتنی دور

بس چلتا تو جا کے بجھاتی ان آنکھوں کی پیاس
ہوتے پنہوں تو پوری ہوتی، پیا ملن کی آس
اب تو ہوں تقدیر کے ہاتھوں بے بس اور معذور
کون بتائے پیچ پنہوں کا دیس ہے کتنی دور
الا میاں! پیچ ہے کتنی دور

---



مُدیر : حسین کاظمی

NOCNo MP / DCB (D) / 1383 / ADV / 1010 / 89 DT 26 2 / 1989.

امیر چیمبر
امیر سینٹر اور ریاض چیمبر
کی کامیاب تکمیل کے بعد

اب

# امیر کمپلیکس

SB-1 بلاک 10-A راشد منہاس روڈ گلشن اقبال کراچی




بکنگ
15000/-
سے
25000/-
روپے

مستقبل
کے کاروبار کے لئے
وسیع شورومز
بمعہ اٹیچڈ باتھ

● ۲ بیڈ رومز بمعہ اٹیچڈ ٹائیلڈ باتھ ● ڈرائنگ/ڈائننگ
● ٹی وی لاؤنج ● کشادہ امریکن کچن
● ٹھنڈے و گرم پانی کی لائنیں۔

● ۱۸ ماہ میں قبضہ کی گارنٹی ● آسان اقساط ● قرضہ کی سہولت

جمعہ کو دفتر کھلا رہے گا۔ بکنگ سائٹ آفس پر ہوگی۔



## لائیڈز انٹرپرائزز

امیر سینٹر SB-32 سیکٹر 11-ایچ - نارتھ کراچی ٹاؤن شپ
فون: 654725-471284

# روفی ہائٹس

ایف ایل ۳ بلاک ۱۷ گلستان جوھر

رہائش ۳ بیڈ رومز، ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج
اٹیچڈ باتھ، ٹیرس اور کچن

تمام دیگر سہولتوں سے آراستہ

روفی بلڈرز۔ سائٹ آفس

ایف ایل ۳ - بلاک ۱۷ گلستان جوھر کراچی

گلشنِ اقبال میں ۲۰۰ فٹ چوڑی سڑک پر
۴ کمروں کے فلیٹوں کا ایک پُروقار رہائشی منصوبہ

---

# گڈارتھ کورٹ

کے نام سے پیش کرتے ہیں

مزید تفصیلات کے لیے فون نمبر ۴۶۷۰۷۳
پر رُجوع کریں

بکنگ سائٹ اور آفس میں ہوگی

---

گڈارتھ (پرائیویٹ) لمیٹڈ اے-۲ اسلامک پلازہ نمبر ۲

ایس بی ۲ - بلاک نمبر ۱۳ - بی - یونیورسٹی روڈ - گلشنِ اقبال - کراچی

آپ کی اپنی طرزِ رہائش

آپ کی اپنی ضروریات کے مُطابق آسائش

مین یونیورسٹی روڈ پر، سوک سنٹر سے کچھ آگے اُردو کالج کے سامنے

۹۰۰ سے ۹۵۰ مربع فٹ پر مشتمل

چار کمروں کا لگژری فلیٹ

# داتا اپارٹمنٹس فیز

بکنگ ۱۵۰۰۰ روپے سے ۲۰۰۰۰ روپے کل قیمت ۱۹۰۰۰۰ روپے

قرضے کی سہولت ۷۰۰۰۰ روپے

میسرز ماڈرا سٹون بلڈرز۔ اے ۲/۱ فرسٹ فلور

فائیو اسٹار پلازہ بلاک ۱۳۔ سی گلشنِ اقبال۔ کراچی



اپنی جہاز راں کمپنی

# پی این ایس سی

کے

# جہاز

سے مال بھیجئے

## بروقت - محفوظ - باکفایت



پی-این-ایس-سی براعظموں کو ملاتی ہے۔ عالمی منڈیوں کو آپ کے قریب لے آتی ہے۔ آپ کے مال کی بروقت، محفوظ اور باکفایت ترسیل برآمدکنندگان اور درآمدکنندگان، دونوں کے لیے نئے مواقع فراہم کرتی ہے۔

پی۔این۔ایس۔سی قومی پرچم بردار۔ پیشہ ورانہ مہارت کا حامل جہاز راں ادارہ، ساتوں سمندروں میں رواں دواں

**قومی پرچم بردار جہاز راں ادارے کے ذریعہ مال کی ترسیل کیجئے**




**پاکستان نیشنل**
**شپنگ کارپوریشن**
قومی پرچم بردار جہاز راں ادارہ

# A LIVING SCULPTURE

## The Great Break through in Housing

**STAR STUDDED PROJECT WITH 5 DISTINCTIONS**

Habib Estates **pioneer 5-Star Super Luxury Apartments**

**Model Flat ready for inspection** Habib Centre

**Plot: 5, Block: 5, Scheme: 5, Kahkashan, Clifton.**

Down Payment Rs. 40,000/-

NO OTHER PROJECT DARE OFFERS
SO MANY FACILITIES

A morvel Structure—A Living Sculpture
Work in Progress

***LOAN FACILITY Rs. 1,20,000/- *EASY INSTALMENT**
***NO ESCALATION *ON TIME POSSESSION**

*For detail and booking, turn to :*

Habib Estates

SITE OFFICE : F-L-5, Block No 5, Kahkashan,
Scheme No. 5, Clifton, Karachi—Phone: 534764

**Do visit our site. Site office will remain open on Friday.**

سنجیدہ اور فکری ادب کا نمائندہ




کراچی

جلد: ۲ ——— مشترکہ شمارہ ۸، ۹
سالنامہ
فروری ۔ مارچ ۱۹۸۹ء

چیئرمین ریڈرز پبلیکیشنز ——— **عبداللہ دادابھائی**

مدیر ——— **حسنین کاظمی**

مدیر معاون اعزازی ——— ممتاز مرزا
معاون اعزازی ——— مشرف احمد

| | |
|---|---|
| سالنامہ | ۳۵/- روپے |
| سالانہ | ۱۱۰ روپے |
| ششماہی | ۵۵ روپے |
| بیرون ملک | سالانہ ۲۵ پونڈ یا ۴۰ ڈالر |

**پتہ:** ماہنامہ "دائرے" شاہین چیمبرز ۴ ۔ کمرشل ایریا
بلاک ۷، ۸ کے ۔ سی ۔ ایچ ۔ ایس ۔ کراچی ۔ ٹیلیفون نمبر ۴۲۲۵۸۰

پرنٹر وسیم احمد صابری نے شیخ سلطان ٹرسٹ پریس ۲۵ سول لائنز ۔ ا بیومنٹ سے چھپوایا
اور سید محمد فضل پبلشر نے ریڈرز پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی کی جانب سے شائع کیا۔

علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قومی زندگی کے جس مرحلے پر ہم آج پہنچے ہیں یہ نازک بھی ہے اور اُمید افزا بھی۔ اس وقت اہلِ علم، اہل فکر اور اہل قلم پر بڑی ذمہ داریاں ہیں اور ہمیں پوری توقع ہے کہ یہ ذمہ داریاں بطریقِ احسن پوری ہوں گی

دادابھائی فاؤنڈیشن۔ ماہنامہ دائرے کے اشتراک کے ساتھ

# شمارہ نما

افسانے



گوشہ غالب



شخصیات



طنز و مزاح



منظوم سفر نامہ



گفتگو



ایک کتاب ایک مبصر



صوفیائے سندھ



بیاد شیدا جبلپوری

# پہلی کرن

پاکستان جس صورت میں قائم ہوا تھا۔ اسی صورت اگر مستحکم ہوتا چلا جاتا تو عالم اسلام کے اتحاد کی منزل قریب تر آجاتی اور اس کے مسائل حل ہوتے چلے جاتے۔ اب بھی پاکستان کے استحکام سے عالم اسلام کو بڑی تقویت حاصل ہوگی لیکن ہمیں یہ حقیقت کسی صورت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ قومی بداعمالیاں بالآخر اپنے بد نتائج دکھا کر رہتی ہیں۔ اور یہ بھی کہ عالم انسانیت کی ہدایت کی حیثیت سے اسلام اپنے استحکام کے لئے ہمارا یعنی ہم پاکستان کے رہنے والوں کا محتاج نہیں ہے وہ تو انسان کی دینی اور دنیوی زندگی کی فلاح کا ضامن نظام فکر و عمل ہے جو قوم جس حد تک اس سے متصل رہے گی فائدے میں رہے گی اسے نظر انداز کرے گی خسارہ اٹھائے گی

خواجہ الطاف حسین حالی نے سو سال پہلے اپنے مسدس میں کہا تھا۔ ع

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے
پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے!
کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خنداں زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو
کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو
نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

ہمیں سوچنا ہے کہ حالیؔ کے دردمند دل سے نکلی ہوئی اس صدا میں آج بھی ہمارے لئے غور و فکر کا کوئی سامان موجود ہے یا نہیں ؟

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دین میں فکری اجتہاد کا ایک راستہ روشن کیا تھا اور غلامی کے باوجود برصغیر میں مسلمانوں کی فکری اور عملی قیادت اس روشنی سے پوری طرح مستفیض ہوئی وہی روشنی تحریک پاکستان کا سبب بنی ۔ دورِ غلامی میں برصغیر کے مسلمانوں کو جیسی مخلصانہ فکری اور عملی قیادت میسر آئی اس نے قوم کو نئی زندگی سے روشناس کیا۔ خود شناسی کا یہی جذبہ تھا کہ قوم اپنی حقیقی آزادی کے مفہوم سے آشنا ہوئی اور اسی کی طلبگار بھی بنی ۔ اور اس سیل رواں کو کوئی قوت نہ روک سکی ۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے آزادی کی راہ پر پہلا قدم بڑے حوصلے کے ساتھ رکھا تھا ۔ لیکن پھر ہم قومی اعتبار سے فانی کے اس شعر کی زندہ تصویر بن گئے ؎

گم کردہ راہ ہوں قدم اولیں کے بعد　　　پھر راہ بر مجھے نہ ملا راہبر کو میں

جس قوم کی قیادت "بلند نگاہ" "دلنواز سخن" اور "پرسوز جاں" کے رختِ سفر سے محروم ہو جاتی ہے اس کا یہی حشر ہوتا ہے جو پاکستان میں ہمارا ہوا ۔ ہم جس فکری انتشار کا شکار ہو کر اپنی موجودہ حالت تک پہنچ گئے ہیں اس میں ہمارے قائدین کے لئے "تفکر" اور "تدبر" کا بڑا سامان موجود ہے اور یہ ان کی قائدانہ صلاحیت کے لئے ایک چیلنج بھی ہے ۔ جو بھی اس چیلنج کا کامیابی سے مقابلہ کر کے قوم کو "ایمان اتحاد اور تنظیم" کا سبق پھر یاد دلا دے گا اس کا شمار پاکستان عالم اسلام اور عالم انسانیت سب کے محسنوں میں ہوگا۔

انسان سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں اس کا احساس بھی ہوتے رہنا چاہیئے بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں احساس کے ساتھ جس کا اعتراف ضروری ہو جاتا ہے ۔ اس ایک برس کے عرصے میں دائرے کی اشاعت کو معتبر بنانے میں اہلِ علم اور اہل قلم نے مجھ پر بڑی عنایتیں کی ہیں اور میں تمام کرم فرماؤں کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں لیکن اس سلسلے میں مجھ سے بعض بڑی کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں جن کا برملا اعتراف اور ان پر اظہار ندامت ضروری ہے ۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ماہنامہ دائرے کی اشاعت کے سلسلے میں پہلی اطلاع تو ایک عمومی مراسلے کی صورت ہی میں دی گئی تھی لیکن اس کے بعد ضروری تھا کہ میں تمام کرم فرماؤں کو ذاتی خطوط بھی تحریر کرتا، ایسا نہ ہوا ۔ یہ پہلی غلطی تھی اس کے علاوہ جن کرم فرماؤں نے اپنی تخلیقات سے نوازا ان کا فوراً تحریری شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا ۔ اس سلسلے میں بھی اکثر کوتاہی ہوئی ۔

اس سلسلے میں محترم ذاکر علی خان نے ایک مضمون اپنے خاص طنزیہ اور مزاحیہ انداز کا عنایت فرمایا تھا ۔ وہ مجھ سے کہیں کھو گیا اور میں نے اس پر ذاکر بھائی سے معذرت بھی نہ کی ۔ گویا دوسری معذرت واجب ہو گئی ۔

جناب نعیم صدیقی مدیر اعلیٰ سیارہ نے نظم و نثر دونوں تخلیقات سے نوازا لیکن نہ ان کا شکریہ ادا کر سکا نہ "آپ بیتی"

کی اشاعت میں تاخیر کی اطلاع دے سکا۔

محترم محشر بدایونی نے از راہ کرم اطلاع دیدی کہ ان کے خود نوشت حالات زندگی تیار ہیں اور میں نے اسے منگوانے کا معقول انتظام نہ کیا۔

بعض کرم فرما ایسے ہیں جن کی خدمت میں تحریر کے وسیلے سے ہی مجھے برابر حاضری دینی ضروری تھی لیکن یہ نہ ہوسکا۔

بعض کرم فرماؤں کے مضامین یا دیگر تخلیقات کی وصولیابی کی اطلاع بھی غالباً ان تک نہ پہنچ سکی۔

ان تمام کوتاہیوں کے باوجود میرے کرم فرما بہرحال کرم کرتے ہیں یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ میں اپنے تمام محبت کرنیوالوں سے اپنی تمام کوتاہیوں پر معافی کا خواستگار ہوں۔ اللہ توفیق بخشے کہ ان غلطیوں پر قابو پاسکوں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے سالنامے میں "ترکی ادب" کا ایک گوشہ شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس سلسلے میں اپنی عدم الفرصتی کے باوصف محترم کوثر بشیر احمد صاحب نے بھرپور تعاون کیا تھا، جس کے لئے ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔

موصولہ تراجم کو دیکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا کہ سالنامے میں صرف ایک گوشہ دینے کے بجائے دائرے کا ایک خصوصی شمارہ "ترکی ادب" کے لئے مخصوص کردیا جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم بہت جلد اس موضوع پر ایک خصوصی شمارہ پیش کریں گے۔

گذشتہ دنوں میں ہم چند نہایت بلند مرتبہ علمی اور ادبی شخصیتوں سے محروم ہو گئے۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی پاکستان ہی کے نہیں عالم اسلام کے نہایت معتبر اور محترم علماء میں شامل تھے۔ دینی مسائل پر نہایت صائب رائے رکھتے تھے۔ عالم بھی تھے اور علم کے قدرداں بھی۔ ان کی گفتگو بصیرت میں اضافے اور قلب میں کشادگی کا باعث ہوتی تھی۔

جناب صادق الخیری نہایت وضعدار انسان اور اعلیٰ رتبے کے ادب شناس تھے۔ انھوں نے زندگی کی دیگر مصروفیات کے ساتھ اپنے والد محترم علامہ راشد الخیری کی ادبی روایات کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں، آپ بیتی میں اور دیگر تحریروں میں نہایت علم و بردباری کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم کی۔

جناب شیر افضل جعفری پاکستان کے صف اوّل کے شعراء میں شامل تھے زندگی کی بہت سی آزمائشوں سے گزرے اور اپنی شاعری کو بھی پروان چڑھاتے رہے۔ نظم، غزل، حمد و نعت اور نثر پارے، انھوں نے اُردو زبان کو بہت کچھ دیا۔

ان بزرگوں کی یاد میں گوشے اشاعت کے لئے تیار ہیں۔ بعض مجبوریوں کی بناء پر یہ گوشے سالنامے میں شائع نہیں ہوسکے۔ آئندہ عام شماروں میں شامل ہوں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

حسنین کاظمی

# الہمزہ

بنام اللہ جو بڑا مہربان بھی ہے رحیم بھی ہے

تباہی اس شخص کے لئے ہے جو طعنہ زن اور عیب جو، ہے
جسے زر و مال جمع کرنے کی، گن کے رکھنے کی آرزو، ہے

جو یہ سمجھتا ہے یہ زر و مال تا ابد اُس کا ساتھ دے گا
یقیناً ایسا نہیں ہے، وہ شخص قعرِ دوزخ میں جا گرے گا

تمہیں خبر کیا کہ یہ کچل دینے والی نارِ شدید کیا ہے؟
رسائی اُس کی قلوب تک ہے، یہ آگ اللہ کی سزا ہے

تنورِ دوزخ میں جھونک کر بند کر دیئے جائیں گے یہ "عاصی"
بلند و بالا حصارِ آتش سے پھر نہ ہو گی گلو خلاصی!

جوہر سعیدی

# رحمت اللعالمین فرما گئے

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ کَفَّارَۃِ الْغِیْبَۃِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَہٗ تَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَہٗ

(رَوَاہُ الْبَیْہَقِی)

ترجمہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس کے لئے استغفار کرے اور کہے کہ اے اللہ ہمیں اور اُسے بخش دے۔

رحمتُ اللّعٰلمینؐ فرما گئے

(مفہوم حدیث)

جرم غیبت کا ہے کفارہ یہی
آدمی اللہ سے ڈرتا رہے
میری، اُس کی مغفرت فرمائیو
رات دن بس یہ دعا کرتا رہے

بے ضمیری، بُغض، نفرت اور غرور
ایک غیبت کے ہیں یہ سارے فتور

ارتکابِ جرمِ غیبت سے بچا
اپنے بندے کو اے ربِّ غفور

جو بنا لیتا ہے غیبت کو شعار
رحمتیں رہتی ہیں اُس سے دور دور

گوشت کھاتا ہے یہ مردہ بھائی کا
کاش ہو انسان کو اس کا شعور

ڈال دیتی ہے دلوں میں وسوسے
چھین لیتی ہے حسیں چہروں کا نور

ابنِ آدم کو یہ رکھتی ہے سدا
ناشناسِ لذّتِ غیب و حضور

اس کی گویائی سے زندہ ہیں فساد
اس کی خاموشی میں ہے شورِ نشور

بند کرتی ہے کھلے ذہنوں کے در
اپنے ہی نشہ میں یہ رکھتی ہے چور

جانتے ہیں اہلِ دل، اہلِ نظر
ہے نفی اخلاص کی اس کا ظہور

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی
اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ التَّاجِرُ
الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ
وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ
(رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ)

**ترجمہ**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
سچا اور امانت دار تاجر، نبیوں، صدیقوں اور
شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

(ترمذی، دارمی)

رحمۃ للعالمین فرما گئے

(مفہومِ حدیث)

اک امانت دار تاجر روزِ حشر
ہوگا نبیوں اور صدیقوں کے ساتھ

ہے تجارت سنتِ پیغمبراں
ہے تجارت سنگِ بنیادِ جہاں

رکھ تجارت کو دل و جاں سے عزیز
سود میں اِس کے نہ کر شامل زیاں

مکر و فن جس کی تجارت میں نہ ہو
اُس کو کہہ سکتے ہو تم جنت نشاں

ہر وہ تاجر جو امانت دار ہے
اُس کی عظمت کا نہیں ممکن بیاں

جھوٹ سے جس نے نہ بیچا اپنا مال
نور برساتا ہے اُس پر آسماں

جس نے ہنس کر گاہکوں سے بات کی
جھوٹ سے ڈرتی رہی جس کی زباں

پوچھنا کیا ایسے تاجر کے نصیب
دین پر ہوں جس کی دُنیاداریاں

وہ نظر آئے گا صدیقوں کے ساتھ
یا شہیدانِ وفا کے درمیاں

یا چلے گا انبیاءؑ کے ساتھ ساتھ
جب دِلوں سے اُٹھ رہا ہوگا دھواں

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَأَلْتُ
النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ
الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى
قَالَ الصَّلٰوةُ لِوَقْتِهَا
(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے
نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ کو
کون سا عمل زیادہ محبوب ہے، آپ نے فرمایا وقت مقررہ
پر نماز ادا کرنا

(متفق علیہ)

رحمت اللعالمین فرما گئے
(مفہوم حدیث)

وقت پر جس نے نمازیں کیں ادا
ہو گیا محبوب، وہ اللہ کا

شوق کو انداز دیتی ہے نماز
عشق کو پرواز دیتی ہے نماز

ہر نفس کرتا ہے اعلانِ وفا
کیا حسیں آغاز دیتی ہے نماز

جب دمک اٹھتی ہے روحِ بندگی
بندگی کو ناز دیتی ہے نماز

دیدنی ہوتا ہے رقصِ آرزو
روح کو جب ساز دیتی ہے نماز

آدمی انسان آتا ہے نظر
یہ بڑا اعزاز دیتی ہے نماز

آدمی کو ہر محاذِ جنگ پر
محرمانِ راز دیتی ہے نماز

بدعتوں کی توڑ دیتی ہے کمر
فرض کو آواز دیتی ہے نماز

بابِ گلزارِ قناعت کھول کر
درسِ ترکِ آز دیتی ہے نماز

ذکر کی مستی کو کرتی ہے امر
فکر کو اعجاز دیتی ہے نماز

وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ
یُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ
(رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ)

ترجمہ

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ فحش کلامی کرنے والے سے ناراض ہوتا ہے

(ابوداؤد)

رحمۃ اللعالمین فرما گئے

(مفہوم حدیث)

فحش گوئی کو بنالے جو شعار
ایسے بندے سے خفا ہوتا ہے رب

ترشروئی، تند خوئی سے بچو
خوش کلامو! بد کلامی سے بچو

نرم گفتاری بڑا اعزاز ہے
بے محل، شعلہ بیانی سے بچو

سادگی سے جیتتے ہیں دل تمہیں
تم لب و لہجہ کی شاہی سے بچو

تر زبانِ شوق رکھو، ذکر سے
فصلِ جاں کی خشک سالی سے بچو

جس کی باتوں سے جھلکتا ہو غرور
ایسے مرشد! ایسے ساتھی سے بچو

ہے لب و لہجہ ہی لفظوں کا حجاب
اپنی صوتی بے حجابی سے بچو

گفتگو میں تمکنت اچھی نہیں
ہوش مندو! اس خرابی سے بچو

اپنے لہجوں سے نہ چھینو سادگی
اپنے لفظوں پر سواری سے بچو

جھول، دامانِ بیاں میں آ نہ جائے
نطق کی بے احتیاطی سے بچو

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْہِمْ
صَدَقَۃً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِہِمْ
فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِہِمْ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

## ترجمہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ
فرض کی گئی ہے جو مالداروں سے لیکر غریبوں میں
تقسیم کی جائے گی

(متفق علیہ)

رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ فرما گئے

(مفہومِ حدیث)

اہلِ سرمایہ سے لی جاتے زکوٰۃ
اور محتاجوں کو دی جاتے زکوٰۃ

سرفرازی کی ضمانت ہے زکوٰۃ
مال کی اپنے حفاظت ہے زکوٰۃ

اہلِ سرمایہ سے لی جاتی ہے یہ
خیر کی واضح علامت ہے زکوٰۃ

اور ناداروں کو دی جاتی ہے یہ
پردہ دارِ شرمِ غربت ہے زکوٰۃ

حق ہے زرداروں پہ ناداروں کا یہ
اور اس حق کی وضاحت ہے زکوٰۃ

اس کا منکر، منکرِ اسلام ہے
ایک رُکنِ دینِ فطرت ہے زکوٰۃ

ایسے سر میں کیا ہو سودائے ہوس
جس کی دستارِ فضیلت ہے زکوٰۃ

مومنوں کی رات کی رعنائی ہے یہ
خاورِ صبحِ سعادت ہے زکوٰۃ

جن سے ڈرتی ہے محبت مال کی
ایسے جذبوں سے عبادت ہے زکوٰۃ

کھود دیتی ہے جڑیں افلاس کی
احترامِ آدمیت ہے زکوٰۃ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَرَادَ الْحَجَّ فَلْیُعَجِّلْ

(رَوَاہُ اَبُوْ دَاؤُدَ وَالدَّارِمِیُّ)

## ترجمہ

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کا حج کا ارادہ ہو وہ اُس کو پورا کرنے میں عجلت کرے۔

(ابوداؤد، دارمی)

رَحْمَتُ اللِّعٰلَمِیْنَ فرما گئے
(مفہوم حدیث)
جس نے حج کرنے کی نیّت کی اُسے
جلد کرنا چاہیئے عزمِ سفر

ہے سفر معراجِ روحانی کا، حج
ورد ہے آیاتِ قرآنی کا، حج

میزباں جس کا ہے خود ربِّ جلیل
نام ہے اِک ایسی مہمانی کا حج

جاگ اٹھتی ہے معاً روحِ خلیلؑ
حق ادا کرتا ہے قربانی کا، حج

آزمائش سے ہے جس کی ابتدا
نام ہے ایسی ہی آسانی کا، حج

ایک کردیتا ہے جسم و روح کو
نیک جذبوں کی فراوانی کا، حج

ذہن و دل تک وسوسے آنے نہ پائیں
ہو اگر یوں فکرِ انسانی کا حج

آدمی اس طرح لوٹے اپنے گھر
کرکے پورا حکم ربانی کا، حج

جیسے وہ پیدا ہُوا ہے آج ہی
ہے بدل، بختِ سلیمانی کا، حج

دل کی نگری میں جل اُٹھتے ہیں چراغ
نور بن جاتا ہے پیشانی کا، حج

افسر ماہ پوری

# حمد

اَے خدائے لم یزل، اے خالقِ کون و مکاں
اے رفیقِ زیردستاں اے انیسِ بے کساں
یہ مہ و خورشید و انجم، یہ زمین و آسماں
یہ شبِ دیجور کی زلفوں میں اُلجھی کہکشاں
یہ بیابانِ جنوں یہ ریگزارِ بے اماں
یہ چمن اندر چمن، یہ گلستاں در گلستاں
یہ افق تک جا بجا کوہ و کمر کے سلسلے
جن کے سینوں میں دفینے آہن و زر کے نہاں
یہ صفِ اشجار سایہ دار تا حدِّ نظر
جس طرح مامور ہوں راز ازل کے پاسباں
یہ تغیّر موسموں کا، گردشِ ایّام سے
یہ خزاؤں میں بہاریں، یہ بہاروں میں خزاں

رفتہ رفتہ یہ سوادِ شام میں گھلتی شفق
یہ نسیم صبح گاہی تارِ دل پر نغمہ خواں
وادیوں کی گود میں یہ جگمگاتی آبجو
یہ خروشِ موجہ دریا و بحرِ بے کراں
یہ سرِ کہسار ٹکڑے ابر کے اُڑتے ہوئے
یہ طیورِ خوش نوا، سوئے نشیمن پرفشاں
یہ منادر سے صدا ناقوس کی شام و سحر
یہ مساجد سے اُبھرتی سوز میں ڈوبی اذاں
الغرض یہ سارے عالم انفس و آفاق کے
تیری حکمت کے کرشمے تیری قدرت کے نشاں
تو حقیقت ہی حقیقت پردۂ کونین میں
ہم فقط وہم و گماں وہم و گماں، وہم و گماں

ارتضیٰ عزمی

# نعت

تاجِ سرِ پیمبری صلِّ علیٰ محمدٍ
زیبا ہے تجھ کو سروری صلِّ علیٰ محمدٍ

در کی ترے گداگری صلِّ علیٰ محمدٍ
مجھ کو شکوہِ قیصری صلِّ علیٰ محمدٍ

بندۂ ربِ ذوالجلال صاحبِ حسنِ بے مثال
اوجِ کمالِ دلبری صلِّ علیٰ محمدٍ

تیرے نثار دو جہاں تو ہے برائے انس و جاں
آیۂ بندہ پروری صلِّ علیٰ محمدٍ

میں ہوں گدائے بے نوا کون کرے ترے سوا
مجھ کو عطا تونگری صلِّ علیٰ محمدٍ

تو نے جو اک نگاہ کی کفر کے دل میں راہ کی
مٹ گئی اس کی خودسری صلِّ علیٰ محمدٍ

رحمتِ بیکراں سے ہے ابرِ گہر فشاں سے ہے
کشتِ جہاں ہری بھری صلِّ علیٰ محمدٍ

دیکھ کے تیرا نقشِ پا اپنی زباں میں بول اٹھا
آئینۂ سکندری صلِّ علیٰ محمدٍ

تیرے جمالِ ذات سے تیرے کمالِ ذات سے
کس کو مجال ہمسری صلِّ علیٰ محمدٍ

تیری ہی پیروی میں ہے تیری ہی رہبری میں ہے
نوعِ بشر کی بہتری صلِّ علیٰ محمدٍ

عزمیؔ بے نوا کی نعت اس کے خلوص کا ثبات
مایۂ صد سخنوری صلِّ علیٰ محمدٍ

# میری کہانی - میری زبانی

میری زندگی پانچ ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے

1) ابتدائی دور جس میں دو جذبات حاوی رہے۔ شدید احساس کمتری اور فادر ہوسٹیلٹی۔ Father hostility

2) جوانی۔ جب ان دو جذبات میں جنسی جنون شامل ہو گیا

3) مطالعہ۔ عقلیہ اور دانشورانہ دور

4) بیداری اور کایا پلٹ

5) شہابیہ دور

میں 1905 میں بٹالہ میں پیدا ہوا۔ امرتسر سے 24 میل دور پٹھانکوٹ کی جانب۔ ضلع گورداسپور میں بٹالہ ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔

میں ایک ڈرا ہوا سہما ہوا اکیلا بچہ تھا۔ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے میں سخت گھبراہٹ محسوس کرتا تھا۔ میری پیدائش کے فوراً بعد والد صاحب نے دوسری شادی کر لی اور میری ماں اپنے گھر کی نوکرانی بنا دی گئی۔

میرے والد بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ملنسار تھے۔ خوش گفتار تھے قابل تھے۔ مزاج کے رنگیلے تھے۔ طبیعت میں رواداری اور تحمل تھے لیکن مجھ میں باپ دشمنی کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ میں ان سے ساری زندگی برسر پیکار رہا۔ والد میں دو کمزوریاں تھیں عورت اقتدار

میرے والد محکمہ تعلیم پنجاب میں ملازم تھے جہاں بھی ان کا تبادلہ ہوتا تھا ہم ان کے ساتھ جاتے تھے۔ میری ماں بڑی نیک اور بے تعلیم

۱۹۲۵ء میں مینے ڈیرہ غازی خان گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹریکولیشن پاس کیا۔ سکول میں میں ایک نالائق بچہ تھا۔ توجہ تعلیم کی طرف نہ تھی۔ چونکہ ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا اسلئے اساتذہ پاس کر دیا کرتے تھے

پھر مجھے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل کرا دیا گیا

ان دنوں اسلامیہ کالج میں چودھریوں کے لڑکے پڑھا کرتے تھے اونچے لمبے تڑنگے۔ انہوں میں چودھرانہ درشتی تھی۔ وہ دھکا مارتے تو میری جان نکل جاتی۔ جماعت میں جانا بہت مشکل تھا۔ گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ اکثر جماعت سے غیر حاضر رہتا۔ دو سال بعد مجھے ڈیٹین کر لیا گیا چونکہ حاضریاں پوری نہ تھیں۔

ان دنوں والد انبالہ گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہوں نے مجھے انبالہ چھاؤنی میں بنارسی داس بیس میموریل کالج میں داخل کرا دیا گھر میں تیسری والدہ آ چکی تھی چوتھی کی آمد آمد تھی۔ گھر میں رہنا ذہنی طور پر تکلیف دہ تھا۔ انٹر کے امتحان میں فیل ہو گیا۔

پھر والد صاحب نے مجھے امرتسر بھیج دیا۔ امرتسر میں انکے دوست تھے جو سناتن دھرم کالج کے پرنسپل تھے۔ بورڈنگ میں ہم تین مسلمان لڑکے تھے۔ ہم سے یوں سلوک ہوتا تھا جیسے ہریجن ہوں۔ ہمارا رویہ غنڈوں کا سا تھا۔ وہیں سے میں نے انٹر پاس کیا

1929 میں اسلامیہ کالج لاہور سے میں نے بی اے پاس کیا

پھر باپ سے جھگڑا ہو گیا۔ ہم الگ ہو گئے۔ ماں نے ہنڈی رولی

کیلے بہت سے کام کیے۔ کپڑے سیئے۔ پتنگ بنائے۔ ڈور پر مانجھا لگایا۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں۔ میری ماں پیدائشی کامی تھی ہاتھ کے کام میں بڑی دسترس رکھتی تھی۔ میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

یہ شدید مالی انحطاط کے دن تھے۔ نوکری نہیں ملتی تھی۔ تنخواہوں میں تخفیف ہوگئی تھی۔ میں بٹالہ میں شارٹ ہینڈ کالج میں داخل ہوگیا جہاں سلون ڈپلوئن سسٹم سکھایا جاتا تھا۔ کالج میں کوئی گریجویٹ نہ تھا۔ وہاں میرا مرتبہ استاد کا تھا۔ میرے پرنسپل نے کہا آؤ ہم دونوں اردو کا شارٹ ہینڈ بنائیں۔ اس پر مجھے فیلو آف سلون ڈپلوئن بنادیا گیا

اس زمانے میں گریجویٹ سٹینوگرافر کی بڑی قدر تھی۔ مجھے انٹرویو کے لیے جو خط موصول ہوتے۔ تمام خط انٹرویو کی تاریخ کے بعد موصول ہوتے۔ ظاہر تھا کہ وہ خط لیٹ پوسٹ کیے گئے تھے۔ دفتروں پر ہندو چھائے ہوئے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ دفتر میں کوئی مسلمان آئے۔

1931 میں مجبوراً میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہوگیا۔

1932 میں مجھے سینئر انگلش ٹیچر کی سند مل گئی۔

اسی دوران میں دو بنیادی جذبات۔ احساس کمتری اور باپ دشمنی کے ساتھ جنسی جنون بھی شامل ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں میں سالہا سال جذباتی دلدل میں پھنسا رہا۔

مجھے عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ ہر راہ چلتی سے محبت لگا کر بیٹھ جاؤں۔ میرے جنسی لگاؤ کو جسم سے قطعی طور پر تعلق نہ تھا وہ خالصتاً ذہنی تھا۔ ساری لذت سفر کی تھی جس کی کوئی منزل نہ تھی اگر وصال کی صورت پیدا ہو جاتی تو میں خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتا۔

یہ کیفیت سکس فینٹیسی Sex Fantasy کے مترادف تھی
پہلی محبت میں نے ایک ایسی لڑکی سے لگائی جسے میں نے قریب سے
دیکھا ہی نہیں تھا۔ سفید رنگ۔ چوڑی لٹ۔ دو سال دیوانہ وار میں
اسے امرتسر میں ڈھونڈتا رہا۔ یہ محبت دراصل والد صاحب کی نگاہ
التفات کے خلاف احتجاج تھی۔

پھر میں نے محلے کی ایک خاتون سے محبت لگائی جو شادی شدہ اور
بچوں والی تھی۔ یہ دیوانگی مجھ پر سولہ سال طاری رہی۔

تیسری محبت ضمنی تھی۔ میرے ایک خوبرو ساتھی کو کسی لڑکی سے
محبت ہو گئی۔ لڑکی کا مطالبہ تھا کہ خط لکھو۔ اسے خط لکھنا نہ آتا تھا۔ یہ
کام میرے سپرد ہوا۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی کو علم ہو گیا کہ خط کوئی اور لکھتا ہے
اور وہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔

یہ تینوں جذبات میری شخصیت کے بنیادی جذبات ہیں۔ بنیادی
جذبات جاتے نہیں دب جاتے ہیں۔ اور جب بھی چاہے ابھر آتے ہیں

## ادب

بی اے تک میں نالائق طالب علم تھا۔ میری توجہ کتاب کی طرف نہیں
تھی۔ بی اے میں فیاض محمود کی وجہ سے میری توجہ کتاب کی طرف مبذول
ہوئی۔ فیاض محمود [illegible] سکول میں پڑھتا تھا ہم اکٹھے رہتے تھے
فیاض محمود مطالعے کا دیوانہ تھا۔ اس کا مطالعہ درسی کتابوں تک محدود
نہ تھا۔ اس میں وسعت تھی۔ فیاض محمود کے ذرائع محدود تھے۔ جو
رقم بھی اس کے ہاتھ میں آتی وہ اس کی کتابیں خرید لیتا تھا۔ فیاض محمود
نے مجھے مطالعہ کی طرف مائل نہیں کیا تھا۔ الٹا میرے ہاتھ میں کتاب
دیکھ کر کہتا۔ اچھا تو آپ کتاب دیکھ رہے ہیں۔ آپ اور کتاب۔ اس کی

بات میں بلا کی کاٹ ہوتی تھی ۔
ہر کمبخت میں میری تذلیل ہوتی ۔ ایسی کہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا
تھا تھا اسی وقت میرے ہاتھ میں کتاب آ گئی اور میں دس بارہ سال
دیوانہ وار مطالعہ کرتا رہا ۔ مطالعہ میرے لیے فرار تھا ۔
میرے دل میں کبھی ادیب بننے کی خواہش پیدا نہ ہوئی تھی ۔ اردو زبان
سے میں قطعی طور پر ناواقف تھا ۔ ان دنوں پنجاب میں اردو کو لینے
کا رواج نہیں تھا ۔
1936 میں جب میں گوجرم لورڈ ہائی سکول میں ٹیچر تھا تو ہیڈ ماسٹر نے
سکول کا جریدہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ۔ مجھے حکم ہوا کہ جریدے کے اردو
سیکشن کے لیے مضمون لکھوں ۔ میں نے کہا جناب میں اردو زبان سے واقف
نہیں ۔ آپ اجازت دیں تو انگریزی میں لکھ دوں ۔ ان کی افسری جلال
میں آ گئی ۔ رو دھو کر پوچھ پوچھ کر میں نے اردو میں ایک مضمون لکھا ۔
پھر ایک اور بیگار پڑ گئی ۔ ن م راشد میرے والد کے پڑوس میں رہتا تھا
ابھی وہ ن م راشد نہیں بنا تھا ۔ اس کا ایک دوست ملتان سے اردو کا
ایک جریدہ نکالتا تھا ۔ نخلستان ۔ اسے ایک مہینے کے لیے باہر جانا پڑا
نخلستان کا ایک شمارہ نکالنے کا فریضہ ن م راشد کو دے گیا ۔

راشد نے صفدر میر کے سے مجھے اپیل کی اور میں نے ایک مضمون "ہلکی
دلہن" لکھ دیا ۔ چھپنے پتہ نہیں کیا ہوا ۔ کیسے ہوا ۔ ادبی دنیا لاہور کے ایڈیٹر
منصور احمد کا مجھے ایک خط موصول ہوا ۔ لکھا تھا ۔ ادبی دنیا کے سالنامے
کے لیے کچھ لکھئے ۔ یہ خط میری زندگی پر ایٹم بم کی طرح گرا ۔ خط موصول ہوا تو
میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔
زندگی میں مجھے کبھی اہمیت نہ ملی تھی ۔ گھر میں کبھی کسی نے پوچھا نہ تھا کہ تم کون
ہو ۔ کیا ہو ۔ سکول میں کوئی حیثیت نہ تھی ۔ اساتذہ کرام مشورہ مارکر بیٹ

کرا دیتے تھے۔ ادبی دنیا کا ایڈیٹر سالنامے کیلئے مجھ سے مضمون مانگتے۔ میں تو تھکا ہارا گیا۔ میں نے بمشکل ایک کہانی لکھی۔ جھلی جھلی آنکھیں

منصور احمد نے ان جانے میں مجھ پر تین ظلم کئے۔ ایک تو میری کہانی سالنامے میں شائع کی۔ دوسرے اسکے بارے میں ایک تعریفی نوٹ لکھا اور تیسرے یہ کہ سالنامہ شائع کرنے کے بعد فوت ہو گئے۔

ان کے بعد عاشق حسین بٹالوی ادبی دنیا کے مدیر بن گئے۔

اس واقعہ کے بعد نہ لکھنا میرے لئے ممکن نہ رہا تھا۔

دوسری کہانی ادبی دنیا کو بھیجی تو عاشق نے یہ لکھ کر اسے لوٹا دیا کہ کوئی طبعزاد چیز لکھ کر بھیجیے۔ عاشق بھی سچا تھا وہ میرا گرائیں تھا اسکا گھر ہمارے محلے کے سامنے تھا۔ اس نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔

کہانی واپس آئی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ڈوبتے نے سہارے کیلئے ہاتھ پاؤں مارے۔ جو تنکا میرے ہاتھ آیا وہ شاہد احمد دہلوی تھے۔ وہ دلی سے ماہنامہ ساقی نکالتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ساقی میں چھپنے لگا۔

کئی ایک سال کسی کو علم نہ ہوا کہ ممتاز مفتی کون ہے۔ میں کسی ادبی محفل میں نہیں جاتا تھا۔ سکول میں میرا نام ممتاز حسین تھا۔ پرچوں میں ممتاز مفتی چھپتا تھا۔ سکول میں اساتذہ کرام رسمی تھے مراد مشینی تھے۔ ایک روز ایک استاد سٹاف روم میں میرا چھپا ہوا افسانہ لے آئے۔ اور کہنے لگے یہ دیکھو۔ لاحول ولا قوۃ۔ پھر وہ مجھے مخاطب کر کے بولے۔ یہ آپ کی تحریر تو نہیں۔ جان بچانے کیلئے میں نے بھی لاحول پڑھ دیا۔ اس کے بعد سکول میں مجھ پر عاید ہو گیا کہ اپنی تصنیفات کو چھپائے لازمی رکھوں۔

ان حالات میں میرے افسانوں کا مجموعہ چھپنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ہوا یوں کہ سکول میں پبلشرز آتے ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک پبلشر

بڑا دیانتدار قسم کا تھا جو درسی کتابوں کے علاوہ ادبی کتابیں بھی شائع کرتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ہمیں ترجمے کی ایک کتاب لکھ دو۔ میں نے کہا کسی اور سے لکھوا لیجئے۔ بولا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ کس سے لکھوانی چاہیئے۔ ہم تمہیں بھاری معاوضہ دیں گے۔ چھ سال کی تنخواہ کے برابر چھ سال میں جو بنتا۔ ان دنوں میری تنخواہ 45 روپے تھی۔ میں نے کہا نہیں چودھری برکت علی صاحب۔ میں ترجمے کی کتاب نہیں لکھوں گا۔ غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں کہنے لگا۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے میاں
ایک سال کے بعد وہ پھر میرے پاس آیا۔ آتے ہی مجھ سے کہنے لگا مجھے اپنے افسانے دیدے میں مجموعہ چھاپوں گا۔ یہ سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ چودھری بولا میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تو افسانے لکھتا ہے۔ تسلی رکھو۔ چھ مہینے کے بعد ان کی چھپ گئی۔

بارہ سال میں نے درس و تدریس کا کام کیا پھر سکول میں اساتذہ کرام کی تنگ نظری سے زچ ہو کر میں نے استعفیٰ دے دیا اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ یوں ممتاز مفتی افسانہ نویس بر سر عام آ گیا

پھر ترقی پسند تحریک نے منٹو کے ساتھ مجھ پر بھی بین لگا کر مجھے اہمیت بخش دی۔

1936 سے آج تک میں نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن اس خیال سے نہیں کہ میں ادب کی خدمت کر رہا ہوں۔ الٹا ادب میرے لئے ایک سہارا تھا جیسے اپاہج کیلئے بیساکھیاں ہوتی ہیں۔ ادب اور ادیبوں نے زندگی بھر مجھے سہارا دیا اتنا کہ جس کا میں مستحق نہ تھا۔

اس دوران میں مغربی مشاہیر کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے میں ایک سکہ بند دانشور بن چکا تھا۔ ہر بات پر شک کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ نہ خدا کو مانتا تھا نہ اسلام کو اور نہ پاکستان کو۔ تقسیم کے وقت

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا منظم قتل عام دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں اور پاکستان میری جائے عافیت ہے۔ لیکن یہ جذبہ سطحی تھا۔ بلکہ یہ ایک ذہنی تاثر تھا جس میں دل کی دھڑکنیں شامل نہ تھیں۔

1955 میں میری زندگی میں ایک عظیم واقعہ رونما ہوا جس نے میرے ریشنل سیلف کی دھجیاں اڑا دیں۔ ایک کایا پلٹ عمل میں آگئی۔ مری کے بزرگ خواجہ جان محمد نے مجھ پر رقت طاری کر دی۔ مجھ پر گویا بے اختیاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ کیفیت دس دن طاری رہی۔ ہر بیس پچیس منٹ کے بعد میں چیخ چیخ کر بآواز بلند رونے لگتا۔ جب ہوش میں آتا تو شرمندگی طاری ہو جاتی۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے۔

رقت ختم ہوئی تو ایک نیا تماشہ شروع ہو گیا۔ جس طرف بھی دیکھتا وہاں اللہ کھڑا ہوتا۔ باغ کی طرف دیکھتا تو وہ ہاتھ میں رمبا اٹھائے مالی کے بھیس میں آ کھڑا ہوتا۔ درخت کی جانب دیکھتا تو وہ باہیں پھیلائے تنے سے چمٹا ہوتا۔ آسمان کی طرف دیکھتا تو ایک زیر لبی گونجتی۔ ہاں۔ میں ہوں۔ اس پر میں چڑجاتا یہ اللہ کہاں سے آ گیا ہے۔ سرگوشی سنائی دیتی۔ ہم نہیں آئے تم آئے ہو۔

خواجہ جان محمد سے مل کر تو حیران رہ گیا۔ دیکھنے میں نہ وہ پیر لگتے تھے نہ بزرگ۔ مرتا دمیں وہ اخلاق ہی اخلاق تھے۔ ہماری اسقدر قدر کیا کرتے کہ لگتا جیسے ہم پیر ہوں اور وہ مرید۔ کوئی مسئلہ پوچھتے تو وہ کہتے۔ ہمیں مسئلے نہیں آتے۔ ہمارے سرکار قبلہ نے ہمیں صرف دو لفظ سکھائے تھے بس وہی دو لفظ ہمارا سرمایہ علم ہے

ہم انہیں بھائی جان کہتے تھے۔ ہم چار تھے جانے پہچانے صاحب طرز ادیب عزیز ملک۔ حنیف آغا۔ راجہ شفیع اور میں۔
بھائی جان کے مرشد سائیں اللہ بخش مرحوم تھے۔ عزیز ملک نے سائیں اللہ بخش کا تذکرہ لکھا تھا۔ مرد قلندر
عزیز ملک نے مجھے بتایا کہ راولپنڈی میں میری آمد سے بہت پہلے بھائی جان نے بتایا تھا کہ آپ کے ایک نئے بھائی آنے والے ہیں۔ جو ادیب ہیں۔ دفعتاً مجھے وہ روسی ٹوپی والا یاد آ گیا جس نے تقسیم کے فسادات کے دوران ہمارے ٹرک کو راستہ دیا تھا۔ کیا سائیں اللہ بخش روسی ٹوپی پہنتے تھے۔ میں نے عزیز ملک سے پوچھا۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ بولا آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ روسی ٹوپی پہنتے تھے۔
بھائی جان سے ملنے کے بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ دنیاوی نظام کے ساتھ ساتھ ایک اور نظام چل رہا ہے۔ جو پراسرار ہے اور حواس خمسہ کی قیدیوں کے ادراک سے باہر ہے اور اس نظام سے تعلق رکھنے والے افراد بڑے طاقت ور ہوتے ہیں

شہاب دور

پھر میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ وہاں میں قدرت اللہ شہاب سے ملا جو ایک آئی سی ایس افسر تھا اور صدر پاکستان کا سیکرٹری تھا۔ طبعاً میں بڑے افسروں سے میل جول سے گریز کرتا تھا۔ چند ایک ملاقاتوں کے بعد مجھے حیرت ہوئی کہ بڑا افسر ہونے کے باوجود اس میں بلا کا عجز تھا۔ قریب گیا تو دیکھا کہ وہ ایک بڑا انسان ہے اونچے کردار کا مالک ہے۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی زندگی میں پراسرار واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ اس پراسرار نظام

سے تعلق رکھتا ہے جو دنیاوی نظام کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے
میں نے دیکھا کہ قدرت اللہ شہاب کا مسلک Mohammad
Hood ہے۔ ہم 28 سال اکٹھے رہے ہیں۔ اس نے مجھے بے حد متاثر
کیا۔ مجھ میں عقیدے اور عمل کی صلاحیت نہ تھی اس لئے میں کوئی مقام
حاصل نہ کر سکا۔ میں آوارہ تھا۔ آوارہ ہی رہا۔ منہ زبانی تھا منہ زبانی
ہی رہا۔ اس نے مجھے بہت کچھ دیا۔ سبھی کچھ دیا لیکن میں پھیلنی تھا۔ مجھ
میں چھید ہی چھید تھے۔
میں اپنی زندگی سے بے حد مطمئن ہوں۔ کوئی مجھ سے کہے مانگ کیا مانگتا
ہے تو میں سوچ میں پڑ جاؤں گا کہ کیا مانگوں

ممتاز مفتی
21.11.86

مرزا ادیب

## خام بُدم پختہ شدم ——

عام دنوں کی طرح وہ بھی ایک دن تھا۔ وقت صبح کا تھا یا شام کا، ممکن ہے رات کا ہو۔ بہرحال انہی دنوں کے کسی وقت ایک بچہ دنیا میں آیا تھا۔ تاریخ ۴۔ اپریل اور سن ۱۹۱۴ء۔ یہ بچہ آج اپنی تاریخ کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے اگر اللہ نے اسے زندگی دی تو ۴ اپریل ۱۹۸۹ء کو چوہتر برس کا ہو جائے گا۔

چوہتر برس پیچھے کا یہ بچہ میں ہوں۔ جس نے لاہور کے بھاٹی گیٹ، محلہ ستھاں، کوچہ دیوی دتا کی ایک چھوٹی سی گلی میں ایک اونچے مکان کی دوسری منزل کے آخری کمرے کے اندر، جسے کوٹھڑی "پرلا اندر" کہتے تھے، زندگی کا پہلا سانس لیا تھا۔ اور آج میں برادرِ عزیز پروفیسر حسین کاظمی کے ارشاد کی تعمیل میں "دائرہ" کے قارئینِ کرام سے مخاطب ہو کر اپنے کچھ حالات بتانے لگا ہوں۔

یہ گلی جسے میں نے گلی شعیب کا نام دیا ہے، میرے دادا مرحوم میرزا غلام حسین کے نام سے منسوب تھی۔ دادی اماں بتایا کرتی تھیں کہ تمہارے دادا جان بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ سارے شہر میں ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ انہیں یہ دکھ مرتے دم تک ستاتا رہا کہ ان کے تینوں بیٹے اور ایک بیٹی علم سے بالکل بے بہرہ رہے۔

میں جب پیدا ہوا تو انہیں دنیا سے رخصت ہوئے کئی برس گزر چکے تھے۔ دادی جان کی باتیں سن سن کر میرے دل میں یہ آرزو جاگ اٹھی کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو میں انہیں دیکھ سکتا۔ ان سے باتیں کر سکتا۔ کچھ پڑھ سکتا۔ ان سے محروم رہ کر ان کی کتابوں سے لو لگا بیٹھا جو صندوقوں میں بند اس کمرے میں پڑی رہتی تھیں جسے ہم نے اپنی زبان میں "پرلا اندر" کہا ہے اور جو کوٹھڑی کا آخری کمرہ تھا۔

ان کتابوں کا وجود ایک حقیقت تھا اور مشہور یہ تھا کہ خاندان کے کسی فرد کا جب جی چاہتا تھا ان صندوقوں کو کھول کر ان میں سے دو چار کتابیں نکال لیتا تھا اور ان کی ورق گردانی کرنے لگتا تھا اور جب طبیعت سیر ہو جاتی تھی تو ان کتابوں کو دوبارہ اسی صندوق کے اندر رکھ دیا جاتا تھا۔ مرزا زمانہ ان پڑھ ہونے کے باوجود ان کا احترام کرتے تھے۔ اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے اور یہی حال کچھ میرا بھی یہی حال تھا۔ البتہ میرے حافظے میں ایک ایسا واقعہ محفوظ ہے جیسے میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ ہوتا یہ تھا کہ میں جب بھی کتابوں کا یہ صندوق کھولتا تھا، پڑوس کی ایک بی بی میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور بڑی دلچسپی سے مجھے کتابیں نکالتے اور ان کی ورق گردانی کرتے دیکھتی رہتی تھیں۔ مگر جب میں ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتا تو چپ ہو جاتی تھیں۔

جو وہیں قریب کے مندوں یا محل میں گھوم سکتا تھا ۔ آج کتابوں کے [illegible] [illegible] چک نی [illegible] [illegible] اپنے دل کو ٹکڑوں میں پھیلنے [illegible]
مدد ملی شام کو جو دن کے سفر میں گزر گیا تھا انھیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] چاہے کوئی چیز کیا تھا ۔

"ڈیلوری" تو کئی اپنے دادا کی طرف [illegible] [illegible] ۔ یہ آج [illegible] [illegible] [illegible] تو [illegible] [illegible] آج [illegible] زندہ
رہتا تو یہ ان سے سنا ۔ " ان [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہیں کہ ان سے دادا جان [illegible] [illegible] ہو سکتا ہے ۔

میرا پیدائشی نام [illegible] ہے ۔ مجھے دادا [illegible] کہتی تھیں ۔ محلے کے بزرگ [illegible] اسی نام سے پکارتے تھے مگر ان [illegible]
[illegible] ۔ یہاں ایک بات کہتا چلوں ۔ گھر میں [illegible] [illegible] کوئی نہیں تھا ۔ [illegible] [illegible] چلتا تھا ۔
دادی اماں اسی گھر میں رہتی تھیں ۔ [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] مکان [illegible] [illegible] [illegible] تھی ۔
گھر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھی ۔
میری عمر چار پانچ سال [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] قرآن مجید پڑھا یا کرتی تھیں ۔
[illegible] دادی [illegible] زندگی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] قرآن مجید پڑھنے والی لڑکیوں کے
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دادا جان [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] 2 بجے [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میری زندگی [illegible] [illegible] ۔ دادی اماں
[illegible] [illegible] ۔ ان کی زندگی [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
دادی اماں کے مکان [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] صبح و شام [illegible] سب کی خدمت گزاری ۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] دادی اماں [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔
[illegible] [illegible] [illegible] ۔ دادی اماں نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] ۔ ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

گویا۔ ہو گیا [illegible] روز کا کام تھا کہ ... [illegible] سیالکوٹ اور محلہ سکول کے یکایک آئے تو مدتوں بعد [illegible]۔ آئے میرے مجھے ... دن [illegible] وہ
کی شکل دیکھی تھی۔ وہ زمین وہ مدرسہ [illegible] جس سکول کا [illegible]
[illegible] چند قدم رکھ دیکھا۔ مادر علمی کے [illegible] دیا [illegible] سکول کے حالات میں چند [illegible]
سکول بدلتے تھے۔ جیسا کہ اس سکول میں تھا کہ اس سکول میں، [illegible] کی تعلیم ختم کی تو [illegible] سکول [illegible]
اس سکول میں جو شخصیتیں [illegible] جن کا تعلق اثرات [illegible]۔ ایک تو تھے [illegible] [illegible] [illegible] غلام مصطفیٰ۔ یہ
صاحب [illegible] دلچسپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سکول کے [illegible] مولوی محمد شفیع تھے۔ وہ
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
وہ ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دیا کرتے تھے۔
یہ سطریں لکھ رہا ہوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] دیا ہوں۔
اب سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] غلام مصطفیٰ [illegible] شعر [illegible]
دلچسپی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible]
تھا "حسن [illegible]" [illegible] [illegible] سکول میں [illegible] [illegible] ایک روز
[illegible] سکول میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] "آؤ شعر لکھیں"۔
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شعر لکھیں [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]۔ [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دیوانہ [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
اس سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
میری [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
مجھ سے کہا [illegible] [illegible] نعت لکھو [illegible] [illegible] شعر [illegible]
سے [illegible] [illegible] شعر [illegible] [illegible] تھی۔ [illegible] اس نعت [illegible]

انتخاب تھا۔ نو شعروں پر مشتمل انتخاب چھپا۔ بہ لحاظ [illegible] حالت [illegible] دو [illegible] [illegible] عالی
خط لکھا تھا۔ [illegible] خاص [illegible] تھا۔ [illegible] [illegible] شعروں کا انتخاب [illegible]۔
[illegible] مشہور شاعر [illegible]۔ [illegible] حالت [illegible] [illegible] اردو [illegible] [illegible]۔
[illegible] مرزا [illegible] ایک [illegible] [illegible] تھے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] مشہور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] شائع ہو گیا [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دکھاؤ۔ [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] حال [illegible]۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بات یہ نہیں کہ انہوں نے کوئی [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible]۔ [illegible] [illegible] [illegible]۔ [illegible] [illegible] کوئی بات نہیں [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] اور [illegible] حالات اسلام [illegible] [illegible] اسلام [illegible] [illegible] [illegible] موضوعات پر [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] منتقل [illegible] ترجمہ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] پروفیسر [illegible] [illegible] محمود [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] صدیقی اور [illegible] [illegible]
[illegible] کالج کے [illegible] اساتذہ تھے۔ ڈاکٹر [illegible]، پروفیسر عبدالغنی، مولانا [illegible]۔ پروفیسر حمید احمد خاں، سید
عبداللہ، پروفیسر [illegible] محمود، پروفیسر [illegible]۔ ان محترم اساتذہ کی [illegible] [illegible] ١٩٢٢
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible]

خاطر دو ماہ جینا تھا۔ دہلی سے پنجاب گیا تو لاہور آ کے چودھری برکت علی کے ادارہ میں آ گیا اور ادب لطیف کی ادارت سنبھال لی۔
یہ نہ چند دفتری امور نبٹا لیتا ہوں۔ ارادہ تھا کہ لکھنے کا وقت اپنے آپ کو نیا ادارہ دے گا مگر جب ادارت کے سلسلہ میں کودا تو معلوم
ہوا کہ اب تو ترجمہ، بیان، تنقید اور ادبی کاموں کا ذکر، باوجود اپنے ارادے کا سارا بوجھ ہے کا بیان نہ ہو سکا۔ روزانہ
دو دو چار چار گھنٹے۔ میں چلا جاتا رہا۔ ادب کا سلسلہ نہ ٹوٹنے دیتا۔ پچھلا وقت خالی نہیں رہتا۔ گھر آتیوں پر وقت ملتا تو
کو گزشتہ ہی لمحوں کی کوشش کرتا رہا۔ جب میری پہلی تحریر پر اعتبار آیا تو مجھے پتا نہ تھا کہ لکھ سکتا ہوں۔ چونکہ ابتدا ان کی
نا کامی کی تھی۔ پھر خود لکھتا رہا۔ کاروبار میں ڈر کا ان کے دنوں کی تعداد ہیں۔ پھر دوسرا حصہ زمانہ۔ گھر پر
دو دو چار پانچ اور مجبوری کے چار۔ یہ نہ ادب لطیف کا ادارتی دستہ دار یہاں تک سال تک نکلتا رہا
پہلی اور زندگی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا۔ اب ۵۵ قریب الختم ہے۔ ان دنوں بچوں کی طرف سے اور مستقل
کاروبار اور اس سلسلہ کا کوئی محور ہوا۔ جب پہلی تحریر کے درمیان لکھتے رہنا ہوگا۔

آخر میں ایک سوال اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ یہ ادب کو کیا دیا ہے۔ دوبارہ زندگی اپنی ۵۵ سال زندگی ہے
۵ ہو سکتی ہے۔ ان سے ایک انکار طرز پر سکتی ہے۔ مگر میں اس دور سے اپنے طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ البتہ
جب یہ کہتا ہوں کہ ہوں نہ تخلیقی عمل ہی اپنی طرف سے کرتا رہا ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی دانشور
معاشرت ادب کی چاہ کا نکلا اس خیال سے کہ تخلیقی ہے کہ میری ہر تحریر تخلیق ہے فلاں فلاں اور غلط صحیح ہے۔
نہ میں مشورہ چھین لیتا ہوں۔ اس کی یہ کہ بعد جلد یا دیر کہ دو اس کا اعتراف کیا جائے گا۔ اسی اعلام نئی نسل
اپنی تحریریں چلا آتا ہوں۔ میں نئی جلدیں لکھنا درست سمجھتا ہوں۔ پھر کبھی چھین پڑتا ہے۔
مجھے زندگی کو سب سے بڑی خوشی ان لمحوں میں ہوتی ہے جب ایک تخلیق مجھے ذاتی طور پر مطمئن کر دیتی ہے۔ کتنا ہے اندھیروں
میں کہیں سے سیلاب نور ہے لپکتا ہے۔



تخلیقات

دو افسانوی مجموعے

عورت اور دیگر خطوط ۱۹۳۹ء

عورت اور دیگر افسانے ۱۹۴۲ء

عورت اور دنیا ۱۹۴۷ء

مختصر ناول

لاوا ۱۹۴۴ء

دیواریں ۱۹۴۴ء

شعلے، ۱۹۵۲ء

کنول، ۱۹۵۷ء

حسرتِ تعمیر، ۱۹۷۹ء

ساون کے چراغ، ۱۹۸۳ء

گلی گلی کہانیاں، ۱۹۸۷ء

ان کے علاوہ میرزا ادیب کے بہترین افسانے، ترجمے بہر طبع روشن صدیقی

زیرِ طبع

خدا رسول کا مجموعہ

افسانے، تمثیلات

ڈرامے

آنسو اور ستارے، ۱۹۵۳ء

سبو اور زالیں، ۱۹۵۵ء

ستون، ۱۹۵۷ء

فصیلِ شب، ۱۹۶۱ء

شیشے کی دیوار، ۱۹۶۲ء

پسِ پردہ، ۱۹۶۷ء

خاک نشین، ۱۹۷۵ء

شیشہ و سنگ، ۱۹۷۹ء

اداکاروں کی گڑیا، ۱۹۸۵ء

داستان کا موسم، ۱۹۸۵ء

ناول

کھلونوں کی راکھ ۱۹۸۹ء

ناٹک

ناخن کا قرض ۱۹۸۱ء

سفرنامہ

بالہ کے اُس پار ۱۹۸۹ء

تنقید

مطالعہ اقبال کے چند پہلو ۱۹۸۵ء

بچوں کا ادب، ایک جائزہ ۱۹۸۸ء

کالموں کا انتخاب

از کاروانِ نگار ۱۹۸۸ء

زیرِ طبع میرزا ادیب کے خاکے ۱۹۸۹ء

خود نوشت

مٹی کا دیا ۱۹۸۱ء

تراجم

جدید افسانے ۔ امریکی افسانوں کا ترجمہ ۱۹۶۲ء

چہرے اور دائرے ۔ امریکی افسانوں کا ترجمہ ۱۹۶۲ء

مدرسہ عکسِ اوراق ۱۹۶۹ء

نئی سوغات ۱۹۸۲ء

ذہن کے اُس پار ۔ یوجین اونیل کے ڈرامے کا ترجمہ

تالیفات

بارہ افسانوی کہانیاں ۱۹۷۲ء

تنقیدی مضامین (شاعری)

تنقیدی مضامین (نثر)

بہترین ادب ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک ۸ جلدوں میں

بچوں کا ادب

سورج مکھیاں

جمال الدین افغانی

امیر خسرو

داتا گنج بخشؒ

جب وہ بچے تھے ۔ ۱۹۵۷ء

کہانیاں (مجموعے)

باب کی قدرت ۱۹۸۰ء

بیاد کی بہار "

خیموں کا بازیچہ "

موعظت ۱۹۸۶ء

دوسرے کا بدلہ "

سفید رقعہ "

پھر تھا پور "

دیکھتی آنکھیں

ناول

شب کے در - ۱۹۶۸ء

چاہ نخچ ۱۹۷۵ء

عزازیل کا شہر

بہاڑی کی چوٹی پر ۱۹۸۶ء

کہانی ایک رات کی ۱۹۸۷ء

ڈرامے

کتابیں — تیس کا زمانہ ۱۹۵۰ء

باغ ودیعہ ۱۹۷۱ء

دلہن، تیری دلہن ۱۹۷۲ء

دو دل اگر نہیں ملتا۔

کالی رات کا جنگ ۱۹۷۷ء

قدموں کی چاپ ۱۹۷۸ء

دلہن کو پیار۔

بجلی کی تڑپ

جن، استرہ

بیسا فرد

تحفہ

بچوں کا ادب

بادل کا ذریعہ

دو گھڑی تھم

زریبا

بھیں کہانیاں

حسین الادیب ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر وزیر آغا

# خودنوشت

میں ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو ضلع سرگودھا (پنجاب) کے ایک گمنام سے دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم دیہاتی مدرسوں میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ سکول سرگودھا سے اور ایف۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج جھنگ سے پاس کیا۔ اس کے بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ چونکہ ہوسٹل کے اخراجات نسبتاً زیادہ تھے اس لئے میں آئندہ چار برس موچی دروازہ میں اپنے ایک عزیز کے پاس امام باڑہ رضا شاہ کے ایک کمرے میں مقیم رہا۔ میری معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ لہٰذا تعلیم کا زمانہ بڑی تنگ دستی میں بسر ہوا۔ جب میں نے معاشیات میں ایم۔ اے کر لیا تو پھر ملازمت کے حصول کا مسئلہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ میرے والد چاہتے تھے کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں لیکن ان دنوں قومی جذبے کا غلبہ اتنا زیادہ تھا کہ میں نے اپنے دشمن کی ملازمت کرنا پسند نہ کیا۔ اس کے کافی عرصہ بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ فیض، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری اور بعض دیگر حضرات نے اس میں کوئی قباحت نہ دیکھی تھی تو پھر افسوس ہوا کہ میں نے اس "شاندار موقعہ" کا فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اگر مجھے یہ سب کچھ معلوم ہو جاتا تو بھی میں نہ کر پاتا۔ دراصل ملازمت پیشہ ہونے کے ساتھ مجھ کوئی طبعی مناسبت ہی نہیں۔ شاید اسی لئے میں نے عمر بھر ملازمت نہیں کی۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کچھ عرصہ گھوڑدوڑ کے [redacted] کاروبار میں دلچسپی لی مگر یہ بھی میری طبیعت کے مطابق نہیں تھا۔ تب میرے والد نے اپنی زمین (جو کہ حالت ناگفتہ بہ تھی) مجھے سونپ دی گئی اور کہا کہ میں اس میں سے اپنے

لمحے کا رزق کشید کرتا ہوں۔ اور مجھے یہ کام اتنا اچھا لگتا ہے کہ میں آج تک اس سے منسلک ہوں۔ یہ میری طبیعت کے عین مطابق بھی ہے کیونکہ اس میں آزادہ روی کی خاصی گنجائش ہے۔ میں پرندوں کے ساتھ ہی بیدار ہوتا ہوں اور ان کے ساتھ ہی شام کو منتشر بسیرے پر ہو جاتا ہوں۔ درمیانی عرصے میں پرندوں ہی کی تقلید میں تمام دن زمین پر نقشِ پا ڈھونڈتا ہوں اور کبھی آسمان کی طرف اڑتا ہوں۔ زمین پر چلنے کے عمل نے مجھے زمین کے لمس سے اور پھر اس کے لمس انشائیہ کے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ اور اڑنے کے عمل نے مجھے کھیتوں کے اوپر اڑ کر "جہانِ دیگر" کا نظارہ کرنے کی سہولت دی ہے۔ یہ تجربہ میری نظموں اور انشائیوں میں جذب ہوتا چلا گیا ہے۔

ابتداً مجھ پہ اپنے والد کے اندازوں (مشرق وسطیٰ کے تصوف اور ویدانت کے اشارے) اور مولانا صلاح الدین احمد کی باغ و بہار شخصیت سے میں نے گہرے اثرات قبول کیے۔ یہ انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ میں نے مسرت کے موضوع پر متعدد مقالات لکھے جو بعد ازاں "مسرت کی تلاش" میں یکجا کر دیے گئے۔ ۱۹۴۹ میں میری شادی ہوئی اور اس کے تین برس بعد میری بیٹی پیدا ہوئی۔ مولانا صلاح الدین احمد کے کہنے پر میں نے اردو ادب میں طنز و مزاح پر ایک مقالہ لکھا جس پر پنجاب یونیورسٹی نے مجھے ۱۹۵۶ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ اسی سال میرا بیٹا سلیم آغا پیدا ہوا۔ میرا ڈاکٹریٹ کا تھیسس پہلی بار ۱۹۵۸ میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے غالباً چار ایڈیشن پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ البتہ بھارت میں اس کے متعدد Pirated ایڈیشن چھپے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں میں "ادبی دنیا" کا شریک مدیر مقرر ہوا۔ اس سے ایک سال پہلے

مجھے مغربی پاکستان کی مشاورتی کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا تھا۔ پورے مغربی پاکستان سے کل بائیس ممبر نامزد ہوئے تھے۔ بعد ازاں باقی ممبروں میں سے زیادہ تر وزارت کے عہدوں پر فائز ہو گئے لیکن ملازمت کی طرح سیاست بھی میری طبیعت کے مطابق نہیں تھی۔ مجھے اس میں قید و بند کا احساس ہوتا تھا۔ چنانچہ میں واپس آ گیا اور پھر کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ ان دنوں آزادہ روی کے مسلک کے تحت میں نے بہت سے انشائیے لکھے اور زندگی کے مخفی پہلوؤں اور مظاہر کو روایات کی قید سے باہر نکل کر ایک کشادہ فضا میں سانس لینے کی کوشش کی۔ ۱۹۶۵ میں میری کتاب "اردو شاعری کا مزاج" شائع ہوئی جو اتنی متنازعہ ثابت ہوئی کہ آج تیئیس ۲۳ برس گزر جانے کے بعد بھی اس کے حق اور مخالفت میں مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں اس کا ہندی ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ ۱۹۶۶ میں میں نے اوراق کا پہلا شمارہ شائع کیا اور جدیدیت کی تحریک کو جسے "ادبی دنیا" کے صفحات کے ذریعے فروغ ملا تھا، اوراق کے ذریعے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ پھر میں نے "تخلیقی عمل" کی ایک تھیوری (بصورت کتاب) پیش کی۔ بعد ازاں جب میں نے "تصوراتِ عشق و خرد" کی صورت میں اقبال پر اسی تھیوری کا اطلاق کیا۔ آخر میں یہ تمام عرصہ شاعری کے سلسلے میں بہت سنجیدہ رہا۔ اب تک میری شاعری کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح انشائیوں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ کل ۲۳ کتابیں چھپی ہیں جن میں میری خود نوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" بھی شامل ہے۔ اس کتاب کا آخری پیراگراف میری موجودہ صورتِ حال کو پوری طرح بیان کرتا ہے لہذا درج ذیل ہے:

"اور اب شام کی آمد آمد ہے۔ میں بدستور اپنے گاؤں میں رہ رہا ہوں۔ مست کم

سفر کرتا ہوں لیکن اس وقت حالتِ سفر میں ہوں۔ جب سورج ڈھلنے لگے تو میں
چڑھائی میں تھا تو کبھی سفر میں نکل جاتا ہوں جس میں شاموں سے نکل رہا ہوتا
ہوں تو میں اس وقت جب "ڈھور ڈنگر اور کسان رات گزارنے کے
ٹھکانوں کی طرف آ رہے ہوتے ہیں۔ راستے میں ان سب سے ملاقات ہوتی ہے
ان کے لئے رات سکون اور آرام اور نیند کا دوسرا نام ہے۔ میرے لئے
رات سفر کا استعارہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمام لوگ سورج کی روشنی کا
آخری نقطہ ہے شہر پر رات کی روشنی کا نقطہ آغاز ہے اور میں ایک
طویل مسافرت کے بعد اب بھی اسی نقطے پر ہوں ... آج سے
تقریباً پونے سو برس پہلے جب میں دن کے نقطہ آغاز پر کھڑا تھا تو اتنا ہی تنہا
تھا کہ مجھے اور کسی کا ہوش نہیں تھا۔ مگر آج کہ رات کے نقطہ آغاز
پر پہنچا ہوں تو دیکھ سکتا ہوں [illegible] اس قدر اسرار کو جو معانی کا
[illegible] اور ان ذات کا [illegible] نہ [illegible] سکتا ہوں مگر اسے
محسوس کر سکتا ہوں۔ میں جسے دیکھتا ہوں تو اس کے اندر ہی دنیا
میں رہنا پڑتا ہے جب نامعلوم کے اندر [illegible] اور [illegible] آسمان مسکراتے
ہوئے ستاروں سے اشارے کرتا ہے ... ان ستاروں کو اپنے پیچھے ہوئے دامن
میں اس طرح سمیٹتا ہوں جیسے شاموں کی [illegible] سمیٹتی ہیں"

(وزیر آغا)

# خودنوشت

برادرِ گرامی قدر محترم حسنین کاظمی صاحب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ محررہ ۸ نومبر باعث نواز ہوا ممنونِ عنایت ہوں کہ آپ نے اپنے موقر مجلے میں میرے ابتدائی حالات کی اشاعت ضروری سمجھی ہر چند کہ یہ بڑا مشکل ہے کہ چند منتشر اوراقِ پارینہ کی شیرازہ بندی کی جائے۔ پروفیسر اختر انصاری دہلوی (مرحوم) نے کیسی حقیقت افروز بات کہی ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

۲ فروری ۱۹۲۴ء کو دیارِ علم و عیارِ دانش ٹونک راجپوتانہ (اب راجستھان) کے ایک خانوادۂ علمی میں آنکھ کھولی اور اپنی حویلی (موسوم بہ چھوٹی حویلی)

میں ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی اس طرح

کہ : چہروں کی صبح آ کے جگاتی رہی مجھے
زلفوں کی رات لوری سناتی رہی مجھے

والدِ گرامی حافظِ حدیث مولوی حکیم سید احمد ہاشمی ریاست ٹونک میں منصف و مجسٹریٹ تھے۔ گھر میں سوائے افکار کے ہر شے کی فراوانی تھی۔ ۱۰ برس کے بعد حافظ محمود خاں شیرانی کے بھائی منشی مودود خاں شیرانی کے پاس دونوں ہم عمر بھائی میں اور سالک رہاشمی (عبیگس) مرحوم و مغفور اردو فارسی کی تعلیم کے لیے نظیر منزل۔ مہدی باغ دونوں وقت جاتے رہے وہیں شاعر رومان اختر شیرانی سے پہلے شناسائی پھر دوستی ہوئی۔ پہلا شعر ۱۰ برس کی عمر میں وہیں کہا :

آہٹ پہ کان در پہ نظر دل میں اضطراب
بیٹھا ہوں انتظار کی دنیا لیے ہوئے

ایک دو غزلیں بھائی جان عاشق تلمیذ داغ دہلوی کو اور ایک دو نظمیں اختر شیرانی کو دکھائیں اور جب اردو فارسی اور انگریزی پڑھ لی تو جے پور گیا اور مہاراجا کالج میں داخلہ لیا جو اب راجستھان یونی ورسٹی ہے۔ جنگِ عظیم دوم شروع ہو چکی تھی اور ایک عسکری ادارے

سے وابستہ ہو کر سرزمینِ شعر و نغمہ کانپور پہنچا اور وہاں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک رہا جہاں کراچی کے ماہرینِ تعلیم یعنی آپ اور سید ابوالخیر کشفی صاحب زیرِ تعلیم تھے اور برادرم نثار صدیقی اپنی صغر سنی کے باوجود شاعروں میں متصوفانہ اشعار پڑھتے تھے۔ اشتیاق اظہر صاحب بھی غالباً ایس ڈی کالج میں تھے اور شاید مولانا سلیم ناطقی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ میرے گھر کے سامنے (ہمایوں باغ) میں مولوی عبدالحق صاحب کے ہم وطن پروفیسر اویس احمد ادیب صاحب رہتے تھے جو آپ سب کے علیم مسلم کالج میں استاد تھے۔ اُن کے فیضِ صحبت سے بڑا استفادہ کیا اور اُن کے سفرِ آخرت تک اُن سے مراسم مخلصانہ قائم رہے۔

اس طویل عرصے میں معاشی طور پر روزنامہ ڈان (اُردو) اور ہمدرد پاکستان سے وابستہ رہا مگر شعر سے ناتا نہ ٹوٹا۔ مطالعۂ کتب اور اشاعتِ کتب ہی دو محبوب مشغلے رہے۔ جس سے ملے دل کے حوالے سے ملے، اُسے ٹوٹ کر چاہا اور اس فریب میں مبتلا رہے کہ یہ ہمارے لیے بھی گوشۂ نرم رکھتے مگر:

”ایں خیال است و محال است و جنوں“

چار طویل نظمیں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۲ء تک
فکر کر چکا ہوں۔ ۳ کتابیں شائع ہو کر ادبی حلقوں،
شخصیتوں اور قومی پریس سے داد و تحسین
حاصل کر چکی ہیں چوتھی "یزدان" ساگر لاہور
میں زیرِ اشاعت ہے۔ ۳ شعری مجموعے
مرتب ہیں اور منتظرِ اشاعت بھی، لیکن
ہمارے ہاں معیارِ سُخن سازی و سُخن سنجی محض
عہدہ و منصب ہے جگر کاوی و جاں پژوہی
شغلِ رائیگاں ہے۔ "پی آر" کے وسیلے سے
شہرت و نام آوری حاصل ہوتی ہے۔ میں نے
کسی دور میں کرسیوں کا طواف نہیں کیا۔ اب
تو عناصر میں اعتدال بھی نہیں رہا۔ ایک

بات اور مختصراً عرض کر دوں کہ اپنے
وطنِ عزیز کے اُردو جرائد و رسائل نے
بڑی وقعت و پذیرائی کے ساتھ میری
نظموں کو اپنے صفحات میں جگہ دی ہے،
یہاں تک کہ آزادیٔ وطن سے قبل حضرت
علامہ نیاز فتح پوری نے بھی میری کوئی
نگارش واپس نہیں کی، بلکہ "نگار" میں شائع

کرکے ہمّت افزائی کی، یہ کبھی نہیں
لکھا کہ آپ کی نگارش یا نام ہمارے لیے
غیر مانوس ہے۔ ہمارے ہاں ایسے کم سواد
لوگوں کی کمی نہیں ہے۔
میرا تو یہ معاملہ ہے کہ میں دولتِ شعور کے
طفیل اپنا تزکیۂ نفس خود ہی کر لیتا ہوں
یہ دو شعر میرے اس قول کی تائید
کریں گے:

اس دورِ آگہی میں دکھاؤ نہ آئینہ
اپنی برہنگی کا میں خود ہی لباس ہوں

دُنیا ہی فقط موردِ الزام نہیں ہے
مجھ میں بھی بڑے کھوٹ ہیں گردن زدنی ہوں

نزآق نے میری نظموں پر اس طرح اظہارِ خیال
فرمایا تھا:
"قمر ہاشمی کی نظموں میں ڈرامائی عنصر
غالب رہتا ہے اور طویل نظموں میں
خاص طور پر یونانی ڈراموں کی سی
خواب ناکی بے حد متاثر کرتی ہے،
لفظوں کا تار و پود بکھرنے نہیں پاتا۔
قمر کی شاعری نے جسم و جاں کے معاملات

کو بڑی خوبی کے ساتھ قبول کیا ہے اور
حسرت، مومن اور تسلیم کے فن سے
بڑا استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے
ترقی پسند افکار سے رومانیت کے
غنودہ تصور کو اپنے ہاں اُبھرنے نہیں دیا
جو ان کی ابتدائی فکر کی بنیاد تھا۔"

قمر ہاشمی

ڈاکٹر محمد حسن

# خودنوشت

۲۵ محرم کو اتر پردیش کے شہر مرادآباد کے محلہ نواب پورہ میں ایک متمول زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ عیسوی تقویم سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی تو اتفاق سے تاریخ پیدائش ۲۰ اگست ۱۹۲۶ء مقرر ہوئی۔ والد حاجی الطاف حسن صاحب۔ والدہ کا نام تھا رضوان فاطمہ۔ ابتدائی تعلیم ہیویٹ مسلم ہائی اسکول، مرادآباد میں ہوئی اور بی اے سے لے کر ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی تک لکھنؤ یونیورسٹی میں۔ اردو میں ایم اے کیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کے بعد اردو کا مستقبل روشن نہ تھا۔ ۱۹۵۰ء میں انگریزی اخبار روزنامہ 'پائنیر' لکھنؤ میں سب ایڈیٹر مقرر ہوا اور کچھ دن بعد ان کے فلمی ہفت روزہ 'فلم سیل' کا مدیر۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کا استاد مقرر ہوا۔ عارضی جگہ تھی ۱۹۵۴ء تک اس پر کام کیا۔

۱۹۵۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر کی حیثیت سے اور ۱۹۶۳ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۱ء میں شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ دو سال بعد ہندوستان کا سب سے بڑا علمی وظیفہ جواہر لعل نہرو فیلوشپ ملا۔ اسی کے تحقیقی کام کے سلسلے میں یورپ کی مختلف درسگاہوں اور کتب خانوں کا دورہ کیا۔ ۱۹۷۵ء میں نئی دہلی کی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے ہندی اور اردو کی تعلیم شروع کی اور ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کیا۔ ۱۹۸۲ء میں ریٹائر ہوا۔ یونیورسٹی نے تین سال کے لئے ملازمت کی توسیع کر دی۔

تصانیف کا حال یہ ہے کہ سب سے پہلی تنقیدی کتاب 'ادبی تنقید' کے عنوان سے ۱۹۴۵ء میں چھپی اور اس کے اگلے سال ڈراموں کا پہلا مجموعہ چھپا اور پھر یہیں سے شائع ہوا۔ دونوں کے ناشر تھے ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ۔ اس کے بعد سے اب تک چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ۶۰ سے زیادہ ہے جن کے نام یاد آتے ہیں لکھے دیتا ہوں:

(الف) تنقید: ادبی تنقید۔ شعر نو۔ جلال لکھنوی۔ ہندی ادب کی تاریخ۔

اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ جدید اردو ادب۔ شناساچہرے۔ معاصر ادب کا پیش رو۔ ادبی سماجیات۔ عرض ہنر۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ مطالعہ سودا۔

(ب) ڈرامے۔ پیسہ اور پرچھائیں۔ مور پنکھی۔ ضحاک۔ میرے اسٹیج ڈرامے۔ تماشا اور تماشائی۔ ابھرے کا چاند۔

(ج) تحقیق و ترتیب: مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات۔ دیوان آبرو۔ کلیات سودا۔ نئے ڈرامے۔ انتخاب میر۔ اقبال پر ہم جہتی مذاکرہ۔

(د) تراجم: گرونانک۔ سندھی کے بال ڈرامے۔ جو الامکھی۔

(۵) انگریزی تصانیف:
Nazir Akbarabadi
A New Approach To Iqbal
Multi-disciplinary Approach To Iqbal
Comparative Indian Literature (ed.)
Vol I + II (editor – Urdu)

(۶) ہندی تصانیف: اقبال۔ گزشتہ لکھنؤ

(۷) متفرقات: فیض آباد کی جھلکیاں (اردو۔ ہندی اور انگریزی میں) مارکسزم اور ادب (ترتیب) ہیئتی تنقید (ترتیب)

(۸) زیر طبع: مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ۔ تدریس اردو۔ مشرقی تنقید

(۹) زیر ترتیب: مجاز پر سوانحی ناول۔ مارکسی تنقید۔ اردو کی تاریخ ادب کی تشکیل نو۔

(۱۰) ادارت: عصری ادب (ادبی سہ ماہی) ۱۹۷۰ء سے تا حال شائع ہو رہا ہے

(۱۱) دیگر مصروفیات: کالم نویسی قومی آواز (دہلی) نئی دنیا (دہلی) بلٹز (بمبئی)، اسٹیٹسمین (انگریزی) نو بھارت ٹائمز (ہندی)

## حالاتِ زندگی — کچھ آپ بیتی، کچھ جگ بیتی

۱۹۵۸ء تک کے حالات "لفظوں کا لہو" کے آپ بیتی نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ گھریلو زندگی کا حال بھی چھپ چکا ہے۔ اس کا حوالہ اس وقت نامناسب ہے۔ بعد کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرار تھا۔ اسی سال پروفیسر رشید احمد صدیقی ریٹائر ہوئے اور پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو پانچ جلدوں میں مرتب کرنے کا پروجکٹ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے شعبۂ اردو کو مل چکا تھا۔ سرور صاحب کا رویہ کچھ اس طرح کا تھا کہ پروفیسر نذیر احمد کے صدر شعبۂ فارسی مقرر ہونے کے بعد اس پروجکٹ کی ذمہ داری میں کچھ حصہ میرا بھی ہوگا لیکن بعد کو اس سے روگردانی ہوئی اور سرور صاحب سے اختلافات پیدا ہوئے۔ ادھر گھریلو الجھنیں بھی بڑھیں اور شعبہ جاتی رقابتیں بھی۔

عین اس وقت جب علی گڑھ چھوڑنے کا ارادہ کر چکا تھا اور بمبئی میں تلاشِ روزگار کر رہا تھا دہلی یونیورسٹی میں عارضی ریڈرشپ کی اسامی نکلی اور خلافِ توقع اس پر تقرر ہو گیا۔ یہاں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ تھے۔ ان سے کچھ ایسی ہمت ملی کہ شعبۂ اردو میں کئی نئے کام شروع کرنے میں شرکت کا موقع ملا۔ مخطوطات شناسی کا نیا کورس۔ ترجمے کا پوسٹ گریجویٹ کورس۔ ایم لٹ کا نصاب۔ عوامی ذرائع ترسیل پر نئے کورس۔ نظامِ اردو خطبات۔ غالب کے ترجموں کا سمینار اور اسی قسم کے کئی کام شروع ہوئے۔ اسی دوران عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اردو کی پروفیسرشپ کی جگہ خالی ہوئی اور اس پر میرا تقرر نہیں ہوا جس کا شدید قلق ہوا۔

دہلی میں قیام کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قومی سطح پر ابھرنے والی فکر سے رابطہ قائم ہوا۔ ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کی زبانوں کے لکھنے والوں سے ربط ضبط بڑھا اور قومی زندگی کے مسائل سے قریبی ربط پیدا ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں بزمِ ہم خیالاں قائم کی اور مختلف زبانوں کے ادیبوں کا ایک سمینار دہلی میں منعقد کیا جس میں سہ ماہی ادبی رسالہ "عصری ادب" شائع کرنے کا بھی فیصلہ ہوا۔

زمانہ وہ تھا جب جدیدیت کا فروغ ہو رہا تھا اور ترقی پسند فکر اور ادبی میلان کی مخالفت عام تھی۔ عصری ادب کے ذریعے یہ کوشش کی گئی کہ پرانی ترقی پسندی کی خامیاں بتاتے اور سہل انگاری اور جدیدیت کی مہملیت، باطن پرستی اور رجعت پسندانہ فکر کے مابین روشن خیال

اور نئی ادبی حسیت کی راہ نکالی جائے۔ عصری ادب کا تیسری آواز نمبر اسی کوشش کا نتیجہ تھا

۱۹۷۱ء کے آخر میں کشمیر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تقرر ہوا اور یہاں ایک نیا رخ سامنے آیا۔ یہاں دو سال کے قیام کے دوران ہندوستان میں پہلی بار اقبال ہفتے کا انعقاد ہوا اور جگن ناتھ آزاد صاحب سے اقبال پر تصویری نمائش منعقد کرائی ۱۹۷۳ء میں جواہر لال نہرو فیلو شپ ملا تو کشمیر سے دہلی آ گیا اس فیلو شپ کے سلسلے میں اردو۔ ہندی۔ پنجابی اور کشمیری کے ۱۹ ویں صدی کے ادبی رجحانات کے مطالعے سے ان کے مشترک فکری عناصر کی کھوج کی گئی۔ یہ تحقیقی کام ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے

۱۹۷۵ء میں نئی دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے اردو پروفیسر شپ کی پیشکش کی اور اس کے بعد سے آج تک اسی یونیورسٹی سے متعلق ہوں یہاں ایک دوسرا ہی منظر نامہ مقابل تھا اردو اور ہندی نحوی اور صرفی اعتبار سے ایک ہی زبان کہی جانے کی مستحق تھیں لیکن ان کا ادبی ارتقا مختلف طرز سے ہوا تھا یہاں اردو کا مطالعہ ہندی اور دوسری سبھی ہندوستانی زبانوں کے پس منظر میں کرنا تھا اور پھر عالمی ادبیات کے تازہ رجحانات کو بھی پیش نظر رکھنا تھا۔ یہاں نصاب کا انداز بھی نیا طے پایا اور ادبی سماجیات، تقابلی ادب، مشرقی اور سنسکرت تنقید۔ مارکسی تنقید جیسے نئے موضوعات سامنے آئے اور خود ادب کا مطالعہ بھی مختلف دوسرے ڈسپلن جیسے عمرانیات، تاریخ، وغیرہ کی مدد سے کیا جانے لگا۔

۱۹۷۳ء میں کل ہند انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کا صدر منتخب ہوا اور اس وقت سے آج تک یہ سلسلہ قائم ہے اس منصب نے مجھے ہندوستان گیر سطح پر اردو کی صورت حال سے متعارف ہونے کا موقع دیا اور اس کے لئے کچھ اہم کام کرنے کی سعادت بھی ملی اسی انجمن کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے پاکستان کی درسگاہوں کا دورہ کیا ۱۹۷۶ء میں ملک میں ایمرجنسی نافذ ہوئی اور میرا رسالہ عصری ادب [illegible] ان چند ادبی رسائل میں تھا جنہوں نے اس آئین زبان بندی کی مخالفت کی اسی زمانے میں ڈراما 'ضحاک' لکھا گیا جو ایمرجنسی پر برملا اور بھرپور طنز ہے

۱۹۷۷ء میں جب جنتا حکومت آئی تو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کا چیئرمین نامزد ہوا تقریباً دو سال کے عرصے میں ایک ہفتے کا اردو میلہ منعقد کیا اردو کتابوں کا میلہ لگایا۔ اردو کی تاریخ پر روشنی اور آواز کی تکنیک سے کھلے میدان میں فیچر اسٹیج کیا جو بہت مقبول ہوا

ہوئی۔ اردو کی نادر اور نایاب کتابوں کی دوبارہ طباعت کا سلسلہ شروع کیا سیمینار ڈائرکٹری تیار کیا۔ اردو رسائل کے مدیروں کی کانفرنس کی اور عام اور اہم موضوعات پر عام فہم زبان میں مختصر کتابیں طبع کیں۔

— جواہر لعل نہرو فیلوشپ کے سلسلے میں پہلی بار یورپ کے مختلف ممالک کے سفر کا موقع ملا تھا فیض احمد فیض پر لندن یونیورسٹی اور نیشنل اکادمی کے جلسے میں شرکت کے لیے دوبارہ لندن جانا ہوا اور اس کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کے جشن زریں کے موقع پر لندن اور اسی سلسلے کے سفر میں کناڈا اور امریکا جانے کا موقع ملا اور یہاں کی اردو آبادی سے ملاقات ہوئی اس سے اردو ادب کے معاملے میں بھی ایک عالمی نقطۂ نظر بخشی اور ضرورت محسوس ہوئی کہ اردو ادب کو محض اپنے لسانی حلقے کی نظر سے نہیں عالمی ادب کی نظر سے بھی دیکھنا چاہئے

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی طرف سے بین الاقوامی پریم چند سمینار اور بین الاقوامی اور سہ جہتی مذاکرہ اقبال پر منعقد کیا ادبی سماجیات اور ادبی طریق تحقیق پر سمینار کیے

یہ سب کچھ ہوا مگر بقول غالب — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔

— تنقید میں یہ ارمان تھا کہ ادب کو وسیع تر اور جامع حسیت کا حصہ بنا کر دیکھنے اور پرکھنے کی راہ نکالی جائے (جس کا ذکر کلیم الدین احمد نے میرے بارے میں لکھتے ہوئے اردو تنقید پر ایک نظر کے تازہ ترین اشاعت میں کیا ہے)

— ڈرامے میں آج کے ضمیر کو متشکل کیا جائے اور اردو ادب کو عوامی ذرائع ترسیل سے جو ڈراما سہما سہما سا رہا ہے اسے زیادہ جرأت مندانہ طور پر اور حوصلہ مندی کے ساتھ زندگی سے اور عوامی زندگی سے مربوط کیا جائے

محمد حسن

دہلی ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر حنیف فوق

# خُداکی بستی اور اُردو ناول نگاری

"خدا کی بستی" اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس میں ایک خطۂ زمین کے واسطے سے اپنے عصر کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ شاید ترتیب شمار میں فرق ہو، لیکن جب بھی دورِ حاضر میں اردو کے چند اہم ناولوں کا ذکر کیا جائے گا تو ان میں خدا کی بستی کا نام ضرور شامل ہوگا۔ شوکت صدیقی نے حادثات کا تانا بانا دوسرے ملکوں یا دوسرے ملکوں کی ناولوں میں پیش کردہ فنی صورتوں سے مستعار نہیں لیا ہے۔ ان کی پیش کردہ زمین، اس زمین پر بسنے والے افرادِ قصہ اور ان کے اعمال و تصورات، سب عصرِ حاضر کی وسیع صورتِ حال کا حصہ ہوتے ہوئے بھی خود اپنے ماحول کا پتہ دیتے ہیں۔ خدا کی بستی میں حقیقت پسندی کی وہ روایت جسے مرزا رسوا اور پریم چند نے فروغ دیا تھا۔ سماجی حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت سے مل کر ہم عصرانہ زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ مرزا رسوا نے حقیقت کی سماجی سطح دریافت کی تھی اور اس کے ذریعہ اپنے غیر جذباتی طرزِ بیان کے باوجود امراؤ جان ادا کو لکھنؤ کی تہذیبی اور احساساتی زندگی کا مرقع بنا دیا تھا۔ پریم چند کے عہد تک سماجی حقیقت نگاری کے تصور نے علم الاجتماع کی روشنیٔ دانش میں فروغ نہیں پایا تھا۔ اس کے باوجود پریم چند کے یہاں سماجی پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے اور سماجی حقیقت کے متعدد گوشے واضح ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں ایک طرف اصلاح پسندی کا میلان ان کے بیشتر ناولوں میں زندگی کی عام تصویروں کی رنگ آمیزی کرتا ہے، وہاں دوسری طرف ان کا رجحانِ طبع ملک کی دیہی معاشرت کو خاص طور پر فن کا مرکز بناتا ہے۔ اس کے برخلاف شوکت صدیقی نے "خدا کی بستی" میں شہر کے معاشرے کی ترجمانی کی ہے اور صنعتی زندگی کے لائے ہوئے نظام نے انسان اور انسان کے روابط کو جس طرح متاثر کیا ہے، اس کی جھلکیاں، اس کامیابی سے پیش کی ہیں کہ بعض اوقات حقیقت کی تلخی کام و دہن کی آزمائش کرتی ہے۔ شوکت صدیقی کی حقیقت نگاری غیر منسلک اور لمحوں کی گرفت پر مبنی نہیں ہے، اسے سماجی شعور کا عکس کہا جا سکتا ہے۔ سماجی حقیقت کی مختلف سطحوں کو ناول نگار نے فنکارانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ زندگی کی بعض گھناؤنی صورتیں، ایسی روح فرسا ہیں کہ نظریں ان کے نظارہ سے ہچکچاتی ہیں۔ "خدا کی بستی" میں بعض مناظر کی ہیبت ایسی ہے کہ ان کی باطنی معنویت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ بہرحال اپنی تمام بدنمائیوں کے باوجود ہم زماں زندگی میں کہیں نہ کہیں حسن کی جھلک بھی مل جاتی ہے اور حیات کے اندھیروں میں زندگی کی جد و جہد کا چراغ روشن رکھنے والے، خود ایک نورانی بشارت کے حامل ہوتے ہیں۔ "خدا کی بستی" اپنے دائرۂ فن میں زندگی کی تفسیر کرتے ہوئے نور و ظلمت

دونوں سے سروکار رکھتی ہے اور فنی تصور کی حیثیت سے اس میں سماجی حقیقت پسندی (SOCIAL REALISM) اور سماجی عینیت پسندی (SOCIAL IDEALISM) دونوں کی لہریں ملتی ہیں۔ ان ہی دو لہروں سے "خدا کی بستی" کے واقعات کے دریا میں تلاطم برپا ہوتا ہے۔ مجموعی طور سے اس ناول نے فن کے دائرہ کو وسیع کیا ہے اور حقیقت کی نئی سرحدوں کی دریافت کی ہے۔ اس اعتبار سے اسے اردو ناول نگاری کے سرمایہ میں ایک اہم اضافہ کہا جاسکتا ہے۔

اردو ناول نگاری کا فروغ اگرچہ مغربی اثرات کے تحت ہوا، لیکن اسے محض تقلیدی کہنا گمراہ کن ہوگا۔ اردو ناول نے بحیثیتِ مجموعی اپنے ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن اس پر دو سمتوں سے مغرب کے دریچے وا ہوئے ہیں۔ ایک طرف مغرب کے لائے ہوئے صنعتی نظام کے اثرات سے رد و قبول یا ان کی باہم آویزش کے پیدا کردہ رویّے ظہور میں آئے اور دوسری طرف مغربی افکار، مغرب کے ترقی یافتہ سماجی یا سائنسی علوم اور مغربی ادبیات نے کسی نہ کسی طور پر اس برِّصغیر میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ اردو ناول نے مغربی ناول نگاری کے موضوعات اور اسالیبِ اظہار سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ حلیم شرر، والٹر سکاٹ کے تاریخی موضوعِ بیان سے متاثر ہوئے لیکن نسبتاً کم گیر حدود میں ماضی کے ذریعہ اپنے حال کی تہذیبی تلاش جاری رکھی۔ مغرب کے نسبتاً جدید ناول نگاروں میں ہارڈی، ڈی ایچ لارنس، کونراڈ، ورجینیا وولف اور جیمس جوائس کی تخلیقات نے اردو ناول نگاری پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ گالزوردی، سمرسٹ مام، الڈوس ہکسلے اور جارج آرویل بھی کسی نہ کسی حد تک اردو میں مغرب کی لائی ہوئی ناول کی روایت کے ذہنی پس منظر میں موجود رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ہنری فیلڈنگ، جین آسٹن، اسٹینڈہال، بالزاک، چارلس ڈکنز، فلوبیر، زولا، ہرمان میل ول، ایملی برونٹے، ترگنیف، دستوئیفسکی، ٹالسٹائی، مارسل پروست، تھامس مان، ارنسٹ ہیمنگوے، گراہم گرین، شولوخوف، اناطول فرانس اور بورس پیسٹرناک وغیرہ کے معرکۃ الآرا کارنامے صرف اپنے ملکوں ہی میں نہیں تمام دنیا کی تہذیبی زندگی میں بڑا حصّہ رکھتے ہیں۔ یہ ناول نگار اپنے اپنے انداز میں اپنے عصر اور عام انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے اکتسابات اور فنی تصوّرات سے خود فکر کی راہیں روشن ہوئی ہیں۔ اس روشنی میں اردو ناول نگاری کا جائزہ لیا جائے تو کسی حد تک مایوسی ہوتی ہے۔ ہمارے ناولوں میں زندگی کے وسیع عناصر کی بڑی کمی ہے اور ان میں زندگی کے مجموعی تصور سے کم کام لیا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو کے بیشتر ناولوں کی اساس جس قصہ گوئی اور عبارت آرائی پر رکھی گئی تھی، اس نے فکری اور سماجی تجزیے سے کم سروکار رکھا تھا۔ سستی رومانیت، جھوٹے تصورات اور مصنوعی آرائش نے بھی اردو ناول نگاری کو نقصان پہنچایا ہے۔ "فسانۂ آزاد" میں ایک محدود تہذیب کو جن وسعتوں میں پیش کیا گیا تھا۔ اردو ناول نگاروں نے عموماً اس کشادگیٔ نظر سے بھی کام نہیں لیا ہے۔ بہر حال یہ کم نہیں کہ اردو ناول نے اپنے مختصر دورِ ارتقا میں ہماری تہذیب و تمدن کے متعدد پہلوؤں کو اسیر کر لیا ہے۔ سماج کا فکری تجزیہ کم سہی، سماجی زندگی کی جھلک کم نہیں ہے۔ پھر اردو ناول نے خود بھی کچھ قابلِ ذکر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس نے محض فنی نمونوں کی نقالی نہیں کی ہے اپنے نمونے آپ بھی بنائے ہیں۔ ان قابلِ ذکر فنی نمونوں میں امراؤ جان ادا، ابن الوقت، گئودان، آگ کا دریا، شکست، شام اودھ، آنگن اور خدا کی بستی کو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ ان ناولوں میں فن اور حقیقت کا وہ امتزاج ملتا ہے جس سے تہذیبی سفر کی راہیں روشن ہوئی ہیں۔ مذکورہ بالا ناولوں کے علاوہ ٹیڑھی لکیر سے لےکر

ایسی بلندی ایسی پستی، علی پور کا ایلی، اداس نسلیں، راجہ گدھ، آبلہ پا، تلاشِ بہاراں، گھر میرا راستہ، غم کے، دو بھی، بستی اور بعض دوسرے ناولوں تک حقیقت کی تلاش کا جو سلسلہ ملتا ہے وہ بعض مخصوص مسئلوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کئی ذہنی رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے۔ مختصر ناول کے میدان میں "ایک چادر میلی سی" اور "یا خدا" نے فنی بلندی کا معیار پیش کیا ہے اور زندگی پر گرفت کے ساتھ ساتھ پریم چند کے بعد اس صنف میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کے مختصر حدود میں معاشرہ کی گوناں گوں خصوصیات سمٹ آئی ہیں اور کرداروں کے نقوش فنی چابک دستی سے ابھارے گئے ہیں۔ موضوع کی گہرائی، کرداروں کے تنوع، قصہ کی قوت، بیان کی صداقت، اور مشاہدہ کے فکری زاویے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مرزا رسوا اور پریم چند کی حقیقت پسندانہ روایت کو شوکت صدیقی نے نئی وسعت عطا کی ہے اور خدا کی بستی اس کی سب سے اہم مثال ہے۔

اردو کے اچھے ناول نگاروں نے مغرب سے اثر قبول کرتے ہوئے بھی، اپنی تہذیب کے مزاج و منہاج کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اپنی ہی معاشرت کی تصویروں سے فن کے نگار خانہ کو سجایا ہے۔ اچھے ناول نگاروں کی پیش کردہ تحریروں میں حقیقت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ سرشار اور نذیر احمد سے لے کر شوکت صدیقی تک ہمیں حقیقت نگاری کا ایک روشن سلسلہ ملتا ہے۔ البتہ حقیقت کی تعبیریں مختلف ہوتی رہی ہیں۔ نذیر احمد نے مسلم متوسط طبقہ میں قدیم و جدید کی آویزش کو حقیقت جانا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی وفاداری قدیم سے ہوتے ہوئے بھی وہ عقلیت کی جدید تحریک سے وابستہ رہے۔ چنانچہ خود ان کے ذہن میں جو کشمکش برپا تھی اس نے اس معاشرتی کشمکش کے اظہار کو نئی تہہ داری عطا کی ہے۔ سرشار نے اودھ کی معاشرت کے رنگا رنگ جلووں سے حقیقت کی تشکیل کی ہے اور اس تہذیب سے وابستگی کے باوجود وہ اس تہذیب کی کمزوریوں کو جو آئینہ دکھاتے ہیں، اس سے ان کی حقیقت بین نظر کی ادا کی ظاہر ہوتی ہے۔ سرشار نے داستان سے ناول کی طرف سفر کیا ہے اور ان کے یہاں دورِ وسطیٰ کے رزم آراؤں کے چھوڑے ہوئے نقوش کے ساتھ اسپین کے ناول نگار سروانتس (CERVANTES) کی طرح ان نقوش کی وہ تحریف بھی ملتی ہے، جو دورِ جدید کے آغاز کا پتہ دیتی ہے۔ نذیر احمد کے فن میں اخلاقیات کو بنیادی تصور کی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ وہ دنیا کی فلاکت اور بدی سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے، لیکن اس کم تناظر میں بھی چارلس ڈکنز کی طرح ان کے ناولوں کے بارے میں پہلے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ برے کرداروں کا برا اور اچھے کرداروں کا اچھا انجام ہوگا۔ پریم چند نے عام زندگی کے مشاہدات سے کام لے کر نیکی اور بدی کو معاشرے کے میدانِ عمل میں تلاش کیا ہے، لیکن ان کے یہاں اصلاح پسندی کا گوشۂ عافیت بھی ملتا ہے۔ ان کی ناول نگاری کا سفر جو رتن ناتھ سرشار، بنکم چندر چٹرجی اور ٹالسٹائی کی اثر پذیری سے شروع ہوا تھا، حقیقت کی تعبیر میں بالآخر گاؤں کو اوّلیت دیتے ہوئے بھی شہر کے مناظر پیش کرتا اور ان کا تصورِ فن ناول نگار کو "کبھی دوست، کبھی ناصح اور کبھی علم و حکمت کا ماہر" مانتے ہوئے بھی سماجی تنقید کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ شوکت صدیقی نے حقیقت کو صنعتی دور کی سماجی کشمکش میں دریافت کیا ہے۔ وہ طبقات میں جکڑی ہوئی زندگی کے بے رحمانہ عکس کو انسانی دردمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں گردن چھپا کر نہیں، زندگی کی بھیانک صورتوں کا سامنا کرنے کی ہمت کے ساتھ، اپنے عصر کی خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس عصر میں تصادمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے اور ایک ملک کے افراد اور گروہوں کے درمیان چپقلش کے علاوہ اب اس نے ایک بین الاقوامی

صورت بھی اختیار کرلی ہے۔ یہ باہمی تصادم زندگی مفاداتِ مادّی سے گزر کر اب افاداتِ ذہنی کے قالبوں میں بھی ڈھل گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں یونیسکو کے ایک مذاکرۂ مطبوعہ میں اس کا اعتراف کیا گیا تھا کہ "فکری تصادمات ہر جگہ موجود ہیں۔ قوموں کے درمیان اور قوموں کے اندر، ذہنوں کے درمیان اور ذہنوں کے اندر" شوکت صدیقی نے خدا کی بستی میں فکری تصادمات سے زیادہ ان کی مادی بنیادوں کو پیش کیا ہے۔ لیکن انہیں پیش کرنے میں خود ان کی زندگی کی مجموعی فکر نے رہنمائی کی ہے۔

آج کا ناول نگار محض قصہ کی دلچسپی کو منتہائے نظر نہیں ٹھہراتا۔ مغرب کی طرح اردو ناول نگاری نے بھی بیانیہ انداز سے لے کر علامت و تجرید تک کئی راہیں طے کی ہیں اور معنویت سے بے معنویت تک کا سفر کیا ہے۔ رومانی اور اصلاحی نقطۂ نظر جب حقیقت کے سائنسی جائزہ کے تحت، سماجی حقیقت نگاری میں بدلا تو عصری زندگی کو بدلنے کی نئی سمتوں کا عرفان بھی ساتھ لایا۔ جنوبی ایشیا اور دنیا کے دوسرے مختلف خطوں میں پہلے آزادی کی جد وجہد اور پھر آزادی کے بعد منصفانہ نظامِ حیات کی کوشش نے نئے مثبت ذہنی رویوں کو جنم دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی ترقی کے خواب میں بعض اندرونی تضادات کے باعث کچھ منفی رجحانات بھی راہ پا گئے تھے۔ لیکن خود ان ملکوں میں جہاں ترقی یافتہ صنعتی نظام دوسرے کم ترقی یافتہ ملکوں کے باشندوں کو اپنے مادی اور ذہنی حربوں سے مغلوب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، وہاں خود ان کی اپنی حدود میں منقسم انسانیت نے افراد کے ذہنوں کو منقسم کر دیا۔ بدصورتی، بے یقینی، بیزاری اور بے چارگی کے وہ احساسات عام ہوئے کہ جنسی تر دامنی بھی ان کا مداوا نہ کر سکی اور ہیئت بے اساسیت اور صورت ہی میں اپنی منزل نظر آنے لگی۔ مشین کی ہیئت جہاں ایک جانب انسان کو بے حس اور بے بصر بنانے پر مصر تھی۔ وہاں اس نے فن کو بھی دہشت، تناؤ اور لایعنیت کی راہوں پر لا ڈالا۔ چنانچہ ناول نگاری میں موضوع، پلاٹ، کردار، مکالمہ بیان، فضا و آہنگ اور نقطۂ نظر غرضیکہ فنی تقاضوں کے مطابق اجزائے اظہار میں کمی و بیشی کے باوجود جو مناسبت ملتی تھی، اس سے انحراف روا رکھا گیا۔ یہاں تک کہ خود زبان کو نئے خود کار سانچوں میں ڈھالنے کی ایسی کوشش بھی کی گئی کہ اظہار حروف ہائے بے معنی سے عبارت ہو گیا۔ شوکت صدیقی بھی صنعتی نظام کی دہشت کو پیش کرتے ہیں لیکن اس دہشت زدگی کو اپنی منزل نہیں بنالیتے۔ وہ ناول کی روایات و فن سے منسلک رہتے ہوئے اس دور کے ظلم و تعدی کو بصورتِ فن معرضِ اظہار میں لاتے ہیں۔ خدا کی بستی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شوکت صدیقی ناول کی ہیئت میں رخنہ اندازی کے بجائے اس سے کام لینا جانتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ناول میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربات کو راہ ملتی رہی ہے۔ اور شاید اسی لئے ای ایم فارسٹر نے ناول نویس کے کسی فارمولے سے زیادہ ناول نگار کی پڑھنے والے کو بہلا کر اپنے لکھے ہوئے کو قبول کرا لینے کی طاقت کو اہم سمجھا تھا۔ ورجینیا وولف بھی ناول کو خصوصیت سے اپنی ارتقاء کے دوران، ہزاروں عام انسانی جذبات کو اکسانے والا مانتے ہوئے اس سلسلہ میں فن کے گھسیٹ لانے کو صحیح نہیں جانتی ہیں۔ اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ناول ایک ادبی مشغلہ ہی نہیں، ادبی صورتِ اظہار بھی ہے اور محض اس کے متاثر کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، ناول کے موضوع کی مثبت یا منفی خصوصیت اور ذرائعِ بیان کی اس سے مناسبت بھی، اس صورتِ اظہار کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہے۔ اگرچہ ای۔ ایم فارسٹر ناول کی تعریف کرتے ہوئے اسے

صرف نثر میں ایک مقدار کا قصہ ہی کہتے ہیں لیکن اچھے ناولوں کا مطالعہ جہاں ناول نگار کی اپنی ذہانت و طباعی کا پتہ دیتا ہے، وہاں خارجی دنیا کے علم، انسانی جذبات و کیفیات سے واقفیت، انسان کی اپنے ماحول اور دوسرے انسانوں سے رابطوں کی آگہی اور سب سے بڑھ کر خود انسانی دردمندی کا احساس دلاتا ہے۔ ناول کی اہم خصوصیت واقعات اور کرداروں کا تفصیلی اظہار سہی لیکن اس کے ذریعہ ناول نگار انسانی زندگی کی فطری اور عصری خصوصیات کے نقوش روشن کرتا ہے۔ پھر ناول میں اس ترتیب و تنظیم کی جھلک بھی ملتی ہے، جو خود ناول نگار کے تصورِ زندگی سے عبارت ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر اچھے ناول نگار کے ساتھ اظہار کی شکل میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آتی ہے لیکن قصہ کی ابتدا، وسط اور انجام کا نظریہ بھی ایک حد تک ناول کی فنی ترتیب میں معاونت کرتا ہے۔ "خدا کی بستی" میں قصہ کی باقاعدہ تشکیل ملتی ہے۔ اس میں ابتدا، وسط اور انجام کے نظریہ کی پابندی کی گئی ہے۔ لیکن اس ابتدا، نشوونما اور انجام میں جو منطق کارفرما ہے، اسے خود ناول نگار کے تصورِ زندگی سے فروغ ملا ہے چنانچہ محض بیانِ قصہ ہی نہیں، اس منطق کا فنی انطباق بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مواد کی فنکارانہ ترتیب کے ساتھ، ساتھ انجام و آغاز اسی سلسلہ منطق کے پابند نظر آتے ہیں۔ اس سے کم از کم یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ ناول نگار نے اپنے موضوع کا فنی اکائی کی صورت میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور الگ الگ بے ترتیب یا غیر مربوط اجزا کو جو ناول نگار کے تصورِ زندگی کی منطق سے غیر منسلک ہیں، ناول کی صورت میں ڈھالنے سے گریز کیا ہے۔

"خدا کی بستی" میں اپنے عصر کی زندگی بڑی صداقت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ شہری تمدن کے نقوش، جن میں سماجی مرتبہ کی خواہش، دولت کے حصول کی اندھی طلب، مستقبل کا خوف، بے روزگاری، بھوک، بے راہ روی، جنس، ہنگامہ اور تصنع نمایاں عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فنکارانہ طنز کے ساتھ ابھارے گئے ہیں۔ اس ناول کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں واقعات کی رفتار تیز اور کسی حد تک غیر متوقع ہے۔ لیکن واقعات غیر متوقع ہوتے ہوئے بھی اس طرح رونما ہوتے ہیں کہ اکثر نہ صرف قابلِ یقین بن جاتے ہیں بلکہ واقعات کے پسِ پشت چھپی ہوئی صورتحال کی منطقی صداقت بھی واضح ہونے لگتی ہے۔ اس طرح پڑھنے والا خود بخود ناول نگار کے تصورِ زندگی سے آشنا ہی نہیں ہوتا، اس کا حصہ دار بھی بن جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے تصورِ زندگی کے تابع، لیکن کسی مقررہ ڈھرے کی پابندی کے بغیر جذبات، تصورات اور واقعات کا جو تانا بانا بُنا گیا ہے، اس میں بڑی جان ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول متحرک سماج کی متحرک تصویروں کا ایک دلچسپ اور عبرت خیز سلسلہ ہے۔

اردو میں عام سطحی مذاق کے ناولوں کی کمی نہیں، ان ناولوں میں واقعات کا ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے جو سطحی مذاق کے پڑھنے والوں کی توقعات کو میکانکی طور پر پورا کرتا ہے اور روح کو مشینوں ہی کے انداز میں مُردہ بنا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے ناول بھی لکھے گئے ہیں جو غیر مربوط ذہنی بیانات کے طومار سے بعض نمائشی ذہنی حلقوں کو متاثر کرتے ہیں لیکن نہ ان کا اپنے عصر کی حقیقت اور نہ اپنے قاری سے رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ان کے برخلاف ایسے ناول جو خارجی کوائف کی روشنی میں انسان کے باطن کی گہرائیوں کا جائزہ لے سکیں، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ انسانی فطرت جس طرح اپنے ماحول کے تغیرات سے اثر قبول

ہی نہیں، اس کا خارجی مواد بھی چھین لیا ہے۔ ایک جانب تیزی سے رونما ہونے والے واقعات سے افراد ہی نہیں شہر کے شہر غارت ہوتے اور ملک کے ملک افراتفری اور دہشت گردی کا شکار بن جاتے ہیں اور دوسری طرف افراد ایسی بے حسی اور سنگدلی میں مبتلا رہتے ہیں کہ انسانی ہلاکت ان کے ذہنوں کو جھنجھوڑنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ ناول نگار زندگی کے ہنگاموں کو نظر انداز کرکے ایسے ذہن کا سفر پیش کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں جس نے پہلے ہی صورتِ حال سے غیر منسلک ہوکر آسیب کی شکل اختیار کرلی ہے۔ شوکت صدیقی نے اس کے برخلاف حقیقتِ حال سے سروکار رکھا ہے اور اپنے ماحول کے درد و الم کو پیش کیا ہے ان کے ناول کے مواد میں صنعتی تہذیب کی سفاکی کے متعدد نقوش در آئے ہیں۔ اس دور میں واقعات کی رفتار تیز ہوگئی ہے بعض اوقات یہ رفتار اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ آئے دن کی زندگی کی سطح پر بھی دہشت، قتل، غارت گری اور عصمت ریزی کے حادثات اپنی سفاکی کے نقوش ثبت کرتے ہیں۔ وہ ناول نگار جو ان واقعات کو پوری سماجی زندگی سے متعلق کرکے دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے مواد کو قابلِ یقین اور مؤثر انداز میں ترتیب دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہر واقعہ اپنی سماجی معنویت کے اعتبار سے اہمیت اختیار کرلیتا اور اسی خصوصیت سے اس میں فن کی گہرائی آتی ہے۔ ورنہ اس سے الگ ہوکر اس طرح کے واقعات جہاں کہیں بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت اخباروں میں سنسنی پیدا کرنے والی خبروں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ "خدا کی بستی" میں ہولناک اجزائے واقعات سے کام لیا گیا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ اکثر مقامات پہ ترتیبِ واقعات ہنرمندانہ ہے بلکہ ان سے زندگی کے کئی تناقضات کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ناول نگار نے محض قاری کی دلچسپی سے کھیلنے کے لئے یہ واقعات گڑھے ہیں۔ بعض اوقات واقعات غیر معمولی ہوتے ہوئے بھی اس علت و دلیل سے وابستہ ہیں جن سے سماجی زندگی عبارت ہے اور اسی لئے قاری کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ یقین بن جاتے ہیں۔ جہاں کہیں مجموعی زندگی سے یہ تعلق کمزور پڑ جاتا ہے، وہیں ناول نگار کے بیان میں بھی فنی منطق سے زیادہ دل خواہی کا انداز نمایاں ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ دل خواہی شوکت صدیقی کی سماجی عینیت پسندی کی ایک لہر ہے لیکن اس لہر نے اسکائی لارکوں کی تنظیم اور کارکردگی میں حقیقت سے زیادہ تصوّر میں پناہ ڈھونڈھی ہے۔ اس تنظیم کے اغراض و دائرۂ عمل میں تصوّر و تصوریت کی جھلک زیادہ ہے۔ لیکن جہاں اس تنظیم کے افراد کا تصادم مفادات کی غرض مندانہ صورتوں سے ہوتا ہے وہاں کہانی پھر قابلِ یقین بن جاتی ہے اور غیر معمولی واقعات، بلوہ اور قتل وغیرہ سب "ممکن الوقوع" معلوم ہونے لگتے ہیں۔ درحقیقت ناول نگار نے زندگی کی آویزشوں کو خوب سمجھا ہے اور یہی ناول کی بڑی خوبی ہے۔ وہ قوتیں جو سماجی تخریب کے ملبے کے ڈھیر سے اُبھر کر غلط راہوں میں بھٹک رہی ہیں۔ ایک دن اپنی تباہی کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کی تباہی کا باعث بن سکتی ہیں۔ ان خرابیوں نے جس طرز زیست کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ زندگی کے حسن و خوبصورتی کو فنا کردینے والا ہے۔ انسانی برتری کی جدوجہد جاری ہے، لیکن اس کی کامرانی کے لئے آنسوؤں کی شبنم سے داغِ وجود کا دھویا جانا ضروری ہے۔ یہ حقیقتِ وجود کی وہ صورت ہے جسے زندگی کے تجربات سے حاصل کیا گیا ہے۔ فلسفۂ وجود کے مجرّدات سے نہیں۔ سلطانہ کی مظلوم نسائیت اس جدوجہد کا ایک اشارہ ہے۔ لیکن ناول نگار نے شاید اسے کافی نہیں سمجھا اور اسکائی لارکوں کی صورت میں اپنی سماجی عینیت پسندی کو خیابانِ خیال کی جانب مہمیز کیا ہے۔ ناول کے پیش کردہ حقیقی پس منظر

کرتی اور اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے اس کا بیان مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ اس میں زندگی کی مجموعی حرکت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تغیرات و تصادمات کے پس منظر میں مختلف سماجی سطحوں پر حقیقت کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ جائزہ اس وقت تک ناول نگاری کے اعلیٰ تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ جب تک کہ کردار، مواقع، جذبات اور تصورات سب کے سب فنکارانہ مشاہدہ، ترتیب اور صورتِ اظہار کی ہفت خواں سے گزر کر ایک منزل نہیں پا لیتے۔ "خدا کی بستی" اسی منزل کی طرف ایک سفر کی داستان ہے۔

اردو میں ناول کے بے شمار امکانات سے کم فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس لئے اکثر ناول پڑھنے والے کے دل میں کسی دیرپا تاثر کو جگانے سے قاصر رہتے ہیں۔ نہ ان سے تسکینِ آگہی ہوتی ہے اور نہ وہ جمالیاتی آسودگی بخشتے ہیں۔ کہیں موضوع کی طرف توجہ ملتی ہے تو ناول ایسا بے ہیئت ہو جاتا ہے کہ ناول نگاری اور صحافیانہ بیان میں فرق باقی نہیں رہتا اور کہیں ہیئت ایسی غالب آجاتی ہے کہ ناول کا موضوع دھندلکوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ موضوع اور ہیئت کے نامیاتی رشتہ سے جو وحدت ظہور میں آتی ہے، اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ بہرحال ان ناولوں میں جنہیں اردو ادب کا قابلِ لحاظ سرمایہ کہا جا سکتا ہے "خدا کی بستی" کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ہنری جیمس نے ہیئت کی طرف خصوصی توجہ کے باوجود اسے تسلیم کیا تھا کہ اچھا ناول کبھی سطحی ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتا اور اسی لئے وہ فن کی صفت کو فنکار کے ذہن کی صفت قرار دیتا تھا۔ وہ تجربہ کو تاثر پر مبنی ٹھہراتے اور خود تاثر کو تجربہ کہتے ہوئے ناول کو اس کی وسیع تر تعریف میں زندگی کا ذاتی اور براہِ راست تاثر بتاتا تھا۔ شوکت صدیقی نے "خدا کی بستی" میں اپنے مشاہدات، تجربات اور تاثرات کو عصری حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا تصورِ فن ذاتی کے بجائے اجتماعی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لئے وہ اجتماعی زندگی کی حرکت کو اپنے فن کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ ذات کے پنہاں خانہ سے باہر نکلتے اور اجتماعی زندگی کے اعمال کی روشنی میں ذہنوں بلکہ تصوراتِ زندگی کی کش مکشوں کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں پیش کرنے میں وہ ناول کے ذرائع اظہار سے کام لیتے اور موضوع و ہیئت میں مناسبت کی جستجو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ "خدا کی بستی" میں زندگی کی ظلومیت کو نمایاں کرتے ہوئے فن کے امکانات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان کی فنکارانہ استعداد، زندگی سے حاصل کردہ موضوع کو زندگی کی تعبیر بنانے میں صرف ہوئی ہے۔ وہ زندگی کی واضح تصویریں سامنے لاتے ہیں، لیکن ان تصویروں میں فن کی وہ معنی خیزی بھی ملتی ہے جو موضوع اور ہیئت کی مناسبت سے پیدا ہوئی ہے۔

رالف فاکس (RALPH FOX) نے ناول نگاری کو دورِ حاضر کی رزمیہ نگاری کہا ہے اور اسے عصرِ رواں کی پیشکش بتاتے ہوئے ناول کو تخیلاتی تہذیب کی سب سے اہم سوغات قرار دیا ہے۔ لیکن وہ ہم عصرانہ ناول میں ہیرو کے اصول کی نفی دیکھتا اور اپنے عہد کے ہیرو کی تشکیل کو دورِ حاضر کے ناول نگار کا اہم فریضہ جانتا ہے۔ رالف فاکس مشینی تہذیب سے جنگ میں انسان کو مشین سے گریز کرنے کے بجائے اسے کام میں لاتے دیکھنا چاہتا ہے اس کے ان بیانات پر غور کرتے ہوئے یہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ صنعتی تہذیب نے خود سماج کو مشین بنا دیا ہے۔ جس سے بیسکا کی انسان ڈھل کر نکلتے ہیں۔ اس تہذیب نے جہاں افراد اور سماج کے رابطوں میں استحصال اور نفرت کا زہر گھولا ہے۔ وہاں ناول کے کرداروں کو بے چہرہ بھی کر دیا ہے۔ اور ناول سے صرف سالم کردار

میں یہ تنظیم تخیل کا بہ تو معلوم ہوتی ہے اور اس میں تصوراتی استعانت کی رنگ آمیزی آجاتی ہے۔

شوکت صدیقی نے "خدا کی بستی" میں ناول کی تکنیک سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ موضوع، پلاٹ، کردار نگاری، بیان، مکالمے، واقعاتی، بیانیہ اور احساساتی آہنگ، پھر سب سے بڑھ کر نظارۂ زندگی کی صلاحیت نے ایک مربوط، منظم اور معنوی اعتبار سے پُر کار ہیئت کی تخلیق کی ہے۔ جس کے ذریعہ ناول نگار کا موضوعِ نظر تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ شوکت صدیقی نے اپنی فنی صلاحیتوں اور لکھتے رہنے کے تجربوں سے حاصل شدہ فنی واقفیت کا اس ناول میں بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ حقیقت، واقعات کی تہہ سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ناول نگار کو براہ راست اپنے تصورات زندگی کو پیش کرنے کی مجبوری سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے۔ ناول نگار کی کامیابی یہ ہے کہ وہ حقیقت کے مختلف اجزا کو اکثر ایک مناسب فنکارانہ صورت عطا کرسکا ہے۔ اس ناول میں ایسی جانداری اور حرکت کا احساس ہوتا ہے، جو اردو ناولوں میں عام طور سے کمیاب ہے۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ ناول نگار نے جس طبقہ کو خاص طور پر اپنا موضوعِ فکر بنایا ہے اس میں مصائب اور سختیوں کا مقابلہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے۔ اپنے محروم، تلخ اور درماندہ شب و روز کے باوجود یہی طبقہ زندگی کی بے پایاں قوتوں کا امانت دار ہے۔ آج اس کی بے پناہ صلاحیتیں رائیگاں جارہی ہیں لیکن کل اسی کے اجاڑ گھروندے سے آفتاب تازہ کی کرنیں پھوٹیں گی۔

"خدا کی بستی" میں مسیحائیت کم اور اذیت زیادہ ہے۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خاص کردار اساطیری قصوں کی طرح محض دکھ جھیلنے کو پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی جذباتی زندگی کی بنیاد طوفانوں پر ہے اور خود وہ ہر لحظہ، روح فرسا مصائب کے مقابل ہیں لیکن ناول نگار کی جیت یہی ہے کہ اس نے خارجی کوائف کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے بھی دبستان فطریت کے ناول نگاروں کے برخلاف فطرت و حوادث کی اندھی جبریت کے بجائے ان کرداروں کی آزمائش و ابتلا کا ذمہ دار انسانوں کی غیر انسانی حرکات کو ٹھہرایا ہے۔ "خدا کی بستی" کے کرداروں کی حرکات و محرکات کا جائزہ لینے میں خارجی حالات کی بے رحم منطق پوری طرح واضح ہوتی ہے لیکن اپنے آخری تجزیہ میں انسان کی ذمہ داری ہر صورت میں باقی رہتی ہے اور کسی فلسفہ کی آڑ لے کر خواہ وہ فطریت پر مبنی ہو یا وجودیت پر، اس کی ذمہ داری سے گریز و فرار کی صورت نہیں نکالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انفرادی فیصلے بھی درحقیقت سماجی جبر کے حامل ہوتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے صرف ظلم سہتے ہوئے افراد کے دکھ درد پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ان کے پس پشت سماج دشمن قوتوں کے اعمال کو بے نقاب کیا ہے۔ شوکت صدیقی کے اس ناول میں مختلف انواع کے افراد ملتے ہیں لیکن ان کی نوعی خصوصیت کے ساتھ ساتھ ان کی فردی شخصیت بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شوکت صدیقی کی دلچسپی انسانوں اور انسانوں کے انسانی اور غیر انسانی اعمال میں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ سوفوکلیس (SOPHOCLES) نے کہا تھا کہ "بہت سی چیزیں عجیب ہیں لیکن انسان سے عجیب تر کوئی چیز نہیں۔" چنانچہ شوکت صدیقی نے بھی واقعات کی حیرت انگیزی سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کے پیش کردہ نقوش میں سب سے زیادہ مؤثر نقش خود انسان کے حیرت انگیز اعمال کا ہے۔ جہاں تک ناول کے خاص دائرۂ عمل کا تعلق ہے، ناول نگار نے کوئی نئی دنیا آباد نہیں کی ہے بلکہ اسی دنیا کے نقوش اس طرح ابھارے ہیں کہ ہر نقش اپنی جگہ جاندار بھی ہے اور اس کے بننے میں سماجی رنگوں اور خطوں کا عمل بھی واضح

ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ناول نگار کا سماجی نقطۂ نظر، موضوعات کے انتخاب واقعات کی ترتیب اور صورتِ اظہار سے ظاہر ہو جاتا ہے لیکن اسے باہر سے عائد نہیں کیا گیا بلکہ یہ خود قصہ کی اندرونی منطق سے منکشف ہوتا ہے، اس ناول میں معروضیت کا احساس اس لئے بھی ہوتا ہے کہ قصہ کی اندرونی منطق اور بیرونی نقطۂ نظر میں بڑی فنی ہم آہنگی ہے پھر ناول نگار کے موضوعِ نظر کا انسانی عنصر جو قصہ کی رگ و پے میں سیّال خون کی طرح دوڑ رہا ہے، اپنے اندر اثر آفرینی قوت بھی رکھتا ہے۔

"خدا کی بستی" میں ہمیں واقعات کے ساتھ ساتھ سماجی تصورات کی واضح جھلک ملتی ہے۔ آج کا ناول نگار اپنے دور کے خیالات و تصورات سے سروکار رکھنے پر مجبور ہے۔ یہ خیالات و تصورات ہمیں طوفانوں کی طرح گھیرے ہوئے ہیں اور بعض ناول نگاروں کی طرح ان سے آنکھیں بند کر کے گزر جانے سے مکمل لاتعلقی کے بجائے ایک منفی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ معاشی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی سطحوں پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اردو ناول بھی ان سے متاثر ہوا ہے۔ لیکن فنکارانہ طور پر متاثر کرنے کی صلاحیت بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے لئے ایک جانب ناول کے فن سے واقفیت ضروری ہے اور دوسری جانب خود ناول نگار کا سماجی شعور اس کے فن کی راہیں متعین کرتا ہے۔ فطرت انسانی کا مطالعہ بھی (جس کی مدد سے ناول نگار کرداروں کے ذہن و عمل کے محرکات کو پیش کرتا ہے) اس کے سماجی شعور ہی کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد محض تحلیل نفسی کی موشگافیاں نہیں، مختلف وسیلوں سے انسان اور انسان کے سماجی رشتوں کا جائزہ لینا ہے ہر لاشعوری یا شعوری رجحان، خواہ کتنی ہی انفرادی سطح پر پیش کیا جائے ماحول سے کسی نہ کسی تعلق کی غمازی کرتا ہے اور ناول نگار کسی نہ کسی انداز سے عصری زندگی کی کوئی نہ کوئی عکاسی کرتا ہے۔ اس عکاسی کے ذریعے مجموعی انسانی زندگی کی گرفت، بڑے ناول نگاروں کا حصہ ہے۔ چنانچہ محض نفسیاتی عقدہ کشائی ناول کے ذریعہ، زندگی کے عقدہ کا حل نہیں، اس کی ایک بہت ہی قلیل الحیات تعبیر ہے۔ اچھا ناول نگار نفسیاتی توضیح کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں وہ وسعت و کشادگی پیدا کرتا ہے کہ اس سلسلۂ حیات کے مختلف مناظر معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے ناول کا دلچسپ، انسانی معاملات و مسائل سے منسلک اور فنی طور پر منظم ہونا ہی کافی نہیں، اسے پڑھنے والوں کے شعور کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دینا ہے۔ چنانچہ کسی ناول کا جائزہ لیتے ہوئے، ان سماجی تصورات کا جائزہ لیا جانا بھی ضروری ہے، جن کی وہ نمائندگی کرتا ہے۔ ناول نگار کے لئے زندگی کے مختلف حادثات محض ذہنی نقوش، تاثرات یا علامات کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کے ذریعے وہ انسانی فطرت کی اپنے عصر و ماحول سے تعلق کی عکاسی کرتا اور ترتیب اقدار کے نئے امکانات کی جانب ذہنوں کے دریچے کھولتا ہے۔ اس لئے اس کا ان حادثات کو خیال کے ایک مربوط سلسلے سے وابستہ کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اس سلسلۂ خیال کی اپنے علم کی روشنی میں تنقیح کرتا اور زندگی کی مجموعی آگہی کی کوششوں کو آگے بڑھاتا ہے۔ اگر ناول نگار ان امور کے خاطر خواہ سر انجام دینے میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کا پیرایۂ اظہار بھی غیر تشفی بخش رہتا ہے اور اس کے فن کی صداقت ایک وسیع تر صداقت کا حصہ بننے اور اس کی جھلک پیش کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔

اگرچہ "خدا کی بستی" میں اپنے دور کی معاشرتی خرابیوں کو بہت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے، لیکن اس کا بنیادی مسئلہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس ناول کے اجزائے بیان ناول نگار کے سماجی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے ذریعے زندگی کی بدصورتی کے نقشے فنی حسن کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن زندگی کی یہ بدصورتی مستقل

بدی کا وہ نقش ہے، جسے آج کے سماج نے مستحکم کیا ہے اور جس کے خلاف ناول نگار کبھی اسکائی لارکوں کے ذریعے اور کبھی خود دیدی سے رزم آرا مظلوم انسانیت کے درد و غم کے واسطے سے اپنے فن کی آواز بلند کرتا ہے۔ دستوئیفسکی (DOSTOYEVSKY) کی طرح شوکت صدیقی کے یہاں اس بدی میں دہشت کے عناصر شامل ہیں اور احساس میں کرب کی وہ گہرائی ملتی ہے جس سے ان کے بیان میں معنویت کے نئے پہلو ابھرتے ہیں۔ دستوئیفسکی ہی نے کہا تھا کہ "جہاں محبت نہیں ہے، وہاں خرد مندی نہیں ہے" اور شوکت صدیقی کے اس ناول میں بھی بدی کی پُر دہشت تصویر کشی کے باوجود انسانی درد مندی اور محبت کے وہ نشانات ملتے ہیں، شوکت صدیقی بدی کے مسئلہ کو معاشرے کی وصفی تبدیلی کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے یہ بدی انسانی فطرت کی پیدا کردہ نہیں، غلط معاشرتی رشتوں کی دین ہے۔ دستوئیفسکی کے ناولوں میں بدی کے ابعاد وسیع ہیں لیکن اپنے حدود میں شوکت صدیقی نے بھی بدی کی دہشت کو پُر تاثیر انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ بدی کو جدید صنعتی دور کی پیدا کردہ خرابیوں کا لازمی نتیجہ سمجھتے ہیں۔ جدید صنعتی نظام کی تنقید کے متوازی نقوش، اس دور کے متعدد لکھنے والوں کے یہاں مل جاتے ہیں۔ شوکت صدیقی کی تخلیقی بصیرت یہ ہے کہ وہ ان نقوش کو انسانی فطرت اور خارجی حالات کے تناظر میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کا فن زندگی کی توانائی کا آئینہ بن جاتا ہے۔ لوئیس ممفورڈ (LEWIS MUMFORD) نے قرونِ وسطیٰ کے اقتصادی عمل سے دورِ جدید کے اقتصادی عمل کا فرق بتاتے ہوئے کہا تھا کہ جب وقت کو دولت سے تعبیر کیا گیا تو ایسے تصورات میں فلسفیانہ طور پر مساوات قائم کی گئی جن کا اتحاد ممکن نہ تھا۔ ڈی ایچ لارنس بھی زیادہ سخاوت مند اور زیادہ انسانی نظام کے لئے دولت کی اقدار کے بجائے زندگی کی اقدار ضروری سمجھتا تھا۔ رالف فاکس نے انگریزی ناول کی تاریخ کے بڑے کارناموں کو نظامِ سرمایہ کے خلاف جدوجہد سے بچنے کی کوئی نہ کوئی کوشش قرار دیا تھا۔ شوکت صدیقی نے "خدا کی بستی" میں انسانی ہجوم، اس کی ترقی کے خوابوں اور صنعتی تہذیب کے تضادات کو بخوبی پیش کیا ہے۔ شوکت صدیقی کی دلچسپی ہجوم انسانیت میں کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ مختلف سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ اس کی نئی نئی صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ آج کی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، ناول نگار نہ صرف اس سے خوب واقف معلوم ہوتا ہے، بلکہ فنی طور پر وہ توجہ قائم رکھنے، اسے تیز کرنے اور حالات پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالنے کا گُر بھی جانتا ہے۔ اس کا بیان دلچسپی پیدا کرتا، جھنجھوڑتا اور دیر تک ذہن کو مصروف رکھتا ہے۔ یہ بیان محض واقعات کا بیان نہیں، اس کے پس پردہ ہمیں سماجی اقدار کی تنقید بھی ملتی ہے۔ وہ جہاں معیارِ تہذیب، محض روپیہ ہے، آخر کار تمام انسانی امنگوں کا مدفن بن جاتا ہے۔ سماج کے جغرافیہ کو اس ناول میں اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ کرداروں کے اعمال، نقشہ کے مختلف خطوط نظر آتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جو کچھ زندہ ہے، اسے ہم زندہ رکھیں اور جسے موت حاصل ہو گئی ہے اسے دفنا دیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ موت ابھی تک زندگی کے روپ میں دندنا رہی ہے اور زندگی، تاریک گوشوں میں موت کی طرح سر چھپائے پڑی ہے۔ چنانچہ حقیقت کی یہ ستم ظریفی فن کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر باشعور لکھنے والا اپنے طور پر اس چیلنج کا جواب دیتا ہے۔ "خدا کی بستی" بھی اس لحاظ سے موجودہ صورتِ حال پر ایک کاری ضرب ہے۔ یہ تہذیب جو اپنے ماضی سے منقطع اور مستقبل سے ہراساں ہے۔ ڈی، ایچ لارنس کے الفاظ میں "اکھڑے ہوئے درخت" کی مانند ہے۔ شوکت صدیقی نے اس

تہذیب کی بدی، کھوکھلے پن، تاریکی، حرص، حماقت اور جنون کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔ ہنری جیمس کے الفاظ میں "عدمِ انسانیت کا مہیب انجام" ہمیں گھیرے ہوئے ہے۔ کیا اس زندانِ غم میں روشنی کی کوئی کرن نہیں؟ "خدا کی بستی" میں موجودہ زندگی کی نہایت حقیقی و مؤثر تصویر کشی کرتے ہوئے بھی ناول نگار نے نئی کے تصور میں صورتِ خیال کو حقیقت بنانا چاہا ہے اور جدید عہد کی حقیقی صورت سازی کے بجائے خیال کے رنگ بھرے ہیں چنانچہ نئی صورتِ زندگی کے بعض خاکوں میں فن اور حقیقت کی وہ مطابقت نہیں ملتی، جو مجموعی طور پر "خدا کی بستی" کا نشانِ امتیاز ہے۔

اردو ناول نے نذیر احمد، سرشار، شرر، سجاد حسین، مرزا رسوا اور پریم چند جیسے باکمالوں کے ہاتھوں نشوونما پائی۔ اس کے دورِ جدید میں قاضی عبدالغفار، کرشن چندر، سجاد ظہیر، اپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، عزیز احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر نے اسے جدید رجحانات سے آشنا کرتے ہوئے بعض نئے اسالیب اظہار بخشے۔ نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور ل احمد وغیرہ نے اگر رومانوی تصورات کو فروغ دیا ہے تو نئے دور میں حقیقت پسندی کی روایت بھی مستحکم ہوئی ہے پھر حقیقت کی مختلف تعبیریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ناول نگاروں کا ایک بڑا سلسلہ جن میں عبداللہ حسین، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، رشیدہ رضویہ، نثار عزیز بٹ، الطاف فاطمہ اور متعدد دوسرے ناول نگار شامل ہیں حقیقت کی اپنے اپنے طور پر تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں محمد خالد اختر، غلام عباس حجاب امتیاز علی، قدرت اللہ شہاب اور غلام الثقلین نقوی وغیرہ نے قصہ گوئی کی روایت سے تعلق رکھتے ہوئے بعض نئے رجحانات کی عکاسی کی ہے۔ وہاں ناول نگاری میں جدید تجربات کا سلسلہ انتظار حسین کی یادوں کی وہ تشخی کی توسیع جدید سے لے کر انور سجاد، محمد صدیق سالک، انیس ناگی اور فہیم اعظمی کی حسیات جدید تک پہنچتا ہے۔ فہیم اعظمی کی "جنم کنڈلی" وہ حد ہے جہاں تجربے کے ہاتھوں ناول کی ہیئت کو شکست و ریخت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناول کے فن میں تجربات کی ہمیشہ گنجائش رہی ہے، لیکن "خدا کی بستی" کی جدت مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں جدت کے نقوش، جدید گفتگو، عالمانہ اظہار اور رمزیہ صورت سازی کے ذریعے نہیں پیش کیے گئے ہیں، بلکہ یہ جدت ایک پہلے سے مختلف اور جدید معاشرہ کی انسانی لاتعلقی پسماندگی اندازی کا عکس ہے۔ اس میں جدید شہروں کی متمدن زندگی کے پہلو بہ پہلو زیریں زندگی کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ متمدن سطح کی زندگی اور متمدن سطح سے نیچے کی زندگی کے نقوش اس ناول میں گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ یہی نقوش اس کے نقوش اس ناول میں گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ یہی نقوش اس ناول کو قدیم روش سے الگ کرتے اور جداگانہ حیثیت بخشتے ہیں۔ جدید ناول نگار قصہ کے اہتمام پر کم توجہ کرتے ہیں۔ فن ناول نویسی میں ان کی جدت اختراع تکنیک کے اعتبار سے بڑا درجہ رکھتی ہے لیکن ان کے یہاں اکثر زندہ، حقیقی اور نمو یافتہ کرداروں کی جگہ خیالی صورتیں اور تجریدی پیکر نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف شوکت صدیقی نے کردار نگاری اور قصہ کے در و بست پر خاص توجہ کی ہے اور بڑی حد تک زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں سے واسطہ رکھا ہے۔ "خدا کی بستی" میں خون اور گوشت کے پیکر، درد و مایوسی کے عوامل اور زندگی کی بدصورتی اور بدوضعی کے نقوش، بڑے حقیقت شعارانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شوکت صدیقی کے بیان میں جزئیات کی تفصیل آگئی ہے۔ اس ناول میں جدید زندگی کی ناہمواری کے باوجود

قدیم ناول کی مرقع نگاری پائی جاتی ہے اور یہ مرقع نگاری فن کے سلیقہ اور اہتمام کا پتہ دیتی ہے۔

" خدا کی بستی " کا دائرہ صرف ایک خطۂ آبادی کی داستان تک ہی وسیع نہیں، بلکہ یہ ناول ہمیں آج کی وسیع صورت حال کا ایک نمائندہ نقش نظر آتا ہے۔ اس کا قصہ صرف ایک مفلوک الحال گھرانے کی تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کے کئی رخ ہمارے سامنے اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ استحصال، ظلم اور گراوٹ کے نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس انداز سے ان تصویروں کو ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے، اس سے حالات کے خلاف احتجاج کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ شوکت صدیقی نے اس ناول کے قصہ کو اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ کرداری ارتقاء کے ساتھ ساتھ معاشرتی صورت حال کی تہیں بھی کھلتی جاتی ہیں۔ قصہ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں حالات کی بے رحم جبریت کا احساس ہو جاتا ہے۔ اسباب و محرکات کے سنگین شکنجے میں پھنس کر زندگیاں تباہ ہوتی ہیں اور عصمتیں پامال۔ یہ سارا تماشا اس طرح ہوتا ہے، جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں، جیسے اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا، جیسے انسان کی انسان کے ہاتھوں بربادی ہی اس کی تقدیر ہے۔ " خدا کی بستی " کا اصل قصہ سلطانہ اور اس کے گھرانے کی سرگزشت ہے۔ یہاں ناول نگار نے حقائق کی سنگینی کا اظہار کرتے ہوئے سختی سے حقیقت شعارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ دوسرا ضمنی قصہ، اسکائی لارکوں کا ہے کہ اس میں تخیل اور عینیت پسندی کی جھلک ملتی ہے دونوں قصوں کی وحدت مکمل نہیں لیکن سلمان، نیاز اور پھر خود سلطانہ کسی نہ کسی حد تک ضمنی قصہ کو اصل قصہ سے ملانے والی کڑیاں ہیں۔ اگر ہم ان دونوں قصوں کو پیش نظر رکھیں تو ناول کے موضوع کی تجزیاتی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایک جانب اسباب و حالات کے مارے ہوئے پامال انسان ہیں اور دوسری جانب زندگی کی مہیب وحشت صورتوں کو بدلنے کی کوششیں۔ اسباب و حالات کا جبر انسانی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور " جن ہاتھوں کو قلم کی ضرورت تھی، ان میں ہتھکڑیاں ڈال دیتا ہے "۔ لیکن اس جبر حالات کے درمیان زندگی کو باشعور، خوبصورت اور ارفع بنانے کی کوششیں بھی ملتی ہیں۔ یہ کوششیں وقتی طور پر ناکام ہو سکتی ہیں لیکن ان کے جاری رہنے ہی پر انسانی فلاح کا مدار ہے۔

شوکت صدیقی نے پہلے اور اصل قصہ کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ یہاں ان کے نظریہ اور فن میں بڑی ہم آہنگی ہے اور ان کے مشاہدۂ زندگی کی وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ جزئیات کو اس مہارت سے بیان کرتے ہیں کہ قصہ کے نقوش روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے قصہ کی افلاطونی طرز کی تنظیم چند بے نیاز معاش اصلاح پسندوں کا مشغلہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی رہنمائی بعض تعلیم یافتہ افراد کے ہاتھوں میں ہے اور اس کا ابتدائی سرمایہ ایک متمول فرد کے جذبۂ اصلاح نے فراہم کیا ہے۔ اگرچہ سرسری طور پر اس تنظیم کو زندگی کی جدوجہد کا ہمدرد دکھایا گیا ہے، لیکن حقیقی تغیر آفریں تحریکات اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں۔ اس کا کام ابتدائی تعلیم بالغاں کے اسکول اور ہسپتالوں کے قیام تک محدود ہے۔ لیکن ان کاموں کے لئے کسی اسکائی لارکوں جیسی تصور پسند تنظیم کی ضرورت نہیں۔ آج کے متمول طبقہ کے نمائندے یہ خدمات زیادہ بہتر طور پر اور زیادہ کامیابی سے انجام دیتے ہیں لیکن یہ ان کے کردار کا صرف ایک رخ ہے بہرحال اسکائی لارکوں کی یہ تنظیم بہتر زندگی کے تصور کی ایک کوشش ضرور ہے۔ چنانچہ بعض ان حلقوں میں جہاں سماجی حقیقت نگاری، غالب رجحان کی حیثیت رکھتی ہے، اسکائی لارکوں کی تنظیم کو قابل قبول اور مستحسن

سمجھا گیا۔ البتہ جس خطۂ آبادی کا شوکت صدیقی ذکر کر رہے ہیں وہاں اس کی سماجی بنیادیں کمزور معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کے ذریعے ناول نگار کی سماجی حیثیت پسندی کے اظہار کے ساتھ ساتھ قربانی، ایثار اور انسان دوستی کا اشارہ ضرور ملتا ہے۔

کردار نگاری "خدا کی بستی" کا سب سے مضبوط پہلو ہے۔ حالات کے دائروں میں کرداروں کی شخصیتیں خود ابھرتی ہیں ناول نگار کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ کردار جو شروع میں محض ہیولے کی حیثیت رکھتے ہیں، واقعات کی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنی تشکیل کے مدارج طے کرتے اور آخر میں اس طرح جانے پہچانے معلوم ہونے لگتے ہیں کہ ناول کے اختتام پر ان سے جدا ہوتے وقت افسوس ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے گرد و پیش سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ ہونے والے واقعات کے عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ بھی ان سے متعلق واقفیت فراہم کرتا ہے۔ اس طرح کرداروں کی شخصیتیں اور محرکات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ پھر کرداروں کے واسطے سے ہم انسان اور سماج کے تصادمات تک رسائی حاصل کرتے ہیں اس ناول میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اپنے نمو و ارتقاء سے اکثر کردار سالمیت اختیار اور کردار کی منطق پر پورے اترتے ہیں۔ اس کے بیشتر کردار زندگی کی حرارت سے زندہ ہیں، اور محض جامد، سپاٹ اور کتابی نہیں۔

"خدا کی بستی" میں سب سے نازک اور سب سے اہم کردار سلطانہ کا ہے جو کئی بار لٹتی ہے، یہاں تک کہ اپنے سوتیلے باپ کے ہاتھوں بھی لوٹی جاتی ہے، لیکن اس کی فطری معصومیت، سادگی اور دلکشی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس مظلومیت سے اس کی نسائیت اور نکھر آتی ہے۔ اپنے بھائیوں سے محبت کرنے والی یہ بہن الگ الگ وقفوں میں دونوں بھائیوں کی مفارقت کے صدمے سہتی، ماں کی رقابت برداشت کرتی، اپنے چاہنے والوں کے ہاتھوں مایوس ہوتی، نئی امیدیں باندھتی اور اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھتی، ناجائز بچے کو جنم دے کر سوتیلے باپ کی داشتہ کہلاتی اور اس کے قتل کے بعد غاصبوں کا لذیذ شکار بنتی ہے۔ لیکن اس کی نسائیت کبھی نہیں مرتی اور جب علی احمد کی بیوی بن کر وہ پیار بھری ازدواجی زندگی گزارنے لگتی ہے تو اس کی فطری دلآویزی چمک اٹھتی ہے۔ بظاہر سلطانہ ایک سیّال کردار کے مانند واقعات کے تمام سانچوں میں ڈھل جاتی ہے ۔ لیکن بباطن اس کی فطری معصومیت بڑی سخت جان ہے اور یہ سیّال کردار اپنی پائیدار خصوصیات و صفات بھی رکھتا ہے۔ ناول نگار نے کہیں سلطانہ کو مثالی بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے اس میں بڑی لوچ اور نزاکت ہے۔ اس کردار تراشی میں حقیقت کا رنگ غالب ہے اور کردار کی انسانیت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ انسانیت اپنی کمزوریوں کے باوجود دلکشی رکھتی ہے۔ جب نیاز، کنواری سلطانہ سے پہلی بار اپنے کمرے میں چل کر سو جانے کی فرمائش کرتا اور اس کو بازوؤں میں اٹھا لیتا ہے تو سلطانہ کوئی مزاحمت نہیں کرتی اور سہمی ہوئی اس کے سینے سے لگ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بیان میں شوکت صدیقی نے فنی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ سلطانہ کو اپنی لق و دق، تنہا، مایوس اور بے سہارا زندگی کا احساس ہے۔ اس ذہنی فضا کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے جو خارجی فضا قائم کی ہے (موسلا دھار بارش، ہوا کی چیخیں، قدموں کی آواز، تاریکی وغیرہ) وہ بھی جسمانی سپردگی کے اس سانحہ کا پس منظر ہے۔ البتہ اس جگہ تفصیل کی ایک فروگذاشت ملتی ہے۔ نیاز کے آنے سے پہلے بجلی فیل ہو جاتی ہے اور اس کے آنے کے بعد بھی یہ دکھایا گیا ہے (خدا کی بستی۔ پہلا

ایڈیشن) کہ بجلی کی روشنی واپس نہیں آئی تھی۔ لیکن اس کے آنے پر گھنٹی زور سے بجتی ہے اور دروازہ کھلنے کی آواز ابھرتی ہے۔ اگر اس گھنٹی (DOOR BELL) کا بجلی سے تعلق ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہ اسرار، تاریکی اور بارش کی فضا ہمیں ایڈلن پو کے ایک افسانے میں بھی ملتی ہے، جس کا نتیجہ ہیروئن کی خودسپردگی ہے۔ شوکت صدیقی کے یہاں یہ بیان خارجی فضا کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور سماجی عوامل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور مفہوم کی وسعتیں رکھتا ہے۔ سلطانہ کی عصمت ریزی جبرِ حالات کے ہاتھوں معصوم انسانیت کی تباہی ہے۔

سلطانہ کے بھائی نوشا اور اس کے دو ساتھیوں شامی اور ساجد کے ذکر سے اس ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ ان پر جو کچھ بیتی اس سے نہ صرف ان کے کردار کے ارتقائی مطالعہ کا موقع ملتا ہے بلکہ اس طرح ہمیں ناآسودہ اور مسخ شدہ زندگی کے ڈھانچے بھی نظر آتے ہیں۔ نیاز ایک کباڑی ہے اور انسانی زندگیوں کو بھی کباڑ سمجھ کر ان کا مول لگاتا ہے۔ وہ سلطانہ کی خواہش رکھتے ہوئے، سلطانہ کی ماں سے شادی کرتا اور ڈاکٹر خیرات محمد موڈ کے تعاون سے اسے ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ لیکن وہ جس راہ پر چل رہا ہے وہ زندگی کی نہیں، موت کی راہ ہے۔ خان بہادر فرزند علی جن کے اشتراک سے وہ ٹھیکیدار بن کر مارکیٹ کی ناقص تعمیر کرتا اور طوفان میں عمارت کے گر جانے سے بہت سی جانوں کے زیاں کا سبب بنتا ہے، خود اپنی حفاظت کے خیال سے اس کے قتل کی سازش کر رہے ہیں۔ لیکن اس سازش کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے اپنا قرض چکانا پڑتا ہے۔ وہ سلطانہ کے دوسرے بھائی الو کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ جو پہلے ایک تانگے والے اور پھر احمد جان کے ہاتھ لگتا ہے جو اسے بدراہی کی راہ دکھاتے ہیں۔ سلطانہ کا پہلا بھائی نوشا واپس آکر شامی سے دو جواب لکشا چلا جاتا ہے، ماں بہن اور بھائی کی ساری روئیداد سنتا اور انتقاماً نیاز کو قتل کر دیتا ہے۔ نیاز کی سیرت کشی بڑی حد تک کامیاب ہے لیکن اس کردار میں بڑے کرداروں کی راہ گم کردہ بڑائی نہیں، صرف پروان یافتہ برائی ملتی ہے۔ سلطانہ کی ماں کو مصیبتوں نے دنیا شناس بنا دیا ہے لیکن وہ اپنی تنہائی اور معاشی بدحالی کی وجہ سے نیاز کے جال میں پھنس جاتی ہے۔ اپنی بیٹی سلطانہ کو وہ بغیر شادی کے سلمان کے حوالے کر دینا چاہتی ہے کیونکہ بھاگ جانے کی رسوائی کے مقابلے میں نیاز کے ساتھ رہنا اس کی دانست میں زیادہ خطرناک ہے۔ لیکن سلمان حسب وعدہ نہیں آتا۔ رات ڈھل جاتی ہے اور دروازہ پر دستک نہیں ہوتی۔ ماں اور بیٹی کی آنکھوں میں جلتے ہوئے امید کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے اس واقعے کو بڑے مؤثر انداز سے پیش کیا ہے۔ یہاں زندگی کے حزن کی لَے تیز ہو گئی ہے اور محرومی کا احساس ابھر کر فضا پر چھا جاتا ہے۔ سلمان کا کردار آج کے ذہین لیکن بے عمل تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ناساز ماحول، معاشی دشواری، انتشار اور خیال پرستی نے ایک طرح کی مجہولیت پیدا کر دی ہے اور وہ دنیا کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس لئے آزمائش کے موقعوں پر سلمان راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ وہ طبعاً نیک ہے لیکن اسے نیکی کا راستہ معلوم نہیں۔ پہلے وہ سلطانہ کا ہاتھ اس لئے نہیں تھام سکا کہ اس کی جیب خالی تھی اور دوسری بار فلک پیما (سکائی لارکوں کی تنظیم) سے وابستگی، اسے اس ارادہ سے باز رکھتی ہے۔ لیکن یہ دراصل اس کی اپنی مجہولیت ہے۔ جس کا اظہار بعد کے واقعات سے ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بیوی کا شوہر بن کر کمانے کی دھن میں گرفتار ہونے کے

بجائے کہ اس تنظیم سے وابستہ رہ کر صرف اپنی ضروریات پوری کر لینا کافی سمجھتا ہے لیکن جب اس تنظیم پر حملے سے حالت ابتر ہو جاتی ہے تو وہ نیاز کے ساتھ سلطانہ کو آسودہ اور مطمئن دیکھ کر، اس کی دل اٹھنے والی نگاہ و غلط انداز کا غم لئے ہوئے، رات کی ٹرین سے گھر روانہ ہو جاتا ہے، وہاں جا کر وہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ اپنے بہنوں اور بھائیوں کو متوسط طبقے کی اوپر اٹھنے کی بے روح جد و جہد میں مصروف دیکھتا اور آخر پانچ ہزار روپیہ نقد اور ملازمت کے وعدے پر ایک ایم۔ ایل۔ اے کی بھتیجی سے شادی کے لئے رضامند ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی سیدھی سادی اور گھریلو بیوی کو لے کر ایک غیر ملکی فرم میں ملازمت کے لئے کراچی پہنچتا ہے، تو رفتہ رفتہ اس شہر کی ہوا، اس کی اپنی مجہولیت اور سینئر افسر جعفری کی پیش قدمی سے اس کی ازدواجی زندگی کانٹوں کا بستر بن جاتی ہے۔ جعفری اس کی بیوی کو خود ہی لے لئے نہیں پھرتا بلکہ غیر ملکی ڈائرکٹر کو اپنی ترقی کے لئے بطور رشوت بھی پیش کرتا ہے۔ آخر کار سلمان کی انسانیت اور مردانگی جاگ اٹھتی ہے وہ ملازمت سے استعفیٰ اور بیوی کو طلاق دے کر پھر فلک پیما کا رخ کرتا ہے، جہاں سلطانہ علی احمد کی بیوی بن کر پہلے ہی سے موجود ہے۔ وہ اس نئے صدمے سے دوچار ہوتا ہے لیکن جلد ہی معاشرتی اصلاح کی کوششوں میں مشغول ہو کر اپنا راستہ متعین کر لیتا ہے۔ شوکت صدیقی نے اس کردار کو بڑی نفاست سے ابھارا ہے اور اس کی کمزوریوں، گمراہیوں اور فرار کی کوششوں کے باوجود مستقبل کی روشنی کی جھلک رکھتا ہے، اور اس دور کے نوجوانوں کی تخیلاتی کیفیتوں کا آئینہ ہے اس کے برخلاف جعفری کا کردار درآمد شدہ مصنوعی طرز زندگی کی ایک جھلک ہے اور ذہن کی پستی کو پیش کرتا ہے۔ خان بہادر فرزند علی اس ناول میں بدصورتی، برائی اور سماج دشمن کارروائیوں کا سرچشمہ ہیں انھیں سماج میں اونچا مقام حاصل ہے۔ ان کے فرزند غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور بقول ناول نگار "عوام لوشا، راجہ، شامی اور انو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل کر کے جیل چلا جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرتا ہے اور کوئی بیچڑوں کے ساتھ رہ کر کوٹھے مٹکاتا ہے۔" البرٹ کامیو نے بدی کے مسئلہ کو سماجی سے زیادہ کائناتی سمجھتے ہوئے اپنی ایک گفتگو میں کہا تھا کہ "میں بدی سے تمہاری دہشت کا حصہ دار ہوں، لیکن تمہاری رجائیت کا نہیں۔ میں اس کائنات کے خلاف جد و جہد جاری رکھوں گا، جس میں بچے دکھ سہتے اور موت کا شکار ہوتے ہیں۔" شوکت صدیقی نے اپنے احتجاج کو سماجی حدود میں رکھا ہے، کیونکہ ان حدود میں بھی بدی کی روک تھام سے درد و اجل کے سانحوں میں نمایاں کمی آ سکتی ہے

خان بہادر فرزند علی کا کردار بھی بدی ہی کا کردار ہے۔ اگرچہ یہ کردار مجموعی طور پر کم ابھرتا ہے، لیکن اس سے بدی کا تاثر قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح علی احمد اور اکثر دوسرے اسکائی لارک زندہ کردار کم اور اچھائی کے نشانات زیادہ ہیں۔ پھر بھی علی احمد اور صفدر بشیر میں ایک حد تک زندگی کی علامات پائی جاتی ہیں۔ علی احمد کو اس کی سنجیدگی، تفکر اور پھر دل سوزی نے کچھ نہ کچھ زندگی بخشی ہے، تو صفدر بشیر کی آزردگی (اسکائی لارکوں کی طرف سے اس کے مقابلے میں ڈاکٹر زیدی کی نامزدگی کی وجہ سے) لاپروائی، قطع تعلق اور پھر ڈرامائی موت نے اسے بعض انسانی خد و خال عطا کئے ہیں۔ اس کردار کی تعمیر میں ناول نگار نے نفسیاتی حقیقت اور سماجی صداقت دونوں کو مدِنظر رکھا ہے۔ اس کے باوجود یہ کردار کتاب کے صفحوں سے ابھر کر ہمارے درمیان سانس لیتا ہوا محسوس نہیں ہوتا، کیونکہ کرداری تفصیلات یا ان کے ایک مجموعی نقش کی طرف ناول نگار نے پوری توجہ صرف نہیں کی ہے۔ ناول نگاری اور ناول میں کردار نگاری کے استاد معظم ٹالسٹائی کے بارے میں تو ایک

روسی نقاد نے یہاں تک کہا ہے کہ "اس کے ناول "حرب وصلح" میں کتے بھی انفرادیت رکھتے ہیں" البتہ شوکت صدیقی نے جہاں نچلی سطح کے مظلوم کردار پیش کئے ہیں، وہاں اکثر چند ٹیڑھے ترچھے خطوط ہی سے انھیں متحرک اور جاندار بنا دیا ہے۔ وہ کردار بھی جو تھوڑی دیر کے لئے ہمارے سامنے آتے ہیں، زندگی کی رمق سے خالی نہیں ہیں۔

ناول نگار نے کرداروں کا شہر آباد کیا ہے۔ ان کرداروں کی تصویر کشی میں مکالمے سے بہت کام لیا گیا ہے۔ مکالمہ نگاری کا ناول نگار کو اچھا سلیقہ ہے۔ عام گفتاری الفاظ (SLANGS) کے استعمال، طبقاتی روزمرہ کے صرف اور مختلف سطحوں کی آئینہ داری کی وجہ سے یہ یہ مکالمے بڑے جاندار بن گئے ہیں، جہاں ناول نگار نے مختلف جذباتی اور واقعاتی صورتوں کو خوش انداز میں پیش کرنا چاہا ہے۔ وہاں بھی اکثر مکالمے نے مدد کی ہے۔ مثلاً ناول کے آغاز اور اختتام کے قریب مندرجہ ذیل جملے بڑی حد تک اس پورے قصہ کا خلاصہ ہیں۔ آغاز میں سلطانہ نوشا سے کہتی ہے "او موٹے بتے رضائی تو اوڑھ لے، تجھے سردی بھی تو نہیں لگتی" یہ گویا بھائی بہن کی پیار بھری چھیڑ کے علاوہ ایک واقعاتی و کرداری صورت کا تعارف ہے۔ لیکن اختتام کے قریب سلطانہ کا یہ جملہ (جب نوشا کو نیاز کے قتل کے جرم میں حبسِ دوام کی سزا ہوتی ہے۔) "نوشا میرا بھائی (شاید میرے لئے بہتر ہوتا) خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر نہ جا، نہ جا، نوشا نہ جا، میں مر جاؤں گی نوشا، نوشا" جذباتی لہروں کے ساتھ ساتھ اپنے اندر حزن، تلاطم اور چیخ کی کیفیتیں رکھتا ہے۔ ناول نگار نے اپنے موضوع کی پیچیدہ صورتوں کی تصویر کشی میں مکالمہ اور فضا دونوں سے کام لیا ہے۔ اگرچہ بیان اکثر شاعرانہ اظہار سے خالی ہے، لیکن بعض اوقات کھردری حقیقتوں کی ترجمانی میں یہ آرائش سے عاری بیان بھی شاعرانہ کیفیت کے قریب پہنچ گیا ہے۔

ناول کے حدود کا تعین کافی دشوار ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ناول کو طنز، ہدایت، مذہبی و سیاسی تبلیغ اور تکنیکی معلومات کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا ہے انہیں ضمنی قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کا صاف اور براہِ راست مقصد فطرت سے لئے ہوئے سلسلۂ مناظر کی مصوری کے ذریعے اور جذباتی بیان کے رشتے سے فرحت بخشنا ہے اس میں شک نہیں کہ ناول نگار پڑھنے والے کی دلچسپی کو فن کی جمالیاتی مسرت کے ساتھ قائم رکھتا ہے لیکن ناول نگاری کی مندرجہ بالا تعریف ناول کے بہترین نمونوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناکافی ٹھہرتی ہے۔ ناول میں فطرت سے براہِ راست اور ہوبہو مطابقت ایک نقطۂ خیال کی تسکین کرتے ہوئے بھی اس کے متعدد دوسرے تصورات پر حاوی نہیں۔ پھر متعدد ناول نگاروں نے تفنن سے زیادہ فکر و فن کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ناول کو فلسفۂ حیات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا گیا ہے اور اس میں رموز و علائم کے ذریعہ معنویت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے بعض صورتوں میں یہ کوشش بے معنویت کی طرف بھی لے گئی ہے۔ ناول نگاری کی سنجیدہ کاوشوں نے اسے محض سطحی دلچسپی کی چیز نہیں رہنے دیا ہے۔ اب ناول ہئیت کے اعتبار سے گوناگوں تجربوں اور فکر کے اعتبار سے زندگی کے مختلف النوع تصورات پر مبنی ہے۔ اگر ناول ادب کی شاخ ہے تو اس کا انسانی زندگی سے براہِ راست یا بالواسطہ تعلق ضروری ہے اور ماحول و فطرتِ انسانی کی کسی تعبیر کے بغیر کوئی ناول اپنے مقصد میں کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ ناول نگار چاہے تو نفسیاتی یا فلسفیانہ تجزیات و تصورات کو اپنے فن کا موضوع بنا سکتا ہے لیکن اس کے لئے بھی نہ صرف زندگی سے واقفیت ضروری ہے بلکہ اس واقفیت

کو اپنے شعور کا محور بناتے ہوئے ناول کے اجزائے اظہار کے سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ یہیں ناول اور دیگر اصنافِ ادب کے فرق کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناول نگار کا تصورِ زندگی' اس کے موضوع کے انتخاب' کرداروں کی تخلیق، بیان کے مضمرات، فضا کی تعمیر' آہنگ کی تشکیل' پلاٹ کی تعمیر اور مکالموں کے ممکنات، غرض تمام عناصر ترکیبی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن ناول نگار کی کامیابی یہ ہے کہ اس اثر اندازی کے باوجود ناول خود اپنی آزادانہ زندگی سے معمور نظر آتا ہے جہاں ناول کی آزادانہ زندگی اور زندگی کی انسانی جدوجہد میں رابطہ قائم ہوجاتا ہے اور تصور و اظہار کی راہیں ایک ہوجاتی ہیں، وہاں ناول نگاری کے بڑے کارنامے وجود میں آتے ہیں

چاہے اردو ناول کو مشرقی قصوں اور داستانوں کی ترقی یافتہ شکل کہا جائے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ موجودہ اردو ناول مغربی اثرات ہی کی پیداوار ہے اور ان اثرات کے مطالعے کے بغیر اس کا صحیح جائزہ ممکن نہیں۔ اسی طرح خود مغرب میں قدیم داستانوں بلکہ مشرقی داستانوں کی طرف مراجعت کا ایک رجحان ملتا ہے اور اس رجحان کو بھی بعض محققین اردو کے اجتہاد اور ان کی قدیم کو زندہ کرنے والی فکری، ایک سے تعبیر کرنا غلط ہوگا۔ خود نثریہ علامت نگاری کا آغاز اردو کی ابتدائی نثری کاوشوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن موجودہ علامت نگاری یقیناً مغربی اثرات ہی کا نتیجہ ہے۔ یہی نہیں، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے شکار نامہ میں بے معنویت میں معنی پیدا کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے اور اس کے معانی انداز کی مختلف اوقات میں مختلف شرحیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن موجودہ ناول میں بے معنویت کا رجحان آج کی صنعتی تہذیب کی دین اور مغربی نمونوں کا عکس کہا جاسکتا ہے اسی طرح ناول کے موضوع اجزائے بیان اور خود زبان کے استعمال میں موجودہ دور کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ زبان کی طرف توجہ کا ایک رجحان تو وہ تھا کہ فلوبیر ہمیشہ اس بات سے آزردہ خاطر رہا کہ اس نے مادام بواری میں "بیوی کے ڈاکٹر کا بیگ کہاں ہے" کہتے ہوئے ایک جملے میں فرانسیسی کے حرفِ حالتِ اضافی کی دوبار تکرار کی تھی۔ ہنری جیمس نے بھی ناول کی زبان پر خاص توجہ دی اور مجموعی حیثیت سے فن کی زندگی پر اور عکس کی اصل پر فوقیت کا دعویٰ کیا۔ جیمس جوائس نے ایک نئی زبان اختیار کی اور یولیسیز میں' ای ایم فارسٹر کے خیال کے مطابق جہاں روشنی اور لطافت کو ناکامی ہوئی ہے وہاں پستی اور درشتی سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یولیسیز جدید ناول نگاری میں ایک اہم سنگ میل ہے اور اس نے مختلف جہتوں سے ناول نگاری کو متاثر کیا ہے اس کا پورا واقعہ ایک دن کا واقعہ ہے اور سجاد ظہیر کی لندن کی ایک رات ایک شب کی سرگزشت ہے۔ ورجینیا وولف نے کہا تھا کہ زندگی کا بہت کچھ یولیسیز میں چھوڑ دیا گیا ہے یہی بات تصورِ زندگی میں فرق اور ادبی مرتبہ میں اختلافِ رائے کے باوجود لندن کی ایک رات کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ بہت کچھ نظر انداز کرتے ہوئے بھی دونوں نے اپنے فن کے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لیا ہے۔ ایک کی تجرید تجربات کی منطق منفصل پر مبنی ہے تو دوسرے کی منطقِ متصل کو کام میں لاتی ہے۔

علامت نگاری بھی موجودہ اردو ناول نگاری کا ایک اہم رجحان بن گئی ہے۔ کامیو نے اپنے علامتی ناول پلیگ کے آغاز سے پہلے ڈیفو DANIEL DEFOE سے ایک اقتباس پیش کیا تھا کہ "ایک قسم کے حبس کو دوسری قسم کے حبس کے ذریعہ پیش کرنا ایسا ہی معقولیت پر مبنی ہے جیسا کہ کسی واقعتاً موجود شے کی نمائندگی کسی غیر موجود شے کے ذریعہ۔ خدا کی بستی میں حقیقی صورتحال کو حقیقی طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس کا بنیادی مدعی کا مسئلہ وسیع طور پر انسانیت پر اعتماد اور بداعتمادی کے زاویہ ہائے نظر سے وابستہ

ہے۔ دونوں کے درمیان مقامات بہ مذغ بھی موجود ہیں لیکن ناول نگار نے مجموعی طور پر اسے انسانیت پر اعتماد اور وابستگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تھامس مان کا جادو کا پہاڑ ۔ The Magic Mount) (ain موجودہ تہذیبی تشکیل میں فنکاروں کی عدم وابستگی پر پُرقوت تمثیلی طنز کا درجہ رکھتا ہے۔ دراصل تمثیل و علامت کا استعمال ناول میں قدیم سے موجود ہوتے ہوئے بھی بعض نئے گوشوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ نذیر احمد اور سرشار کے کرداروں کے تو نام آزاد اور نصوح بھی کسی نہ کسی حد تک علامتی حیثیت رکھتے ہیں۔ میل ول کے اس خوف کے باوجود کہ موبی ڈک کو کہیں تمثیل نہ سمجھ لیا جائے، اسے بدی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ محض تعاقب اور جدوجہد کو اس ناول کا موضوع بتانے کے علاوہ، اس سفید، وال ماہی (WHALE) کو بدی کے بجائے نیکی اور ناقابل مفتوح و مہلک فطرت یا کائنات کی وحشی قوت کی علامت بھی کہا گیا ہے۔ میل ول کے اثرات، کامیو کے پلیگ اور ہیمنگوے کے بوڑھا اور سمندر میں ملتے ہیں۔ کامیو کے بیان کردہ انسان کے دکھ بدی ہی کا حصہ ہیں، البتہ ہیمنگوے کا قصہ اپنی بائبل کی سی سادگی بیان کے باوجود زیادہ وسعتِ مفہوم رکھتا ہے۔ کامیو کے پلیگ کا سب سے اہم نکتہ ابتلا و یا بدی کے مقابلے میں انسان کی فطری قوتِ مدافعت کی نشوونما ہے۔ وہ خصوصی اور عمومی کے درمیان راہ اختیار کرنے کی سفارش کرتا اور اپنے ناول کو ہر قسم کے جبر کے خلاف مزاحمت سے تعبیر کرتا ہے اس ناول میں موجود بدی کی تعبیر دشمن کے تسلط کے طور پر بھی کی گئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود بدی کا کے وجود میں انسان شریک ہیں۔ یہ آسمانی عذاب کی طرح نازل نہیں ہو جاتی۔ علامت سازی نے ناول کے دائرہِ امکان کو وسیع کیا ہے لیکن علامت اور تجرید دونوں بعض اوقات فنکار کی وابستگی اور اس کی ذمہ داری کے شعور سے بچنے کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ فرار کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ماضی بعید کی تاریخی، رومانی یا ذہنی صورتوں میں پناہ ڈھونڈی

جائے۔ اقدار کے ردّ و قبول اور ان کی آویزش سے بعض اوقات سچائی کی نئی صورتیں سامنے آتی ہیں لیکن گریز و فرار کی ایک صورت، اقدار کی نفی سے عبارت ہے ہیمنگوے نے اپنی ایک کہانی قمار باز، راہبہ اور ریڈیو میں عقیدہ سے لے کر روٹی تک متعدد اشیاء کو گناتے ہوئے کہا ہے کہ انقلاب تو ترکیب ہے لیکن اس سے پہلے اور بعد کیلئے انہیں عوام کی افیون کہا جا سکتا ہے۔ دنیا میں پھیلی ہوئی بدی کے مسئلے نے ناول نگاروں کے ذہن کو اکثر اپنی طرف رجوع کیا ہے لیکن اس مسئلہ کو انسانی وابستگی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے وہ مثبت تاثر پیدا ہوتا ہے جو دستوؤسکی کے یہاں ملتا ہے اس کے برخلاف عدم وابستگی کی منفی حد، مارکس ڈی سیڈ (MARQUIS DE SADE) کی تحریریں ہیں۔ دستوؤسکی نے کافکا کی قلبِ ماہیت کے تصوّر کی پیش روی کرتے ہوئے اپنے ایک کیڑے بن جانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا، لیکن اس کی انسانی وابستگی کا احساس ہر شے پر بالاتر رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو منفی جذبہ مارکوئس ڈی سیڈ کے یہاں ملتا ہے، وہ اس کے ناول جسٹین میں کیمیا داں کے انسانی تباہی کے خواہاں ہونے کے علاوہ، انسانی تعلق کی آخری حد توڑتے ہوئے بکریوں سے رابطۂ جنسی پیدا کرنے کی خواہش کے اظہار تک لے جاتا ہے۔

صنعتی تہذیب کے فشار نے اجنبیت، بیرونیت اور ذہنی ملال کے احساسات کو تقویت دی ہے۔ گرٹروڈ اسٹین (GERTRUDE STEIN) نے پہلی بار ہیمنگوے سے کہا تھا کہ تم سب ایک گم شدہ نسل ہو اور بعد میں یہ گم شدگی اس نسل کی شناخت بن گئی لیکن مالکوم کاؤلے (MALCOLM COWLEY) کے خیال کے مطابق جن لوگوں نے پہلے پہل یہ لیبل پسند کیا، ان میں شیخی بگھارنے کا جذبہ تھا۔ پھر صنعتی تہذیب کے دباؤ نے جو اقدار کی بے معنویت پیدا کی تھی اس نے خود فن کی بے معنویت کے لئے جواز پیدا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بڑے لکھنے والوں نے بے ترتیبی سے ترتیب، انتشار سے نظم اور بے معنویت سے معنویت

پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور غالب کے الفاظ میں نفی سے اثبات کی جانب قدم اٹھایا ہے لیکن اکثر یہ بے معنویت، لاطائل و لایعنی بن کر رہ گئی ہے اکثر لکھنے والے مفہوم سے زیادہ لفظوں کے طلسم میں گرفتار ہو گئے اور پھر خود زبان کی شکست و ریخت پر مائل ہوئے۔ کچھ لوگ قاری سے متنفر اور تمام سماجی تصورات سے الگ ہو کر خود وقت کے وجود کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ یہ صنعتی تہذیب سے فرار چاہتے ہوئے بھی اس میں محصور ہو جانے کی صورت تھی۔

اس نے بے ربط خیالات کے غیر منظم رویّوں کو جنم دیا۔ چند ناول نگاروں نے موجودہ دنیا کے حسّیاتی تجربوں کو منطق، تنظیم اور خارجی صداقت کے بغیر ایسے اظہار کے قالب میں ڈھالا کہ بے ربطی اور بے تہی امتیازی خصوصیات بن گئیں۔ بعض نے بیانیہ کو ختم کرتے کرتے خود ناول کی ہیئت ہی کو ختم کر ڈالا اور ناول کے اجزائے بیان کو تابوت کے مردے سے تعبیر کرتے کرتے، خود ناول کا آسیب بن گئے۔ ناول میں لا استدلالیت اور مافوق الواقعیت کے رویّوں سے جو متعدد چھوٹی بڑی ذہنی حرکتیں وجود میں آئی تھیں آخر وہ فن کو نا فن بنانے میں صرف ہوئیں اور ناول کو ردِّ ناول تک لے گئیں۔ ایک جانب متمدن زندگی کی تضاد آرائی اور دوسری جانب یہ بین الاقوامی صورتِ حال کہ دخود چرچل کے الفاظ میں) اب طاقت کے توازن کے بجائے خوف کے توازن پر انحصار کیا جانے لگا ہے۔" سچ یہ ہے کہ سوچنے والے ذہنوں کے لئے صد درجہ انتشار انگیز تھی۔ لیکن ہر صداقت کی بنیاد خارج میں موجود ہوتی ہے اور رفع انتشار کی بنیاد بھی انسانیت کی وہ ختم نہ ہونے والی جدوجہد ہے، جو موجودہ دور کے سارے خطرات کے باوجود آج بھی جاری و ساری ہے۔ جہاں تک ناول کے فن کا تعلق ہے، گریز کا دائرہ مکمل ہو گیا ہے اور میکانکی تجرباتیت کی تکرار سے عاجز ذہن پھر حقیقت کی نئی اور تخلیقی دریافت کی جانب مائل ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں اردو کی جن چند ناولوں سے اظہارِ حقیقت کی روایت مستحکم ہوئی ہے، ان میں "خدا کی بستی" بھی ایک اہم درجہ رکھتی ہے اور اس لئے اس کا تازہ مطالعہ فن کی تازہ کاری کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔

"خدا کی بستی" کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں ہمیں ناول نگار کی خارجیت کا احساس ہوتا ہے، وہاں یہ بھی سراغ لگتا ہے کہ اس خارجیت کی بنیاد انسان دوستی پر ہے۔ آج مختلف سماجی اور ذہنی عوامل کے ہاتھوں ناول نگار حیات و کائنات کے کسی مربوط تصور سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ پھر ہمارے زمانے میں وقت، کے سیال تصور، وقت کی جبریت کے خاتمہ کی خواہش اور شعور کی رو کے بہاؤ کے نفسیاتی طریقِ کار نے حادثات و واقعات کو غیر منسلک اور معلق، رجعت و بازگشت کا غیر مختتم سلسلہ بنا دینا چاہا ہے اور تہذیبی نقوش کو سماجی محرکات کی جگہ دی ہے لیکن خود زندگی کے حرکت و عمل کو فراموش کر دیا ہے۔ اس تصور اور طریق کے امکاناتِ اظہار سے ناول نگاری کچھ نئی سمتوں میں بڑھی ہے لیکن ان کے زیرِ اثر بعض ناول نگاروں نے کردار کی تکمیلی تعمیر سے روگردانی کی ہے، اور فن کے انسانی منصب کو فراموش کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ معاصرانہ زندگی میں جو برائیاں اور اچھائیاں پائی جاتی ہیں، بعض اوقات ناول نگار ان سے بھی دامن کشاں گزرنے لگا ہے۔ جہاں ترقی پذیر اور کم ترقی پذیر سماج میں بدی ایک نمایاں اجتماعی مظہر کی حیثیت رکھتی ہے، وہاں ترقی یافتہ معاشرے نے بدی کو نہایت اکتاہٹ اور بیزاری کے ساتھ محض سماجی ڈگر سے الگ ہٹ کر چلنے کی خواہش میں بعض ذہین افراد کی طرف سے اپنانے کی صورت بھی پیدا کر دی ہے۔ خدا کی بستی میں بدی کا بیان مستعار اور عائد کیا ہوا نہیں ہے اور ناول نگار کی اخلاقی حِس انسانی فطرت کی نیکی اور پاکیزگی کی پاسدار ہے آج جب مختلف تضادات اور شکنجوں میں جکڑی ہوئی زندگی غیر انسانی اور غیر فطری حدود کو توڑ کر اپنے کو پانے کی سعی کر رہی ہے، فن کی تصورِ انسانیت سے وابستگی، نمایاں اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ گودی کا ایک کردار دوسرے سے کہتا ہے کہ " ہر سوال کے صرف دو جواب ہیں، ایک اثبات میں اور دوسرا نفی میں۔ تم تیسرا (جواب) ایجاد کرنا چاہتے ہو۔ بہت سے لوگ یہ چاہتے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس میں کوئی کامیاب نہیں ہوا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ بعض موجودہ ناول نگاروں کے یہاں سماجی مظاہر کی المناک صورتحال کا احساس ہوتے ہوئے بھی جو مفاہمت یا بے معنی احتجاج ملتا ہے وہ تیسرے جواب ہی کی کوشش ہے۔ البتہ بدی کی دو دنیاؤں کے درمیان انسان دوستی پر مبنی ایک تیسری دنیا کی کوشش تشکیل، حقیر ہوتے ہوئے بھی اپنا مقامِ ثبات رکھتی ہے۔ لیکن ایک ناول نگار کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کے تضادات اور تصوّر و حقیقت کے تصادمات کو سچائی کے ساتھ پیش کرے فنّی اعتبار سے مثبت و منفی دونوں طرح کے کردار یکساں اہمیت رکھتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خود ناول نگار، زندگی کے اثبات کی طرف مائل ہے یا اس کا فن ذہن کے منفی رویّوں کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے۔ "خدا کی بستی" کا مطالعہ کرتے ہوئے انسان دوستی کے نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے کرداروں اور واقعات کے بیان میں علّت و معلول کے سلسلوں کو پیشِ نظر رکھا ہے لیکن ان کا فن زندگی کے انسانی مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ بدی اور بدصورتی کو پیش کرتے ہوئے ہچکچاتے نہیں کیونکہ ان کے فنکارانہ اظہار سے خود خیر اور حُسن کی قوتوں کو نمایاں ہونے کا موقع ملتا ہے۔ "خدا کی بستی" کی وسیع ساخت میں بعض جگہ حقیقت کی گرفت، تصور پر یا تصور کی گرفت، حقیقت پر کمزور پڑی ہے۔ لیکن اکثر دونوں کا تخلیقی امتزاج ہی اس کی حیات کا ضامن ہے۔ شوکت صدیقی کا فن موجودہ تہذیب کے انکار سے نشو و نما نہیں پاتا بلکہ انسانی جدوجہد کو مشعلِ راہ بناتا ہے اور ان کے کردار زندگی کے حُسن و بدصورتی کے آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی فن کے غائتی میلان کی سمت نمائی کرتے ہیں۔ وہ فنّی ہیئت کی بربادی کو ایک نیا جمالیاتی تجربہ بنانے کے بجائے اسی ہیئت کی پابندی سے فنّی زیبائی کی راہ نکالتے ہیں۔ "خدا کی بستی" تاریخ اور تہذیب کے ایک مخصوص سلسلہ کو پیش کرتی ہے اور اس سے الگ ہو کر اس کی خصوصیات کا صحیح تعین نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسے ان خصوصیات ہی کے تعین سے فن اور تہذیب کے وسیع تر سلسلوں میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس سے جو تہذیبی نقش قائم ہوتا ہے، وہ انسانی تاریخ کی ارتقائی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ چنانچہ یہ ناول اپنے وقت اور اپنے ماحول کے حدود کی عکاسی کرتے ہوئے بھی نئی منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس میں مربوطِ مکان خصوصیات اس آب و تاب سے جھلکتی ہیں کہ ان کا انعکاس بین الاقوامی تہذیبی رنگوں کا جزو بن جاتا ہے۔

انجم اعظمی

# ادب۔ انسان کی پہچان

اس عہد کی پہچان زندگی کی تیز رفتاری ہے اور ادب انسان کی پہچان ہے۔ جدید ادب انتہائی تیز رفتار زندگی میں انسان کی پہچان کو قائم رکھنے کی سعیٔ معتبر کا نام ہے۔ صدیوں کے سفر میں ادب نے انسان کی پہچان کرائی ہے۔ اس پہچان کے قائم رکھنے کا بھی مسئلہ ہے اور نت نئے انکشافات سے اس پہچان کو فروغ دینے کا مسئلہ بھی ہے آج کی تیز رفتار زندگی انسان کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتی اور انسان کو نہ صرف اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا ہے بلکہ اپنی ذات سے مکالمہ بھی کرتے رہنا ہے۔

زندگی کی تیز رفتاری نے بڑے بنیادی مسائل پیدا کر دیئے ہیں اس تیز رفتاری کے سبب پوری دنیا میں سیاسی، معاشی اور تہذیبی اقدار میں انتہائی سرعت سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور آدمی جب تک کسی ایک شے کے بارے میں سوچتا ہے اور کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اقدار بدل جاتی ہیں۔ رویے بدل جاتے ہیں ایسی صورت میں اپنی ذات سے مکالمہ مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے پروفیسر کرار حسین سے اس کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ اس کا مقابلہ ایک ہی طرح ممکن ہے کہ اپنی ذات میں استحکام پیدا کیا جائے اور ان سے اتفاق کرتے ہوئے میں بات کو اس طرح آگے بڑھاؤں گا کہ کبھی کبھی خارجی حالات سے بظاہر بے پروا ہو کر ذات میں استحکام پیدا کیے بغیر اپنی ذات سے مکالمہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انسان اپنے خارج و باطن میں پھیلا ہوا ہے۔ خارج سے اہلِ علم پوری طرح آگاہ ہیں اور عام آدمی بھی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے کیونکہ زندگی کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ بہتا رہتا ہے لیکن باطن سے مراد انسانی وجود سے وابستہ بنیادی اقدار ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط رہتی ہیں۔ اسی ربط کی وجہ سے فکر و خیال کے دھارے اور تخلیقی چشمے جاری ہوتے ہیں۔ ذات میں استحکام کا مطلب دراصل باطن کا استحکام ہے یا انسانی وجود سے وابستہ اقدار کا استحکام ہے یہی قدریں آفاقی ہوتی ہیں ورنہ خارج میں زندگی کا جتنا بھی پھیلاؤ ہے اس میں سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں میں مسلسل تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور ہوتی رہیں گی البتہ انسانی وجود سے

وابستہ قدروں کا جتنا گہرا اثر ان پر پڑے گا اتنا ہی خارج کی قدروں میں بھی استحکام پیدا ہوگا۔ اور جب انسانی وجود کی قدروں کا عکس مدھم یا دھندلا ہوگا تو خارج کی اقدار بے یقینی اور بے اعتمادی سے دوچار کریں گی۔ صوفیاء کے اعتکاف اور مفکرین کے استغراق کا یکساں تعلق استحکام ذات سے ہے اور جب ایک ادیب ذات کے استحکام پر توجہ دیتا ہے تو ایک مفکر کے استغراق اور ایک صوفی کے اعتکاف کی ملی جلی کیفیت سے گزرتا ہے یہ ایک گہرا داخلی تجربہ ہوتا ہے جس کی معنویت میں خیر اور حسن کے بے شمار اجزا موجود ہوتے ہیں۔ جو اس کی تحریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔

جو ادیب بے یقینی اور بے اعتمادی کے دائروں سے باہر نہیں نکل پاتے اور بے یقینی کو اس عہد کا بنیادی مزاج سمجھ بیٹھتے ہیں۔ وہ دراصل اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ وہ اپنے داخلی تجربے سے نہیں گزرے اور اپنی ذات میں استحکام پیدا نہیں کر سکے اور انہوں نے انسانی قدروں کو زندگی کی تیز رفتاری پر اثر انداز ہونے کے مواقع کھو دیئے اور عام انسانوں کی طرح بغیر سوچے سمجھے زندگی کے تیز رفتار دھارے میں بہتے رہے اس زمانے میں نشر و اشاعت کی بے حساب آسانیاں ہیں جس آدمی کی جو سمجھ میں آتا ہے لکھتا ہے اور شائع کراتا ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن اس تن آسانی سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ اچھے ادب کی تخلیق کی بنیادی شرط داخلی تجربہ ہی ہے جو خال خال نظر آتا ہے۔

کسی ادیب کی شہرت اس کے داخلی تجربے کی غماز نہیں ہوتی شہرت کے بے شمار اسباب ہوتے ہیں۔ عام آدمی شہرت سے متاثر ہوتا ہے لیکن ادب کو جانچنے پرکھنے والوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ادیب کی تحریروں کو پڑھ کر اور ان کا تجزیہ کر کے فیصلہ کریں کہ ادیب کسی داخلی تجربے سے گزرا یا نہیں گزرا۔ میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" تنقید کی کتاب ہے۔ اس میں تیس بتیس صفحات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ زندگی میں ثنویت ہے۔ اور بہت سی کتابیں پڑھ کر یہ کھوج لگایا گیا ہے کہ سب سے پہلے یہ بات ایک چینی مفکر نے کہی تھی۔ اردو تحقیق میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ایسی باتوں پر محقق کو بڑا فخر ہوتا ہے کہ اس نے فلاں بات کا پتا لگایا۔ لیکن ہمارے فخر کرنے سے ان غیر اہم باتوں کو دنیائے تحقیق بہت زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ رہی تنقید تو یہ علم کی ایک الگ شاخ ہے۔ اگر ڈاکٹر وزیر آغا زندگی میں ثنویت کے قائل ہیں تو چینی مفکر کے کہہ دینے سے ان کی بات نہیں مان لی جائے گی بلکہ انہیں خود ثنویت کی بھرپور وکالت کرنی ہوگی اور اگر ثنویت ہی زندگی کی بنیادی صداقت ہے تو اس کا محاکمہ کرنا ہوگا لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی کتاب میں ثنویت پر کوئی محاکمہ نہیں ملتا اور پوری کتاب پڑھنے کے بعد یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اردو شاعری میں وہ ثنویت کے اس فارمولے کے ذریعہ کیا تلاش کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی داخلی تجربے کے بغیر ہی ایک ضخیم کتاب لکھتے چلے جا رہے ہیں جس کا ایک ثبوت کتاب کا نام "اردو شاعری کا مزاج" ہے

شاعری کا ایک مزاج ہوتا ہے لیکن کسی زبان کی شاعری کا علیحدہ سے کوئی مزاج نہیں ہوتا بلکہ کسی زبان کی شاعری کا مزاج عہد بہ عہد بدلتا رہتا ہے اور تمام زبانوں میں عہد بہ عہد بدلتے ہوئے مزاج کو اگر کوئی کیفیت احاطہ کرتی ہے تو وہ شاعری کا مزاج ہے جو انسان کی داخلی صداقت ہے۔ وزیر آغا داخلی تجربے سے گزرے بغیر ایک وابستہ اور ایک بیمار رومانیت کا سہارا لے کر لکھتے چلے گئے اور انھیں بالکل خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں انھیں چاہیئے کہ قلم اٹھانے سے پہلے وہ شہرت کے سراب کے بجائے داخلی تجربے سے گزرنے کی کوشش کریں۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ اس عہد کی پہچان زندگی کی انتہائی تیز رفتاری ہے بعض افراد ادب کو عہد کا ترجمان کہتے ہیں اور اس میں روحِ عصر تلاش کرتے ہیں۔ ادب اپنے عہد کا بھی ترجمان ہوتا ہے اور اس میں روحِ عصر بھی ہوتی ہے۔ لیکن روحِ عصر کسی عصر کی ہر شے میں ہوتی ہے صرف ادب میں نہیں ہوتی اور زندگی کی تیز رفتاری کا اثر بھی صرف ادب پر نہیں ہر شے پر پڑتا ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد کا ادب اس عہد کے آدمی کی پہچان ہوگا۔ اس کی داخلی صداقت میں روحِ عصر موجود ہوگی اور وہی اس کے داخلی تجربے کی صداقت کی گواہ ہوگی۔ کیوں کہ اپنی ذات کے استحکام کے عمل میں آدمی صرف خارج میں پھیلتا رہتا ہی نہیں ہے بلکہ خارجی اثرات کو اپنے وجود میں سمیٹتا اور نئے سرے سے اپنے ہونے کا ادراک کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر لمحہ ایک نئی شان اور آن بان سے جلوہ گر ہوتی ہے لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات زمان و مکان سے بلند و برتر ہے۔ اور اس سے قرآنِ حکیم کا اشارہ جشنِ الوہیت کی طرف ہے۔ جس کی شان اور آن بان ہر لمحہ نئی ہے اور اس جشن میں (جو کن فیکون کی تشریح ہے) انسان مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو ہر لمحہ نئی شان سے جلوہ گر نہ ہو سکے تو اپنی تخلیق کے بنیادی تقاضے سے انحراف کرے گا در اصل ہر لمحہ نئی شان اور نئے آن بان سے جلوہ گر ہونا اس کے وجود کا تقاضا ہے وہ ایک متحرک وجود کا مالک ہے جس کے ساتھ صدیوں کا تجربہ ہے اور آنے والی صدیوں کے خواب ہیں جو اپنی پیدائش سے موت تک بھی ایک متحرک وجود ہے۔ ذہن تو ہر انسان کو فطرت نے ودیعت کیا ہے لیکن زندگی بھر کے تجربوں کو سمیٹ کر ہی وہ دانائی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی رعایت سے ہماری داستانوں میں "پیر دانا" کا کردار ملتا ہے افسوس کہ ہمارے موجودہ معاشرے میں پیر دانا کی جگہ خود غرض بوڑھوں نے لے لی ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہمارا معاشرہ بیشتر دانائی سے خالی ہو چکا ہے اور اسی کے ساتھ ہمارے نام نہاد جدید ادب میں داخلی تجربے کی کمی اور کھوکھلے الفاظ کی بھرمار ہوتی جارہی ہے۔

نیا ادب اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب نیا انسان پیدا ہو۔ اور نیا انسان وہ ہوگا جس کا داخلی تجربہ سچا ہوگا اور روحِ عصر اس تجربے میں لمحہ لمحہ اپنی تازگی سمو کر نئی شان پیدا کرتی رہے گی۔ داخلی تجربے کی خوبی یہ ہے کہ انسان

اپنے آپ سے بچھڑتا نہیں۔ سارا ماضی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ روایت کی ساری گہری تہیں داخلی تجربے کا حصہ ہوتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس میں بے مثال تازگی ہوتی ہے جسے ادب کا ہر خاص و عام قاری محسوس کرتا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ میں جدید کے مفہوم کو تلاش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کارواں کے بجائے گردِ کارواں کی تلاش ہو۔ کارواں صرف اور صرف نیا انسان ہے انسان کی گزرگاہ کی دھول تلاش کرنے والے نئے انسان کا چہرہ نہ دیکھ سکیں تو ان کی تلاش ادھوری ہے انھیں یہ چہرہ دیکھنا ہے تو سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی برحق، نئے ادب کی تخلیق پر توجہ دیں جو داخلی تجربے کا اظہار ہے اگر انھیں اظہار میں کامیابی ہوئی تو یہ چہرہ انہیں ادب کے آئینے میں ضرور نظر آئے گا اور یہ ان کا اپنا چہرہ ہوگا جسے دیکھنے کی ان میں بصیرت پیدا ہو چکی ہوگی۔ (یہاں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے بہانے انسانی ذہن نے جدید دنیا تو پیدا کر دی ہے جس کے اپنے بے شمار پیچیدہ مسائل ہیں لیکن جدید ادب صرف جدید انسان ہی پیدا کر سکتا ہے جس کا صرف ذہن نہیں پورا وجود نیا ہو جو صدیوں کا ذہنی اور جذباتی سرمایہ سمیٹے عصر کے اس کنارے کھڑا ہو جس کے آگے مستقبل کا بے پایاں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور اس کی لہروں سے عصر کا دامن بار بار بھیگ رہا ہو اور نئے انسان کے داخلی تجربے کو بھی سرابور کر رہا ہو اور یہی جدید انسان جدید دنیا کے پیچیدہ مسائل حل کر سکتا ہے)

ادب کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں ان میں سے ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ادب اظہار ذات ہے لیکن اظہار ذات کے سلسلے میں خود ذات کو چیستاں بنا دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب اظہارِ ذات بھی ہے زندگی کی تفسیر و تنقید بھی ہے زندگی کا ترجمان بھی ہے عہد کا ترجمان بھی ہے زندگی کی رفتار کا بھی ترجمان ہے ماضی کا بھی ترجمان ہے شعور و لاشعور کا بھی ترجمان ہے اور یہ سب کچھ بیک وقت اس لیے ممکن ہے کہ ادب انسان کی داخلی صداقت کا اظہار ہے انسان ایک ایسی اکائی ہے جس میں یہ ساری جہتیں ایک ساتھ موجود اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ادب انسان کے پورے وجود کی گواہی ہے ایسی گواہی جو ادب کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ اسی لیے زندگی کی رفتار چاہے کتنی ہی تیز ہو جائے انسان ہمیشہ اپنی ذات کے استحکام کے ذریعہ اس پر غلبہ پاکر اپنے آپ سے مکالمہ جاری رکھے گا اپنے متحرک وجود کی گواہی دیتا رہے گا اور نیا اور سچا ادب تخلیق کرتا رہے گا کیونکہ ادب کی موت تو خود انسان کی موت کی شہادت ہوگی۔

شمیم احمد

# فرد، تنہائی، محبّت، شاعری اور توحید

تنہائی اور اپنے وجود میں بے اماں ہونے کا شدید احساس، انسان کے عمیق اور قدیم تجربات میں شامل رہا ہے۔ اگر ہم آدمی کی ماہیت کا تقابل مشاہدات، نباتات اور حیوانات سے کریں تو ان کے طبعی عوامل اور طبقاتی عناصر میں چند در چند عوامل کے باوجود، آدمی اور طبعی عناصر میں اور پھر آدمی کی ابتدائی جبلی ماہیت سے انسان کی طرف سفر کرتے ہوئے ابتدائے آدمیت کے ہر مرحلے پر اس کی زندگی میں تنہائی، جستجو، عمل اور پھر اپنی تنہائی کو دور کرلے، پیاس کو بجھانے اور کسی ہستی میں جذب ہو جانے کی شدید باطنی خواہش ملتی ہے اور یہ عمل اتنا بنیادی متواتر اور مسلسل ملتا ہے۔ کہ ہم اسے آدمی کی شناخت قرار دے سکتے ہیں، ایسی شناخت جو آدمی میں خود کو جاننے، تلاش کرنے کے ساتھ آگے بڑھنے، کچھ نہ کچھ حاصل کرنے اور حال سے نامطمئن، مستقبل کی طرف اپنے پورے وجود سے اپنی تمام خواہشات اور ناآسودگیوں سمیت نگراں رہنے میں اپنی ترقی اور بقا سمجھتا ہے۔

گویا ہم اسے آدمی کی سطح سے انسان کی طرف بڑھتے ہوئے کائنات کی تسخیر، سعی و عمل کی قوت کے ساتھ اپنی عقل اور شعور کے ذریعہ آگے بڑھنے کی فطرت سے تعبیر کرسکتے ہیں، لیکن یہ شناخت اگر ایک طرف انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچاتی ہے اور اس کی آج تک کے علوم و افکار کی فتوحات اور جدید تر سائنس اور ٹیکنولوجی کی تمام تر ترقی اسی سے پھوٹتی ہے تو دوسری طرف انسان آج بھی اپنے وجود کی گہرائیوں اور باطن کے اندر اتنا ہی تنہا، اتنا ہی بے چین اور اتنا ہی تشنہ نظر آتا ہے جتنا وہ اپنے اس ابتدائی عہد میں تھا جس کو آج ایک آدمی نما مخلوق کا دور قرار دیا جاتا ہے۔

آدمی کا یہی وہ احساس تنہائی اور اس کے وجود کا خلا تھا جس کو پُر کرنے کے لئے انسان نے اگر خود کو معروف سے معروف تر، آسودہ سے آسودہ تر اور آگہی کے تمام تر وسیلوں سے پیراستہ تر کرکے کائنات کے سکوت اور اپنے اردگرد کے سکوت کو ایک پُرشور دنیا میں تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کی تاکہ احساس تنہائی، ناآسودگی اور تشنگی اس کا پیچھا نہ کرسکے بلکہ اس کو اچانک آلینے کا اسے موقعہ ہی نہ مل سکے۔ مگر ہم ان تمام کاوشوں، کاہشوں اور خواہشوں کا نتیجہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے عہد کے جدید سے جدید تر اور ترقی یافتہ ترین معاشروں میں ایسے افراد موجود ہیں جو خود کو اپنے ہی ملک، اپنے ہی معاشرے اور اپنی ہی سرزمین میں پہلے زیادہ تنہا، مایوس، ناآسودہ اور تشنہ محسوس کررہے ہیں بلکہ خود کو بے زمین اجنبی اور بے جڑ قرار دینے میں بھی انہیں کوئی تکلف نہیں۔ کیا ہم اس اعتبار سے یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ انسان کی تمام جدوجہد اور مسلسل ترقی ناکام ہوگئی ہے؟ گویا ہزاروں برسوں سے آدمی اپنی ذات میں اتنا ہی تنہا اتنا ہی بے بس، عدم تکمیلیت کا شکار اور اندر کے تمام خلا اور کسی امکان کو پورا کرنے کو آج بھی اتنا ہی رگِ جاں کے قریب

محسوس کر رہا ہے۔ جتنا ابتدائی انسان کرتا تھا۔ اور یہ تجربہ اربوں افراد پر مشتمل معاشروں، ان کی ہمہ گیر مشترک معاشرت اور وجود کو مسلسل ہزار طرح سے آسودہ کرنے کی کوششوں کے باوجود آج کے معاشروں کا فرد بھی اسی طرح کر رہا ہے اور اس شدت سے کر رہا ہے کہ جیسے یہ اس کا سب سے بڑا بہتر سچا اور طبعی تجربہ ہو۔ جدید فلسفوں اور ادب میں اس کو طرح طرح کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے اور انسان کی ناکامی کا نوحہ پڑھا جا رہا ہے اس فلسفہ پر مشتمل طرح طرح کے افکار اور تخلیقی تجربوں کا ریلا آئے ہوئے بھی عرصہ گزر چکا ہے۔ نئے ذہن نے انسان کی اس تنہائی کے مسئلہ پر تجریدی فلسفوں کی بنیاد رکھ ہی دی تھی۔

آخر آدمی کے اندر یہ پُراسرار عمل، یہ خلا اور ایسا گہرا اور مسلسل احساسِ تنہائی کیسے اور کیوں موجود ہے؟ اس کی خواہ کیسی بھی نفسیاتی، جذباتی، عقلی اور سائنسی توجیہہ کر دی جائے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ہزاروں برسوں سے رنگ، نسل، جغرافیہ اور طبقاتی فرق کے باوجود اپنے وجود میں خود کو تنہا محسوس کرتا آیا ہے۔ یہ بے سبب دل کا اداس ہو جانا، خود کو کسی شے کا تمنائی محسوس کرنا اور کبھی کبھی اپنے وجود میں کسی خلا کو محسوس کرنا ہر آدمی کی زندگی کا سچا تجربہ ہے۔ یہ بھری پری محفل میں کسی محفلِ طرب میں کہ جہاں ہر طرف نشاط و سامانیاں بکھری ہوئی ہوں۔ قہقہے اور چہچہے فضا میں گونج رہے ہوں، ساز و آواز اور نغموں کی فضا اپنے پورے عروج پر ہو۔ عین اس لمحہ میں اچانک اس محفل میں ہمارے اندر باطن کے اندر سے درد کی کسی لہر کا آ کر دل کو اپنی گرفت میں لے لینا اور ہمیں اس فضا سے بے آہنگ کر دینا یا کسی درد، کسی یاد، کسی افسردگی، کسی تشنہ کامی کا بھری محفل اور بزم میں متضاد طور پر قلب پر اچانک طاری ہو جانا خود ایک ایسا عمومی تجربہ اور اہم سوال ہے جو انسان کے کسی اندرونی اور طبعی عمل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اسی طرح انتہائی شدید مسرت میں کیسے اچانک غم کا ایک زیریں احساس ابھر کر پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یا کیسے ماں بچھڑے بیٹے کو اچانک پا کر آنسو بہانے لگتی ہے یا انسان کے اندر کا کوئی وحشی تیز و تند جذبہ نفرت اور انتقام کی آسودگی سے گزر جانے کے بعد کسی پاداش عمل کچھتاوے اور پھر ایک کرب و الم سے آشنا ہوتا ہے یہ سب انسانی زندگی کے بڑے فطری تجربے ہیں غرض کہ یہ کیسا انجانا غم اور احساسِ الم ہے جو انسان کی انتہائی خوشیوں میں چھاپا مار کر اس کو کسی الم یا تنہائی کی گداز کا تجربہ کراتا ہے؟

اسی نوع کا تجربہ انسان کو فطرت کی آغوش میں اکثر اور عموماً اس وقت ہوتا ہے جب سورج نکلنے سے قبل فجر کے وقت اور پھر شام کو سورج غروب ہوتے وقت یعنی مغرب کے قریب دل پر ایک ناقابلِ بیان بوجھ، غم اور افسردگی کے احساس اور ایک قلبی گداز کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب چرند اور پرند خود بخود چہچہانے، بولنے، آشیانوں میں سمٹنے اور خاموش ہو جانے کا عمل کرنے لگتے ہیں اور انسان خود کو کائنات کی وسیع اور کشادہ وسعتوں اور پہنائیوں میں تنہا محسوس کرنے اور کسی ہستی اور وجود کی طرف انتہائی کشش اور اس کے ناقابلِ حصول ہونے کا المناک تجربہ محسوس کرتا ہے۔ ان لمحوں میں انسان اپنے باطن میں جو خلا محسوس کرتا ہے اس کا تجربہ وہ فطرت کے قریب جانے پر عموماً اور مشینی زندگی اور بڑے شہروں کے ہماہمی کے باوجود کبھی نہ کبھی اب بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آدمی کے اس باطنی عمل اور انسانی فطرت اور اس کے طبعی رجحان کو اس کے حساس ترین افراد دو وسیلوں سے اپنی گرفت میں لاتے رہے ہیں اور اس کا ریکارڈ مہیا کرتے رہے ہیں۔ ان میں ایک تو شاعری ہے اور دوسرا اس کا روحانی طرزِ احساس جو اس عمل اور اس کے تجربے کو ایک سرّی کیفیت میں محسوس کرتے ہیں۔ دنیا کی وہ قدیم شاعری جو فطرت کی قربت اور کشادہ آغوش میں اظہار میں آئی ہے اس کے باطن میں سب سے زیادہ

تحیّر اور تجسس کی کیفیت اسی لئے پائی جاتی ہے۔ خواہ وہ وجود کے (بالخصوص رنگ و بو) کے فطرت سے ہم آہنگ دھڑکتے ہوئے ازلی نغمات ہوں۔ جن میں انسان کی ازلی تنہائی، معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے اور ان کو جلد ہی سے کر چلنا چاہتی ہے یا عرب کے قصیدہ نگاروں کے فطرت کی گود میں بھٹکتے ہوئے جذبوں کی طرح اوائ جہاں صحرا کا سناٹا انسان کے باطن کا سناٹا بھی محسوس ہوتا ہے اور اس کے اپنے وجود کی گواہی کی ایک پُرقوت آواز بھی۔ خواہ وہ بائبل کے پیغمبروں کی بشارتیں ہوں یا نوحے۔ سب میں انسان اپنی تنہائی اور بے بسی میں کسی کی استعانت اور مدد کے بغیر زندگی کا حوصلہ نہیں پاتا اور خواہ مثنوی مولانا روم کی نئے کی وہ جاں سوز تنہا الم انگیز لَے ہو جس میں "آوازِ دوست" ہی اس کی دستگیری کا واحد ذریعہ بن جاتی ہے یا شاہ بھٹائی اور خواجہ فرید کی عشقیہ علامتیں اور استعارے جو تمام سالکانِ طریقت کا ایک مشترک عمل ہے۔ ہماری شاعری اور ہماری دینی اور روحانی روایت چونکہ ایک ہی سوتے سے پھوٹتی ہیں اس لئے ہماری زبانوں کی شاعری میں عموماً فارسی اور اردو غزل اپنی عشقیہ واردات کو ایسے رموز و کنایات، علامتوں اور استعاروں میں بیان کرتی ہے جو گہرے عشقیہ تجربے کے سبب میں انسان کے وجود کی ان ہی تنہائیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ اپنی عشقیہ علامتوں میں محبوب کے استعارے میں اس ہستی کی طرف سفر کرتی ہے جس کی تمنا روحِ ازل بن کر ہماری شاعری میں بکھری ہوئی ہے اور اس کے منتخب اشعار اور مصرعے ہی اگر جمع کر دیئے جائیں تو ایک دیوان مکمل ہو سکتا ہے لیکن میں صرف اِدھر اُدھر سے چند آسانی سے حاصل ہونے والے نمونوں کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارے یہ عشقیہ تجربات اور علامات ہماری تہذیب کی ایک بنیادی جہت کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس میں تنہائی اور ازلی تشنگی کا کتنا گہرا تجربہ شامل ہے۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
(ولی)

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
(سراج اورنگ آبادی)

اب حسرت آنکھوں میں اس کی نومیدانہ پھرتا تھا
میرؔ نے شاید خواہش دل کی آج کوئی پھر رخصت کی

آج کل بے قرار ہم بھی ہیں
بیٹھ جا چلنے ہار ہم بھی ہیں

بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم
دیکھئے اب کی سال کیا ہووے

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

تاب و تواں کا حال وہی ہے آج تلک ہم جیتے ہیں
تم پوچھو تو اور کہیں کیا نسبت کل کی بہتر ہے

دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے
نکہتِ گل سے آشنا نہ ہوئے

آج کل بے قرار ہم بھی ہیں

بیٹھ جا چلنے ہار ہم بھی ہیں
دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
واشد ہوئی نہ بلبل اپنی بہار میں بھی
کیا جانیے کہ جی میں یہ کیسی گل چھڑی ہے
یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
یہ زندگی کو کہاں سے جگر آوے
عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

(میر)

ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال
دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

(درد)

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

(مصحفی)

دولت عشق کا گنجینہ وہی سینہ ہے
داغ دل زخم جگر مہر و نشاں ہے کہ جو تھا

(آتش)

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے
صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

(غالب)

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

(مومن)

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

(حالی)

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

(شاد)

نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے

کس کی آواز کان میں آئی
دور کی بات دھیان میں آئی

(یگانہ)

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

(حسرت)

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

آج روزِ وصالِ فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

(فانی)

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست
اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

میرا شوقِ سخن پروردہ آغوشِ حرماں ہے
میں خود شیدائے غم ہوں رفتۂ دردِ محبت ہوں

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیرِ لبی

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

(اصغر گونڈوی)

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

ہو گئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رت پلٹ گئی
کون یہ مسکرا دیا ہنسنے لگی کلی کلی —

جس کو اکیلے میں آ کر دھیان تمہارا رہ رہ کے ستائے
چپکے چپکے بیٹھا روئے آنسو پونچھے اور رہ جائے

(آرزو لکھنوی)

چاہیئے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
مری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

یہ گنبدِ مینائی یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
تو شاخ سے پھوٹا کیوں میں شاخ سے ٹوٹا کیوں
اک جذبۂ پیدائی! اک لذتِ یکتائی

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کے جزا دیکھ

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند وہ تارا وہ پتھر یہ نگیں ہے
دیتی ہے مری چشمِ بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ یہ دریا ہے، وہ گردوں یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

(اقبالؔ)

روح بن جاتی ہے خود نغمۂ بے ساز و صدا
ختم جب معرکۂ لفظ و بیاں ہوتا ہے

عمریں بیتیں صدیاں گزریں
ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

برقؔ حوادث الله الله
جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن

جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

تشنہ رہی ہے زندگی برس رہی ہے زندگی
نفس نفس میں تشنگی کی داستاں لئے ہوئے

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

دیکھا ہے اک جہانِ خاص میں نے کبھی کبھی جگرؔ
حسن سے بھی بلند تر عشق سے بھی لطیف تر

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

(جگرؔ)

ازل سے جو نہ مٹ سکی وہ بےکسی تھی عشق کی
تری نگاہِ لطف نے ہزار آسرا دیا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

غم ہی پر نہیں موقوف وہ خوشی ہو یا کچھ ہو
اہلِ غم کے سینوں میں اک چھری سی چلتی ہے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تیری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

(حفیظ ہوشیارپوری)

تنہا تنہا پھرتے ہیں
دلِ ویراں آنکھیں بے نور

(ناصر کاظمی)

ستم نصیبوں کو بےچینیاں مبارک ہوں
انہی سے آتا ہے انسان کی زندگی میں ثبات

(سلیم احمد)

یہ چند اشعار جو بغیر کسی اہتمام کے اِدھر اُدھر سے لئے گئے ہیں۔ فرد کی تنہائی نا تمامی، ازلی تشنگی، افسردگی بے اطمینانی، محرومی اور ایسی عدم تکمیلیت کے باطنی تجربے کو دکھاتے ہیں جس میں جسم سے اوپر اٹھنے اور کسی ہستی کی طرف کھینچنے کی ازلی کشش تخلیقی عمل میں شامل ہو کر انسانی وجود کا سب سے اہم سوال بن جاتی ہے۔ بعض شعراء نے تو سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت قلبِ انسانی کی کیفیت کو بھی ریکارڈ کر دیا ہے۔ جب دل پر اک بوجھ طاری ہو جاتا ہے یا روح کائنات سے قربت اور فاصلے، کشش اور دوری کا بیک وقت تجربہ انسان کو ہوتا ہے اور وہ اپنے وجود میں ایک ایسا خلا محسوس کرتا ہے جسے مادی اور حیوانی عمل کے مقابل صرف انسانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب وہ خود کو تمام کائنات سے ماورا کسی عظیم قوت اور ہستی کی طرف مائل بہ پرواز محسوس کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو جوش ملیح آبادی کے اس شعر پر غور کیجئے جنہوں نے دیکھئے اس تجربے کو کیا جہت دے دی ہے؟

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

پھر ایک جدید غزل گو نے "مغرب" کے وقت کے اپنے

انکے تجربے کو بڑی خوبی سے ریکارڈ کر دیا ہے۔

قریب شام دھندلکوں میں پائے جاتے ہیں
کسی کے چند اشارات وہ بھی مبہم سے (فرید جاوید)

صبح و شام کے اوقات میں یہ تجربات تمام دنیا کی شاعری میں کسی نہ کسی طرح بیان ہوئے ہیں۔ قدیم مشرق میں اور بالخصوص ہندوستان کی قدیم شاعری ویدوں اور اس کی اشلوکوں سے لے کر ہندی گیتوں میں جھٹپٹے کے وقت اور شام کی بیلا تک ایک خاص جہت بھی رکھتے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی صبح اور شام کے مناظر شعرا کا موضوع رہے ہیں اور اردو غزل تک میں اس کو بڑے لطیف استعاروں میں بیان کیا گیا ہے۔ دونوں سے محض چند مثالیں دیکھئے:

مسند گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا
(ولی)

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج
رات گزرے گی کس خرابی سے
(میر)

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی
(سودا)

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا
(ناسخ)

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہان بینِ خلیل
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ میری آہِ صبح گاہ میں ہے
گراں بہا ہے ترا گریہ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
(اقبال)

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں
(فراق)

سماجی علوم اور علوم بشریات کے ماہرین نے آدمی اور انسان کے سفر ارتقاء اور ماہیت کا سراغ لگانے کے لئے اس کے قدیم ترین آثار جنگل کی رہائش اور پھر آہستہ آہستہ ابتدائی سماجی معاشروں کے بنیادی عوامل، مشاغل کا پتہ چلانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں انسان کی تنہائی اور پوری کائنات کے سامنے اپنے وجود کی بقا کی جدوجہد اور خواہش کو قائم رکھنے کے لئے دنیوی قوتوں کے ساتھ ماورائے طبیعات اور کائنات کی طاقتوں کے سرچشموں کی استعانت اور مدد حاصل کرنے کے تمام عوامل کو خوف کی جبلت سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ یہ خوف خود انسان کے ازلی احساس تنہائی اور دنیا کی سختیوں، آزمائشوں اور فطرت کی چیرہ دستیوں کے مقابل اپنی بے بسی کے احساس سے پیدا ہوا تھا۔ اب خواہ اسے دور کرنے کے لئے جادو ٹونے ٹوٹکے اختیار کئے گئے ہوں یا بھوت پریت اور مخالف قوتوں کی تسخیر کے عمل (WITCH CRAFT) کا سہارا لیا گیا ہو یہ بات واضح ہے کہ کسی نادیدہ قوت یا ہستی کی امداد

استعانت اور اعانت اور اس سے تعاون حاصل کرنے کی خواہش آدمی کو ابتدا سے رہی ہے اور یہ عمل ابتدائی سماجی معاشروں میں اتنا بنیادی اور اہم رہا ہے کہ خواہ جدید ماہرین معاشیات یا اشتراکی نقطۂ نظر کے حامل افراد، اس امداد و اعانت کے وسیلوں کو استحصال کی پہلی کوشش قرار دیں جو محض اپنی چالاکی اور ذہانت کے ذریعہ شعبدہ بازی کے وسیلوں سے، بغیر محنت اور قوت بازو کے، گھر بیٹھے پیٹ بھر لیتے ہوں اور خواہ پیداواری ذرائع کے مقابل، غیر پیداواری ذرائع کے ذریعہ فائدہ حاصل کرنے کو طبقاتی مفادات کا اوّلین تجربہ قرار دیا جائے۔ یہ بات بالکل طے ہے کہ آدمی کا ماورائے طبیعات کسی نادیدہ قوت کو خوش کرنے اور موسموں کی قہرسامانیوں، پیداوار اور اپنے وجود کے تحفظ کے خاطر اس نادیدہ قوت کے سامنے سر جھکانے کا عمل بغیر اس کی اپنی فطرت کے تقاضوں اور علت کے ممکن نہیں تھا، جو ابتدا سے انسان کی ماہیت اور اس کی انفرادی اور اجتماعی ہیئت میں شامل تھا۔ اگر یہ خواہش آدمی کی ذات اور یہ علت اس کی فطرت میں موجود نہ ہوتی تو نہ اس کو "ایکسپلائٹ" کر کے بعض مغربی ماہرین کے مطابق اسے "استحصال" کا ذریعہ بنایا جاسکتا تھا اور نہ اسے انسان میں موجود معبودیت کے تقاضے کے مطابق کسی نادیدہ قوت کے سامنے سر جھکانے سے آسودگی اور قلبی اطمینان اور نفسِ مطمئنہ کا وہ باطنی عمل اور جوہر حاصل کیا جاسکتا تھا جو آج بھی اس کی فطرت میں من وعن موجود ہے اور سارے مشاہدات، علوم اور مادیت کے شعور کے دعووں اور اس کی بنا پر اس حقیقت سے انکار کے باوجود اب بھی موجود ہے۔ لہٰذا اگر ہم کسی نادیدہ قوت کے سامنے سر جھکانے کی فطرت اور اس سے باطنی آسودگی اور قوت حاصل کرنے کے اس عمل کو انسان کی جبلت قرار دیں تو اس پر کم از کم حیرت تو نہیں ہونی چاہیئے؟ جبلت کا ذکر کیا ہے تو اسے مغرب کے اکثر اہلِ دانش نے بقول اقبال فیضانِ سماوی سے محروم ہونے کے باعث کبھی کسی عمل سے تعبیر کیا اور کبھی کسی سے، اس کا ایک پہلو آپ کی نظر سے اوپر گذر چکا ہے ان اہلِ دانش میں بعض علم النفس کے اوّلین ماہرین نے انسان کو تین بنیادی جبلتوں کا مجموعہ قرار دیا ہے ان میں بھوک پیاس جیسی بنیادی ضروریات کے علاوہ خوف اور جنس کو زیادہ اہمیت حاصل تھی لیکن فرائیڈ نے تو انسان کے تمام خصائص میں جنسی آسودگی کو اتنی اہمیت دی کہ من و تو کا ہر فرق مٹا کر رکھ دیا۔ بےشک تمام حیوانات میں جس میں ان کے بقول آدمی سب سے ترقی یافتہ ہے دیگر جبلتوں کے ساتھ خوف اور جنس انسان میں سب سے زیادہ لطیف (REFINE) صورت میں موجود رہی ہے اور ان کے مقابل آدمی اپنی عقل اور شعور کی بنیاد پر ارتقاء پذیر بھی ہے لیکن جس بنا پر وہ بالکل ایک نئی نوع قرار پاتا ہے وہ اپنے باطن میں خود کو نامکمل محسوس کرنے اور کسی ہستی کی طرف ازلی کشش محسوس کرنے کی جبلت کی بنا پر ہے ——— جہاں تک نفسیات کے اعتبار سے خوف اور جنس کی نوعیت کا معاملہ ہے تو خوف کے بارے میں ایک ہلکا سا اشارہ اوپر کیا جاچکا ہے لیکن نفسیات والوں نے جنس کو اتنی اہمیت دی ہے کہ انہوں نے آدمی کے بنیادی آسودگی کے عوامل میں تو اس کو ثابت کیا ہی تھا۔ انہوں نے تو انقلابی جدوجہد تک کرنے والوں کو بھی جنسی ناآسودگی کا شکار قرار دے دیا ہے جب کہ وہ اس کی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا چنانچہ اس خیال کو خود مغرب کے بعض نفسیات والوں نے مسترد کر دیا ہے۔ مگر میں اسے اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک خاص زاویے سے دیکھنا چاہتا ہوں۔

اوپر یہ بتایا جاچکا ہے کہ انسان اپنے وجود میں عدم تکمیلیت، محرومی اور تنہائی کے طبعی عمل کی وجہ سے کسی ہستی کو پانے اور کسی وجود کے ذریعہ اپنے وجود کی تکمیل اور ایک نامعلوم اور نادیدہ قوت کی طرف کشش محسوس کرنے اور اس اعتبار سے تشنگی محسوس کرنے کی ایک

ازلی شدتِ احساس کا تجربہ اکثر کرتا رہا ہے۔ یہ عمل انسان اور فطرت کے درمیان اور اپنے ماحول اور انسانی معاملات میں کئی شکلیں اختیار کرتا ہے۔ اس کا بنیادی عمل وہ ہوتا ہے جسے محبت کہتے ہیں اور اس عمل کو انسانی وجود کے ایک اور نادر الوجود اور قدرت اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیت کے وسیلے یعنی شاعری میں خاص اہمیت حاصل ہے اور شاعری کا تو وہ اختصاص ہے۔ اس کا ذکر تو اپنے وقت پر آئے گا۔ لیکن محبت کے اس عمل کو نفسیات دانوں نے خالص جنسی نوعیت کا اور حیاتیاتی عمل قرار دیا ہے۔ عورت اور مرد کا رشتہ یقیناً اپنی نوع کے تسلسل اور بقاء کے لئے وہی نوعیت رکھتا ہے جو حیوانوں کی نسل کو برقرار رکھنے اور بقاء کے لئے رکھتا ہے۔ لیکن انسانی جنس، حیوانی جنس کے مقابل طبایع نفسیات، شعور، اور اپنے ذہنی عمل کی بناء پر اپنے تقاضے اور معیار بدلتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ محض جنسی عمل یا بقائے انسانی کا جسمانی فعل نہیں رہتا بلکہ اپنے وجود اور دوسرے فریق کے وجود کو کچھ اور سطحوں پر بھی قبول کرتا ہے۔ جس کا سب سے زیادہ قوی عنصر عشقیہ ہوتا ہے۔ عشقیہ تعلق، جنس کے عمل کے ساتھ محبت اور وجود کی تشنگی کے تمام امکانات کے ساتھ دوسرے فریق کو اس طرح قبول کرتا ہے جیسے وہ اپنے وجود کی تکمیل کر رہا ہو یا کسی ایسی محرومی کو پورا کر رہا ہو جس میں اس کی ذات صرف جسمانی سطح پر نہیں بلکہ وجود کی ہر سطح پر آسودگی کی متلاشی رہتی ہے۔ یہاں جنسی فعل محض جنسی آسودگی یا جسمانی فعل کی تکمیل نہیں رہتا بلکہ وہ خود کو مکمل طور پر اپنی ذات کے ان دیکھے اور شعور و لاشعور کے تمام امکانات کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ یہاں اس سوال کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ اگر عشق محض جسمانی آسودگی یا جنسی فعل کی تکمیل ہوتا تو 'لومیرج' یا اپنی محبوبہ کو جسمانی طور پر حاصل کر لینے کے بعد آدمی کو مکمل آسودگی اور باطنی طمانیت میسر آجانی چاہیئے۔ مگر ہم اور آپ ننانوے ۹۹ فیصد 'لومیرجز' کا انجام جانتے ہیں بلکہ متعدد مجنوں اور 'لومیرجز' اور آزادانہ جسمانی خواہشات اور طرح طرح کے تنوع کے حوالوں کے استعمال کرنے کے باوجود خود کو آدمی آج بھی اتنا ہی تنہا، ناآسودہ، تشنہ اگر محسوس کرتا ہے تو ہمیں اسے ایک اہم انسانی جبلّت کے حوالے سے صرف حیاتیاتی یا جنسی فعل قرار دینے کے تصور پر از سرِ نو غور کرنا چاہیئے۔ ہر وقت جنسی اور جسمانی طلب کے نوبنو طریقوں میں غرق رہنے والے اسے ایک فطری جسمانی تقاضہ اور حیاتیاتی عمل قرار دیتے ہوئے دراصل اسے حیوانی جبلّت کی صورت میں دیکھتے ہیں حالانکہ حیوان بھی اپنی اس جبلّت اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے موسموں، ماحول اور وقفوں کے محتاج ہوتے ہیں، جب کہ انسان اسے اپنے شعور اور خواہشات کے تابع کر لیتا ہے مگر انسان کا باطنی خلاء پھر بھی پُر نہیں ہوتا! کیوں؟

اگر آپ اس سوال پر ذرا دیر غور کریں تو ایک تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عشق اور عشقیہ عمل میں جنس اور جسم کی خواہشات اور لذّات شامل تو ہوتی ہیں اور اس کے بغیر وہ یقیناً انسانی عمل نہیں رہتا مگر اس کو کسی شخص اور اس کے عشق کے لئے مقصود بالذات یا واحد ضرورت یقیناً قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ جسمانی یا جنسی ضرورت کے پورا ہو جانے کے باوجود محبوبہ اور بیوی کو حاصل کر لینے اور اس سے مسلسل متمتع ہونے کے باوجود ناآسودہ، تشنہ، نامکمل اور کسی نہ کسی اعتبار سے کسی امکانی ہستی اور ذات کے لئے بے چین، مضطرب کیوں رہتا ہے؟ اور وصل سے شادکام ہونے کے بعد بھی انجانے اور غیر شعوری طور پر کسی اور محبوب کے ہجر اور فراق، دوری اور التہاب کو کیوں اب بھی اسی طرح محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جو انسانی سرشت اور فطرت میں شامل ہے۔

بعض شعرائے اس انوکھے غیر معمولی، متضاد عناصر کو یکجا

کرنے والے مگر طبعی، کیمیاوی عمل کو زبان دی ہے۔ مثلاً جگرؔ کے اس شعر کو دیکھئے۔

ہجر سے شاد وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگرؔ نے پائی ہے

میرؔ اس عمل کو دوسری طرح دکھاتے ہیں۔

اک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل
وہی بے قراری بدستور ہے

غالبؔ نے دیکھئے اس میں کیا تہہ داری پیدا کی ہے۔

ہر چند ہر اک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

اور فراقؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

آج تو درد ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آیا ہوتا

مراد یہ ہے کہ آدمی کے لئے عشق میں صرف جسمانی یا جنسی آسودگی یا لذت کا تجربہ پوشیدہ نہیں بلکہ اس کے وجود کی ازلی تشنگی اور محرومی بھی ساتھ ہی شامل ہو جاتی ہے۔ جو اسے اضطراب اور جستجو میں مبتلا رکھتی ہے۔ گویا عشق انسان کی اس آغوشِ تمنا کا نام ہے جو کسی ان دیکھی ہستی اور وجود کے لئے ہمیشہ کھلی رہتی ہے وہ یقیناً ایک انسانی جذبہ ہی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وہ کسی نہ کسی انسانی پیکر میں اپنی ناآسودگی کے لئے پناہ بھی چاہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ وہ اس میں کامیابی اور مکمل آسودگی کے باوجود خود کو تشنہ اور نامکمل محسوس کرتا ہے اور اگر بدنصیبی سے وہ اپنے جسمانی ہدف کو بھی حاصل نہیں کر سکتا ہے تو اس کی تشنگی، ناآسودگی، محرومی اور ناکامی اس کی زندگی کو المیہ میں تبدیل کر دیتی ہے لیکن اس کا عشق اضافہ کا باعث ہو جاتا ہے اور اسی وقت وہ اپنے حوصلے اور بساط کے مطابق اپنے جذبے کی گہرائی اور گیرائی کو ظاہر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

آیئے اب اس عمل کو عمومی تجربے کی سطح پر بیان کر کے اسے اپنے شعور کی گرفت میں لائیں! ہو سکتا ہے کہ اس میں بے لطفی پیدا ہو جائے مگر بے لطفی میں بھی کیا مضائقہ ہے؟ کیونکہ ایک بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ محبت ایک ایسا عمل ہے کہ اس کا مزہ ہر فرد زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں چکھتا ضرور ہے۔ جب کوئی فرد بچپن سے نکل بلوغت کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو جہاں وہ اس عمر میں بڑا حساس ہوتا ہے وہاں وہ اپنے محبوب نظر کا انتخاب کرتا ہے اور اسے حاصل کرنے میں شدت جذبات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نفسیات کی رو سے اس عمر میں وہ جبلی طور پر جنس کا باقاعدہ اظہار کرتا ہے لیکن جیسے جیسے وہ اپنی محبت میں ڈوبتا جاتا ہے اور اپنے محبوب کے حصول میں دشواری محسوس کرتا ہے یا ناکام ہوتا جاتا ہے۔ یہ محبت اس کی زندگی کی سب سے اہم سرگرمی بنتی چلی جاتی ہے۔

یہاں ایک پہلو کی وضاحت کرتا چلوں کہ مشرق میں عموماً انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب کی غلامی کے باعث اور پھر اس کے وسیع تر معاشرتی، علمی اور تہذیبی اثرات کے تحت ہمارے معاشروں میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مگر اس تبدیلی کے باوجود یہاں اب بھی ہماری چند اخلاقی، انسانی اور معاشرتی اقدار ایسی موجود ہیں کہ ہمارے معاشرے اب تک وسیع پیمانے پر آزاد جنسی تجربوں سے آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ دوسری طرف مغرب میں بھی بڑے پیمانے پر انفرادی آزادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے تحت جنس کے آزادانہ تجربوں کے باوجود وہاں کے معاشروں میں اس کا "حیوانی مظاہرہ" یا اجتماعی جنسی عمل اب بھی نظر نہیں آتا۔ اور ان کے نوجوانوں میں اپنے ابتدائی عشقیہ تجربات میں جنسی عمل اور لذات

سے پوری طرح بہرہ یاب ہونے کے باوجود اب بھی کچھ رفاقت کی تمنا یا شعور موجود ہے۔

ہمارے اپنے روایتی معاشرے میں تو کسی نوجوان اور نوبالغ کا کسی کو چاہنے یا اسے محبوب کی صورت میں پسند کرنے کا عمل اس کی عمومی زندگی کو بدل کر رکھ دیتا ہے اور اس عمر میں محبت یا عشق کا تجربہ اُس کی زندگی کی سب سے اہم اور شدید سرگرمی بن جاتا ہے یہاں بہت کچھ بدلا ہے مگر اب بھی سب سے پہلے اس کے معمولات میں بے قاعدگی آجاتی ہے۔ اس کی نیند اور آرام میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ کھانے کو جی نہیں چاہتا، بھوک اڑ جاتی ہے، ایک خاص محویت پیدا ہو جاتی ہے جو اس سے قبل کی زندگی کے بہت سے معمولات پر سے اس کی توجہ ہٹا دیتی ہے اور پھر وہ لمحہ آتا ہے جب وہ ساری ساری رات آنکھوں میں اور بستر پر کروٹیں بدل بدل کر کاٹ دیتا ہے جی ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے، چہرہ اتر جاتا ہے۔ یہی وہ عمل ہوتا ہے جب ہمارے معاشرے میں اب بھی ماں باپ بھائی بہن یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا! چنانچہ اس کی شادی کا سوچا جانے لگتا ہے۔ ایک رفیق کی تلاش کا مسئلہ اتنا آسان مرحلہ نہیں ہوتا سب سے پہلے تو مطلوب کو حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ آنکھ لگ جانا الگ بات ہے مگر ایک دوسرے کو حاصل کرنا بالکل دوسری بات۔ اور پھر ہمارے یہاں جہاں طبقاتی فرق، خاندان، برادری اور کفو، غیر کفو کے تصورات جو اب بھی ہمارے رسوم و رواج میں گہرائی تک شامل ہیں۔ لہٰذا عاشقوں کی اکثریت اُسی مرحلے پر ٹھکانے لگ جاتی ہے محبوبہ کسی اور کی ہو جاتی ہے اور اپنی مجبوری کے نام پر دونوں رو پیٹ کر صبر کر لیتے ہیں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عشق کو ایک چیلنج سمجھ کر محبوبہ کو حاصل کرنے کے قابل ہونے یا ان شرائط کو پوری کرنے کے لئے جو محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں، زندگی کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ان میں کچھ کو ناکامی ہوتی ہے تو وہ سماج کے رسوم و رواج اور معاشرتی اقدار کے باغی بن جاتے ہیں۔ (جس سے فرائڈ کو جنسی ناآسودگی کے سبب اور اپنے مخصوص تجزیہ کی بنیاد پر انہیں انقلابی تک کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہوا) ان میں کچھ مگر بہت کم ایسے بھی ہوتے جو جبر اور تشدد سے محبوبہ کو حاصل کرنے کی کوشش میں سماجی یا اخلاقی مجرم بن جاتے ہیں اور ان سے بھی کم وہ ہوتے ہیں جو محبت اور عشق کے مرحلوں، جد و جہد اور تگ و دو کو بڑے حوصلوں، وفاداری اور استقامت سے طے کرنے کے بعد محبوبہ کو حاصل کرنے یا جیت لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بہت ہی عبرت ناک انجام ہوتا ہے کہ یہ شاندار کارنامہ سر انجام دینے کے بعد بہت ہی شاذ ایسا ہوتا ہے کہ وہ محبوبہ کو بیوی کی صورت میں دیکھ کر کچھ وقت پہلی سی محبت کی توقعات یا سرشاری میں گزار لیتے ہوں ورنہ ان میں سے اکثر اکبرالہ آبادی کے الفاظ میں جلوۂ کثرت اولاد میں مبتلا ہو کر نون، تیل، لکڑی کی فکر میں رہ کر ساری عمر کھپتے جاتے ہیں اور اپنی محبت پر پچھتا پچھتا کر ہر وقت محبوبہ سے چخ میں جھگڑے رہتے ہیں اور اگر کوئی ایک آدھ ذرا بالغ نظر ہوا، اور ذہنی اور جذباتی طور پر آسودہ تو کم از کم ابتدائے عشق کی ہلچل، بے چینی اور اضطراب سے محروم ہو کر پھر اپنی ذات میں تنہائی، وجود کی ناتمامی اور ذات کے خلا کو اسی طرح محسوس کرنے لگتا ہے۔ جس کی کمی کو دور کرنے یا تکمیل کرنے کی خاطر اس نے محبوبہ کے حصول کو ہی سب کچھ سمجھا تھا۔

دراصل عشق کا اصل تجربہ انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ محبوب سے گزر کر صرف محبت، منزل سے رہائی پاکر صرف سفر اور اپنے آپ کو بھول کر صرف محبوب کی موجودگی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ گویا عشق اس وقت کامل ہوتا ہے جب عاشق محبوب کے سامنے اپنے وجود کو مکمل طور پر (SURRENDER) کر دیتا ہے اور اپنی محبت کو ایک

(DEVOTION) یا کامل سپردگی کی صورت میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی محبت اور عشق کا وہ ارفع تصور ہے جو ساری دنیا کے ادبیات کی عشقیہ شاعری میں انسانی وجود کی اکائی اور صداقت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایثار اور قربانی کی اعلیٰ ترین اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ عشق کا یہ تصور ہی دراصل ہماری شاعری بالخصوص عشقیہ شاعری اور غزل میں نمو کرتا ہے۔ میں شاعری کی مثالیں انتہائی اختصار سے دے رہا ہوں ورنہ یہ روایت فارسی شعرا سے لے کر فراقؔ تک بڑا لمبا سفر طے کرتی ہے۔

ہر قدم پہ تھی اُس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا
محبت نے کھویا کھپایا ہمیں
بہت اس نے ڈھونڈا نہ پایا ہمیں
رفتگاں میں جہاں کے ہیں ہم بھی
ساتھ اس کارواں کے ہیں ہم بھی
مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
(میرؔ)

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
(غالبؔ)

اب نہ کوئی نگاہ ہے اور نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں
(اصغر گونڈوی)

جو بہار آئی میرے گلشنِ جاں سے آئی
خاک کے ڈھیر میں یہ بات کہاں سے آئی
(ذہین شاہ تاجی)

یہاں محبت کامل انسان کا باطنی تقاضہ اور اس کی ذات کا بنیادی مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ پہلے کسی کا ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کو محبوب کی ذات میں جذب کر دیتا ہے جو بعد میں نام کے تعلق سے اور من و تو سے بے غرض ہو جاتی ہے اور ایک علامت بن جاتی ہے۔ آپ کے ذہن میں اگر عربی فارسی اور اردو کی عشقیہ شعری اقدار اس کی تشبیہات اور استعارات ہیں۔ اور اس کی بنیادی علامتیں واضح ہیں تو آپ کو یہ معلوم ہی ہوگا کہ اس کی بہترین عشقیہ علامتیں وہی ہیں جنہوں نے کامل سپردگی کے ساتھ اپنے تمام تر وجود کی نفی کر کے نہایت بے غرضی، مکمل اخلاص اور ایثار کے ساتھ محبوب کے سامنے خود کو سرنڈر کر دیا تھا یا اپنی ذات کو اس کی ذات میں جذب اور گم کر دیا تھا جہاں عاشق دراصل ایک فرد نہیں بلکہ ایک قدر اور ایک رویّے کی علامت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس اعتبار سے عربی، فارسی اور اردو کی عشقیہ شاعری میں مجنوں کو امام عاشقاں کی حیثیت حاصل ہے اور اسی لئے اردو غزل کے سب سے بڑے امام میرؔ نے مجنوں کو عشق کی ایک اعلیٰ ترین کسوٹی اور معیار قرار دے رکھا ہے۔

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

مجنوں اس لئے سب سے بڑا عاشق تھا کہ اس نے اپنی ذات اور انا سے گزر کر پہلے تو خود کو اپنے مطلوب کی ذات میں اتنا گم کر دیا کہ اس کے سامنے اس کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہا اور پھر ایک منزل وہ آئی کہ جب لیلیٰ کا وجود اس کے لئے کسی پیکر جسمانی کا نام نہ رہا بلکہ اس کی اپنی ذات اور محبت کا ایک استعارہ اور وسیلہ بن گیا۔ اس کی موت اس کی اسی والہانہ اور جذب کا ایسا اظہار جو سپردگی، ایثار اور اخلاص کا کامل نمونہ بن گئی۔ وہ صحرا میں ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں بیٹھا ہوا تھا کہ آرہ کشوں نے جو اس کی وہاں موجودگی سے بے خبر تھے درخت کو دو حصوں میں چیر دیا اور اس کے ساتھ مجنوں کو بھی، لیکن نہ اس کی محویت میں کوئی کمی نہ اس کے ہونٹوں سے کوئی اف نکلی، یہ جذب یہ خود فراموشی یہ "دیوانگی" ہی معیار محبت بن گئی۔ میرؔ نے محبت کی اس "کسوٹی" کو اپنی شاعری میں جگہ جگہ برتا ہے کہیں نام لے کر، کہیں اپنے حوالے سے اور کہیں محبت کے مثالی نمونے اور علامت کی صورت میں۔

زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

اردو اور فارسی شاعری میں عشق کی ایک اور بڑی علامت فرہاد کا بھی بہت ذکر ملتا ہے۔ مگر کامل سپردگی اور محبت میں ڈوب جانے کی جیسی علامت مجنوں ہے ویسا فرہاد نہیں ہے اور اس کو خودکشی کے باعث مجنوں کے مقابل کم حوصلہ، کمتر اور کم ظرف عاشق گردانا جاتا ہے اور اس بنا پر اس کے "جذبۂ اخلاص" اور محبت میں سپردگی کی کمی کو مجنوں کے مقابل اکثر طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ اردو کے سب سے خود نگر شاعر غالبؔ نے بھی جو اردو اور فارسی کے روایتی عشق کے تصور کے بہت زیادہ قائل بھی نہیں فرہاد کی کم حوصلگی پر طنز کے تیر چلاتے ہیں۔

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامیٔ فرہاد نہیں۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

میرؔ نے فرہاد تو کجا مجنوں سے بھی اپنا مقابلہ کہیں کہیں فخر کے ساتھ کیا ہے۔ میرؔ کے یہاں خود کو عشق میں گم کر دینا عشق کی شرطِ اوّل ہے جسے فراقؔ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

عشق نے مجھ سے کمی کی ورنہ
مجھ پر تیرا دھوکہ ہوتا

دراصل محبت اور عشق کو وہ عاشق کے لئے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا کر اپنی ناکامیوں، محرومیوں اور دنیا کے سخت سے سخت مصائب کے ساتھ موت کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کر کے محبت کو زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد اور قدر بنا دیتے ہیں۔

مرے سلیقے سے مری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

چنانچہ میرؔ نے ساری زندگی خونِ جگر پینے کے باوجود محبت کے لئے جان دے دینے کے اسی جذبۂ کامل کی بنا پر خود کو اگر ایک طرف فرہاد کا استاد قرار دیا ہے۔

مرے سنگِ مزار پہ فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

تو دوسری طرف وہ مجنوں سے بھی چشمک کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میرؔ نہایت پاسِ عزت داراں ہے

کوہکن و مجنوں یہ دونوں دشت و کوہ میں سودائی

شوق نہیں ملنے کا ہم کو میرؔ ایسے آواروں سے

عشق میں ہم ہو گئے نہ دیوانے
قیس کی آبرو کا پاس کیا۔
گویا شہرِ وفا میں سمجھ کے کہ مجنوں
کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

میرؔ کے یہاں محبت کا یہ "شعور" ہی ان کو باقی غزل گوؤں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

جنوں "کا یہ "شعور" جو دنیا کے بہترین عاشقوں، جگر والوں، مجاہدوں اور شہیدوں کو پیدا کرتا ہے۔ یہ عشق دنیائے انسانیت کی ان عظیم ہستیوں کی شناخت کا سبب بنتا ہے جو صداقت اور حق کے لئے اور انسانیت کے اعلیٰ ترین مقاصد کے لئے کبھی اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پیتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ان کو حق کی راہ میں استقامت، قربانی اور مکمل سپردگی کی وجہ سے مصلوب کیا گیا۔ اور کبھی انہوں نے اپنے خاندان سمیت رہِ شہادت میں ایسی قربانیاں دیں جو قیامت تک کامل ترین شہادت کی علامت بن کر روشن رہیں گی اور دنیائے تاریخ میں ایسی تو متعدد اور بے شمار مثالیں اور شخصیات ہیں جنہوں نے ظلم اور تعدی کی تمام آزمائشوں سے گزر کر اور جان پر کھیل کر بھی اپنے پورے شعور کے ساتھ اس جنوں کی گواہی دی جو ان کے ایمان اور ایقان کے لئے آج بھی عشق کی اعلیٰ ترین مثالیں قرار دی جاسکتی ہیں اور پھر اللہ کی راہ میں خود کو پیش کرنے والے ان برگزیدہ پیغمبروں کی زندگیوں پر غور کیجئے جنہوں نے خالقِ حقیقی کے حضور اپنی بندگی کا وہ نذرانہ پیش کیا جس نے دنیا کو انقلابات اور انسانیت کی راہ دکھائی۔ یا پھر ان انقلابیوں کی جدوجہد، قربانیوں اور ایثار پر غور کیجئے جنہوں نے کسی سیاسی اجتماعی، معاشرتی اور انسانی تصور کے لئے اپنی زندگی کا سودا کر لیا تھا اور جان پر کھیل کر قید خانوں کی نذر ہو کر، گولیوں کا نشانہ بن کر، سولیوں پر چڑھ کر انہوں نے اپنے عظیم مقصد میں خود کو اس طرح جذب کر دیا کہ بقول شاعر منزل اگر نہ پاسکا تو سر تو کھو سکا کی مثال بن گئے اور ان ہی قربانیوں کا ثمر بعد میں آنے والوں نے اٹھایا۔ عشق کا یہی وہ ارفع تصور ہے جو جسم اور جنس کی سطح سے بلند ہو کر کسی "مجرد" حقیقت اور ایک پاکیزہ تصور کو اپنی ذات کا بنیادی مرکز بناتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس کا حامل فرد اپنی خواہشات، نفسانی لذات، تسکین اور جسمانی آسودگی سے بلند ہو کر اپنی اس "محبت" اور "عشق" کے سامنے بے نفسی، بے غرضی اور اخلاص کے ساتھ اپنے وجود کی قربانی پیش کرتا ہے۔ گویا انسان کے اندر اس کے وجود کی تشنگی اور جستجو جس ترفع اور مثالی زندگی کی طرف لے جاتی ہے اس کا بنیادی عمل مکمل سپردگی کا عمل ہے۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا آدمیوں کے اس "مخصوص" تجربہ کو گرفت میں لانے یا "ریکارڈ" کرنے کی کوئی کوشش کی گئی ہے یا نہیں؟ یا اب تک ہم نے اپنی "نوع" کی اس بنیادی ماہیت کا سراغ لگانے کی کتنی اور کیسی کوشش کی ہے؟

سماجی علوم اور علوم بشریات کے مطالعے سے ایک بات کا سراغ تو تمام جوازات اور چنیں و چناں کے باوجود مل جاتا ہے کہ انسان کسی نہ کسی نادیدہ قوت کے سامنے ابتدا سے سر جھکاتا آیا ہے۔ کسی نہ کسی شدید اضطراب، خوف اور پریشانی میں اسی کی استعانت چاہتا ہے اور جب اپنے پورے وجود سے اس کی شکر گزاری کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو اسی ہستی کے سامنے سجدہ بجالاتا ہے اور جب بھی انسان مشینی زندگی کے شور و شغب سے آج بیسویں صدی میں بھی کائنات کی کھلی آغوش میں پہنچ جاتا ہے اور فطرت سے اسے جب بھی ہم آہنگ ہونے کا موقع ملتا ہے تو وہ خود کو تنہا اور اس کے مقابل پاتا ہے اور اس کے اندر ایک افقی جہت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے وجود

میں کوئی ایسا لموہوم عمیق رخنہ، دقیقہ یا جھری کو موجود پاتا ہے جو اسے کسی اور جانب متوجہ اور بے تاب رکھتی ہے ۔اب خواہ سائنس یا نفسیات اس کی کوئی بھی توجیہہ کرے مگر بظاہر اس مادی اور مشینی عمل کی دنیا میں انسان کے وجود میں کوئی جھری، پٹ یا کھڑکی ایسی ضرور موجود ہے جو انسان کو کسی ماورائے کائنات اور ماورائے طبیعات "مجرد" جلوے سے دوچار کر دیتا ہے اسے مادی سطح سے بلند کر کے کسی کائنات گیر روح سے آشنا کرتا ہے اور خواہ اس کی منطق اس کی سمجھ میں آتی ہو یا نہ آتی ہو مگر ایک نادیدہ پراسرار اور تمام کائنات پر محیط کسی قوت کا احساس اور کسی الفاظ سے ماورا عظیم تر ہستی کی طرف کشش کا احساس ہی آدمی اور انسان کا عمیق ترین قدیم ترین اور عمومی تجربہ ہے۔ جو آج بھی انسان کے لئے ایک بنیادی سوال کی صورت میں آویزاں ہے اور یہ سوال خود انسان کے وجود کو اپنے سے آشنا کرتا ہے ؟

یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ اس ہستی کا انسانی وجود میں کامل ترین ارتکاز اور انسانی وجود کا خلا کثرت سے آسودہ نہیں ہو سکتا تھا جتنا وحدت اور اکائی سے جس طرح ایک حقیقی عاشق بیک وقت کئی محبوباؤں سے محبت کر کے اپنے جذبۂ محبت کو بھرپور طور پر کسی ایک جگہ مرتکز نہیں کر سکتا ہو جس طرح انسان انتشار ذہنی اور کسی نفسی اور معاشی بحران میں اپنے کو کسی ایک "نکتے" پر مرکوز نہیں رکھ سکتا اسی طرح انسانی وجود کی تشنگی خلا اور عدم تکمیلیت کا یہ سوال کسی ایک ہی ہستی کی طرف ترفع کرتا ہے۔ اسی لئے ہم اگر ماہرین نفسیات اور بشریات کے اعتبار سے آدمی کی حیثیت میں جبلّات میں حیوانوں سے اشتراک کرتے ہیں تو خالص آدمی اور انسانی جہت سے ہماری بنیادی جبلّت توحید قرار دی جاسکتی ہے۔ انسان کے اندر اس کی تنہائی، تشنگی اور عدم تکمیلیت جس امکانی جہت کو اپنے اندر گہرائی میں پیدا کرتی ہے وہ ایک ہی نادیدہ اور ماورائے کائنات ذات کی جستجو کے لئے بےقرار رہتی ہے گویا انسان کا اپنا وجود ہی توحید کا وسیلہ، آلہ اور ( RECEIVER ) ہے۔ مگر انسان کا ہیولیٰ اور اس کی حیوانی جبلّات اپنی غلاظت، آلودگی اور کثافت سے رہائی حاصل کر کے ہی توحید باری تعالیٰ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور چونکہ انسانی عقل اور شعور ابتدائی مراحل میں اس قابل نہیں تھی کہ مجرد تصور تک جاسکتی اور وحدانیت کا کماحقہ ادراک کر سکتی۔ لہٰذا توحید تک پہنچنے کے لئے آدمی کو کتنے عوالم اور طبقاتِ ادراک سے گزر کر انسان کی اس منزل پر پہنچنے کے لئے کتنے ہزاروں سال صرف کرنے پڑے اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور جب آدمی کا دماغ اور شعور حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح اور شعور تک پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس علم سے آگاہ کرنے اور اس کو وجود میں لانے کے مقصد کو، اس کو شعور میں لانے کے لئے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعہ ابتداء سے توحید ہی کی دعوت دی اور وحدانیت ہی کی طرف بلانے کا اہتمام کیا۔ لیکن سوائے چند نفوس قدسیہ کے بہت بڑے عرصے تک انسانی ذہن اجتماعی طور پر اتنی مجرّد، پاکیزہ، منزّہ، لہا ، اور بسیط حقیقت اور صداقت کو اپنے شعور میں لانے سے قاصر رہا۔ اور اس محرومی اور انکار کی پاداش عمل بھی بھگتی ۔ لیکن بالآخر انسانی شعور اس منزل تک پہنچ گیا جب صاحب شریعت اور صاحب کتاب برگزیدہ پیغمبروں کے ذریعہ اس ہدایت کو انسانوں کے ایک بڑے طبقے تک پہنچایا گیا مگر انسانی ذہن مجرّد حقیقت مطلق تک اجتماعی طور پر شاید پہنچ نہیں سکتا تھا اور کثرت، مادہ اور حقیقت کو ہی اصل حقیقت سمجھ کر توحید کے راستے کو بار بار ترک کر کے جہالت کا شکار ہو جاتا تھا۔ اللہ کی کتاب میں تحریف کرنے لگتا تھا اور توحید کی تعلیم کو مسخ کر کے کچھ سے کچھ بنا دیتا تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بار بار ایک نیا پیغمبر مبعوث کیا جاتا تھا تاکہ وحدانیت کے پیغام کا اعادہ کیا جائے اور انسانی

ذہن کی تربیت کی جائے اور اس کے شعور کو مجرد حقیقت تک پہنچانے کے لئے صیقل کیا جائے تا آنکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو توحید کامل کے صحیفہ کے ساتھ پیغمبر آخر الزماں بنا کر بھیجا گیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ انسانی شعور اور ذہن اس درجے اور سطح پر پہنچ گیا ہے کہ توحید کا ادراک کر سکے اور انسان اپنے اس سوال کا جواب پا سکے کہ اس کے اندر ایک خلا کیوں موجود رہتا ہے، کیوں وہ بھری پری کائنات میں تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے کیوں بزم نشاط میں بھی ایک انجانا درد اور الم اس کے دل پر چھاپا مارتا رہتا ہے اور اس کے وجود میں امکانات کی دنیا، اس کے عدم تکمیلیت کی وارداتِ قلبی اس کی طبعی فطرت کیوں ہے؟ اور اس طرح وہ یہ جان لیتا ہے کہ انسانی وجود کا امکان جس حقیقت ابدی کو پر تکمیل پاتا ہے تو وہ توحید ہے۔

انسان کے اس سوال اور تجربہ اور اللہ تعالیٰ کی اس علم کا آئینہ ریکارڈ، اظہار، ثبوت یا تو شاعری مہیا کرتی ہے یا روحانی نظام کی دستاویزات یعنی الہامی صحیفے اسی لئے قرآن حکیم میں شاعری کو حرام بھی قرار نہیں دیا گیا ہے اور نہ مستحسن۔ کیونکہ عشق کا ارفع ترین عمل جس شاعری میں نظر آتا ہے وہ توحید کی طرف لے جاتا ہے۔ انسان کی یہ ازلی صداقت جس شاعری میں ابھرتی ہے وہ خیر کا عمل ہے اور اگر شاعر صرف اپنے نفس سے آگے نہیں بڑھتا تو وہ گمراہی ہے۔ ہماری داستانوں میں لوحِ طلسمی اس وقت تک روشن نہیں ہوتی جب تک مہرۂ طلسمی موجود نہ ہو کائنات اور انسانی طلسم کی یہ لوح یعنی قلبِ انسانی نفسانی تاریکی سے اس وقت تک رہائی حاصل نہیں کر پاتا جب تک اسے مہرۂ ربانی یعنی توحید کا شعور حاصل نہ ہو۔ عشقیہ شاعری کے بلند ترین مدارج اور کمتر مدارج میں یہی عمل فرق پیدا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابتؓ سے یہی تو فرمایا تھا کہ تم اپنی شاعری میں خیرِ مطلق کو پیش کرو اور ان کے شر کے مقابل حق و صداقت سے کام لو۔ اور حق و صداقت کا تقاضہ یہ ہے کہ کفر کے مقابلے پر توحید کو پیش کرو تو تم کامیاب ہو گے۔ گویا حضور نے فرمایا ہے کہ تم جب خیرِ مطلق کو پیش کرو گے تو اس کی گواہی سننے والوں کو اپنے وجود سے ملے گی۔ شاعری میں خیر و شر کا یہ تصور گویا انسان کی تنہائی، عدم تکمیلیت اور گداز قلب کی علم کے حوالے سے توحید کی شناخت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

بقول میرؔ

اے میرؔ شعر کہنا کیا ہے کمال انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آ گیا ہے

ویسے بھی انسانی سرشت کو ذہن کے ارتقاء کے ذریعہ جس شعور تک پہنچانا تھا وہ خیر و شر کے تصادم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ہابیل اور قابیل کے ذریعہ انسانی وجود کے اندر توحید کے اقرار اور انکار کو ایک ازلی اور ابدی حقیقت کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں کہیں اسے دائیں اور بائیں والوں اور کہیں اقرار اور انکار کرنے والوں کی اصطلاحوں میں واضح کیا گیا ہے۔ گویا ہابیلی فطرت انسانی وجود کے اندر اقرار، اثبات، تسلیم، سپردگی، محبت، قبولیت، تعمیر اور خیر کے ساتھ توحید کی طرف بڑھتی ہے۔ اور قابیلی فطرت انکار، انحراف، گریز، استرداد، نفرت اور تصادم کی علامت ہے جو توحید سے انسان کو محروم کر دیتی ہے اور اس کو نفس، خواہشات مادیت، جسم، دنیا اور لذات میں اتنا الجھا لیتی ہے کہ وہ اپنی ازلی آواز کو سن ہی نہ سکے مگر توحید انسان کی فطری طبعی اور جبلی حقیقت ہے، خواہ قابیلی فطرت کتنی بھی کامیاب اور غالب کیوں نہ آ جائے خواہ وہ اس ازلی آواز کو کتنا بھی فراموش کر دے یا شناخت سے انکار کر دے مگر وہ ہابیلی انسان کے باطن میں زندہ رہتی ہے۔ انسان جب تک اپنے وجود میں تنہا نامکمل اور محروم محسوس کرتا رہے گا جب تک وہ خود کو اپنے اردگرد کی

دنیا میں مضطرب، مضمحل، مایوس اور بے اماں محسوس کرتا رہے گا۔ اللہ کی استعانت کا طلب گار رہے گا۔ خدائے واحد کے سامنے سر جھکاتا رہے گا۔ اور قرآن حکیم نے انسان کی گمراہی اس کے مقابل توحید کے فطری عمل کو دیکھئے کس خوبی سے اُجاگر کیا ہے۔

(ترجمہ) اور اللہ ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں لئے لئے پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب (بعض اوقات) تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعے سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان کی رفتار سے خوش ہوتے ہیں (اس حالت میں دفعتاً) ان پر ایک جھونکا مخالف ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھی چلی آتی ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ بُرے آ گھرے اس وقت سب خالص اعتقاد کرکے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں کہ اے اللہ اگر آپ ہم کو اس مصیبت سے بچالیں تو ہم ضرور حق شناس (موحد) بن جاویں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو اس مہلکہ سے بچالیتا ہے تو فوراً ہی وہ اطراف واقطار زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو سن لو یہ تمہاری سرکشی تمہارے لئے وبال جان ہونے والی ہے۔ بس دنیوی زندگی میں چندے اس سے حظ اٹھا رہے ہو۔ پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے اور پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو جتلا دیں گے اور اس کی سزا دیں گے۔

(ترجمہ: از شاہ رفیع الدین و مولانا اشرف علی تھانوی)۔

ہمارے تمام صلحاء اور عرفا اور بزرگانِ دین کی زندگی پر غور کیجئے تو وہ دراصل اپنی زندگی کو اسی ہستی کی محبت کے لئے وقف کردیتے ہیں جو مسجودِ مطلق ہے۔ فنا فی اللہ کی منزل ہی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے باطن میں اس "راہ" کو تلاش کرلیا ہے جو اسے محبوب حقیقی کی طرف لے جاسکتی ہے اور چونکہ اسے "پانا" ناممکن ہے لہٰذا ہجر و فراق اس کا ازلی نتیجہ۔ دنیا کی اعلیٰ ترین شاعری جب بھی انسان کے وجود کی تنہائی، جستجو، عدم تکمیلیت، خلاء اور امکان کو گرفت میں لاتی ہے تو اسی ازلی حقیقت کا نغمہ سناتی ہے خواہ وہ ویدوں کے اوّلین شاعری کے لافانی گیت ہوں یا بھجن جہاں کائنات کی کھلی آغوش میں انسانی وجود کسی ہستی کی چاپ سے سرشار نظر آتے ہیں اور خواہ وہ مشرق کی تمام بڑی زبانوں کی عشقیہ شاعری ہو جو محبوب کے اثبات اور اقرار کے ساتھ سپردگی اور بے تابی کے والہانہ نغمۂ محبت الاپتی ہے۔ ہماری اردو شاعری بھی اسی روایت سے مزین ہے جس کی گہری عشقیہ شاعری اور غزل میں محبوب، محبوبِ حقیقی کا ایک استعارہ بن جاتا ہے۔ اس کے عشقیہ تجربات میں تہہ داری پیدا ہوجاتی ہے۔ غزل کے ہر اچھے شعر میں ساری معنویت اسی عمل کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ذرا چند شعر اس تعلق سے ملاحظہ کیجئے۔

پرم کے سو پیانے سوں مد پلا کر
پیا طاق ابروسوں سجدا کرایا

(قلی قطب شاہ)

ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

(ولی)

جو جی میں آوے تو ٹک جھانک اپنے دل کی طرف
کہ اُس طرف کو ادھر سے بھی راہ نکلے ہے۔

دیکھ بنیاد رتبۂ آدم ہے
جان لے گا اگر تو محرم ہے
دل کو اس بات پہ گواہی ہے
ہر طرف مظہرِ الٰہی ہے

کہیں خلق و کہیں خلاقِ عالم
کہیں ظاہر کہیں پنہاں ہوا ہے

(حاتم)

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھی نہ گیا

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس کا ذرہ ظہور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ
اس ستم گر ہی سے کنایت ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ماہ و خورشید ابر و باد سبھی
اس کی خاطر ہوئے ہیں سودائی
(میرؔ)

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

گل و گلزار خوش نہیں آتا
باغ بے یار خوش نہیں آتا

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے
(دردؔ)

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
(سوداؔ)

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
(مصحفیؔ)

عالمِ حسنِ خداداد بتاں ہے کہ جو تھا
چہرۂ شاہدِ مقصود عیاں ہے کہ جو تھا

راہ میں تیری شب و روز بسر کرتا ہوں
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

باغِ عالم میں رہیں خواب کی مشتاق آنکھیں
گرمیٔ آتشِ گلزار نے سونے نہ دیا

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے
(آتشؔ)

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے
(ذوقؔ)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

(غالبؔ)

جنونِ عشق ازلی کیوں نہ خاک اڑائیں ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانیٔ جہاں کے لئے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

(مومنؔ)

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
ہم سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

(داغؔ)

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے
کون جانے تجھے کہاں تو ہے
لاکھ پردے میں تو ہے بے پردہ
سو نشانوں میں بے نشاں تو ہے

تو ہے خلوت میں تو ہے جلوت میں
جان کہتی ہے جانِ جاناں تو ہے

جہاں نام آتا ہے ان کا زباں پر
تو لیتی ہے بوسے زباں کیسے کیسے

(امیر مینائیؔ)

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

کس کی آواز کان میں آئی
کیوں پرائے مکان میں آئی

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر
ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

(یگانہؔ)

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

(حسرتؔ)

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

(فانیؔ)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی
جلوؤں کے اژدہام نے حیراں بنادیا

حسن بزارِ طرز کا اک جہاں اسیر ہے
ملحد بے خبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں

(اصغر گونڈوی)

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ جھلا جھلی

(آرزو لکھنوی)

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

(علامہ اقبالؒ)

جب کوئی ذکرِ گردشِ ایام آگیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آگیا
یوں زندگی گزار رہا ہوں تیرے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

(جگر مراد آبادی)

میں دورِ جیب و دورِ مئے سے بے خبر نہیں مگر
چھڑا ہوا ہے ازل سے اس آنکھ کا معاملہ
شبِ فراق سے آگے ہے آج مری نظر
کہ کٹ ہی جائے گی یہ شامِ بے سحر بھی

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

(فراق)

آپ نے ان اوپر کے اشعار کو غور سے پڑھا ہے اور اس کی معنویت پر توجہ کی ہے تو ان میں ہمارا عشقیہ تجربہ اور روحانی تجربہ ایک ہو گیا ہے اور یہی ہماری بنیادی شعری روایت ہے۔

یہاں تک تو میں نے اردو شاعری کی تہذیبی جہت کی مدد سے اس کے ایک اہم اور بنیادی رویّے کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب ایک اور اہم سوال کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ کیا فرد کے وجود کی تنہائی اور محرومی کے ازلی عمل کے ساتھ اس کی عدم تکمیلیت اور ذات کے خلائیا امکان پر کسی نے غور و فکر اب تک کیا ہے یا نہیں؟ نفسیات اور سائنس کے لئے یہ مسئلہ ٹھوس حقیقت اور مادی مسئلہ کبھی نہیں رہا گو کہ نفسیات دانوں نے فرد کی نفسیاتی اور جنسی گتھیوں کے حوالے سے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے مگر چونکہ وہ مادّی حقیقت سے اوپر نہیں اٹھ پاتے اس لئے اکثر جگہ ان کے خیالات گمراہ کن ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی تردید اور تکذیب بھی کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس مسئلہ پر کسی نے واقعی کچھ سوچا ہے تو وہ فلسفی ہیں۔ مگر انہوں نے اس مسئلہ پر نیا طریقہ انسانی وجود کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ انسانی وجود کی ضرورت اس کی ماہیت اور کائنات میں اس کے مقام اور اس سے تعلق اسی حوالے سے طبیعات اور مابعد الطبیعیات کے تقابل اور معنویت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں افلاطون کے عالمِ مثال سے لے کر اقبال تک کے افکار اور سارے اہلِ فکر شامل ہیں۔ مگر یہ میرا مسئلہ نہیں۔ ہماری بنیادی روایت میں اگر اس مسئلہ کو کسی نے کما حقہ طور پر اہمیت دی ہے تو وہ ہمارے صوفیائے کرام ہیں یا شعرا ہیں۔ شعرا کا عمل آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ وہ انسان کے اس باطنی تجربے کی شدت، ضرورت

اور طبعی ہونے کی گواہی تو دیتے ہیں اور اس کی طرف مسلسل اشارے کرتے چلتے ہیں۔ لیکن وہ اس عمل کو تخلیقی تجربے سے الگ کرکے نہ پیش کرسکتے ہیں نہ دکھا سکتے ہیں۔ لیکن بعض صوفیائے کرام نے قرآن میں آدم کی تخلیق اور اسے جنت سے نکال کر دنیا میں لانے کے حوالے سے انسان کی بندگی اور خالقِ کل کے درمیان تعلق کو ایک بنیادی اور "مستقل تعلق" قرار دیا ہے۔ اور پھر بندگی، اللہ سے محبت، صبغت اللہ، تقویٰ اور احسن التقویم کے حوالے سے انسان کی باطنی بے تابی، اضطراب اور بے اطمینانی کو "سکینیت" کا راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

صوفیائے کرام کے خیال میں قرآن حکیم کے مطابق روزِ ازل فردوس میں حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو تمام نعمتیں تو مہیا تھیں ہی مگر انہیں اللہ تعالیٰ کی حضوری اور انوارِ ربانی کی سرشاری حاصل تھی۔ لیکن جب ابلیس نے پہلے حضرت حوا اور ان کے توسط سے حضرت آدمؑ کو بہکا کر جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے امتناع کیا تھا۔ (گویا یہ ایک عہد تھا آدم اور اللہ کے درمیان) اسے توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے انوار کے وصل اور حضوری سے محروم کرکے راندۂ جنت قرار دے دیا۔ اور پھر حضرت آدمؑ کی "ندامت" کے پیشِ نظر اسے پابند کیا کہ وہ دنیا میں اپنی مشقت اور محنت سے کام لے گا۔ لیکن اسے دوبارہ فردوس میں داخل ہو کر اللہ کی حضوری اور وصل اسی وقت حاصل ہوگا جب وہ یہاں دارالمکافات میں اپنے اعمال اور حضوریٔ قلب سے یہ ثابت نہ کردے کہ وہ اللہ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس سے اس نے روکا ہے اس سے رک جائے اس کے رنگ میں رنگ جائے اور اس کے کہنے کو سب سے افضل قرار دے۔ جب وہ اس آزمائش میں پورا اترے گا تب روزِ آخرت اس کا اجر ملے گا اور وہ پھر روزِ ازل کی طرح انوارِ الٰہی سے ممتع ہوگا۔ اس پورے عمل میں جو قرآن اور شریعت کے روحانی نظام کا ایک خاکہ ہے۔ صوفیائے کرام نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا خسارہ یہ ہے کہ وہ قربِ الٰہی سے محروم ہو گیا اور دنیا کی آزمائشوں میں ڈالا گیا ہے۔ جب کہ دنیا میں انسان ہر گھڑی اس پچھتاوے کی صورت میں دوریٔ جنت کی سزا بھگتتا ہے اور اس کا قلب ہر وقت اپنے "محبوبِ حقیقی" کی حضوری میں تڑپتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ دنیا میں ہجر و فراق کی زندگی گزارتا ہے۔ ہر وقت بے تابیٔ جاں اسے بے قرار رکھتی ہے وہ خود کو تنہا اور اپنی محبت سے محروم محسوس کرتا ہے۔ اس کی تسکین کا واحد ذریعہ خود کو اپنے معبودِ حقیقی کے لئے وقف کر دینا اور اس کی محبت میں جذب کر دینا ہے چنانچہ صوفیائے کرام کے مختلف روحانی مدارج اس محبت اور آزمائش میں اترنے والے برگزیدہ بندوں کے مدارج ہیں۔ جس طرح بعض عاشق اپنی محبت کے اخلاص اور کامل ایثار کی بنا پر اپنے محبوب کی گواہی بن گئے۔ بالکل اسی طرح انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی سچی اور حقیقی گواہی دے اور اپنی جان بیچ کر اس شہادت کے مقام کو حاصل کرے جو اللہ کے نزدیک انسان کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل اور اس کی محبت اور ایثار کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ان تمام سامنے کے مسائل کو نہایت بے باکی سے پیش کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ یہ دہرا سکوں کہ صوفیائے کرام نے انسان کی تنہائی، بے تابیٔ جاں اور طبعی بے چینی کا سبب تلاش کرکے اس کا منطقی جواب دینے کی بھرپور کوشش کی ہے اور غالباً یہ جواب کسی اور طبقہ یا علم یا وسیلے کے ہر جواز سے بہتر ہے۔ گویا انسان روزِ ازل اپنے خالق کے انوار سے محروم ہو کر ساری زندگی اس کی حضوری کے لئے ترستا رہتا ہے۔ یہ انسان کی تقدیر ہے اور اس آزمائش سے سرخرو اور کامیاب ہونے والے روزِ آخرت پھر دوبارہ اس کے وصل سے شادکام ہوں گے۔ بشرطیکہ انہوں نے ہر آزمائش میں خود کو اس کے قابل بنائے رکھا۔ روزِ آخرت اس کا مشاہدہ سب کریں گے۔ بہت سے دائمی قربت میں، بہت سے دائمی ہجر میں! یعنی اپنے اعمال

کی جزا بھی حاصل کریں گے اور سزا بھی بھگتیں گے۔

صوفیا کے اس باطنی "کشف" نے یہ ثابت کردیا کہ اللہ کی محبت یعنی محبوبِ حقیقی کا عشق آدمی کی جبلّت میں شامل ہے۔ جس کے بنیادی مراحل یہ ہیں۔ حقیقتِ کُلّی یعنی اللہ تعالیٰ، کُن، آدم، حوّا، مکمل حضوری، ترغیبِ ابلیس، حضوری سے محرومی، دارالآزمائش، روزِ قیامت، جزا اور سزا، دائمی حضوری یا دائمی مہجوری۔

(حوّا کا بہکانا دراصل اللہ کی محبت میں شریک ہونا ہے جو شرک ہے اور جسے اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک انسان حوّا سے بھی گزر کر اپنے پورے وجود سے توحید کا اقرار نہیں کرے گا تکمیلِ وجود نہیں کرسکتا) اس علم میں پوشیدہ حقیقت یہ ہے کہ آدم اپنے وجود کی تمام مادّی، نفسانی اور جسمانی خواہشات، تمام حقیقت کونیہ اور ارضی حقائق، حوّا سے مل کر تکمیلِ جنس اور جسم کے ساتھ نسلِ انسانی کو برقرار رکھنے کی بنیادی جبلّت کو پورا کرنے اور اس سے متمتع ہونے کے باوجود تنہائی اور محرومی کا اس لئے شکار ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق سے رابطہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس کے لئے نفس اور لذّاتِ جسمانی سے بلند ہونے، گزر جانے اور اس سے رہائی حاصل کئے بغیر چین نہیں آتا۔ محبوب سے محبوبِ حقیقی کی طرف یہ سفر جو خالص روحانی یا باطنی ہوتا ہے مکمل سپردگی SARRENDER اور مکمل اخلاص DEVOTION یعنی اس کی ذات میں جذب ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

دراصل ہماری ساری شاعری اور تہذیب اپنے اندر یہ جہت لازمی طور پر رکھتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں تو وہ تمام شعرا جنہوں نے تربیت ہمارے بنیادی معاشرے اور اس کی اقدار میں ہوئی ہے، اپنے کلام میں ظاہر کرتے ہیں۔ بیشتر شعرا کے یہاں تصوف کا براہِ راست اثر رہا ہے یا اسلامی تعلیمات کا گہرا شعور رہا ہے۔ ان کے یہاں یہ جہت بہت نمایاں ہے۔ یہ اور شعور ہے۔ محض چند اشعار دیکھئے جن میں اوپر کے تجربے کا عکس نظر آجائے گا۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب، محبت سبب
محبت سے ہوتے ہیں کارِ عجب
محبت سے انتظامِ جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں
محبت ہی سے دل کو رو بیٹھئے
محبت میں جی مفت کھو بیٹھئے
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ
محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ

میر اپنے اس فلسفۂ محبت میں نہ صرف تخلیقِ کائنات کا سبب محبت کو قرار دیتے ہیں بلکہ کائنات میں بھی اسی (کشش ثقل) کو جلوہ فرما دیکھتے ہیں اور انسان کے ہر تعلق اور جذبۂ محبت اور پھر عشق کو اسی جہت سے دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ صرف میر تک محدود نہیں بلکہ ہماری پوری روایتی شاعری میں یہ تصوف اور تہذیبی روایت، روح کی طرح جاری اور ساری ہے۔ ذرا اسیر کے اس شعر کو دیکھئے اس نے کس لطف اور شعور کے ساتھ ادھر اشارہ کیا ہے۔

باغِ ہستی میں یہی فکر رہی ہم کو اسیر
دیکھئے گل کی طرف یا چمن آرا کی طرف

حاتم نے تو اس مسئلہ کو شعرا کے لئے بھی اور اپنے قارئین کے لئے بھی بالغ نظری کی شرط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

رمزِ توحید کو سمجھ کر بول
گر تو صاحبِ شعور و دانا ہے

درد نے اسے انسانی فطرت کا "طبعی" تجربہ قرار دیا ہے۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

آتش کی اس "دلیلِ محبت" کو ذرا دیکھیے ۔

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

غالب نے اپنا اندازِ فکر یہاں بھی برقرار رکھا ہے ۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

امیر مینائی کو تو یہ کہنا ہی تھا ۔

تبسم کہتا ہے جان ہے تو ہی
جان کہتی ہے جانِ جاں تو ہے

یگانہ کی ساری "اکڑ" آتی ہی ہے یہاں سے ۔

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

مگر اصغر نے صوفیا کے اس اصل موقف سے ہی پردہ اٹھا دیا ہے ۔

ازل میں ایک تجلی سے ہوئی تھی بے خودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

گردانائے راز جگر نے اس شعور کو شاعری کا ایک بنیادی عمل قرار دیا ہے ۔

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

فراق نے اسی عمل کو دوسری سطح پر دیکھا ہے ۔

شاعر ہوں گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں
چونکا رہے ہیں ان کو بھی میرے توہمات

غالباً اب اس بات کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہماری غزل میں محبوب کی بے نیازی، عاشق سے بے اعتنائی اور ہجر و فراق کی جتنی کیفیتیں اور علامتیں ملتی ہیں۔ اس کے پیچھے بندہ اور خالق کے درمیان "معاملات" کام کرتے ہیں۔ البتہ دبستانِ لکھنؤ کے آخری دور کی شاعری میں چونکہ محبوب کا محض خارجی اور جسمانی تصورِ غزل کے نظام پر حاوی آگیا تھا جس کی وجہ سے ایک صوفیانہ، مبتذل اور مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی تہہ داری اور تہذیبی گہرائی پر خارجی اور جسمانی کنایات نے غالب آکر اس کو ہماری تہذیبی سطح کی نچلے درجے کی اور دور کی آواز بنا دیا تھا ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو اور فارسی غزل کو اس وقت تک پوری طرح نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ جب تک اس کے تہذیبی رویے، انسانی وجود کی تمام جہتوں کا شعور اور فرد کے تمام عشقیہ اور باطنی تانوں بانوں کی آگہی نہ حاصل ہو، جس کے بغیر ہماری شاعری اکہری، بے تہہ اور سطحی نظر آنے لگتی ہے ۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

جمال پانی پتی

# اُردو کا پہلا دوہا نِگار

یوں تو اردو میں دوہے لکھنے کی اکا دکا کوششیں جمیل الدین عالی سے پہلے بھی ہوتی رہی ہیں لیکن عالی سے پہلے جن لوگوں کے دوہے اردو میں ملتے ہیں ان پر "اردو دوہے" کا اطلاق مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ دوہے اپنے مضامین و موضوعات، اپنی بحر، تکنیک لب و لہجہ اور طرزِ احساس وغیرہ کے اعتبار سے ہندی دوہوں کی روایت ہی کے تسلسل میں لکھے گئے ہیں اور ان کی زبان بھی ہندی دوہوں کی زبان سے کچھ ایسی زیادہ مختلف نہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوائے زبان کے معمولی سے فرق کے ان میں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو انہیں ہندی دوہوں کے بنیادی مزاج سے الگ کر کے اردو کی ایک صنفِ سخن کے طور پر ان کی پہچان واضح کر سکے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں دوہے کی صنف عالی ہی کی بدولت متعارف اور مقبول ہوئی اور عالی ہی کے دوہوں کے ذریعے اس صنف نے اپنی شناخت کے خدوخال اردو میں پہلی بار ہندی دوہے سے الگ ہو کر واضح کئے۔ پھر جب ایک بار عالی کے دوہے اردو میں چل نکلے تو اس کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے شعراء نے بھی اسی انداز کے دوہے اردو میں لکھنے شروع کئے۔ تاج سعید، نگار صہبائی، جلیل عشقی، صہبا اختر، کشور ناہید، شبی فاروقی، احمد شریف اور عالمتاب تشنہ سے لے کر پرتو روہیلہ تک کتنے ہی شعراء ایسے ہیں جنہوں نے عالی کے بعد دوہے کی صنف میں کام کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ عالی کی سی شہرت اور مقبولیت ان میں سے کسی کے بھی دوہوں کو حاصل نہ ہو سکی۔ خیر، عالی تو محض ایک دوہا نگار ہی نہیں، غزل گو بھی ہے۔ لیکن اب تو بعض شاعر اردو میں صرف دوہا نگار ہی کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں۔ مثلاً پرتو روہیلہ۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ دوہے کی شاعری اب آہستہ آہستہ اردو میں بھی اپنے لئے جگہ بنا رہی ہے۔ بہر حال، یوں تو، دوہوں سے قطع نظر، عالی اپنی غزل کے حوالے سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شہرت اور مقبولیت زیادہ تر ان کے دوہوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دوہے کی شاعری کو اردو میں رائج کرنے اور فروغ دینے کا کریڈٹ بھی عالی ہی کو جاتا ہے۔

اس بات پر ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ عالی سے پہلے بھی بعض کوششیں اردو میں دوہے لکھنے کی ہو چکی تھیں۔ لہٰذا اس باب میں عالی کو اولیت کا درجہ دینا مناسب نہیں۔ لیکن یہ اعتراض دراصل ایک ایسے مغالطہ پر مبنی ہے جو ہندی کے دوہوں اور ان دونوں کے درمیان یا ان کے بعد جو کوششیں اردو میں دوہے لکھنے کی ہوئیں، ان تینوں میں کوئی فرق نہ کرنے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، اور جو اس مغالطے

کی بنا پر حالی کے دوہوں کو بھی اردو میں ہندی دوہے کی روایت ہی کا ایک تسلسل جانتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ حالی کے دوہوں کا کوئی تعلق ہندی دوہے کی روایت سے نہیں۔ اس لئے کہ اس نے اپنے پیش رووں کی طرح ہندی دوہوں کو اردو میں منتقل کرنے یا ہندی روایت کی قلم اردو میں لگانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کی بجائے اس کی کاوشوں کا رخ ایک بالکل جداگانہ سمت میں رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ دوہے کو اردو میں ایک بالکل ہی نئی شکل کے ساتھ رائج کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یعنی اس نے ہندی دوہے کی روایت سے ہٹ کر دوہے کی صنف کو ہندی سے اردو میں (TRANSFORM) کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی لئے وہ اردو میں ایک بالکل مختلف اور نئے انداز کے دوہوں کی روایت قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کے برعکس حالی سے پہلے جن لوگوں نے اردو میں دوہے لکھے انہوں نے بالعموم ہندی روایت ہی کا تتبع کرتے ہوئے دوہے کو ہندی ادب سے اٹھا کر جوں کا توں اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ان دوہوں اور ہندی دوہوں میں سوائے زبان کے فرق کے اور کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ وہی اکھڑی اکھڑی سی بحر جو ہندی میں دوہے کے لئے مخصوص ہے اور جو اپنے اکھڑے اکھڑے پن کے ساتھ اردو کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اور خیالات و احساسات کی کم و بیش وہی ٹکی بندھی روایت جس کا سلسلہ ہندی میں سورداس اور کبیر داس سے ملتا ہے، شعراء نے اکثر و بیشتر اسی کا تتبع اپنے دوہوں میں کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ دوہا اردو میں نہ چل سکا۔ اس کے برعکس حالی کے دوہوں میں دوہے کے نام اور ہیئت کے سوا مشکل ہی سے کوئی چیز ایسی ملے گی جسے ہندی روایت سے منسوب کیا جا سکے۔ رہا اس کا نام اور ہیئت، تو ان دونوں چیزوں پر ہندی کا کوئی اجارہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں تو ہماری بعض علاقائی زبانوں میں بھی جوں کی توں موجود ہیں۔ چنانچہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ حالی کے دوہے اور ہندی دوہے میں ایک بنیادی اور جوہری فرق ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑا اور بنیادی فرق تو بحر یا وزن و آہنگ ہی کا ہے۔ اس لئے کہ حالی نے ہندی دوہے کی مخصوص بحر کو چھوڑ کر اپنے دوہے اس سے بالکل مختلف، ایک ایسی بحر میں لکھے جو اردو کے عروضی مزاج سے مطابقت رکھتی تھی۔ ہندی کے چھند شاستر میں تو دوہے کے لئے جو بحر مخصوص ہے، چھند شاستر کے پنڈتوں نے اسے چوبیس ۲۴ ماتراؤں کے چھند پر مشتمل بتایا ہے جس میں دوہے کا ہر مصرع دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پہلا حصہ تیرہ ۱۳ ماتراؤں کا اور دوسرا حصہ گیارہ ۱۱ ماتراؤں کا ہوتا ہے۔ اور دونوں کے درمیان بشرام (یا وقفہ) ضروری ہوتا ہے۔
ہندی دوہے کی اس معیاری بحر کو اگر ہم اپنے عروضی نظام کی مدد سے ظاہر کرنے کی کوشش کریں تو اس کی صورت کچھ یوں بنے گی۔

فعلن فعلن فاعلن (وقفہ) فعلن فعلن فاع (یا فع)

رہیمن دھاگا پریم کا ، مت توڑو چٹکائے
ٹوٹے سے جڑتے نہیں ، بیچ گانٹھ پڑ جائے

اب ہندی کے دوہے تو خیر اس بحر میں ہوتے ہی ہیں۔ لیکن اردو میں بھی جعفر زٹلی اور امانت لکھنوی سے لے کر خواجہ دل محمد تک جس کسی نے بھی دوہے کہنے کی کوشش کی اس نے ہندی دوہے کی اسی بحر کو اپنایا۔ اس کے برعکس حالی نے ہندی کے دوہا چھند سے بالکل الگ، ایک مختلف بحر اپنے دوہوں کے لئے اختیار کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بحر کو ہندی کے دوہا چھند اور اس کی مختلف اقسام سے بالکل الگ تصور کرتے ہوئے اسے حالی چال کا نام دیتا ہے۔

کیا بھر مر کیا شہ بجہ پیو دھر کیا کھپ کیا بیال
اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے حالی چال

حالی کا ہندی دوہے کی مخصوص بحر (دوہا چھند) سے یہ انحراف اتنا بنیادی ہے کہ اس انحراف کی بنا پر ڈاکٹر عنوان چشتی، حالی کے دوہوں کو "دوہا" تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور نظیر صدیقی کا کہنا بھی یہی ہے کہ اگر اردو میں دوہے لکھنے کے لئے ہندی دوہے کی بحر کو اختیار کرنا ضروری سمجھا جائے تو عروضی نقطۂ نظر سے حالی کے دوہوں کو "دوہا" کہنا ممکن نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس اعتبار سے اس کے دوہے اصطلاح کے غلط استعمال (MISNOMER) کی ذیل میں آتے ہیں۔ اور پچھلے دنوں الیاس عشقی نے بھی اپنے ایک مضمون میں یہی لکھا ہے کہ ہندی شاعری میں دوہے کا جو ایک مخصوص وزن متعین ہے، اس وزن کے سوا کسی اور وزن میں کہے گئے دو ایسے مصرعوں کو جن کے آخر میں قافیہ لایا گیا ہو، دوہا نہیں کہا جا سکتا۔ سو بے شک، اس باب میں ہم بھی ان سے متفق ہیں، یعنی یہ بات مانتے ہیں کہ ایسے دو مصرعوں کو جو ہندی دوہے کی مقررہ بحر کے سوا کسی اور بحر میں لکھے گئے ہوں۔ "ہندی کا دوہا" کہنا درست نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بات صرف ہندی ہی کی حد تک درست مانی جا سکتی ہے۔ اردو پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ آپ یہ پابندی اردو پر یا دنیا کی کسی بھی زبان پر عائد نہیں کر سکتے کہ وہ کسی دوسری زبان سے کوئی صنف سخن اپنے ہاں اس وقت تک درآمد نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اس صنفِ سخن کے سلسلہ میں اصل زبان کے مقرر کردہ تمام حدود و قیود اور شرائط کی پابندی کو خود اپنے ہاں بھی روا نہ رکھے اور اس صنف کے ساتھ اپنی زبان میں وہ عروضی آہنگ یا بحر بھی درآمد نہ کرے جو اس صنف سخن کے لئے اصل زبان میں موجود اور متعین ہے۔ مثال کے طور پر گیت کی صنف کو لیجئے۔ یہ صنف اردو میں ہندی سے اور ہندی میں سنسکرت سے آئی ہے۔ لیکن کیا سنسکرت سے ہندی اور ہندی سے اردو تک آتے آتے گیت کی صنف نے ان اوزان و بحور کے ساتھ ساتھ کتنی ہی ایسی شرائط کو بھی خیر باد نہیں کہہ دیا جو اس صنف کے لئے اصل زبان میں مقرر اور متعین تھیں۔ بہر ان لوگوں کے برعکس جو اردو میں دوہے لکھنے کے لئے ہندی دوہے کی بحر کو اختیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ دوہے کو اردو کی صنف کے طور پر اختیار کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس کی ہندی بحر میں حسب ضرورت تصرف کر کے اسے اردو کے عروضی نظام سے ہم آہنگ کیا جائے۔ چنانچہ حالی نے اس اصول پر عمل کر کے دوہے کو اردو کی ایک صنف سخن بنانے کی کوشش کی ہے۔

مگر ایک دلچسپ بات اس سلسلہ میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر عنوان چشتی نے حالی کے دوہوں کو ہندی دوہوں کی روایت کے تسلسل میں تو بالکل بجا طور پر "دوہا" ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ انہیں دوہوں کی بجائے "سرسی چھند" کے مطابق قرار دیتے ہیں[1] جو ان کے بقول ہندی کے چھند شاستر میں ستائیس[۲۷] ماتراؤں کا ایک چھند ہے۔ اور جس کے ہر مصرع کے پہلے حصہ میں سولہ[۱۶] اور دوسرے حصہ میں گیارہ[۱۱] ماترائیں آتی ہیں اور دونوں حصوں کے درمیان وقفہ (یا بشرام) ضروری ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب "سرسی چھند" کے عروضی وزن کو اردو میں اس طور پر ظاہر کرتے ہیں :-

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر عنوان چشتی کی کتاب "اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" (صفحہ ۲۰۱)

اب حالی کے دوہوں کا عروضی وزن اردو کی اس بحر کے ارکان پر تو بے شک پورا اترتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہندی کے سرسی چھند کا وزن اور آہنگ بھی حالی کے دوہوں کے داخلی آہنگ (حالی چال) سے قریبی مماثلت رکھتا ہو، لیکن اس کے دوہے سرسی چھند کے ماترائی آہنگ کی جملہ شرائط پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ یہ بات خاصی غور طلب اور اس کے قطعی فیصلے کے لئے ہمیں ہندی چھند شاستر کے کسی پنڈت ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں ایک سوال یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندی کے سرسی چھند کو اردو کی جس بحر کے ارکان سے ظاہر کیا ہے اس میں بشرام (یا وقفہ) کا وہ تصور موجود ہے یا نہیں جو سرسی چھند یا ہندی کے دوسرے ماترائی چھندوں کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ بہر حال حالی کے دوہوں سرسی چھند کے مطلعوں پر منطبق کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے، یہ ایک الگ بحث ہے مگر اس سے قطع نظر یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کے دوہے ہندی دوہوں کی مخصوص بحر یعنی دوہا چھند میں ہرگز نہیں لکھے گئے۔ یوں بھی دوہا چھند کی اکھڑی اکھڑی بحر اردو کے شعری مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کا آہنگ امانت سے لے کر خواجہ دل محمد تک، ساری کوششوں کے باوجود اردو کے شعری آہنگ کا حصہ نہیں بن سکا۔ اس کے برعکس حالی نے اپنے دوہوں کے لئے جس بحر (حالی چال) کو منتخب کیا، اس کا آہنگ اُردو/فارسی بحروں کے ارکان کی مطابقت میں ہونے کی وجہ سے اردو کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے اور یہی وجہ ہے کہ حالی کے بعد اردو دوہے لکھنے والے دوسرے شعراء یعنی تاج سعید سے لے کر پرتو روہیلہ تک سبھی دوہا نگاروں نے اس حالی چال والی بحر کو اپنایا ہے غرض یہ کہ حالی کا دوہا ایک تو حالی چال والی بحر کی بنا پر اپنے وزن اور آہنگ میں ہندی دوہے سے بالکل مختلف ہے اور دوسرا بڑا فرق دونوں میں یہ ہے کہ ہندی کا ہر دوہا اپنی جگہ ایک مستقل اکائی ہوتا ہے اور سوائے ان دوہوں کے جو جوڑوں کی شکل میں یا سوال جواب کے انداز میں کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ مختلف دوہوں میں باہمی طور پر کوئی معنوی ربط یا داخلی تسلسل نہیں پایا جاتا۔ لیکن حالی نے اپنے ہاں ہندی دوہے کی اس بنیادی خصوصیت کو بھی برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے دوہوں کو مسلسل اشعار یا نظم کی صورت دے دیتا ہے۔ ایسے مسلسل دوہے یوں تو اس کے دونوں ہی مجموعوں میں موجود ہیں، مگر "لاحاصل" میں اس نے مسلسل دوہوں پر خصوصیت سے زیادہ توجہ دی ہے۔ مسلسل دوہوں کی اس ٹکنیک کو حالی کے بعد دوسرے دوہا نگاروں میں پرتو روہیلہ نے خصوصیت کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ ان دو باتوں کے علاوہ تیسرا بڑا فرق یہ ہے کہ حالی نے تلسی داس اور کبیر داس کی زبان کے پھیر میں پڑنے کی بجائے اپنے دوہوں کے لئے ایک ایسی ہلکی پھلکی زبان اختراع کی جو عام فہم اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لطف اور سوچ بھی رکھتی ہے۔ یہ زبان اردو میں ہندی کے چند آسان الفاظ ملا کر بنائی گئی ہے مگر اس پر ہندی کی بجائے اردو کی فضا غالب ہے۔ محمد حسن عسکری نے بھی اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے علاوہ ایک اور اہم فرق کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حالی نہ تو تلسی داس اور کبیر داس کی زبان کے پھیر میں پڑا اور نہ ہی اس نے ہندی شاعری کے خیالات اور احساسات کی روایت کا تتبع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دوہا اپنے رنگ ڈھنگ اپنی خوبو اور ذائقہ کے اعتبار سے بھی ہندی دوہے سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ ہندی کے چند آسان الفاظ کا استعمال تو بے شک اس کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن اس کا دوہا بحیثیت مجموعی اپنے طرزِ احساس میں ہندی دوہے سے بالکل مختلف اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس کے دوہوں کو اگر تلسی داس یا کبیر داس کے دوہوں میں ملا دیا جائے اور انہیں میں اردو کے ان سب دوہا نگاروں کے دوہے بھی شامل کر دیئے جائیں جو امانت لکھنوی سے لے کر خواجہ دل محمد تک گزرے ہیں تو حالی کے تمام دوہے

بہت آسانی کے ساتھ اس سے جلے ڈھیر سے چھانٹ کر الگ کئے جاسکتے ہیں۔ گویا بحر کا معاملہ ہو یا زبان کے اسلوب کی بات ہو یا تکنیک کی یا طرزِ احساس کی حالی کے ہاں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کا کوئی تعلق ہندی شاعری کی روایت سے ظاہر ہو سکے۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حالی نے ہندی سے بالکل مختلف اردو میں دوہے کی ایک نئی شکل کو رواج دیا۔ چنانچہ اپنے دوہے کو ہندی شاعری کی روایت سے بالکل الگ کرتے ہوئے اس کے بارے میں وضاحت کرتا ہے کہ بات صرف اتنی ہے کہ آسان اردو کی ان دو بیتوں کے مجموعہ کو میں نے دوہا کہہ دیا اور بس۔ نہ مجھے ہندی کے چوبیس چھندوں سے کوئی تعلق ہے نہ مجھے ناٹک بھید آتا ہے ...... غزل کا نام بدنام نہ ہوتا اور یہ پابندیاں نہ ہوتیں کہ ایک قافیہ یا ایک ردیف ہو وغیرہ وغیرہ تو میں ان دوہوں کو شعر ہی کہتا۔[1] چنانچہ جب اس کے دوہوں کو ہندی روایت کی کسوٹی پر کس کے دیکھنے والے معترضین اسے دوہا ماننے سے انکار کرتے ہیں تو اسے ہرگز یہ اصرار نہیں ہوتا کہ اس کے دوہوں کو لازمی طور پر دوہا ہی کہا جائے۔ وہ ایسے معترضین کو بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ :-

تم کہو دوہا تم کہو بیت اور تم کہو سرتی چھند
نہیں مری من ندی کا طوفاں نالوں کا پابند

لیکن حالی کے دوہوں کو ہندی شاعری کی روایت سے الگ کرنے کا مطلب یہ بہرحال نہیں ہے کہ اس کے تخلیقی وجدان پر ہندی دوہوں کے سرمایہ سے استفادہ کی راہ بھی بند کر دی جائے۔ اس نے ہندی شاعری کی روایت سے اپنی راہ تو بے شک الگ نکالی ہے، اپنے دوہے کی زبان اور ڈکشن میں بھی تبدیلی کی ہے اور اس کی مروجہ روایتی شکل کو بھی بدلا ہے مگر اس نے اپنے تخلیقی وجدان کو اس سرمایہ سے حسب ضرورت استفادہ کے لئے آزاد ہی رکھا ہے، جو ہندی میں تلسی داس کبیر داس بہاری اور رحیمن کے دوہوں کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں اگر اس سرمایہ سے استفادہ کی کچھ صورتیں کہیں کہیں نظر آجائیں تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایسا استفادہ تو دنیا کی کسی بھی زبان کا شاعر دنیا کی کسی بھی دوسری زبان کے ادب سے کر سکتا ہے۔ اور کوئی اگر اس سے انکار کرے بھی تو حالی کے دوہوں کی داخلی شہادت خود ہی اسے جھٹلانے کے لئے کافی ہوگی۔

سور کبیر بہاری میرا رحیمن تلسی داس
سب کی سیوا کی پر حالی گئی نہ من کی پیاس

---

حالی تو جو چاہے کہے ظاہر ہے ترا انجام
سو را دن ترے بیری اور تو نا چھمن نا رام

---

[1] جمیل الدین عالی کا مضمون "میں اور میرا فن" مطبوعہ "شعور" حیدرآباد (سندھ) شمارہ نمبر ۳، ۴

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

# ابوالکلام کی نثر

مولانا ابوالکلام آزاد محض ایک ادیب، انشاء پرداز، صحافی، تذکرہ نگار، خطیب، مترجم، نیز مذہبی مفکر اور سیاسی مدبر ہی نہیں، بلکہ ایک منفرد طرزِ نگارش اور امتیازی اسلوبِ تحریر کے بھی مالک تھے جس کی طرف ہر اس شخص کی توجہ مبذول ہوتی ہے جو ان کی تصانیف کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد کے اسلوبِ نثر کی انفرادیت کا اعتراف حسرت موہانی نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

سجاد انصاری نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی۔" [1] مولانا عبدالماجد دریابادی کے بہ قول مولانا آزاد "تحریر و انشاء میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔" [2] مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی "ذکرِ آزاد" میں لکھتے ہیں کہ "مولانا کی ہر تحریر ایسی ہے کہ عش عش کرتے رہیئے۔ اعلیٰ انشاء و ادب کا نمونہ جس کی تقلید ممکن نہیں۔" [3]

یہ تمام بیانات اس امر کی دلیل ہیں کہ مولانا آزاد کا اسلوبِ تحریر روشِ عام سے ہٹ کر تھا جس میں بلند آہنگی، شان و شکوہ، علمی وقار اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ایک ادبی حسن اور جمالیاتی کشش بھی پائی جاتی تھی۔ لسانی اعتبار سے مولانا آزاد کا اسلوب عہد بہ عہد بدلتا رہا ہے۔ آزاد کی پچاس سالہ تصنیفی زندگی میں ان کے اسلوب نے اپنے ارتقا کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ آزاد نے اپنی نگارشات میں زبان کے اطلاعی ، ہدایتی ، اور اظہاری تینوں بنیادی اسالیب سے کام لیا ہے۔ بہ حیثیتِ مجموعی آزاد کا اسلوب اردو کے بنیادی اسلوب سے انحراف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہی ان کے اسلوب کی امتیازی شان ہے اور اسی میں ان کی انفرادیت مضمر ہے۔

## (۲)

مولانا آزاد کے اسلوب کے ارتقاء کو سمجھنے کے لئے ان کی تصنیفی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں وہ "الہلال" اور "البلاغ" جاری کرتے ہیں اور اپنی خود نوشت سوانح عمری ترتیب دیتے ہیں۔ دوسرے دور میں وہ قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ تیسرے دور میں وہ مکتوب نما انشائیے لکھتے ہیں اور چوتھے اور آخری دور میں وہ بعض ایسے خطبات پیش کرتے ہیں جن کی

کئی لحاظ سے سب سے اہمیت ہے۔ اسلوبیاتی اعتبار سے ان چاروں ادوار کی چار نمائندہ تصانیف کے نام ہیں۔ (۱) "تذکرہ" (۲) "ترجمان القرآن" (۳) "غبار خاطر" اور (۴) "خطبات آزاد"۔

مولانا آزاد کی علمی اور تصنیفی زندگی تقریباً نصف صدی پر محیط ہے جس کا آغاز ۱۹۰۳ء میں کلکتے سے "لسان الصدق" کے اجراء سے ہوتا ہے اس وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ لیکن اس اخبار کے اجراء سے قبل ان کی مضمون نگاری کا آغاز ہو چکا تھا اور ان کی نگارشات اس دور کے معیاری رسائل مثلاً "مخزن"، "خدنگ نظر" اور "احسن الاخبار" میں شائع ہو چکی تھیں۔ "لسان الصدق" کے اجراء کے نو سال بعد مولانا آزاد نے پوری آب و تاب کے ساتھ میدان صحافت میں دوبارہ قدم رکھا۔ اور جولائی ۱۹۱۲ء سے ایک ہفتہ وار جریدے "الہلال" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ "الہلال" مولانا آزاد کی مذہبی فکر، سیاسی تدبر اور ادبی احساسات کا ترجمان تھا۔ لیکن ان کی فکر و تحریر کی بے باکی اور انقلاب انگیزی کی وجہ سے یہ اخبار حکومت وقت کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ بالآخر اخبار کی ضمانت ضبط ہونے پر مولانا آزاد کو نومبر ۱۹۱۴ء میں یہ اخبار بند کر دینا پڑا۔ لیکن اس کے ایک سال بعد نومبر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے "البلاغ" کے نام سے ایک دوسرا اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار "الہلال" کا نقش ثانی تھا۔ چنانچہ اس کا بھی وہی حشر ہوا جو "الہلال" کا ہوا تھا یعنی اپریل ۱۹۱۶ء میں یہ اخبار بند ہو گیا۔ اور مولانا آزاد رانچی میں نظر بند کر دیئے گئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے "الہلال" اور "البلاغ" کے مہتمم فضل الدین احمد مرزا کے اصرار پر اپنی سوانح عمری لکھنا شروع کی جس نے ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر لی اس کتاب کا پہلا حصہ "تذکرہ" کے نام سے پہلی بار ۱۹۱۹ء میں کلکتے سے شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ شیخ جمال الدین بہلول کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

رانچی ہی میں نظر بندی کے دوران مولانا آزاد نے ایک اور اہم علمی کارنامہ انجام دیا جسے "ترجمان القرآن" کہتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا اردو ترجمہ اور اس کی تفسیر و تشریح ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں دو جلدوں میں شائع ہوئی لیکن جس طرح "تذکرہ" نامکمل رہ گیا تھا اسی طرح قرآن کریم کا یہ ترجمہ بھی پورا نہ ہو سکا اور صرف ۱۸ پاروں تک پہنچ کر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"تذکرہ" اور "ترجمان القرآن" کے بعد مولانا آزاد کی تیسری اہم تصنیف "غبار خاطر" ہے۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے قلعۂ احمد نگر کی اسیری کے دوران ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں اپنے دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، رئیس بھیکم پور کے نام لکھے تھے۔ لیکن یہ خطوط مکتوب الیہ کو بھیجے نہیں گئے۔ بہ قول مولانا آزاد "یہ تمام مکاتیب بیچ کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں گے" لیکن قید سے رہائی کے بعد محمد اجمل خاں کے اصرار پر مولانا آزاد نے ۱۹۴۶ء میں یہ خطوط "غبار خاطر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کرا دیئے بہ قول احمد سعید ملیح آبادی مولانا آزاد نے یہ خطوط "ہم کلامی" اور "اپنے ایک نئے طرز انشاء سے اردو ادب میں اضافے کی غرض سے لکھے"۔[۵] لیکن یہ دراصل مختلف موضوعات پر انشائیے ہیں جنھیں مکاتیب کی شکل دے دی گئی ہے۔

مولانا آزاد کے تصنیفی آثار میں "خطبات آزاد" کو بھی ایک قابل لحاظ اہمیت حاصل ہے۔ "خطبات آزاد" میں پندرہ خطبے شامل ہیں جن میں سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل، نیز حالات حاضرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے مولانا آزاد کے وہ خطبات بہت اہم ہیں جو انہوں نے ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۸ء کے دوران پیش کئے تھے۔

زبان کا بنیادی مقصد ادائے منصب اور ترسیل و ابلاغ ہے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے زبان کئی اسالیب اختیار کرتی ہے جن میں سے تین اسالیب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ۵؎

۱۔ اطلاعی اسلوب

۲۔ بدایتی اسلوب

۳۔ اظہاری اسلوب

ان اسالیب سے زبان مختلف کام لیتی ہے۔ زبان کا ایک نہایت اہم فریضہ اطلاع رسی ہے۔ یہ اطلاع سامع یا قاری تک اثبات میں بھی پہنچائی جا سکتی ہے اور نفی میں بھی۔ زبان کا استعمال جب اثبات و نفی کے لئے کیا جائے یا جب اس کے ذریعے استدلال پیش کئے جائیں تو یہ زبان کا اطلاعی اسلوب کہلائے گا۔ "اطلاع" کا لفظ یہاں خالص اپنے لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی سامع یا قاری کو کسی بات کی اطلاع دینا یا کسی بات سے مطلع کرنا یہ اطلاع غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی۔ اسی طرح دلائل بھی غلط اور صحیح ہو سکتے ہیں۔ اطلاعی اسلوب بیانیہ ہوتا ہے اس کا مقصد محض بیانِ واقعہ یا ہے۔ سماجی اور سائنسی علوم کی زبان اطلاعی اسلوب کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اسی طرح غیر افسانوی نثر میں بھی اطلاعی اسلوب کے بہت اچھے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مولانا آزاد نے "الہلال"، "البلاغ"، "تذکرہ" اور "خطبات" میں اطلاعی اسلوب یعنی بیانیہ انداز تحریر سے کام لیا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو جو مذہبی اور سیاسی پیغام وہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے وہ شاید نہیں پہنچا سکتے تھے۔ "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" کی زبان اگرچہ مختلف انداز کی ہے لیکن اس میں بھی اطلاعی اسلوب کے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ اطلاعی اسلوب لسانی اعتبار سے سادہ بھی ہو سکتا ہے اور مشکل اور پیچیدہ بھی۔ رسمی اور پُر تکلف بھی ہو سکتا ہے اور غیر رسمی بھی۔ جامد ( ) بھی ہو سکتا ہے اور متحرک بھی۔

خطبات آزاد" کا اطلاعی اسلوب لسانی اعتبار سے بالعموم ایک سادہ اور سہل اسلوب ہے اور کافی حد تک اردو کے بنیادی اسلوب سے قریب ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے رام گڑھ (بہار) میں ۱۹۴۰ء میں انہوں نے جو خطبہ پیش کیا تھا اسے دیکھ کر بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کے مصنف کی زبان ہے کیونکہ اس کی زبان کافی حد تک عام فہم، مانوس اور غیر رسمی زبان ہے۔ اسی تقسیم ملک کے فوراً بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دہلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ بھی سادگی اور سلاست کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس ضمن میں مولانا آزاد کے اس صدارتی خطبے کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا جو انہوں نے گاندھی جی کے سانحۂ قتل کے چند روز بعد کانسٹی ٹیوشن کلب، نئی دہلی کے ایک جلسہ میں فروری ۱۹۴۸ء میں پیش کیا تھا۔ ان خطبات کی زبان میں سادگی، صفائی اور سلاست بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان میں الفاظ و تراکیب کی وہ گھن گرج موجود نہیں جو اس سے پہلے کی تصانیف کا طرۂ امتیاز ہے اور نہ ہی وہ رنگینی، آراستگی اور مرصع کاری ہے۔ جسے بعض نقادوں نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ خطبات کی زبان میں عربی فارسی کے غریب اور مغلق الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے جن کی "تذکرہ" میں بھرمار ہے۔ ان خطبات میں اضافی اور عطفی ترکیبیں بھی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ فارسی اور عربی کے صرف وہی مرکبات استعمال کئے

گئے ہیں جو عام فہم اور مانوس ہیں اور اردو زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ صرف دو یا تین خطبات کو چھوڑ کر بقیہ خطبات کی زبان عربی اور فارسی کے فقروں، جملوں، مصرعوں، اشعار اور امثال سے بڑی حد تک مبرا ہے۔ آخری دور کے خطبات میں تو یہ چیزیں بالکل دیکھنے کو نہیں ملتیں۔

مولانا آزاد انگریزی زبان پر کامل عبور نہیں رکھتے تھے۔ لیکن وہ انگریزی الفاظ کے مناسب، موزوں، برجستہ اور برمحل استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ رام گڑھ (بہار) کے خطبے میں انہوں نے پہلی بار انگریزی الفاظ کا آزادانہ استعمال کیا ہے۔ جس سے ان کے اسلوب کی جدت کا پتہ چلتا ہے۔

اس خطبے میں ہمیں ڈپلومیسی   ڈسپلن   ری ایکشن   ڈومی نین

اسٹیشن   ڈاکومنٹ   ریزن   کوآپریشن   کانسٹی ٹیوشن

فیکٹر   فیڈریشن   ریوائول   ٹریجڈی

اور انٹرنیشنل   جیسے الفاظ نظر آتے ہیں۔ خطبات کی زبان نہ صرف الفاظ کی سطح پر ایک سادہ اور عام فہم زبان ہے بلکہ فقروں کے اعتبار سے بھی یہ سہل نگاری کا ایک نمونہ ہے۔ ان میں آزاد کے فقرے بالعموم چھوٹے اور سادہ ہیں جن میں وہ "اور" "لیکن" "کہ" "جو" "بلکہ" وغیرہ جوڑ کر ربط پیدا کرتے ہیں۔ آزاد کے اس سلیس اور سہل اسلوب کی ایک مثال ان کے ایک خطبے "گاندھی جی کی یادگار" (فروری ۱۹۴۸ء) سے پیش ہے۔

"گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے۔ لیکن انھوں نے ہندو دھرم کو اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ جب وہ اس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے ان کو مٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی سچائی جو کسی ایک کا ورثہ نہیں ہے، بلکہ سورج اور اس کی شعاعوں کی طرح سب کے لئے ہے۔" [۱]

خطبات کے اسلوب کی سادگی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اسلوب آزاد کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ زبان کے فوری اور برجستہ استعمال کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان خطبات کے مخاطب مختلف طبقوں اور جماعتوں کے لوگ ہوتے تھے، اس لئے انہیں زبان کو ممکن حد تک آسان رکھنا پڑتا تھا تاکہ سامعین ان کی بات بآسانی سمجھ سکیں۔ مالک رام صاحب نے "خطبات آزاد" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد "اپنے سامعین کے مطابق زبان بھی بدل لیتے ہیں" یہی وجہ ہے کہ "اتحاد اسلامی" "جمعیۃ العلماء ہند" اور "خلافت کانفرنس" جیسے خطبات کی زبان نسبتاً مشکل ہے، کیونکہ ان کے مخاطب صرف مسلمان تھے۔ لیکن دوسرے خطبات کی زبان بہت آسان ہے جسے ہم بلا شبہ اردو کا بنیادی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس "الہلال" اور "البلاغ" بالخصوص "تذکرہ" میں انہوں نے نہایت مشکل اور بوجھل زبان استعمال کی ہے جسے مولانا آزاد کی نثر کا علمی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ علمی اسلوب میں ایک طرف صرف و نحو اور قواعد کی پیچیدگیاں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف عربی اور فارسی کے ذخیرۂ الفاظ و تراکیب اور مصطلحات کا آزادانہ استعمال ملتا ہے۔ "تذکرہ" کی زبان عربی فارسی کے ثقیل اور منغلق الفاظ اور مشکل پیچیدہ تراکیب سے حد درجہ بوجھل ہے۔ یہی نہیں بلکہ جا بجا عربی کے ٹکڑے، فقرے، جملے، اقوال و امثال اور اشعار، نیز قرآن و حدیث کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں جن کی اردو نثر کبھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ "تذکرہ" میں فارسی کے مصرعے، اشعار اور اقوال بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

مولانا آزاد عربی کے منتہی اور فارسی کے جیّد عالم تھے۔ بلکہ عربی تو ان کی مادری زبان بھی تھی، لہٰذا وہ عربی اور فارسی سے کسی بھی صرف نظر نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مذہبی دعوت و تبلیغ اور خطابت میں ان زبانوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی فارسی زبانوں سے بھرپور اخذ و استفادے میں ان کے نزدیک اظہاری سہولت مدِ نظر رہی ہوگی لیکن اس سے ان کے اسلوب کی امتیازی شان اور ان کی شخصیت کے انوکھے پن کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں کسی سنجیدہ یا علمی موضوع پر اظہار خیال کے لئے عربی فارسی کا سہارا ازلبس ضروری ہے۔ اور مذہبی مسائل و مباحث اور استدلال کے لئے تو ان زبانوں کا سہارا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے، لیکن مولانا آزاد کے یہاں عربی فارسی عناصر کا تناسب اپنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گیا ہے۔ اسی اسلوب کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے "اثقل" کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"شروع میں اسلوب بیان ذرا ثقیل تھا اور "تذکرہ" میں تو ثقیل سے گزر کر اثقل ہو گیا ہے۔" ۷

"الہلال"، "البلاغ" اور "تذکرہ" کی زبان اور انداز بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا تخاطب صرف خواص اور مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے سے تھا نہ کہ عوام سے۔ مالک رام صاحب "غبار خاطر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"ان پرچوں کا خاص مقصد تھا، اور ان کے مخاطب بھی تعلیم یافتہ لوگ بلکہ بہت حد تک طبقہ علماء کے افراد تھے۔ ان اصحاب سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ نہ صرف ان تحریروں کو سمجھ سکیں گے، بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مطالب اس سے آسان تر زبان میں بیان نہیں ہو سکتے تھے۔ پس ظاہر ہے کہ عوام تو درکنار متوسط طبقہ بھی ان سے پورے طور پر مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔"

مولانا آزاد بھی یہ بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کو "الہلال" کا جب دوبارہ اجراء عمل میں آیا تو انہوں نے اس میں لکھا:۔

"یہ ظاہر ہے کہ "الہلال" کے فوائد عام نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اس کا دائرہ بحث و نظر عام فہم نہ ہو۔ اور عام فہم جبھی ہو سکتا ہے کہ جب مطالب کے سہل ہونے کے ساتھ ان کا اسلوب بیان اور زبان بھی سہل ہو۔" ۸

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"آئندہ "الہلال" میں دونوں قسم کے مضامین درج کئے جائیں۔ بڑا حصہ تو سہل و عام فہم ہو، لیکن کچھ حصہ بلند اور خاص قسم کا بھی۔ اس طرح عوام و خواص دونوں کے ذوقِ نظر کا سامان مہیا ہو جائے گا۔" ۹

مولانا آزاد نے جو اسلوب بیان اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں اختیار کیا ہے اس کی مثال ان کے ہم عصروں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ آزاد کے عہد میں ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین اور محمد مجیب جیسے دانشور موجود تھے جن کی گہری دلچسپی علم و ادب، مذہب و سیاست اور تعلیم و تدریس کے مسائل سے تھی، لیکن ان میں سے کسی نے بھی مولانا آزاد کا سا اسلوب اختیار نہیں کیا۔ اسی عہد میں سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی جیسے عالم بھی موجود تھے۔ لیکن ان کے اسلوب میں بھی الفاظ کی وہ گھن گرج، بلند آہنگی اور مرصع کاری نہیں پائی جاتی

جو آزاد کے اسلوب کا امتیاز خاص ہے ۔ بلکہ ان مصنفین کا اسلوب سادگی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ آزاد کے پیش رووں میں سرسید نے عصری تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت ایک نئے اسلوب کی بنا ڈالی تھی جو نثر میں رنگینی، مرصع کاری اور آراستگی کے شدید رد عمل کے طور پر سامنے آیا تھا جس کی جڑیں میر امن کی " باغ و بہار " سے جا کر ملتی ہیں ۔ سرسید مسلمانوں میں جدید علوم کو فروغ دینا چاہتے تھے جس کے لئے شعر و ادب کی زبان قطعی ناموزوں تھی ۔ اسی لئے انہوں نے ایک سادہ اسلوب سے کام لیا جس کی بعد کے دور میں حالی اور پھر عبدالحق کے یہاں نمائندگی ہوتی ہے ۔ آزاد نے جس طرح سرسید کی سیاسی فکر کو قبول نہیں کیا تھا ، اسی طرح انہوں نے ان کے لسانی اسلوب کو بھی رد کر دیا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ نظریاتی اعتبار سے آزاد علامہ شبلی سے بہت قریب تھے اور یہی قربت تھی جو انہیں کشاں کشاں ندوہ لے آئی جہاں انہوں نے کچھ عرصے تک شبلی کے علمی رسالے " الندوہ " کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ۔ آزاد نے شبلی کی تصانیف " الفاروق " " المامون " " الغزالی " اور " سیرۃ النعمان " وغیرہ کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا ۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ انہیں اپنے خاندان کے بزرگوں کے تاریخی اور سوانحی حالات لکھنے کا خیال ان تصانیف کو پڑھنے کے بعد آیا ہو اور جیل کے فرصت کے اوقات اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں معاون ثابت ہوئے ہوں ۔ لیکن " تذکرہ " میں شبلی کے اسلوب تحریر کی بھی جھلک دکھائی نہیں دیتی ۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ " تذکرہ " کا اسلوب آزاد کے اپنے ذہن کی ایجاد و اختراع ہے جس میں ان کے تبحر علمی، عربی فارسی پر عبور کامل اور اسلامی فلسفہ و فکر سے گہری مناسبت اور قرآن و حدیث سے غیر معمولی اخذ و استفادے کو زیادہ دخل ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت کے انوکھے پن نے بھی ان کے اسلوب کی تعمیر و تشکیل میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔ یہ تمام چیزیں مل کر ان کے اسلوب کو مشکل، بوجھل اور ثقیل بنا دیتی ہیں جس کا انہیں خود بھی احساس تھا اور وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ زبان اور انداز بیان ممکن حد تک آسان اور عام فہم ہونا چاہیئے ۔ " الہلال " کے دوبارہ اجراء پر اس کی ۱۰ ر جون ۱۹۲۷ ء کی پہلی اشاعت میں انہوں نے لکھا :-

> " باقی رہا زبان کا معاملہ تو وہ ہر حال میں حتی الوسع سہل اور صاف اختیار کی جائے گی ۔ کسی درجے کا موضوع ہو لیکن اسلوب بیان مشکل اور دیر فہم نہ ہوگا ۔ "

مولانا آزاد کے خیال میں اسلوب بیان اس وجہ سے مشکل ہو جاتا ہے کہ " دقیق اور علمی مطالب " بیان کرنا پڑتے ہیں ۔ " الہلال " کی ۱۰ ر جولائی ۱۹۲۷ ء کی اشاعت میں وہ لکھتے ہیں :-

> " مشکل یہ ہے کہ ہر طرح کے مطالب عام فہم طریقے پر بیان کرنا آسان نہیں ۔ بعض دقیق اور علمی مطالب ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں کتنا ہی گھلا کر بیان کیا جائے ، ایک حد تک مشکل اور گراں ضرور ہوں گے ۔ "

(۴)

اطلاعی اسلوب کے بعد زبان کا دوسرا بنیادی اسلوب ہدایتی اسلوب ہے ۔ یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کسی فعل کو سرانجام دینے کی ہدایت دی جاتی ہے یا کسی عمل سے باز رکھنا مقصود ہوتا ہے ۔

ہدایتی اسلوب کی بہترین مثالیں حکم اور استدعا کے لئے استعمال کی جانے والی زبان میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایسے اسلوب میں فعل امر و نہی کے صیغوں اور امر تعظیمی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ "ترجمان القرآن" میں جہاں ایک طرف اطلاعی اسلوب کے نمونے ملتے ہیں وہیں یہ کتاب ہدایتی اسلوب کی مثالوں سے بھی پُر ہے۔ "ترجمان القرآن" کا یہ جملہ "حق کے سوا کچھ اور نہ کہو" (ص ۵۷۶) کوئی اطلاع ہم تک نہیں پہنچاتا اور نہ ہی اس سے کسی جذبے یا تاثر کا پیدا کرنا مقصود ہے، بلکہ ایک مخصوص عمل کے لئے مخاطب کو آمادہ کرنا ہے اور اس میں تحریک پیدا کرنا ہے کہ اس سے وہ عمل سرزد ہو۔ ہدایتی اسلوب کا مقصد حصول نتائج ہے نہ کہ اطلاع رسی۔ "ترجمان القرآن" کے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

اپنے دین میں غلو نہ کرو (ص ۵۷۶)

اللہ پر ایمان لاؤ (ص ۵۴۹)

جب گواہی دو تو صاف صاف بات کہو (ص ۵۴۹)

فتح و کامیابی کے بعد ظلم و شرارت نہ کرو (ص ۵۶۵)

جو کوئی برائی کرے اس کی مدد نہ کرو (ص ۵۸۷)

احکام حق کی اطاعت کا عہد پورا کرو (ص ۵۹۶)

خدا نے جو چیزیں تم پر حلال کردی ہیں انہیں اپنے اوپر حرام نہ کرو (ص ۶۶۱)

"ترجمان القرآن" کے علاوہ مولانا آزاد کے بعض خطبات کا اسلوب بھی ہدایتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مسلمانان دہلی کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یہی اسلوب اختیار کیا تھا۔ اس خطبے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راتوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی ضرورت ہے۔"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ حکم اور استدعا دونوں ہی ہدایتی اسلوب کی شکلیں ہیں۔ امر تعظیمی کے استعمال اور "تم" کی جگہ "آپ" کے استعمال سے حکم کو استدعا میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ "ترجمان القرآن" میں امر تعظیمی کی شکلیں بالکل مفقود ہیں۔ اس کے برعکس خطبات میں ان شکلوں کا بارہا استعمال ہوا ہے۔

ہدایتی اسلوب پُر تکلف اور رسمی بھی ہو سکتا ہے اور بے تکلفانہ اور غیر رسمی بھی۔ تقسیم ملک کے بعد دلّی کی جامع مسجد سے انہوں نے مسلمانوں کو جو خطبہ دیا تھا وہ بے تکلفانہ اسلوب کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس خطبے میں آزاد کا تخاطب صرف مسلمانوں سے ہے جس میں انہوں نے شروع میں صرف ایک بار "آپ" اور باقی ہر جگہ تم، تمہیں، تمہارا، تمہارے کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اسی طرح اس خطبے میں ہر جگہ فعل امر کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں اور کسی ایک جگہ بھی امر تعظیمی استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال یہ ہے :-

"یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے! ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا، اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا

ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔"

(۵)

زبان کا تیسرا بنیادی اسلوب، اظہاری اسلوب (                    ) ہے۔ جس طرح سائنس کی زبان اطلاعی اسلوب کی بہترین مثال ہے۔ اسی طرح شاعری اظہاری اسلوب کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اظہاری اسلوب کے ذریعے شاعر اطلاع رسی یا معلومات کی ترسیل کا کام انجام نہیں دیتا بلکہ جذبے اور احساس کی ترجمانی کرنا اس کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ شاعر اس لئے شعر تخلیق نہیں کرتا کہ وہ معلومات کا خزانہ قاری کو دینا چاہتا ہے یا کوئی اطلاع ہم پہنچانا چاہتا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے داخلی جذبے اور تاثر کو پیش کر سکے اور اگر ہو سکے تو وہی جذبہ اور تاثر وہ قاری کے اندر بھی پیدا کر سکے۔ زبان سے جب داخلی تاثر، جذبے اور احساس کی ترجمانی کا کام لیا جاتا ہے تو یہ زبان کا اظہاری استعمال کہلاتا ہے جو اظہاری اسلوب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اظہاری اسلوب کو ہم ادبی اسلوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اظہاری اسلوب کا تعلق صرف شاعری ہی سے نہیں بلکہ نثر میں بھی یہ اسلوب برتا جا سکتا ہے اور "غبارِ خاطر" اس کی ایک بہت عمدہ مثال ہے۔

"غبارِ خاطر" میں مولانا آزاد نے جو مکتوب نما انشائیے پیش کئے ہیں ان میں معنی کے بجائے نقطہ اہم ہے اور بیان کے بجائے طرزِ بیان۔ ان میں مواد کی وہ اہمیت نہیں جو اظہار کی ہے۔ مولانا آزاد نے اظہاری اسلوب کے ذریعے "غبارِ خاطر" کی نثر میں وہ داخلی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو شاعری میں ملتا ہے۔ "غبارِ خاطر" کے بعض نثر پارے قاری کو ایک مخصوص جمالیاتی تجربے کا احساس دلاتے ہیں۔ "حکایتِ زاغ و بلبل" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

زمستاں کی برف باری اور ریت جھڑنے کے بعد جب موسم کا رخ پلٹنے لگتا ہے، اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ و صحرا پر چھا جاتی ہے، تو اس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکا یک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہو گئی۔ انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر ابلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے تو فضا کا ایک ایک ذرہ عیش و نشاطِ ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی، آج آنکھ کھولیے تو حسن کی عشوہ طرازی ہے۔ کان لگائیے تو نغمے کی جاں نوازی ہے۔ سونگھیے تو سرتاسر بُو کی عطر بیزی ہے۔"

"غبارِ خاطر" کی نثر ادبی مرصع، رنگینی اور آراستگی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ لفظی رعایات و مناسبات فقروں کی صوتی و ذو بست جملوں کی متوازن ترکیب و ترتیب، اظہار کے بدلے ہوئے پیرایے اور نت نئے تلازمات اور نادر ترکیبات نے اس کی دلآویزی اور دلکشی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ "حکایت بادہ و تریاک" سے رعایات و مناسبات لفظی اور مرصع کاری کی ایک خوبصورت مثال ملاحظہ ہو۔

"جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق

ہر روز نکھرے، پہ نہ ہر روز صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و عشرت کے مکانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔" ۱۲

یہاں ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس فیصلے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ "غبار خاطر" ایک لحاظ سے "بیکاری کا مشغلہ" ہے جس میں ابوالکلام کا قلم "بیمار" اور "ضعیف" معلوم ہوتا ہے۔ ۱۳

لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبان کا جتنا شعوری اور تخلیقی استعمال "غبار خاطر" میں ملتا ہے آزاد کی کسی اور تصنیف میں نہیں ملتا۔ یہاں آزاد کا قلم نہ تو بیمار ہے اور نہ ضعیف، بلکہ ایک متحرک و توانا قلم ہے جسے ایک نئے پیرایۂ اظہار اور ایک نئے اسلوب نثر کی تلاش ہے۔

## حواشی

۱۔ سجاد انصاری۔ "محشر خیال"

۲۔ عبدالماجد دریابادی "اُردو ادب کا ادیب اعظم"، ص ۲۵

۳۔ عبدالرزاق ملیح آبادی "ذکر آزاد"، ص ۲۱۲

۴۔ احمد سعید ملیح آبادی "مولانا آزاد کے چند اہم مسودات"، "مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت اور کارنامے" مرتبہ خلیق انجم (دلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء) ص ۳۶۶

۵۔ "اطلاعی"، "ہدایتی" اور "اظہاری" یہ تینوں اصطلاحیں ارونگ ایم۔ کوپی نے زبان کے تین کے لئے استعمال کی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ زبان کے تین اسالیب ہیں جن کی طرف اس کی توجہ مبذول نہیں ہوسکی دیکھئے مرتبہ اینڈرسن اور اپنچھے برگ، ص ۲۴

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد "خطبات آزاد" مرتبہ: مالک رام (نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۷۴ء) ص ۳۵۰

۷۔ عبدالماجد دریابادی، اردو کا "ادیب اعظم" ص ۲۵

۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد، "الہلال" ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء۔

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد "غبار خاطر" مرتبہ: مالک رام (نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۶۷ء) ص ۲۰۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۳۔ سید عبداللہ "انوار ابوالکلام" ص ۸۷۔

قاضی تیسیرالاسلام

# وجودیت ـ تصوّر امتلائے ذات یا کراہیت اور لغویت ولا العینیت کا مفہوم

امتلائے ذات[1] یاکراہیت، انسانی وجود کی ایک ایسی ذاتی[2] و داخلی کیفیت کا نام ہے جو اس کے اندر سے، اپنی ذات کی بے[3]معنویت کے شدید داخلی احساس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اکتاہٹ کے دوران اُمنڈ کر سامنے آتی ہے۔ یہ ایک ایسا داخلی انسانی انفرادی احساس ہے جو اندرونِ ذات اور بیرونِ ذات کی پوری فضا کی بے معنویت کے شعوری احساس سے پیدا ہونے والی انتہائی ناگواریت[4] کے ماحول میں، کسی بھی انسانی فرد کو اس کی مخصوص صورتِ حال میں مبتلائے ابتلا[5] بنائے رکھتا ہے۔ زندگی میں در آنے والے انتہائی اُکتا دینے والے ناگوار لمحات کی یلغار کے ہاتھوں انفرادی بے بسی و بے چارگی نیز بیزاری کا عالم، جبر و اکراہ اور امتلا کی متنوع حالتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔

جبرو اکراہ[6]۔ تنفر[7]، تنغض، دہشت[8] و وحشت کے علاوہ امتلا و ابتلا کی ان تمام داخلی وارداتوں کو اگر بخوبی سمجھنا مقصود ہو تو پھر اس کے لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم کرکیگارد اور ہائیڈیگر کی تحریروں سے بالعموم اور سارتر کی تحریروں سے بالخصوص رجوع کریں۔ یہاں ہم جبرو اکراہ، امتلا و ابتلا، تنفر و تنغض کی کیفیات کو سمجھنے کے لئے خاص طور پر سارتر کی ناول "ناسیا" کے ماحول کو پیش نظر رکھیں گے۔ کیونکہ سارتر نے اپنی اس ناول کے ہیرو روکوئن ٹائن کے حوالے سے ایک روز نامچے کی صورت میں انسانی روزمرہ پر گزرنے والی لمحہ بہ لمحہ وارداتوں کو بالتفصیل بیان کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں سارتر کی اسی ناول سے ایک اقتباس کا "آزاد ترجمہ" ہم اپنے قارئین کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ اس اقتباس سے ہمارے قارئین کو یہ اندازہ بخوبی ہو جائے گا کہ سارتر نے عالم فطرت اور انسانی فطرت کی تمام تر جزیاتی تفاصیل اور شدتِ احساس کی ایک پوری تصویر کس طور پر کھینچی ہے اور اس تصویر کشی سے اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ اب تک اکثر روایتی[9] فلسفوں

---

1 NAUSEATED-SELF/NAUSEA
2 INNER-STATE OF SELF OR MIND
3 MEANINGLESSNESS
4 ILL-FEELING
5 SUFFERING - NAUSEA
6 BRUTALITY/NAUSEATING
7 HATRED
8 DREAD
9 ROQUENTIN

"CONCEPT OF NAUSEA AND ABSURDITY"
IN
"EXISTENTIALISM"

نے عالم فطرت کو عقل و منطق[2] اور اسباب[3] و علل کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور انسانی فطرت کو نفسیات کے ساختہ سانچوں کے محیط کے اندر رکھ کر واضح کرنے کی بے شمار کوششیں کی ہیں تاہم وجودی فکر نے دنیا اور انسان کو سمجھنے کے لئے تمام روایتی[1] منطق و سائنس، نیز نفسیاتی اصولوں کو ایک طرف ڈال دیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اس انسانی اور کائناتی صورت حال کو براہ راست انسانی داخلی واردات کے حوالے سے سمجھا جائے۔ چنانچہ سارتر کی ناول "ناسیا"[4] کا پورا ماحول دنیا اور انسان کو اس کے اسی شدت احساس کی روشنی میں سمجھنے کے لئے ہمیں ایک وسیع و کشادہ اسٹیج مہیا کرتا ہے۔ تو آیئے ہم بھی دیکھتے ہیں کہ زندگی کو زندگی کی اپنی فضا میں دیکھنے کے لئے "ناسیا" کا ہیرو روکن تاں کس طرح سے احساس کے کونوں کھدروں میں گھستا ہے اور پھر وہاں سے اس عالم فطرت کا نظارہ کرتے ہوئے اشیاء[5] کے پرت در پرت کھردرے زینوں سے ان کے اندر کی جانب کچھ اس طرح سے اترتا جاتا ہے کہ پھر اسے ان کی بے معنویت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور اس صورت حال میں وہ از خود دہشت[6] و علت کا شکار ہو کر امتلائے ذات[7] سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ امتلاء[8] و تنفر کی اسی کیفیت کی وضاحت کے لئے ہم یہاں سب سے پہلے سارتر کی خود نوشت "الفاظ"[10] کا ایک جملہ یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں :-

"مجھے اپنے بچپن سے نفرت ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہے جو میرے اس مکروہ ماضی سے ابھر کر آج بھی میری زندگی سے چمٹی ہوئی ہے[9]"

"ناسیا" سے اقتباس کا یہ "آزاد ترجمہ" امتلائے ذات کی داخلی کیفیت کے اظہار کی ایک بھرپور اور مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ اکراہ و امتلائے ذات کی اس داخلی انسانی صورت حال سے ناول کے ہیرو روکن تاں کا سابقہ جس انداز سے پڑتا ہے وہ پیش خدمت ہے :-

"امتلائے ذات کی اس کیفیت نے تو مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔ اس نے تو مجھے بالکل ہی نچوڑ کے رکھ دیا۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ کیفیت کہ جو اب مجھ میں پیدا ہوئی ہے، شاید یہ سب ہی کچھ قبل از وقت ہوا ہے۔ خیر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب میں مزید اس صورت حال سے دوچار نہیں ہو سکتا، کیونکہ مجھ میں اب نہ تو امتلائے ذات کی کیفیت کا کوئی عارضہ ہی رہا ہے اور نہ ہی اس کی صورت کسی دورے کی سی ہے۔ یہ تو بس "میں" ہی ہوں اور کچھ نہیں ---!!!

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے اول ہی دن سے میرا "وجود" ہی سر تا پا ایک کیفیت امتلاء ہے، ایک کراہ ہے، ایک جبر مسلسل اور ایک عالم ابتلاء ہے ---!!

---

1. TRADITIONAL PHILOSOPHIES
2. REASON/LOGIC
3. CAUSES AND EFFECTS
4. "NAUSEA" - SARTRE
5. BENEATH AND AT THE BOTTOM OF THE THINGS
6. DREAD
7. NAUSEATED-SELF
8. HATRED/NAUSEA
9. "I hated my childhood and everything that remains from it" ← "THE WORDS"
10. "THE WORDS" - SARTRE

ILLNESS OR PASSING FIT

STATE OF SUFFERING "I"

اب یہی دیکھئے نا ـــ مثلاً یہ کہ ابھی ابھی میں ایک پبلک پارک میں تھا اور جس بنچ پر میں وہاں بیٹھا تھا اس کے بالکل نیچے سے شاہ بلوط[1] کے درخت کی جڑیں دور تک زمین میں دھنسی ہوئی تھیں۔ مجھے اس دوران بالکل یہ پتہ ہی نہ لگ سکا کہ وہاں میری بنچ کے نیچے کوئی جڑ بھی ہے۔ خود فراموشی کا ہی ایک ایسا عالم تھا کہ جس کے دوران شاہ بلوط، اس کی جڑ اور بنچ کے نیچے زمین کی تہہ میں اس کا دور تک اترنا ـــ یہ سب ہی الفاظ اور ان کے تمام تر معنی و مفہوم اور ان کے محل استعمال کی تمام تر صورتیں اور ان تمام صورتوں سے متعلق ان کے وہ تمام غیر اہم حوالے جو لوگوں نے ان اشیاء اور ان سے متعلقہ ناموں اور الفاظ کے بارے میں سطحی انداز سے گڑھ رکھے تھے، یہ سب کے سب یکسر میرے ذہن سے محو ہو کے رہ گئے ـــ میں وہاں اس پارک میں نیچے گردن جھکائے، سر نیوڑھائے شاہ بلوط کی سیاہی مائل سرخ گانٹھ دار جڑ کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا اور شاہ بلوط کی یہ ڈراؤنی جڑ مجھ میں لرزہ پیدا کر رہی تھی۔ خوفزدگی اور وحشت کے اس تہ تنہا سناٹوں میں میرے ذہن میں اچانک ایک کوندا سا چمک اٹھا ـــ مگر جب میرے شعور کے نہاں خانوں میں بجلی کی ایک روشن لکیر سی پھیل گئی تو سمجھ مجھے یہ خیال گذرا کہ ابھی چند روز پہلے تک تو مجھے یہ گمان تک نہ گذرا تھا کہ میں یہ خیال کروں کہ ـــ "موجود ہونے" یا "ہونے" سے آخر کیا مطلب ہوا کرتا ہے؟ کیونکہ اس خیال سے پہلے تو خود میں بھی بعض دوسرے لوگوں کی طرح ایک عام سا آدمی ہی تھا۔ بعض ایسے عام لوگ کہ جن کے اکثر شب و روز تو موسم بہار میں نئے سے نئے لوازمات کا لطف اٹھاتے گذر جاتے ہیں اور میں بھی کبھی ان ہی لوگوں کی طرح یہ کہا کرتا تھا کہ "اخاہ! دیکھو تو سہی سمندر ہرا ہے اور یہ کہ اس ہرے سمندر کے اوپر دور کہیں آسمانوں میں ایک وہ چمکتا ہوا سفید سا "بحری بگلا[2]" ہے۔ مگر میں نے اپنے اس مشاہدے کے دوران کبھی یہ سوچا تک نہیں کہ اشیاء کا اپنا کوئی وجود بھی ہے کہ نہیں اور یہ کہ یہ "بحری بگلا" واقعتاً ایک ایسا "بحری بگلا" ہے جس کا اپنا کوئی وجود بھی ہے؟ غرضیکہ عموماً ہر عام آدمی کی طرح میری نظر میں بھی وجود کا معاملہ ایک مخفی اسرار[3] ہی بنا رہا اور ان تمام چیزوں کا وجود کہ جو ہمارے چاروں طرف پھیلی پڑی ہیں سچ پوچھئے تو ایک ایسا وجود ہے جو نہ صرف یہ کہ ہمارے ارد گرد ہے بلکہ یہ تو ہمارے اندر بہت اندر تک رچی بسی ہیں۔ ہم ان کے بغیر دو لفظ تک بولنے اور کہنے کے قابل نہیں پاتے۔ تاہم ان تمام موجودات سے اس درجہ قربتوں کے باوجود بھی، اے میرے بھائی، اے میرے ساتھی، تم انہیں چھو تک نہیں سکتے۔ مجھے مگر پھر بھی ان تمام اشیائے عالم کا یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ گویا یوں سمجھو کہ جس لمحے میں ان اشیاء کو اپنے یقین کا حصہ بنا رہا ہوتا ہوں۔ ٹھیک اسی لمحے اس کے بارے میں سوچ بھی رہا ہوتا ہوں اور جس لمحے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوتا ہوں اس وقت میرا ذہن ہر قسم کے خیالات سے بالکل خالی اور مکمل طور پر عاری ہوا کرتا ہے۔ ہاں مگر بجز اس ایک خیال کے اور سوائے اس ایک لفظ کے، کہ جو میرے ذہن میں اس وقت بھی ہوا کرتا ہے ـــ وہ یہ ہے کہ "ہو جانا" یا "ہونا" ایک واقعی صورتِ حال ہے، اور بس!! مگر ٹھیک اسی لمحے علاوہ اس "خیال" کے ایک دوسرا خیال جو میرے ذہن میں اور ہوتا ہے۔ وہ یہ فکر ہے کہ آخر میں اس لفظ "ہونا" کو کس طرح برتوں؟ چنانچہ پھر میں نے "ہونے یا ہو جانے" کے متعلقات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور اسی ادھیڑ بن

---

CHESTNUT-TREE

1. SEAGULL
2. EXISTENCE IS A HIDDEN MYSTRY
3. TO BE

میں "اپنے تئیں" دل ہی دل میں یہ کہتا رہا کہ سمندر کا تعلق ان اشیائے سے ہے جو ہرے رنگ کی ہوتی ہیں —— یا پھر یہ کہ ہرا رنگ سمندر کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ یہاں تک کہ جب میں نے ان اشیاء کی طرف دیکھا تو اس وقت بھی میں اس سوچ سے کوسوں دور تھا کہ یہ اشیاء اپنا کوئی وجود بھی رکھتی ہیں کیونکہ یہ اشیاء مجھے کسی اسٹیج کے منظر کی مانند لگ رہی تھیں۔ چنانچہ جب میں نے ان کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تو ان کی حیثیت مجھے محض ایک "آلۂ کار یا اوزار" کی سی لگی کیونکہ مجھے ان اشیاء میں موجود قوتِ مزاحمت[1] کا اب بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ سب ہی کچھ کہ جو مجھے اس لمحے پیش آ رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہی لمحے یہ سب میرے لئے بالکل سطحی بن چکا تھا۔ چنانچہ اسی صورت میں اگر کوئی شخص مجھ سے یہ پوچھ بیٹھتا کہ بتاؤ بھئی "وجود" کیا چیز ہے —— تو اغلباً میں اُسے بڑے اعتماد سے یہی جواب دیتا کہ یہ وجود "وجود" بھلا کیا شے ہوتی ہے —— یہ تو بس ایک ایسی ہی خالی خولی سی صورتِ حال ہے جو ان خارجی و معروضی اشیاء پر مستزاد ہوا کرتی ہے۔ تاہم اس ایزاد اور اضافے سے ان خارجی اشیاء کی ماہیت میں سرِ مو کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ مگر اس تمام صورتِ حال کے دوران جو ابھی میں نے بیان کی ہے اچانک مجھے ایسا لگا کہ نہیں، "وجود" ایک شے تو [illegible] بالکل روزِ روشن کی طرح ایک کھلی ہوئی حقیقت، جس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ اور یہ کہ یہ حقیقت یعنی "وجود[2]" اب مجھ پر قطعاً منکشف ہو چکا تھا اور اس کی تجریدی شکل و صورت اب میری نگاہوں کے سامنے سے بالکل اوجھل ہو چکی تھی۔ یعنی وجود کی یہ حقیقتِ منکشفہ[3] میرے سامنے محسوس[4] اشیاء کے روپ میں میری نظر کے سامنے آموجود ہوئی تھی۔ چنانچہ جس لمحے شاہ بلوط کی اس بھیانک جڑ نے وجود کا روپ دھارا —— یا پھر دوسری جانب اس صورتِ حال کے برعکس یہ ہوا کہ خواہ وہ شاہ بلوط کی جڑ ہو کہ پارک کو گھیرنے والی تاروں کی باڑھ[5] ہو، کہ پارک میں پڑی ہوئی تنہا بنچ ہو، کہ لان پر اُگنے والی گھنی گھاس[6] ہو۔ یہ تمام کی تمام اشیاء میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئیں۔ اشیاء کے حوالے سے صورتِ حال کا یہ تنوع، اشیاء کی تفرید[7] کا یہ عالم مجھے محض ایک دھوکا لگا۔ صورتِ حال کا ایک ایسا دھوکا جس پر پے در پے ملمع کیا جا رہا ہو —— اور وہ ملمع[8] بھی ایسا کہ جو اپنی چمک دمک اور اپنی وقعت کھو بیٹھتا ہے۔ جس پر سے اس ملمع کے بھدّے بھدّے سے پپڑ پپڑ اُکھڑتے رہتے ہیں اور اس شے کا وجود پلپلا[9] پڑنے لگ جاتا ہے۔ یہ وجود بے ہنگم سے ایک کھردرے بے ڈول سے وجود میں ڈھل جاتا ہے —— تا آنکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ وجود پھر بے غیرتی اور بے حیائی کی حد تک عریانیت[10] کا اس درجہ شکار ہو جاتا ہے کہ دل دہل اٹھتا ہے۔ یہ یہ وجود میرا ہی تو نہیں —— اور پھر اِمتلا[11]، اِمتلا اور اِمتلائے ذات[12] کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہاں، ہاں یہ اِمتلا یہ اکراہ "خود میں ہوں"۔ جو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا اور خود

---

1. RESISTANCE POWER
2. EXISTENCE
3. REVEALED REALITY
4. CONCRETE THING
5. PARK RAILINGS
6. SPARSE GRASS
7. INDIVIDUAZATION
8. VENEER
9. FLABBY
10. TERRIFYINGLY AND OBSCENELY NAKED
11. NAUSEA
12. NAUSEATED-SELF

میری ہی ذات کی لایعنیت[1] اور لغویت سے میرے وجود میں در آیا ہے۔ یہ میرے وجود میں در نہیں آیا بلکہ یہ تو ازل سے میرے وجود کا حصہ ہے۔

سوچ کے اس دورانیے میں میں نے ذرا سی حرکت سے بھی گریز کیا اور پھر مجھے ضرورت ہی کیا پڑی تھی کہ میں اپنے آپ کو برابر اس پوزیشن میں رکھتا کہ میں وہاں پیڑوں کے پیچھے اس طرف نیلے نیلے ستونوں کے پاس جہاں مدھم مدھم چراغ دانوں[2] کی ایک قطار سی نظر آ رہی تھی دیکھ سکتا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ میں ان تمام اشیا کو جو میرے تخیل کے عمل میں تحلیل ہو رہی ہیں آخر کس طرح بدلوں — ؟ پھر میں نے یہ چاہا کہ یہ اشیا میری نگاہوں میں اس درجہ نہ چبھیں تو بہتر ہے۔ میرے لئے یہ قدرے مجرد انداز میں ایک فاصلے کے ساتھ ابھر کے سامنے آئیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں کہ وہی شاہ بلوط کا پیڑ میری آنکھوں میں آ چبھا اور میں نے دیکھا کہ اس کا نچلا نصف حصہ کہ جو سبزی مائل سیاہ پھپھوندے[3] سے بری طرح اٹا ہوا تھا میرے شوق نظارگی پر مسلسل بار ڈال رہا تھا۔ اس کی چھال جس پر سیاہی کے ساتھ ساتھ دھبے دھبے سے پڑے تھے، ابلے ہوئے چمڑے[4] کی مانند ایک مکروہ منظر پیش کر رہے تھے اور قریب ہی کو موجود بوسیدہ فوارے کی کیچڑ نما گندگی سے میرے کان ٹھس گئے تھے اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے سائیں سائیں کرتی سیٹیاں بجاتی مکروہ آوازوں کی ایک بھنبھناہٹ نے وہاں بسیرا سا کر لیا ہے۔ میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے، میرے نتھنے پھول کے کپا ہو گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان سے گاڑھی گاڑھی غلیظ متعفن رطوبتیں نکل پڑیں۔ اور اس واردات کے بعد میں نے دیکھا کہ اس ماحول کی ہر ہر چیز نہایت آہستگی کے ساتھ وجود کے پیکر میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ اشیا کے وجود میں ڈھلنے کا یہ منظر تھکن[5] سے چور ان عورتوں کی مانند ایک ایسی صورتِ حال تھی جو خود کو بھیانک قہقہوں کی بے لگام ڈوریوں سے کس کر باندھ لیتی ہیں اور پھر ایک وحشیانہ رقص کچھ اس انداز سے کرتی ہیں کہ جیسے ان کے ڈھلے ہوئے جسموں کی ازسرِ نو شادابی کی کوئی سبیل زندگی کے اسی انداز میں مضمر ہو۔ زندگی کے بوجھ تلے دبی ہوئی یہ عورتیں ایک دوسرے کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوئیں، اپنی اپنی زندگیوں کا ایک انتہائی حقیر و سفلہ انداز پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے اسی طرزِ زندگی میں ان کے وجود کے بھدے اور مکروہ اسرار ان کی سیاہ متعفن باہوں پہ ناچتے اور ایک دوسرے کو منہ چڑاتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ "غیر وجود[6]" اور فراوانیٔ[7] وجود کی بتدریج تقلیل و تفریط کی ان ہر دو صورتوں کے مابین کوئی اوسط صورتِ حال وجود کی موجود ہی نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ یہاں اگر وجود نام کی کوئی شے موجود ہے بھی تو پھر اس ناگزیر موجودگی کا یہ عالم ذہنی حالات اور غشائی وجود

---

1. ABSURDITY MEANINGLESSNESS AND FUTILE

2. CANDELABRUM

3. GREEN-MILDEW

4. BOILED LEATHER

5. WORN-OUT WOMEN

6. NON-EXISTENCE

7. SWOONING ABUNDANCE

کی کسی ایسی صورت حال سے کسی طرح بھی کم نہیں ہو سکتا کہ جہاں وجود کے عریاں اور برہنہ[1] بدن پر سرتاپا رستے ہوئے زخموں کی سڑاند[2] سے زندگی کی پوری فضا اور ماحول کا ہر دریچہ داغ داغ ہو کر مہک اور دہک نہ پڑتا ہو۔

اور جہاں تک خود میں اور میرے وجود کا تعلق ہے تو یہ بھی کسی پلپلے[3] سے مریل[4] ٹٹو زخمی اور برہنہ پا وجود سے کم نہیں کہ جو زندگی کی عیارانہ[5] بود و باش کے سفلانہ طرز عمل میں لپٹا ہوا اپنی بے عملی اور بے مقصدیت کا جنازہ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے یونہی اِدھر اُدھر اپنی آوارہ خرامی کی مدہوش راہوں پر، اپنے افسردہ[6] خیالات کی یخ بستہ فضاؤں میں، بے یار و مددگار بھٹکتا پھرتا ہے — گویا خود میں کیا اور میرا وجود کیا، یہ تو محض بے ڈول، بے رنگ، بے آہنگ اور بے سود سا ایک وجود ہے اور بس — !! میں تو مگر بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے اپنی اس حالت کا احساس اب تک نہیں ہے۔ میں اپنی اس حالت کو محسوس کئے جانے سے اگر خوفزدہ نہ ہو گیا ہوتا، بے آرامی نہ محسوس کر رہا ہوتا' تو شاید میں اپنی اس حالتِ زار کے بارے میں اس سے بھی کہیں زیادہ واقف ہوتا۔ مگر نہیں مجھے تو اب بھی کسی ایسی صورت حال سے خوف ہی آتا ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں پھر یہ صورت حال مجھے گدی سے پکڑ کر میرے سر کو سمندروں میں آنے والے بلاخیز طوفانوں میں بہتے کوڑے کرکٹ اور کھوجڑ[7] کی مانند بہت بلندیوں سے میلوں دور پرے جا کر نہ پھینک دے۔ پھر میں نے بڑی بیزاری اور مبہم انداز سے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کیوں نہ میں اپنے آپ سے بالکل ہی پیچھا چھڑانے کی کوئی تدبیر کروں، تاکہ زندہ اشیا کی اس بے ہنگم اور بے مصرف بھیڑ سے کم از کم، ایک بے سود وجود تو کم ہو جائے اور اس طرح میں خود کو مکمل طور پر تہس نہس[8] کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔ مگر جونہی میں نے اپنے آپ کو تباہ کر لینے کا یہ منصوبہ باندھا تو مجھے معاً یہ خیال بھی آیا کہ میری موت کی یہ صورت حال کیا میری زندگی ہی کی طرح محض ایک فضول اور بے کار سا واقعہ نہ ثابت ہوگا —!! فضول اور بالکل بے کار سا ایک واقعہ جہاں میری نعش[9] اور اس سے رسنے والا یہ لہو کہ جہاں تمام بے مصرف پودوں کے درمیان یہاں گھاس پھونس کے اس ضوفشاں لان پر پڑا اپنی بدبو اور سڑاند[10] بھرے چپچپے گوشت سے اس پوری فضا کو چراند سے بسائے ہوئے ہے اور یہ زمین کہ جس پر یہ متعفن[11] نعش چیتھڑے چیتھڑے پڑی ہے۔ کچھ دیر نہیں گزرنے پائے گی کہ اس کے گوشت کو مکروہ چونچوں والے گدھوں کی فوج اور حشرات الارض چٹ کر جائیں گے۔ پھر یہاں اس میدان میں باقی ہی کیا رہ جائے گا۔ سوائے میری ان ہڈیوں کے جن کا گودا[12] تک نہ بجاتے ہمیں کیڑوں کی لذیذ غذا بن چکا ہوگا۔ یہ ہڈیاں اندر سے اس درجہ کھوکھلی اور صاف ستھری ہو چکی ہوں گی کہ پھر ان کے آر پار دیکھنا ممکن ہو سکے گا اور پھر ہماری یہ ہڈیاں، یہ پھنکنیاں دور اندیشوں اور مصلحت بینوں کے حوالے بن کر صرف تاریخ ہی کے عجوبوں پر، مکڑی کے

---

1 OBSCENITY
2. ROTTENNESS/BLOATEDNESS
3 FLABBY
4 LANGUID
5. AIMLESSLY JUGGLING
6 DREARY THOUGHTS
7 GROUND-SWELL
8. ANNIHILATED
9. SUPERFLUOUS
10. CORPSE
11 DE-COMPOSED FATTY FLESH
12 ROTTEN , BAD-SMELL
13. BONE-MORROW

جالوں کی طرح اپنا وجود قائم رکھ سکیں گی — چمگادڑوں[1] کی پھڑپھڑاہٹ اور کوؤں کی کائیں کائیں ہی گم، انسانوں کی یہ تاریخ — لغو، محض فضول سے وجود کی ایک بے نام سی تاریخ کا ایک بے اصل ماجرا — !!! گویا میں — تلازمِ ابدیت[2] محض بے سود اور بے وقعت ہستی یا وجود کا حاصل ایک وجود ہوں۔

یہ لفظ "لایعنیت[3] یا لغویت" میرے قلم کی نوک سے ٹپک پڑنے والا چھپا سادہ لفظ ہے جو ابھی ابھی معرضِ وجود میں آیا ہے۔ ورنہ ابھی جب میں اس پارک میں تھا تو اس وقت میری ملاقات اس سے نہ ہو سکی تھی اور پیچھے سے اس لفظ سے میری ملاقات ہوتی بھی تو کس طرح ہوتی کہ نہ تو مجھے اس وقت اس کی کوئی جستجو تھی اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ میں نے تو یہاں اس موقع پر پارک میں چیزوں کے بارے میں، ان کی ہمراہی کے ماحول میں رہ بس کر سوچا تھا اور نہ ہی چیزوں کے بارے میں میری سوچ کا یہ سلسلہ الفاظ کا محتاج کوئی ایسا لزوم تھا جس کی کوئی منطق ہوا کرتی ہے۔ جس کے اندر موجود تنظیم و ترتیب اور قواعد کے کچھ اصول انسان اور اس کے چاروں طرف موجود اشیاء کے براہِ راست رشتوں کو مضبوط و مربوط بنا دیا کرتے ہوں۔ یہ تو بس ایک "لایعنی" صورتِ حال ہے، غیر محکم اور غیر مربوط صورتِ حال — !!! یہ "لایعنیت" میری استخوانی کھوپڑی[4] کے قید خانے میں بند کوئی ایسا تصور ہرگز نہیں، جسے انسانی لب و لہجے کی مطلق آوازوں سے تعبیر کیا جانا ممکن ہو سکے۔ مگر میرے پیروں میں پڑا وہ لمبا مردہ سانپ، جڑیلی لکڑی کا سانپ — ایک لایعنی صورتِ حال کو ضرور پیش لے آتا ہے۔ غرضیکہ اسے سانپ کہیں کہ جڑیلا پنجہ[5]، یا پھر اسے موذی چیر گدھ[6] کا نام دے لیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ سب ہی مثالیں، یہ سب ہی چیزیں، اپنی اپنی جگہ ایک لایعنیت کو ضرور جنم دیتی ہیں۔

اور پھر جب صورتِ حال کچھ یوں ہو تو پھر کسی بھی شئے کو کسی واضح تصور میں ڈھالے بغیر میرے لئے پورے طور پر یہ تسلیم کر لینا ممکن ہو جاتا ہے کہ میں نے "وجود[7]" کی کنجی کا سراغ لگا لیا ہے۔ میں نے اپنی ابتلائے ذات کی کیفیت کا راز پا لیا ہے اور جب "ابتلائے[8] امتلا[9]" سے میری ہستی میں لرزہ پیدا ہو گیا تو پھر مجھے یہ یقین بھی آ گیا کہ میرا اپنا ایک وجود ہے، میری اپنی ایک زندگی ہے۔ یعنی زندگی ہے تو امتلا ہے اور امتلا ہے تو زندگی ہے۔ مجھے اپنے "ہونے" کا ثبوت اپنی کیفیتِ امتلا سے ملتا ہے۔ غرضیکہ ہر وہ شئے کہ جس کا میں فہم حاصل کرنا چاہتا ہوں، اس شئے کے حصولِ فہم کی میری یہی کوشش، مجھے میرے ماضی میں بہت دور تک دھکیلتی لئے چلی جاتی ہے۔ میرا وہ ماضی کہ جہاں میرے وجود[10] کی مطلق و بنیادی

---

1. BATS
2. ETERNITY
3. ABSURDITY / FUTILITY
4. SKULL
5. CLAW
6. VULTURE'S TALON
7. KEY OF THE EXISTENCE
8. NAUSEATING-SELF
9. NAUSEA OR SICKNESS SUFFERING
10. BEING OR EXISTENCE

لایعنیت" عرش کی کھڑکی سے فرش کے آنگن میں مجھے گھورتی، اور مجھے منہ چڑاتی نظر آتی ہے ـــــ چنانچہ اب اور ابھی" میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی اس "بنیادی یا مطلق لایعنیت"[1] کے بیش نظر جس کا ادراک مجھے وہاں اس پارک میں ہوا تھا۔ اور اس ادراک کے دوران مجھے ایک خاص کیفیتِ امتلائی سے گزرنا پڑا تھا۔ مکروہ سانپ کا وہ واہمہ، استعارۃً بھیانک اور دل دہلا دینے والا واقعی واہمہ کہ اسی واہمے نے تو مجھے یہ حوصلہ دیا کہ میں اب اور ابھی" الفاظ[3] کے خلاف اعلانِ جنگ کر دوں۔ کیونکہ الفاظ کی دنیا، توضیحات اور توجیہات کی دنیا، تعقل و تدلک کا عالم[5]، اسباب و علل کا عالم[6] ـــــ ان میں سے کوئی ایک "دنیا" بھی ایسی نہیں کہ جسے "وجود" کی دنیا کے مدمقابل لاکھڑا کیا جا سکے[8]۔"

غرضیکہ ناول کے ہیرو رکویٹن تائن کی ڈائری نویسی کا سلسلہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا چلا گیا کہ "وجود" کی صورتِ حال میں کوئی تعقل و منطق، کسی بھی طرح کی تنظیم[9] و ترتیب[2] موجود نہیں اور یہ کہ عالم فطرت میں موجود اشیائ کے اندر کوئی جوہر یا صفت ایسی موجود ہی نہیں جس کی بدولت ان کی قطعی تعریف کا تعین کیا جانا ممکن ہو سکے۔ عالم فطرت کے اندر کوئی ایسے اٹل قوانین موجود نہیں کہ جن کے مطابق اس کائنات کے اندر موجود اشیائ کے درمیان پائے جانے والے باہمی ربط کو ٹھیک طور پر بیان کیا جا سکے۔ ہر طرح کا تعقل و معقولیت، تمام کی تمام سائنس، ہر طرح کے اصول و قوانین کہ جو ہمیں اس عالم ہست و بود میں نظر آتے ہیں۔ یہ سب کے سب خود ہم انسانوں کے ساختہ ہیں اور چونکہ انسانی ذہن نے ان کا اختراع کر کے انہیں اشیائ سے مستزاد وابستہ کر کے ان کو مخصوص ناموں سے موسوم کر دیا ہے۔ اس لئے ان اشیائ کے برہنہ اور بے لاگ وجود اور ان کے ناموں کے درمیان کوئی داخلی تعلق و وابستگی موجود نہیں اور یہ کہ یہ تمام صورت حال محض ایک ظاہری صورت حال ہے۔ گویا "وجود" ایک ایسی شے ایک ایسی صورت حال ہے جس کے پسِ پشت کوئی مقصدیت پوشیدہ نہیں۔ یہ وجود لایعنی اور بے صورت ایک ایسا وجود ہے جہاں امکان در امکان کی صورت گری کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ بیک لمحہ بیک دم استقبال سے عبارت ایک ناگزیر امکان[3] کا ماجرا ہے۔

ایک موقع پر رکویٹن تائن ڈائری لکھتے لکھتے اپنے قارئین کو چونکا دینے والے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے یوں کہتا ہے۔

"اشیائ سے ان کے مخصوص ناموں کے پیراہن اتار پھینکو۔ ان پر سے ان کی شناخت کے رنگ برنگ چھلکوں کو بالکل چھیل کر ان اشیا کو ان کے برہنہ وجود[4] کے حوالے سے جاننے کی کوشش کرو۔ اگر تم ایسا کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو پھر تم یہ دیکھو گے کہ ان اشیائ کی بے لاگ نظارگی سے تم پر ایک لرزہ طاری ہو چکا ہے۔ وجود کی مکروہ لبالبیت تم میں امتلائ و اکراہ کی حالت پیدا کر دے گی۔ تم

---

1 ABSOLUTE AND BASIC ABSURDITY

2. ORDER AND ORGANIZATION

3. NECESSARY CONTINGENT

4 BARE EXISTENCE

[redacted]



تم اس سے خوفزدہ ہو رہے ہو گے۔ یہ ایک کیفیت جلال و جبروت ہے۔ جس سے ہم میں حزن و ملال اور خوف و دہشت کی ہزار صورتیں پیدا ہوتی ہیں[1]۔

اس کارخانۂ قدرت میں صناعِ عالم کی صنعت و حرفت کے بے شمار نمونے، حسن و جمال کی صورت میں موجود ہیں۔ مگر حسن و جمال کی کاریگری کے ساتھ ساتھ قدرت کے بچھو بٹوں کی بھی لکھو کھا مثالیں، بدصورتی[2] اور بدہیئتی کی شکل میں جس کا ذکر ابھی سطور بالا میں "ناسیا" کے حوالے سے ہوا۔ اگر اس بدصورتی و بدہئیتی کو دیکھنا مقصود ہو تو پھر کبوتر کے اس نوزائیدہ بچے میں دیکھئے جو ابھی ابھی انڈے سے باہر آیا ہو۔ "وجود" کی بدصورتی اور منحوسی کا یہ عالم اس کی پیدائش کے اوّلین دن سے وجودی تحریکوں کا محبوب موضوع ہے۔ اور خوف و دہشت اور حزن و ملال، نیز جلال و جبروت کی کیفیت کو مندرجہ ذیل مثال سے اس طرح سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ بھی وجودیوں کے وارداتی موضوعات میں سے چند ہیں۔ تو آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا یہ تاثرات راقم الحروف کی درج ذیل وجودی عبارت کی طرح کے نہیں۔

"یہ شام کا وقت ہے۔ میں سمندر کے کنارے بالکل تن تنہا ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ میں اپنے اطراف و جوانب سے بالکل غافل، دور سمندر کے پانیوں میں جہاں آسمانوں کا آخری سرا کسی باریش بوڑھے کی سفید جھریوں سے بھرے چہرے کی طرح جھکا ہوا ہے۔ اس تکتے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے ہوں جہاں سورج دہکتے انگارے کی ٹکیہ کی مانند، سمندر کے کھولتے پانیوں کے کڑاھاؤ میں تھوڑی دیر بعد ہی ایک چھناکے کی آواز کے ساتھ غروب ہونے والا ہے۔ مجھ پر لرزہ سا طاری ہو چکا ہے۔ دور افق پر شفق رنگ آسمان پر رات کے اندھیرے اور ماحول کے مہیب سناٹے اپنے بد رنگ اور بھدے بازوؤں کو پھیلائے جا رہے ہیں۔ میں اب پہلے سے بھی زیادہ خوفزدہ ہو چکا ہوں۔ میرا اکیلا پن پورے ماحول کے تاریک سناٹوں کی چیخ میں کفن اوڑھے کھڑا ہے۔ لوبان اور کافور کی دھواں دھواں فضا میرے دہشت زدہ نیم مردہ وجود کی میت اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھائے آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مجھے اب میری اپنی ہی محرومیوں کی چتا[2] پر رکھ کر جلایا جانے والا ہے۔ اس رسم کو ادا کرنے کے لئے نفرتوں و کدورتوں کا ایندھن استعمال کیا جائے گا۔ میں اپنا یہ بھیانک انجام اپنی ہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھ پر دہشت و دہشت کے دورے پڑ رہے ہیں۔ میرا پورا "وجود" "متلی"[4] بن کر سمندر کے جھاگ میں ملنے ہی والا ہے۔ تو سنو! یہ "ابتلا" ہی میری اصل حقیقت ہے۔ جو میں اوپر آسمانوں سے اپنے ساتھ لے کر نیچے اترا ہوں۔ میری ہمیشہ کی طرح یہ ہی کوشش آج بھی ہو گی کہ میں اس "ابتلا" کو بوڑھے آسمان کے منہ پر انڈیل آؤں۔ شاید یہ مہربان سمندر میرے اس ارادے میں میری کچھ مدد کرے۔ میں آپ اپنا نگہبان ہوں۔ اور چرواہوں کی روایتی نگہبانی سے سختی سے انکاری ہوں ..... انکاری ہوں۔ انکاری ہوں[5]۔"

---

1. "FROM SOCRATES TO SARTRE" - T.Z.LAVINE
2. UGLINESS

FEAR/DREAD

MELONCHOLY-MOOD

GRANDEUR

TERRIFYING STATE OF BODY

FUNERAL PILE OR PYRE

MOROSENESS AND HATRED

PUTRID UNDIGESTED OVERFLOW OF MATTER OR NAUSEATIC EXISTENCE

TRADITIONAL HYKSOS RULE

اختلافِ کراہیت اور لغویت ولا یعنیت کے مفہوم کی وضاحت کے لئے اپنے اسی ناول "ناسیا" کے ہیرو روکنٹین تائن کے حوالے سے سارتر نے خود کلامی[1] کی داخلی صورتِ حال کا سہارا لیا ہے اور ان مذکورہ احساسات کی شدت کو درج ذیل اقتباس میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہاں اس ناول کا ہیرو کس طرح سوچ رہا ہے۔ سوچ کا ماحول اور پس منظر کچھ یہ ہے کہ رکوئین تائن بوائیل کے مقام کی جانب عازمِ سفر ہے۔ وہ کار پر بیٹھتا ہے اور سوچ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ زیرِ لب بڑبڑاتا ہے۔

"یہ ایک چیز (کار[2]) جس پر میں بیٹھا ہوں اور میرا یہ سر جس چیز پر ٹکا ہوا ہے اس چیز (سیٹ[3]) کو عرفِ عام میں کار کی سیٹ کہا جاتا ہے ــــ کچھ لوگوں نے اس چیز (کار کی سیٹ) کو عام و خاص تمام لوگوں کے بیٹھنے کے واسطے بنایا ہے۔ سیٹ کو بنائے جانے کا یہ معاملہ کوئی لمبا چوڑا منصوبہ نہیں ہے۔ انہوں نے تو بس چمڑا[4] لیا، کچھ اسپرنگ[5] اور کپڑا لیا اور اپنے ذہن میں موجود بندھے ٹکے تصور کے مطابق اس سیٹ کو مکمل طور پر بنا ڈالا۔ گویا انہوں نے وہ چیز تخلیق کر ڈالی کہ جو وہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جیسا چاہا ویسا بنا لیا۔"

رکوئین تائن کے ڈائری لکھنے کا سلسلہ ابھی جاری ہے وہ آگے چل کر مزید لکھتا ہے اس کی یہ سوچ بھی خود کلامی کا ایک انداز ہے ــــ وہ کہہ رہا ہے۔

"ہونہہ!! میں بڑبڑایا۔ "یہ ایک سیٹ ہے" زیرِ لب جو لفظ ابھی میں نے کہا، وہ ایک لفظ ہی تو تھا جو میرے ہونٹوں پر آ کر رک گیا اور ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ یہ لفظ (سیٹ) میرے منہ سے نکل کے آگے جاتا اور پھر اس چیز (سیٹ) سے جا کر چپک جاتا۔ یہ لفظ (سیٹ) تو وہیں ٹھہرا رہا کہ جو وہ ہے یعنی صرف اور صرف ایک لفظ (سیٹ) اور وہ ایک چیز یعنی "سیٹ" بھی اپنی ہی جگہ رہی۔ اپنی تمام تر صورتوں کے ساتھ۔ یہ سرخ رنگ کا ملائم روئیں[6] دار مخملی کپڑا، مخملی روئیں دار پنجے[7] کی مانند ایک چیز، اپنی جگہ پر موجود بالکل بے حس و حرکت مردہ ایک شے۔ جسے سیٹ کہہ لیجیے اور اس سیٹ میں دھنسا ہوا میرا بھیانک توند[8] والا یہ وجود، جو کچھ عجب نہیں کہ کسی لمحے اندھا ہو کر اوپر کو اٹھ جائے۔ اس میں سے خون رسنے لگ جائے اور یہ غبارے کی طرح پھول کے کپا ہو جائے اور پھر میرا یہ کپا سا وجود اپنے تمام تر مردہ بے حس پنجوں کے ساتھ اور یہ میرا توندیلا وجود کار کی محدود فضاؤں میں تیرنے لگ جائے یہاں تک کہ یہ سرمئی[9] آسمانوں میں اڑنے لگ جائے۔ اور پھر اچانک ایسا لگے کہ جیسے میرا یہ توندیلا وجود، یہ سرمئی آسمان، اور یہ ایک چیز جسے سیٹ کہتے ہیں کچھ بھی باقی نہ رہے ــــ اور یہ کہ اب میں اور میرا وجود: یہ سب ہی کچھ مردہ گدھا[10] بن چکے ہیں۔ جس کی پھولی ہوئی نعش پانی میں اِدھر اُدھر اُچکتی پھر رہی ہے۔ مگر نہیں، ایسا بھی تو ممکن ہے کہ یہ مردہ گدھا خود میرا اپنا وجود نہ ہو بلکہ میں پھولے ہوئے مردہ گدھے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا، پانی میں اپنے عریاں[11] پاؤں کو چھپا چھپ کر رہا ہوں[12]۔!!"

---

1. SELF-MURMERING
2. STREET CAR
3. SEAT
4. LEATHER
5. SPRING
6. RED PLUSH
7. RED-PAWS
8. .OATING BELLY
9. GREY SKY
10. DEAD DONKEY'S BELLY
11. BARE-DANGLING FEET IN WATER
12. FROM SOCRATES TO SARTRE - BY T.Z.LAVINE

ہم یہاں وجودی فکر کے اس مرحلے پر وجودیوں کے اپنے خالق سے گلے[1] شکوے کے غیر محسوس لہجے کا تذکرہ بھی کریں گے۔ فلسفی شاعر علامہ اقبال[2] نے بھی شکوہ[3] لکھ کر نہایت خوبصورت انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں موجود انسانی حالات کی کہاں تک ذمہ داری اللہ اور اس کے بندوں پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس کے حل کے طور پر کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک ایسا ہی شکوہ وجودیوں نے بھی کیا ہے۔ تاہم ان کا انداز علامہ اقبال سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کی فکر میں اگر عاجزی و انکساری کا لہجہ، پرسشِ احوال کا شکوہ اور مفاہمت کا رویّہ پایا جاتا ہے تو وجودیوں کے یہاں غم و غصے[2]، تحقیر و تنفر[3] اور باغیانہ[4] تیور پائے جاتے ہیں چنانچہ آیئے دیکھتے ہیں کہ ان کے یہاں شکوے کا یہ انداز کیا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال کو راقم الحروف کی تحریر کردہ درج ذیل وجودی عبارت کے حوالے سے دیکھئے:۔

"مجھے اب اپنی ہی محرومیوں کی چتا پر رکھ کر جلایا جائے گا۔ "دیوتاؤں[5] نے شاید آگ[6]" اسی لئے تخلیق کی تھی کہ انہیں مجھے اس میں جلانا مقصود تھا۔ مگر نہیں دیوتاؤں نے یہ زحمت ہی کیوں کی ـــــ کہ میرے جل مرنے کے لئے اپنے ہی مد مقابل "غیر[7]" کا جہنم ہی بہت ہے۔ اور پھر یہ کہ دنیا بنانے والے نے اپنی دنیا بنانے کے بعد ساتویں دن سکھ کا سانس لیا یعنی آرام بھی کیا۔ اے لوگو! میں بھی اپنی ایک دنیا بنا رہا ہوں۔ لیکن دنیا بنانے کے اس پورے عمل کے دوران میری زندگی میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں کہ جو میرے آرام کا چھٹا یا ساتواں دن ہو ـــ اور ایسا اس لئے ہے کہ میری دنیا تو مشاغلِ کار کی دنیا ہے۔ محنت و عمل کی دنیا ہے، یہ مسلسل و متواتر مصروفیت کا عالم ہے۔ زندگی کی اسی روش میں انسانی مسرتوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے۔ اس کے برعکس اُدھر عالم بالا میں دائم خوشگواری کی فضا ہر چند کہ تھکن[15] و نا آسودگی سے عاری ایک فضا ہے۔ تاہم یکسانیت و اکتاہٹ کی یہ فضا بے عملی کی ایک ایسی فضا ہے جہاں پورے چھ دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کا التزام کیا جاتا ہے جو میرے اور میرے ساتھی انسانوں کے لئے ناگواری[16] کا ایک عالم ہے۔ فرشتے[17] اس فضا میں خوش ہوں تو ہوں، مگر ایک "باعمل وجود" ایسی کسی فضا کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تو پھر آؤ میرے دوستو! میرے ہم نفسو ـــــ! کہ ہم اسی زمین کو عرش[18] بنائیں۔ یہیں اپنی پسند اور اپنے مزاج کے مطابق ایک خوبصورت[19] جنت تخلیق کریں!! ایک ایسی پسندیدہ جنت کہ جہاں ہم اور تم سب اپنی مرضی اور اپنے منشا سے زندگی کا تاج محل تعمیر کرنے کے لئے آزاد ہوں۔ جہاں مجھے میری مرضی کے خلاف کسی دوسری زمین پر دھکیلنے والا کوئی "جبر[20]" وہاں موجود نہ ہو۔ جہاں میرا احساسِ جرم مجھے مزید نادم نہ کر سکے۔

---

1. COMPLAINING RESENTMENT
2. ANGER AND SORROW
3. HATRED AND BELITTLING ATTITUDE
4. REBELLIOUS AND FURIOUS MOODS
5. FRUSTRATIONS
6. GODS
7. FIRE
8. THE OTHER IS HELL
9. THE MOMENT OR DAY OF
10. COMPLETE - REST ACCORDING TO
11. BIBILIC EXPLANATION
12. THERE IS NO-REQUIRED "SIXTH OR SEVENTH" DAY OF REST IN OUR WORLD OF BUSINESS AT HAND.
13. WORLD OF ACTION AND LABOUR
14. LEBENSWELT - LIFE-WORLD
15. FATIGUE AND DISCONTENTMENT
16. DISPLEASUREMENT
17. ANGELS HEAVEN
18. PARADISE OF OUR OWN LIKINGS AND LIVINGS
19. WHERE, THERE WILL BE NO MORE BRUTAL-FORCE
20. TO PUT OR ABONDONE - THE "I" IN THE
21. OTHERWISE WORLD OF ESTRANGEMENT.

اور یہ کہ جہاں کوئی موت کی دہشت میرے تعاقب میں نہ آسکے۔ میں وہاں مروں بھی ضرور مگر اس طرح سے کہ میری یہ موت میرا اپنا خوشگوار انتخاب ہو اور یہ کہ جب میں چاہوں تو اس کے "بلاوے[1]" کا دعوت نامہ بھی میں خود ہی اپنے قلم سے لکھوں۔ اور پھر ہماری یہ ہر دلعزیز "موت" بلا کسی لمحے بھر کی تاخیر کے میرے لئے یہاں آموجود ہو۔ اور جب کبھی دنیا میری نئی تاریخ لکھے تو یہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا جائے کہ موت ان پر ہرگز بھاری (عذاب[2]) نہ تھی بلکہ یہ تو ان کے مسکراتے ہوئے انتخاب کا دوسرا نام ہے۔ یہی انتخاب ان کی آزادی[3] ہے تمام دکھوں سے رستگاری کے لئے موت کا ایک آزادانہ انتخاب ان کی پسندیدہ[4] موت کا لمحہ — !! ان کی جہد مسلسل کا ایک انمول تحفہ[5] ہے !!![6]"

غرضیکہ کراہیت و امتلاء، لغویت و لایعنیت کے داخلی شدتِ احساس کے موضوع پر "ناسیا" کے حوالے سے جو تفصیلی بیان ابھی گزشتہ صفحات میں گزرا۔ اس سے ناول کے ہیرو رکوئین ٹائن کی زیرلب بڑبڑاہٹ کے پس منظر میں انسانی صورت حال کی وحشت ناک، دہشت ناک اور اذیت ناک حالت کا پتہ چلتا ہے اور سارتر اپنی مذکورہ تحریر میں یہ دریافت کرنا چاہ رہا ہے کہ اشیائے عالم اپنے واقعی وجود میں اپنی اصل اور عریاں حقیقت میں کیا ہیں۔ سارتر کا اصرار ہے کہ اشیاء اور ان کے "وہ نام کہ جو ہم نے ان کے اصل وجود پر منسوب رکھے ہیں۔ ان دونوں صورتحال کے مابین کوئی "جھوٹا یا سچا" کسی بھی طرح کا کوئی "تعلق" سرے سے موجود ہی نہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ اپنی طرف سے ان اشیاء کے بے صفت اور بے جوہر وجود کے ساتھ ان پر اپنے "مفروضہ اوصاف کی ایک طول طویل فہرست اوپر سے چسپاں کر رکھی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان اشیاء کا وجود بالکل برہنہ[7]، قطعی عریاں اور کھلا[8] کھلا واضح موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک چیز کہ جس پر رکوئین ٹائن بیٹھا ہے۔ کیا وہ "شے" واقعی ایک کار ہے جو سڑکوں پر بھاگتی پھرتی ہے۔ کیا اس شے (کار) کا یہ نام اس کے اس جوہر یا وصف کی کھلی کھلی اور پوری پوری تصدیق کرتا ہے؟ کیونکہ یہ سب ہی کچھ یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ شے (کار) وہ کچھ نہ ہو، کہ جسے ہم نے اس پر ایک مخصوص نام کی چھاپ لگا کر اسے بنا رکھا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ شے صرف ایک کار ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے ہزاروں سرخ مخملی پنجے[9] ہی ہوں یا پھر یہ بھی نہ ہو بلکہ یہ صرف مردہ گدھے کا سرخ کپا جیسا تودہ یا وجود ہی ہو..... اور بس!!!

سارتر کہتا ہے کہ اشیاء جیسی کہ وہ اس عالمِ فطرت میں واقعتاً موجود ہیں۔ مکمل طور پر واضح اور صاف طور پر ظاہر ہیں۔ ان کا اس کے علاوہ اور کوئی جوہر یا صفت موجود ہی نہیں۔ ان اشیاء کا وجود اپنے ہونے کے ثبوت کے طور پر کوئی ایسا پابند یا مشروط وجود ہے ہی نہیں جن کی تصدیق، توجیہات و الفاظ[10] کے ذریعہ سے کی جا سکے۔ کیونکہ الفاظ و اوصاف کی مہر تو ہم خود ان پر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ

---

1. A "SELECTED" AND "WILLFUL HAPPY DEATH"
2. ANGUISH
3. FREEDOM * INVITATION
4. LIVELY AND WILLFULL DEATH
5. PRECIOUS GIFT
6. "AN EXPLAINATORY IMPRESSIVE WRITING" BY AN EXPERT'S PEN
7. BARE/NAKED
8. OPENNESS
9. RED-PAWS
10. WORLDS/EXPLANATIONS

اب سے دو سو سال قبل ڈیوڈ ہیوم[1] بھی کچھ اسی نتیجے پر پہنچا تھا جس پر کہ آج سارتر پہنچا ہے۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وجودات[2] واقعات[3] و معاملات کی اس متنوع اور رنگارنگ دنیا کا الفاظ و توضیحات، عقل و منطق کی دنیا اور ریاضیاتی اصولوں کی دنیا سے کوئی تعلق موجود نہیں۔ وجود کا سا معاملہ تعقل[4] کا معاملہ ہے ہی نہیں۔ چنانچہ اس کی کوئی منطق موجود نہیں کہ اشیاء جیسی کہ "وہ ہیں"[5] اس سے مختلف کیوں نہیں ہوا کرتیں اور اس بات کی بھی کوئی معقول توجیہہ نہیں کی جاسکتی کہ اگر یہ دنیا موجود ہے تو آخر کیوں موجود ہے یا اس کے بجائے یہاں کوئی "عدم"[6] کیوں موجود نہیں وغیرہ۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر سارتر "وجود"[7] کی غیر معقولیت[8] کو ہیجان[9]، خوف[10] و دہشت اور امتلاء کی کیفیت اور اکراہ کے شدید احساس کے وسیلے سے ہی ظاہر کرنے پر کیوں مُصر نظر آتا ہے — ؟ تو اس سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ایک سارتر ہی کیا، اس سے پہلے کے بعض دوسرے فلاسفہ بھی مثلاً سورن کرکیگا[11] اور نطشے جیسے صاحبِ عقل اور دراک فلاسفہ نے بھی کھل کے یہ بات کہہ دی کہ وہ ایک فکری صورتحال کہ جسے عموماً[12] "فلسفوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے صرف اور صرف عقلی کرتبے لگانے کا نام نہیں، یہ محض منطقی موشگافیاں اور ذہن کی کے کھیل تماشے نہیں جو وجودی بساط پر محض تفریحاً[13]، اور بحث برائے بحث کے مصداق پر کھیلے یا برتے جاتے ہوں۔ جیسا کہ آج عصرِ حاضر میں بھی بعض مکاتبِ فکر فلسفے کے بارے میں یہی خیال کرتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں وجودی یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ نقطۂ نظر ہرگز درست نہیں بلکہ یہ کوتاہ بینی پر مبنی ایک خیال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلسفے تو وہ فکری صورتیں اور خد و خال ہیں کہ جن کے درمیان ہم اور آپ، بلکہ ایک دنیا رہتی بستی ہے۔ فلسفہ تو زندگی کرنے کا نام ہے۔ وجودیوں کا خیال ہے کہ فلسفے انسانی نفسیات پر اپنا بہت گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ یہ انسانی نفس و روح[14] کے لئے موت و زیست کا معاملہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ روایتی[15] فلسفوں کے علی الرغم اگر وجودیوں کی اس فکر کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ عالمِ فطرت میں نہ تو کوئی معقولیت پائی جاتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی نظم و ترتیب ہی موجود ہے۔ نہ اس میں کوئی سائنسی اصول اور نہ ہی کوئی فلسفیانہ جواہر پہ مبنی اس کی کوئی ساخت ہوا کرتی ہے۔ اور یہ کہ یہ تو بس ایک دنیا ہے جہاں کسی وقت بھی کچھ بھی رونما ہو سکتا ہے، کچھ بھی پیش آسکتا ہے۔ وجودیوں کی یہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے کہ جہاں وجود کے کھانچے[16] میں اوصاف و جواہر کی کوئی بھی تصویر، خواہ وہ کتنی ہی صاف و واضح کیوں نہ ہو، فٹ ہو ہی نہیں سکتی، اور یہ کہ اس دنیا میں اسباب[17] و علل کا کوئی بھی سلسلہ نہ تو پہلے کبھی تھا، نہ اب ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگا۔ اس کی کوئی "بنیادی ساخت"[18]

---

1. DAVID HUME
2. BEINGS
3. MATTERS OF FACT
4. REASON
5. THINGS AS THEY ARE
6. NOTHINGNESS
7. EXISTENCE
8. IRRATIONALITY
9. EXCITEMENT
10. FEAR/DREAD
11. SOREN KIERKEGAARD/NIETZSCHE
12. INTELLECTUAL GAMES OR CONSTRUCTIONS
13. LOGICAL PLAY-GAMES
14. HUMAN SPIRIT
15. TRADITIONAL PHILOSOPHIES
16. FRAME OF EXISTENCE
17. CAUSES AND EFFECTS
18. BASIC STRUCTURE

نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں چنانچہ یہ تو بس کسی وقت بھی ریزہ ریزہ[1] ہو جانے والی چیز ہے کہ جو بالآخر تحلیل و فنا ہو جائے گی ــــ اور میں بھی یعنی خود میں بھی اسی کے ساتھ ہی فنا ہو جاؤں گا کہ میں بہر حال اس سے جڑا ہوا ہی ایک وجود ہوں۔ یہ تو بس ایک ایسی شاخ کی مانند ہے کہ جو ناپائیدار ہے اور میں بہر حال اسی شاخ پر بیٹھا ہوا ایک احمق ہوں۔ چنانچہ جب یہ شاخ ہی نہ رہے گی تو اغلب امکان یہی ہے کہ میں بھی نہ رہوں۔ گویا یہ دنیا اور میں "دونوں ایک غیر یقینی صورت حال کی زد میں ہیں۔ چنانچہ "وجود" کی یہ "غیر یقینیت"[2] "لغویت" نہیں تو اور کیا ہے۔ وجود کی اصل حقیقت کلیتاً اس کی لغویت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور لغویت کی تعریف یہ ہے کہ یہ اشیاء کے وجود میں معقولیت کا اساسی[3] فقدان ہے۔ چنانچہ ابھی وجود کی اس پوری کہانی میں جو منظر بھی گذشتہ صفحات میں ہماری نظر سے گزرا ہے وہ ایک ایسی ہی لغو اور فضول اور بے سروپا صورت حال کا مظہر ہے۔ وہ منظر شاہ بلوط کی جڑ[4] ہو کہ سانپ[5] کا واہمہ ہو، سرخ مخملی پنجہ[6] ہو کہ اڑیل چیل گدھ[7] کے بھونڈے پاؤں کی مثال ہو۔ سمندری گھڑیال[8] کی جھریوں پڑی سخت اور گھناؤنی کھال ہو کہ بد صورت پنجوں والا اودھ بلاؤ ہو، عریانیت کی ترشی ہوئی سیاہ مورتی ہو کہ برہنگی کا لجلجہ لجلجہ[9] لیس پن ہو، کچھ بھی کیوں نہ ہو ــــ یہ سب کے سب مناظر، وجود کے ہی مناظر ہیں جن میں توجیہہ و تعقل کا کہیں کوئی گزر نہیں ہوا کرتا۔ یہ تعقل و توجیہہ کی سطح سے بہت نیچے کی چیزیں ہیں۔ جن کے لئے صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ یہ چیزیں بس وہاں ہیں اور بس یوں ہیں؟ کیسے ہیں؟ کس طرح ہیں؟ بس یہی نہ پوچھو۔ ہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ یہ ایک شعور[10] کی رو ہے جس کی تہہ میں منظر در منظر بہت ہی نچلی سطح پر وہ کچھ پیش آتا رہتا ہے جو "چوں و چرا" سے آزاد اپنا ایک دائرہ بنتا رہتا ہے۔ اس دائرے میں عقل کی مکڑی اپنا شکار پا ہی نہیں سکتی۔ اس لجلجے جالے کے تاروں کو اگر چھونا ممکن ہو سکتا ہے تو اس کے لئے احساس کی مضراب سے ہی کام لینا ہوگا۔ یہ کیفیت و احساس کی دنیا ہے اس کو معقولیت[11] کے کھرپے سے کریدنا چاہو گے تو تمہیں وہاں سوائے راکھ کے بھوبل کے اور کچھ ہاتھ نہ آسکے گا۔ اس کے عرفان کے لئے تمہیں خود کو کرب و اذیت کے الاؤ میں جھونکنا ہوگا۔ پھر کہیں تمہیں اس چنگاری کا پتہ لگ سکے گا جس کی تمہیں واقعی تلاش ہے ــــ یہ چنگاری "وجود[12]" کی چنگاری ہے۔ بالکل برہنہ اور روشن روشن؛ چم چم کرتے "وجود" کی چنگاری ــــ !!!

سارتر کہتا ہے کہ مگر یہ وجود لغو ہے اور لغو اس لئے ہے کہ یہ محض ایک "امکان[13]" ہے کہ جس کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ "یہ ہو کہ نہ ہو"۔ یہاں عقل کا گزر ہو سکتا ہے اور نہ یہ وصف سے متصف ہے۔ یہ تو محض اپنے "ہو جانے" کی راہ امکان کے بین بین ایسی کہیں ہے!! یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہے تو کہاں ہے، کس منزل پر ہے اور کیا ہے۔ یہ تو بس مکرر ہے؟ زائد اور فاضل[14] ہے۔ اسی لئے یہ لغو و لایعنی ہے۔ ہر وہ چیز کہ جو موجود ہے وہ

---

1. FALLS APARTS OR DISOLVES
2. UNCERTAINITY/ABSURDITY
3. FUNDEMENTAL LACK OR GAP
4. ROOT OF CHESTNUT TREE
5. ILLUSION OF SNAKE
6. RED-PAWS
7. VULTURE'S FOOT
8. SEA-LION
9. BARENESS WITH ITS STICKY - VISCOUS MATTER
10. STREAM OF CONSCIOUSNESS ASH-MATH
11. REASONABILITY
12. SPARK OF EXISTENCE
13. CONTINGENT
14. IN THE WAY OF EXISTENCE
15. de-Trop

لیں پیدا ہوتی ہے اور اپنی نحیف و زاری نیز لاغری کے باوصف خود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مبتلا رہتی ہے اور پھر ایک روز دن بھی اس چیز پر آن پڑتا ہے کہ یہ اتفاقاً موت کی زد میں آجاتی ہے۔

اور اب اس مرحلے پر پہنچ کر رکوئین ٹائین اپنی کیفیتِ امتلا کے راز کو پالیتا ہے اور کہتا ہے کہ :-

"امتلا"[1] کی کیفیت کسی انسان کا وہ شدتِ احساس ہے جو اسے اپنے چاروں طرف کی دنیا سے گھرے ہونے پر اس دنیا کی لغویت و بے ثباتی نیز اس کی نامعقولیت کے ذاتی تجربے کے دوران بری طرح سے کوفت پہنچاتا ہے اور جب اس کو اس انسانی صورت حال سے فرار کی کوئی صورت نہیں نظر آتی تو پھر یہ دہشت زدہ ہو کر "کیفیتِ امتلا"[2] کا شکار ہو جاتا ہے۔"

یہاں سارتر "ناسیا" کے حوالے سے یہ بتانے میں تو کامیاب نظر آتا ہے کہ اشیا کے وجود میں اساسی[3] فقدان اگر کسی چیز کا ہے تو وہ ان کی معقولیت کا ہے اور یہی نامعقولیت[4] اشیا کی لغویت ان کی لایعنیت[5] ہے — مگر اپنی فکر کے اس مرحلے پر سارتر کی "ناسیا" کا ہیرو رکوئین ٹائین ابھی تک جس چیز کا سراغ نہیں پاسکا ہے۔ وہ فقط اشیا کی معقولیت کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ماجرائے فکر اس کی اپنی ذات کی معقولیت، تعینیت اور بامعنی ہونے کا بھی ہے۔ یعنی ایک وہ ذات کہ جو اس کی اپنی ایغو[6] کا راست حوالہ ہے کہ "خود" وہ کیا ہے؟ یہ ذات کہ جو ایک شخص ہے اور صفتِ تفکر و تعقل کی حامل ذات ہے اور اپنی اسی صفت کی بنا پر یہ ذات، یہ شخص، یہ آدمی کبھی ایک مورخ ہے تو کبھی ایک سوانح نگار ہے۔ غرضیکہ قدم قدم پہ یہی، یہ ذات اپنی حکمت و دانش کے لکھو کھا کمال دکھاتا نظر آتا ہے۔ خود اس کی اپنی یہ ذات بھی اپنے اوپر تھوپی جانے والی توصیفات و توضیحات کا ہی معاملہ ہے۔ یعنی انسان نے خود اپنی ذات کو بھی معنی و مفہوم سے آراستہ کیا ہوا ہے چنانچہ انسان کی معنی و مفہوم سے آراستہ و پیراستہ، اس کی خود ساختہ شخصیت، اس کے اس واقعی اور کھلے ہوئے[7] عریاں وجود سے سرمو کوئی مناسبت[8] اور تطابق نہیں رکھتی، جو پیدائش کے اولین دن سے اس کا مقدر ہے — اور یہ کہ اسی وجہ سے اس کا وجود اس کے اس جوہر پر مقدم ہوتا ہے جس کا اضافہ انسان خود بتدریج اپنی ذات میں کرتا رہتا ہے۔ انسانی وجود بھی اشیا کے وجود کی مانند، اوصاف و جواہر سے عاری ایک کھلا ڈُھلا وجود یا ایک وجودِ محض ہی ہوا کرتا ہے اور چونکہ اس وجود میں بھی کوئی صفت موجود نہیں ہوتی اس لئے اس کی بھی کوئی توضیح و توجیہہ ممکن نہیں۔ سارتر کہتا ہے کہ کوئی بھی جوہر یا صفت ایسی موجود نہیں کہ جو انسانی ذات سے مناسبت و موزونیت رکھتی ہو۔ لہٰذا جب صورت حال یہ ہو تو پھر ڈیکارٹ کا "کاگیٹو"[9] COGITO" یا "اندیشم" (میں سوچتا ہوں) کا تصور یا کوئی وجودِ مفکر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ کوئی ایسا وجودِ مفکر موجود ہی نہیں کہ جو کوئی ایسا جوہر تشکیل دے سکتا ہو جو میرے وجود سے مکمل

---

1. ABSURDITY/UNCERTAINITY OR IRRATIONALITY
2. STATE OF NAUSEA
3. BASIC LACK OR GAP
4. IRRATIONALITY
5. ABSURDITY
6. RATIONALITY/DETERMINISM/MEANINGFULL EGO
7. OPEN AND BARE EXISTENCE
8. CONGRUGENCE
9. - " 1 THINK" - COGITO

مناسبت رکھتا ہو چنانچہ کوئی تجسّم شخصی، یعنی انسانی جسم وہاں سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا، اور وہاں صرف ذات ہی بہ حیثیتِ "شعور" کے باقی رہتی ہے جو یکے بعد دیگرے اشیائے "ظہورِ مسلسل"[1] اور "نمودِ متواترہ"[2] کا وقوف کرتی رہتی ہے۔ گویا یہ انسان کی ایک ایسی شعوری صورت حال ہے جسے شعور کی رو سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ شعور کی رو کی اس انتہائی تہہ میں "آنی جانی اشیا"[3] کا ایک تواتر مسلسل جاری رہتا ہے۔ کبھی "یہ" تو کبھی "وہ" شے نمود کی سطح پر ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس طرح سے ڈیکارٹ کا وجودِ ممتد[4] (مادی وجود) کہ جو کائنات میں موجود میکانکی قوانین کا تابع وجود ہے ـــــ اس وجود کے ساتھ ہی ساتھ ڈیکارٹ کا وجودِ متفکر[5] یا شعوری وجود یا کاگیٹو بھی یعنی یہ ہر دو وجودات "شعوری اور مادی" یکسر ناپید ہو کے رہ جاتے ہیں۔

غرضیکہ بحث کے اختتام پر سارتر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کیفیتِ امتلا اس کی اپنی ذات کا ایک اٹوٹ انگ ہے یعنی یہ "کیفیت" اور "وہ خود" دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ مگر تماثلِ ذات[6] کا یہ ماجرا بھی اشیائے دیگر اور افرادِ دگر کی اضافت کے حوالے سے ہی وابستہ ایک انسانی صورت حال ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ امتلائے ذات کی کیفیت دنیا کے بارے میں ہمارے اپنے اساسی بدائی[7] احساسات کا ماجرا ہے۔ کیونکہ ہم اس امتلائے ذات[8] کے تجربے سے گذرے بغیر، دنیا میں موجود کسی بھی شے کا تجربہ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ عموماً ہوتا ہے کہ ہم امتلا کی اس داخلی کیفیت میں مبتلا ہونے کے خوف کو بعض مخصوص خواہشات و مصروفیات کے تابع رکھ کر صورت حال کو ٹال دیئے جانے کے "جھوٹ[9] یا خود فریبی" کا سہارا لے کر، اپنی اس مخصوص کیفیتِ حال کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس میں ہم اکثر ناکام ہی رہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری "ابتلائے امتلا"[10] کی یہ داخلی صورت حال ہماری بنیادی کیفیت حال ہے۔ یہ ہمارا "آپ" اپنے تئیں کے بارے میں بنیادی شعور ہے جس میں خود ہمارا جسم بھی برابر کا شریک ہے۔ کیونکہ اگر ہمارا یہ جسم موجود نہ ہو تو پھر ہماری یہ داخلی صورتحال یعنی ہمارا یہ "جی کا متلانا"[11] بھلا کیونکر اور کہاں ممکن ہو سکتا ہے۔ گویا سارتر کے نزدیک ہمارا جسم "جی متلانے" کا ایک آلہ ہے۔ اس کے ہونے کی بنا پر ہی ہمارا "جی متلاتا"[12] ہے۔ ہماری داخلیت کی نازک ترین اور حساس شہزادی ہماری خارجیت کے رہوار پر سوار ہو کر ہی "ابکائی، چکر اور امتلا"[13] کے عارضے میں مبتلا ہوتی ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ "کیفیت امتلا" ڈیکارٹ کے "کاگیٹو یا اندیشم" کا گویا جسمانی[14] حصہ ہے چنانچہ اگر مجھے اپنی چاروں طرف کی دنیا کا شعور ہوگا۔ تو پھر اس شعور کی کم سے کم صورت یہ بھی ہوگی کہ مجھے اپنے جسم کا بھی وقوف ہے۔ چنانچہ اگر ایک طرف میرا جسم مجھے میری چاروں طرف کی مادی دنیا سے عمل اور ادراک کے ذریعے روشناس کراتا رہتا ہے تو وہیں دوسری طرف میرا ادنیٰ درجے کا یہی "شعور" مجھے میری داخلی "کیفیتِ امتلا" سے شناسا بناتا رہتا ہے اور ہماری "کیفیتِ امتلا" کی یہ صورت ہماری مخصوص انسانی صورت حال کی "مغمومیت" سے جنم لیتی ہے۔

---

1. SEQUENTIAL APPEARANCE
2. SEQUENTIAL EMERGENCE
3. THIS AND THAT
4. EXTENDED BEING
5. THINKING BEING
6. SIMILIARITY OF SELVES
7. BASIC FEELINGS
8. NAUSEATING-SELF
9. FALSITY
10. BAD-FAITH
11. SUFFERING SICKNESS OR NAUSEA
12. NAUSEATING-SELF
13. VIRTIGO/DIZZINES/NAUSEA
14. PHYSICAL COUNTER PART OF "COGITO" OF DESCARTE

ناصر بغدادی

# پستی - کامیو کا ایک ناول

ادب اور فلسفہ کی تغیر پذیر جہتوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں پرکھنے والوں کے لئے البیئر کامیو کی ناگہانی موت حقیقتاً ایک عظیم تر سانحہ تھی۔ اس کی موت ایک ایسے نابغہ روزگار کی موت تھی جس نے اپنے اطراف کی غیر منطقی اور لایعنیت (ABSURDITY) کی حامل دنیا میں منطقی بنیادوں کو مقیاس بنا کر اٹل حقیقت اور معروضی صداقت کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اپنے خیالات کی وسعت اور پھیلاؤ، اور تحریروں کی توانائی اور جدت طرازی کے اعتبار سے وہ ایک بلند قامت ادیب اور فلسفی تھا۔ اس نے عملی زندگی کے ژولیدہ اور تہہ دار موضوعات پر چابکدستی سے طبع آزمائی کرتے ہوئے جو کچھ تخلیق کیا ہے اس کا مطالعہ ایک ذہین قاری کو سوچ اور فکر کا وافر مواد فراہم کرتا ہے۔ میتھ آف سسی فس (MYTH OF SISYPHUS) اور "اجنبی" سے "جلاوطنی اور بادشاہت" تک کامیو کا تخلیقی سفر کئی حیثیتوں سے اہم ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہی کہا جا سکتا ہے! کامیو کی تحریروں کا غائرانہ مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس نے روایتی قدروں اور مروجہ ضابطوں سے اعراض برتتے ہوئے ادب اور فلسفہ میں نئے ابعاد اور نئی جہتوں کو تدریجی تنگ حدود سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی خلاقانہ بصیرت اور تخلیقی اپج کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان اور عملی دنیا کے تناظر میں اہم مجرد اور غیر مجرد موضوعات پر لکھتے ہوئے ادب اور فلسفہ کی سرحدوں کو بہت دور تک پھیلایا ہے۔

اس کی موت پر دنیا کو وراثت کی شکل میں اس کی فکر انگیز تحریروں کا اچھا خاصہ ذخیرہ تو ملا ہے مگر یہ ایک المیہ ہے کہ ناگہانی موت کے باعث وہ اپنے نقطۂ نظر کو کسی مخصوص تصوراتی جہت کے تناظر میں جزئیات کے ساتھ پیش نہ کر سکا تھا اور یوں برسوں تک روغنِ نیم شبی جلانے کے باوجود وہ اپنے خیالات اور تصورات کو کسی حرکی فلسفہ کا مصدر و ماخذ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے عرصۂ دراز تک اپنے اطراف کی دنیا میں بدلتی ہوئی قدروں اور ارتقا کی نمو پذیری کو شفافیت کے ساتھ محسوس کیا۔ اس کے تخلیقی عمل کے اجزائے ترکیبی اس تغیر پذیری سے اثر پذیر ہوتے ہوئے اس کی تحریروں پر اپنے واضح اثرات مرتب کرتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ فکری محرکات کی برانگیختگی کے باعث اس کی تحریروں میں اس کے خیالات کی تہیں نئی معنویت کے ساتھ پیچیدگی اختیار کرتی گئی ہیں۔ اس نے آج کی دنیا کے انسان کی ذہنی پراگندگی اور عدم تیقن کی کیفیت کو اطراف کے لایعنی واقعات سے ممزوج کرنے کی کوشش تو کی ہے مگر اس باب میں کوئی قابلِ قبول متبادل حل پیش نہ کر سکا۔ اگر ان معنوں میں ہم اس کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو

ن کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم اس کو کسی مخصوص مکتبِ فکر کا موجد نہیں کہہ سکتے!!

کامیو "پستی" کو اپنی کہانیوں کے مجموعہ "جلا وطنی اور بادشاہت" میں شامل کرنا چاہتا تھا اور جب اس موضوع پر اس نے لکھنا شروع کیا تو اس کو یہ قطعی علم نہ تھا کہ کہانی کا پلاٹ دلچسپ، طوالت کے سبب پھیلتے پھیلتے ایک ناول کی شکل میں اپنے اختتام کو پہنچے گا۔ اس کے اندازے کی غلطی اور قلم کی معجزہ نمائی کے سبب اس ناول کو قلیل سے عرصے میں بین الاقوامی سطح پر عدیم المثال شہرت حاصل ہو گئی۔ اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ اس کی اشاعت کے چند برسوں میں اس کا ترجمہ کئی ترقی یافتہ زبانوں کے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ اگر کامیو اس کو قطع و برید اور سخت گیر تدوین کے بعد کہانی کی شکل میں شائع کرتا تو ممکن تھا کہ ناول کے مقابلے میں اس کو اتنی ہمہ گیر مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔

"پستی" میں کامیو نے اپنے سابقہ ناول "اجنبی" کے مرکزی خیال اور اسلوبِ فکر کو نئے فکری پیرہن میں پیش کر کے نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ژاں بیپ تیس کلے مینس JEAN-BAPTISTE CLAMANCE فی الاصل "اجنبی" کے ہیرو MEURSAULT کے عملی رویوں اور اصولی قدروں کی انتہا پسندانہ اور جارحانہ انداز میں عکاسی کرتا ہے۔ "اجنبی" کے موضوعات (THEMES) اور بعض عجیب الہیئت (GROTESQUE) علامتوں اور تمثیلوں کو "پستی" میں نئے ابعاد کے اضافہ کے ساتھ بلند آہنگ لہجے اور غیر ابہامی استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بعض جگہوں پر کامیو کا لہجہ غیر محتاط حد تک تلخ اور جارحانہ ہے۔

کامیو نے بالواسطہ بحث کے ذریعہ ان اہم مسائل کا اظہار کیا ہے جو خارجی حالات اور داخلی احساسات کے پس منظر میں انسانی سوچ اور انسانی زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ موت کے تعلق سے پیدا شدہ ٹھوس اور سیال حقیقتوں کا جائزہ لیتے ہوئے انسانی زندگی کے دیگر متعلقہ شعبوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ انسان کے باب میں انسانی سرد مہری اور بے اعتنائی، جدید زندگی سے وابستہ کھوکھلا پن اور بے شناختی فرد کی زندگی پر مسلط کردہ جرم اور معصومیت کے نظریات اور اقدار، عملی زندگی میں لایعنی اور ناقابلِ یقین واقعات کا ظہور اور ہر دور میں بدلتے ہوئے جذباتی اور ذہنی رویوں کی بابت اپنے خیالات کرداروں کے لایعنی افعال کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے یہ ناول کلے مینس نامی ایک سابق وکیل کے غیظ اور تاسف سے بھرپور اعترافات ہیں جو فکری عمق کے ساتھ بلند آہنگ لہجے میں بیان کئے گئے ہیں۔ اب یہ شخص تائب منصف JUDGE PENITENT کی حیثیت سے نہ صرف اپنے ارتکاب کردہ گناہوں پر شد و مد سے اظہارِ تاسف کرتا ہے بلکہ ضمیر کے آئینے میں جھانک کر خود کو شدید الفاظ میں ملعون بھی کرتا ہے۔ اس کے اعتراف کا انداز اور لب و لہجہ سینٹ آگسٹائن اور روسو سے کلیتاً مختلف ہے۔ مغلوب الغضب ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتیت پیرِ تسمہ پا بن کر اس کے ذہن اور قلب پر سوار ہے۔ نرم خرام لہجہ کی بجائے اس کی آواز میں تندی اور ترش روی ہے اور اس پر مستزاد وہ ترحم کے احساسات سے قطعی طور پر بے بہرہ ہے۔ کلے مینس اپنے اعترافات کو ناخوشگوار واقعہ کی طرح بیان کرتے ہوئے تاسف کے منفی جذبات کو نقطۂ عروج پر لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کو تمام تر جزئیات کے ساتھ دوبارہ

ل THE FALL, BY ALBERT CAMUS

زندہ کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے ماضی میں جو کچھ کیا تھا وہ اس کے لئے اب سرمایۂ افتخار نہیں، مگر اس کے اعترافات لاطائل نہیں۔ وہ فی الحقیقت آج کی دنیا کے تناظر میں ایک عام انسان کی زندگی کے منفی پہلوؤں اور تلخ حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں آج کے مجبور محض انسان کے پیچیدہ داخلی احساسات اور اس کے عملی کردار کے تضادات اور تناقضات پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

ایمسٹرڈم کو اس جدید، انہونی دنیا کا اسٹیج منتخب کیا گیا ہے۔ جہاں لوگ سرد مہرانہ انداز میں بے روح کٹھ پتلیوں کی طرح اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان کے چہروں سے بے اعتنائی مترشح ہے اور آنکھوں میں بھرپور عصبیت کی کیفیات براجمان ہیں۔ ان کا انداز، ان کا طرز عمل مخصوص بورژوا طبقے کی غمازی کرتا ہے۔ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کامیو کا ایمسٹرڈم فی الحقیقت ایمسٹرڈم شہر نہیں۔ وہ صرف جدید دنیا کے گنجان آبادی والے شہر کے حوالے سے وہاں کی زندگی کے اذیت ناک حقائق کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ دنیا کا کوئی بھی بڑا شہر ہو سکتا ہے۔ شہر کی بھیڑ میں انسانی جذبات کی کم مائیگی اور بے بضاعتی، ہجوم میں گھرے ہوئے انسان کے اندر کی تنہائی کا روح فرسا احساس، لوگوں کے آشنا چہروں سے ابلتا ہوا بے اعتنائی کا زہر ـــ کامیو چابکدستی سے ہجوم میں گھرے ہوئے بے بس انسان کی بیکراں تنہائی کے احساسات کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بلا تذبذب اور ہچکچاہٹ کے عصر حاضر کے جدید ترین شہروں کو بورژوا طبقے کے جہنم کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک آج کا جدید تقاضوں سے ہم آہنگ شہر اپنی اذیت کوشی کے سبب دانتے کے تخلیق کردہ جہنم سے کسی طرح کم نہیں۔ آج کا انسان شہر کی بلند قامت عمارتوں کے سامنے متعفن تنہائیوں کے پاتال میں ڈوبا ہوا اپنے گمشدہ تشخص کی بازیافت میں معروف تو ہے مگر اسے امید نہیں کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ کامیو کا ناول انسانی اقدار کی پستی کی بھرپور نشاندہی کرتا ہے مگر وہ اس سلسلے میں کوئی متبادل نظام عمل پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔

ناول کا آغاز ایمسٹرڈم کے میکسیکو سٹی نامی ایک شراب خانہ میں ہوتا ہے اور قاری اس ناول کے مرکزی کردار کلے مینس کو تحیر خیز مکالمہ گوئی میں معروف پاتا ہے۔ یہ مکالمہ گوئی عجیب الہیئتی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ناول کی ابتداء سے اختتام تک کلے مینس CLAMANCE کی باتیں سننے والا کسی بھی موڑ پر نہ تو اس کی کسی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ کسی طور اپنے کسی ردعمل کا اظہار کرتا ہے مگر سامع کی جانب سے غیر مختتم خاموشی کے باوجود ہم اس کی موجودگی کو غیر مجرد اور غیر محسوس انداز میں بھی مگر محسوس ضرور کرتے ہیں۔ قاری کے لئے حرفِ آخر تک اس پراسرار شخص کی شناخت ممکن نہیں۔ وہ بس ذہن پر زور دے کر اٹکل پچوانہ انداز میں سامع کی بابت قیاس آرائیاں کر سکتا ہے اور یوں سسپنس اور تحیر کے احساسات کلائمکس پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں۔

ادھیڑ عمر کا کلے مینس متواتر پانچ دنوں تک اپنی زندگی کے حالات اس غیر شناخت شدہ اجنبی کے گوش گزار کرتا ہے جس سے وہ اسی شراب خانہ میں ملا تھا۔ موضوعِ گفتگو اس کی اپنی ذات ہے۔ ماضی کو دہرانے کے عمل کو اس کی گمشدہ زندگی کی بازیافت کا ایک مرحلہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس کی زندگی سے متعلق بے شمار واقعات لاشعور کے اندھے کنوئیں سے ابھر کر کسی فلم کی کہانی اور مناظر کی طرح تواتر کے ساتھ اسے یاد آتے ہیں۔ وہ ان حالات کو یاد کرتا ہے جن کی سنگینی کے زیر اثر اس سے گناہ سرزد

ہوئے تھے اور پھر اپنے ضبط رہتے ہوئے ذہنی اور جذباتی رویوں کی مدد سے وہ اپنی زندگی کو منفی اقدار کے خول سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

تائب منصف ماضی کے حوالے سے اپنی مختلف النوع سرگرمیوں کے پس پردہ کار فرما غایات کی تفصیلی وضاحت پیش کرتا ہے۔ وہ اس وقت کو یاد کرتا ہے جب وہ سر سے پاؤں تک ایک بناوٹی انسان تھا۔ دوسروں کے ساتھ اس کا سلوک ایک برفانی سرد مہری کا حامل ہوتا تھا۔ حقیقی دوستی کے حقیقی مفہوم کو اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس کی فطرت کا جذباتی آہنگ انسانی ذات کے خود غرضانہ پہلوؤں سے وابستہ ہوتا تھا اور اس کا ذوقِ تفنن دوسروں کے لئے نشتر زنی کا کام کرتا تھا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کے لئے قابلِ قدر "کارناموں" کا انجام دینا از بس ضروری ہے۔ پھر اس کی زندگی تیز خرام تغیّر سے متعارف ہو گئی۔ اس کے ساتھ اس کا نیا اثباتی طرزِ عمل خون و خمیر سے ممزوج ہو کر ذہنی طمانیت کا موجب بننے لگا۔ زندگی سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں اس کو بیکراں مسرت اور بے پایاں خوشی سے ہمکنار کرنے لگیں۔ مثلاً بس میں کھڑے ہوئے کسی شخص کو اپنی نشست پیش کر کے، یا کسی نابینا کو سڑک پار کراتے ہوئے اس کی اپنی حیثیت خود اس کی نگاہوں میں برتر ہو جاتی تھی وہ اپنی ذات میں فوق البشر کی بالیدہ فکری کو اجاگر ہوتے ہوئے محسوس کرتا۔ پھر وہ شخصی مخاصمت اور نجی مصلحتوں سے بلند تر ہو کر روحانی ارتفاع کے حصول کی کوشش میں اقدار کے رجائی تصور کا داعی بن گیا مگر اس کے باوصف اس نے محسوس کیا کہ وہ ہنوز زندگی کی حقیقتوں سے ناواقف ہے۔ جن روزمرّہ کے واقف کاروں سے اس کا قریبی تعلق تھا جن کتابوں کو اس نے پڑھا تھا، جن مقامات سے وہ گزر رہا تھا جن اقدار نے اس کی زندگی کو تیز خرام تغیّر سے متعارف کرایا تھا ان سب کے حوالے سے اس کو حقیقت اور صداقت کا ماورائی اور غیر ماورائی ادراک مطلق نہ ہو سکا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جس خوشی، جس سکون کو اس نے اپنی زندگی سے ہمکنار ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا وہ مریضانہ کھوکھلاپن کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب اس نے اس مسئلہ پر مزید غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ عصرِ حاضر کی زندگی نے انسانوں کو ایسی چلتی پھرتی کٹھ پتلیوں میں متبدل کر دیا ہے جن کا مقدر محض بے نامی اور گمنامی ہے اور پھر شاید زندگی کی بے شناختی اور عدم تشخص کی بنا پر وہ مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکیں۔

اور پھر ایک شام پیرس کی ایک آرٹس گیلری سے گزرتے ہوئے اس نے عقب سے ایک بلند آہنگ قہقہے کی گھن گرج بازگشت سنی۔ اس نے فوراً مڑ کر دیکھا مگر وہاں تو دور دور تک کسی ذی نفس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ فی الحقیقت یہ خود کلیمنس تھا جو اپنی ذات پر اس بیدردی سے قہقہہ زن ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس طنزیہ قہقہے کا زہر جیسے اس کے کام و دہن سے گزرتا ہوا اس کی روح میں اتر گیا۔ اس کا سارا وجود جیسے برفانی ٹھنڈک کے زیر اثر منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ اس کی حسی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ وہ اپنے اندر زلزلے کے شدید جھٹکے محسوس کرنے لگا۔ اس کی شخصیت اس کی اپنی نظروں میں زمیں بوس ہو گئی تھی اور وہ یوں خود سے کترانے لگا جیسے بھرے مجمع میں برہنہ کھڑا ہزاروں آنکھوں کا ہدف بنا ہوا ہو۔ یہ اس کی تذلیل، اس کی پستی کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس قہقہے کی دودھاری تلوار سے بچنے کی کوشش

میں جب وہ اپنی شخصیت کے شکستہ آئینے کو ہمرکاب لئے گھر پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے اردگرد کا ماحول ہنوز اس قہقہے کی آسیبی گونج سے لرز رہا ہے۔ اسی شام جب وہ خوفزدگی اور ژولیدہ فکری کا شکار بنا آئینے میں دیکھ رہا تھا تو اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ پھیلتے پھیلتے دوہری ہوگئی ہے فی الاصل یہ قہقہہ ہی تھا جس نے کلے مینس کو احساس گناہ کے اسفل السافلین میں دھکیل دیا تھا۔ جیسے اس کی بند آنکھیں زندگی میں پہلی مرتبہ کھلی تھیں۔ اب وہ ہر واقعہ کے تناظر میں زندگی کے کھوکھلا پن اور لایعنیت کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی خود اعتمادی اور اس کی عملی قوتوں کو دھچکا لگا ہے۔ اس کی زندگی پر سریع الاثر تبدیلی کے واضح اثرات مرتب ہونے لگے۔ اچانک اسے وجود باقی بے معنویت اور لاشیت NOTHINGNESS کا شدومد سے احساس ہوا۔ جیسے زندگی کے کھوکھلے پن کا عفریت باہیں پھیلائے اس کی سمت بڑھتا جا رہا تھا اور فرار کی راہیں یکے بعد دیگرے اس پر بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ مزید شکست و ریخت سے بچنے کے لئے اپنے فکری نظام کو منضبط انداز میں چلانا ضروری ہے۔

اس نے وکالت کے پیشے کو خیرباد کہہ دیا اور تائب منصف کی حیثیت سے گناہ و ثواب کے تناظر میں عملی زندگی کی جہت کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس کے تحقیقی ادراک نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا کہ معصومیت اور برابری کا دعویٰ ایک کھلا جھوٹ ہے۔ اب اس کے نزدیک معصومیت اور عصیاں کے خود ساختہ انسانی نظریات جعلسازی کے سوا کچھ نہ تھے۔ اس کے خیال میں انسان نے انسان کو دھوکا دینے کے لئے یہ نظریات وضع کئے تھے جو نہ صرف انسانی ادراک کی ناپختگی کے عکاس تھے بلکہ ہر دور میں مناقشات اور تعصبات کی خلیجوں کو وسیع تر کرتے رہے تھے۔

لیکن بہت جلد اسے محسوس ہوگیا کہ وہ ہنوز وہی پرانا کھیل کھیل رہا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار اس کا کردار پرانے کھیل کے نئے ضوابط کے تحت بدل گیا تھا۔ کلے مینس ماضی میں زندگی کی عملی سرگرمیوں سے ذہنی رویوں کو ہم آہنگ کرکے دوسروں کی نسبت خود کو برتر سمجھتا تھا۔ لیکن اب اس نے اسی احساس برتری کے حصول کی خاطر ایک دوسرے انتہا پسندانہ تصور کے مدار پر اپنی تمام تر زندگی کو رکھ دیا تھا۔ اب وہ مسلسل اور بے تکان انداز میں ہر بات کے لئے خود کو مورد الزام ٹھہراتا اور اپنی ذات کو لعن طعن کرکے نہ صرف برتر سمجھتا بلکہ اپنے اس طرز عمل سے خود کو دوسروں سے ممیز اور ممتاز کرتا تھا۔ اب اسے سکون اور ابتہاج کے جو لمحات مل رہے تھے وہ ماضی میں ایک مختلف دائرہ کار میں رہ کر ملنے والی خوشی سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ مسرت اور بہجت کی لذت وہی تھی مگر اب اس کا مصدر و ماخذ بدل گیا تھا۔ زندگی کے متعلق اس کا یہ نیا نقطۂ نظر مختلف معتقدات کے تناظر میں ایک شدید قسم کا ردعمل تھا۔

اگر کلے مینس کے ان بدلتے ہوئے داخلی میلانات کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہم کو پاسکل (PASCAL) کے انحراف (DIVERSION) اور خود فریبی کے تصورات کا اتباع کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جان بوجھ کر اپنی حقیقی شناخت کو نظر انداز کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنی ذات کے مدار سے خود کو ہٹاتا جائے۔ اس کی ارتفاع پسند اور انا پرست برتری اس کے لئے وجود باقی ضرورت بن کر رہ جاتی ہے۔ اپنی ذات سے انحراف کا عمل اس کی زندگی میں لایعنی اور غریب الہیئت GROTESQUE سرگرمیوں کو جنم دیتا ہے جو اس کے لئے عارضی

طمانیت اور وقتی نروان کا موجب بن جاتے ہیں۔

خود کو ہر طرح سے بچانے کی کوشش کے باوجود کلے مینس کا اپنا وجود طلبیانہ قہقہے کے زیر اثر عدم تحفظ کا شکار ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی چپکے سے دبے پاؤں نہ معلوم کہاں سے وارد ہو کر یہ قہقہہ ہتھیدی انداز میں اس کے اعصابی نظام کے لئے اختلال کا باعث بن جاتا تھا۔ یہ صرف قہقہہ ہی نہ تھا جو ناگہانی آفت کی شکل میں اس کے حواس پر مسلّط ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی تھا جو اس کے لئے اضمحلال، ذہنی انتشار اور پراگندہ خیالی کا سبب رہا تھا۔ اس واقعہ کو فراموش کرنے کی بہترین کوششوں کے باوجود اس کی یادداشت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے گئے تھے۔ یہ واقعہ ایک عورت کی ذات سے متعلق تھا۔ اس قہقہے سے پیدا شدہ جنسی عذاب میں گرفتار ہونے سے تقریباً دو تین سال قبل نومبر کی ایک بے حد سرد رات کو جب وہ پیرس کے ایک پُل کو پار کر رہا تھا کہ اس نے ایک عورت کو ریلنگ پر جھکے ہوئے دیکھا۔ پل سے گزرنے کے فوری بعد اس نے پانیوں کے شور اور یخ لہروں کے پس منظر میں کسی چیخوں کی گونج کو سنا جو چند لمحوں بعد اطراف کی دبیز خاموشیوں سے سر ٹکرا کر معدوم ہو گئی۔ اب فضا میں پھر سناٹوں کی حکمرانی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ ٹھٹکا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے دوبارہ پل کی جانب لوٹنے کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اس نے کسی کو اس حادثہ کی بابت کچھ بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور رات کی سیاہی میں خود کو خود سے چھپاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ اس مرتبہ بھی ہمیشہ کی طرح کلے مینس نے وجودیاتی فیصلہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ یہ اس کے دائرہ اختیار میں نہ تھا کہ مخصوص حالات اور واقعات سے مطابقت رکھنے والے مخصوص عملی فیصلے کر سکتا۔ یہ اس کا فطری وطیرہ تھا کہ واقعات سے ہم آہنگ فیصلوں کو قصداً ٹالتا رہے۔ اپنی اسی "صلاحیت" کے ذریعہ وہ قنوطیت، یاس اور ناکامی کو عارضی طور پر اپنے قابو میں کر لیتا تھا۔ وہ دراصل بھول جانے کی مؤثر قوت کے ذریعہ فرار کی نئی راہیں تلاش کرتا تھا۔

کامیو نے پروست (PROUST) کے یاد کے نظریہ CONCEPT OF REMEMBRANCE کو معکوس کر دیا ہے۔ پروست کا خیال تھا کہ خوشی کو پیدا کرنے اور طویل کرنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ انسان ذہن میں مسرت و بہجت کے گزرے ہوئے لمحوں کو دوبارہ زندگی بخشے۔ ماضی کی خوشی کا احساس حال کی پراگندگی کو فرو کر کے یاد کرنے والے کو بالیدگی اور مثبت جذباتی ارتفاع سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔ اس کے علی الرغم کلے مینس ماضی سے وابستہ واقعات اور یادوں سے خوفزدہ ہے۔ وہ صرف انہیں واقعات کو یاد کرنے کا اہل ہے جن کے باب میں اس نے وجودیاتی ضرورت کے تحت اہم فیصلوں سے گریز کیا تھا اور بعد ازاں یاد کرتے ہوئے تخویف کے شدید احساسات سے خود کو ہمکنار پایا تھا کہ اس نے اس وقت ایسا کیوں کیا تھا؟ ناول اس مرکزی کردار کے اس واضح تاثر پر منتج ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ وجودیاتی ضرورت کے تحت فیصلہ کن قدم اٹھاتے وقت تاخیر کو طول دیتا رہے گا۔ انسانی زندگی میں فرار کا یہ راستہ زندگی سے متعلق ایک نئے تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔

کامیو زندگی کی یک رنگی اور یکسانیت کو تنقید کا ہدف بناتے ہوئے آج کے انسان کی بے فائی بے اعتنائی کے مختلف النوع پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔ وہ استبداد کی روح ہے اور فکری نظام کے ڈھانچے کو بدلنا وقت کی اہم ضرورت متصور کرتا ہے۔ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مروّجہ اقدار حالات سے ہم آہنگ نہ ہونے کے سبب غریب الہیئت (GROTESQUE) اور لایعنی (ABSURD) واقعات کو جنم دیتے ہیں۔ کامیو نے اس ناول

میں زندگی کی بے معنویت اور لاشئیت کے نظریہ کا از سرِ نو جائزہ لیتے ہوئے اس سے وابستہ مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس کے نزدیک کوئی شے اپنے مخالف کی عدم موجودگی میں نمو پذیری اور ارتقاء کا مرحلہ طے نہیں کر سکتی۔ نیکی اور بدی، معصومیت اور گناہ، زندگی اور موت کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ارتقائی منازل طے کر سکتے ہیں۔ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ فکر و عمل کے تناظر میں ان کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔ کامیو کے خیال میں انسان اپنی نقل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

---

لے "MAN MUST LIVE WITH HIS OWN DUPLICATE"

آفاق صدیقی

# شاہ لطیف کے اثرات

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے پیام و کلام کی ہمہ گیر مقبولیت ان کی زندگی میں ہی دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مقبولیت کا دائرہ بڑھتا رہا اور اب یہ عالم ہے کہ نہ صرف سندھی شعر و ادب کے شائقین اور اہل قلم شاہ جو رسالو سے مستفیض ہوتے ہیں بلکہ پاکستانی اور بدیسی زبانوں کے ادب پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔

شاہ بھٹائی نے سندھی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ سندھی زبان ان سے پہلے بھی سندھ کے لوک ادب اور کلاسیکی شاعری میں اپنا رنگ جماتی رہی تھی لیکن اسکے رنگ و آہنگ کو جو نکھار شاہ جو رسالو نے بخشا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سلسلے میں جناب اے کے بروہی کا یہ کہنا بجا ہے کہ شاہ صاحب نے نہ صرف سندھی بولی کو اپنے کلام میں استعمال کیا بلکہ اپنے کلام کے معجزے سے سندھی بولی کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔" سندھ کے ہر خطے کی بولی پر ان کو عبور تھا حالانکہ انہوں نے عموماً اپنے کلام میں "بھٹ" والے خطے کی بولی استعمال کی ہے جس خطے میں وہ پیدا ہوئے نشوونما پائی اور بڑے ہوئے۔ سندھی بولی کے وہی لفظ اور اصطلاحات شاہ سے پہلے بھی رائج تھے مگر لطیف نے ان میں بیان کی لطافت اور معنی کی دلپذیری کا ایسا رس بھر دیا جو وہ عام کے بدلے خاص ہو گئے" [۱]

شاہ لطیف کے بعد اب تک سندھی شعر و ادب میں جو رسالو کے ذخیرہ الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی معجز بیانی سے وہ کام لیا تھا کہ ہر لفظ ایک خوبصورت نگینے کی طرح ان کے بیتوں اور وائیوں میں روح پرور معنویت کی مرصع کاری کو حسن و جمال کی ایسی دل آویزی پیدا کرتا ہے جو کسی اور شاعر و ادیب کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تو بس یہی کہا جا سکتا ہے [۲]

اے کمال سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

شاہ بھٹائی نے سندھ اور سندھ کے گرد و نواح کی عوامی بول چال سے اپنی قوتِ اظہار کو اعلیٰ تخلیقی جوہر سے اس مقام پر پہنچایا کہ خود انہیں کے الفاظ میں ابیات کے آیتوں جیسی اثر آفرینی اختیار کر لی۔

جی تو بیت پا نئیاسی آیتون آهین
نیوَ مَن لائین پریان سندی پار ڏي [۳]

رسکن نے ایسی بے پناہ قوتِ اظہار کے بارے میں ٹھیک ہی کہا ہے: "قوت اظہار کی اپج نئے الفاظ کی اختراع پر منحصر نہیں۔ وہ شخص جس میں خداداد اپج ہوتی ہے اسی طرز بیان میں لکھے گا جو اس زمانے میں رائج ہو اور اسی سے بڑا بن جائے گا۔ مگر وہ جو کچھ

---

[۱] کلیدی خطبہ شاہ لطیف کانفرنس سکھر ۱۹۸۵ء [۲] سندھی ادب کی مختصر تاریخ۔ از۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی (صفحہ ۱۳۶)

بیان کرے گا اس کو اس قدر شگفتگی سے بیان کرے گا گویا ابھی فردوس سے نازل ہوا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کے بزرگ ہمعصروں میں شاہ عنایت رضوی کا کلام سندھی شاعری میں اُن دیرینہ روایات کا امین تھا جو قاضی قادن اور شاہ عبدالکریم کے دور سے جاری وساری تھیں۔ خصوصاً سندھی بیت کو شاہ عنایت نے قبول عام کے درجے پر پہنچانے میں خاصا اہم کردار انجام دیا مگر شاہ لطیف کے کلام کی غیر معمولی شہرت اور ہمہ گیر مقبولیت کی وجہ سے اُن کے کلام کی مقبولیت اس طرح کم ہو گئی جیسے سورج کے سامنے چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ شاہ صاحب کے عقیدت مندوں اور ان کے کلام سے استفادہ کرنے والوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان میں عنایت ٹیرہ اور مدن بھگت جیسے فقیر بھی تھے جو مسائل تصوف اور سلوک کے بارے میں منظوم سوالات کرتے تھے اور بھٹ ذہنی ابیات کی صورت میں جواب دیتے تھے۔

شاہ بھٹائی کے مریدین خاص میں بھی تماچی فقیر، سالح گوہری، تمر فقیر اور کئی دوسرے فقیروں کے نام ملتے ہیں جن کے کلام پر زبان وبیان اور موضوعات شاعری کے اعتبار سے شاہ جو رسالو کے اثرات نمایاں ہیں۔

سندھی شاعری میں شاہ لطیف کے بعد لافانی شہرت و مقبولیت سچل سائیں کے حصے میں آئی۔ ان کا وقیع، متنوع اور پہلودار کلام سندھی کے علاوہ سرائیکی، اردو اور فارسی میں بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جو اپنے خوش آہنگ لہجے اور معنوی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد ہے البتہ ان کے سندھی اور سرائیکی کلام کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ لفظیات اور معنویت کی جہتوں میں سچل سائیں نے شاہ بھٹائی کے اثرات قبول کئے ہیں۔ ان اثرات کو بحیثیت مجموعی لسانی، غنائی، موضوعاتی اور اسلوبی شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہیئت، مواد اور لسانی اثر پذیری کی گہری چھاپ سچل سائیں کے کلام پر موجود ہے۔

سندھی زبان وادب کے ماہرین لسانیات شاہ جو رسالو کی زبان کو مستند تصوّر کرتے ہیں اور جو ذخیرۂ الفاظ شاہ نے اپنے کلام میں یکجا کیا ہے اس کی خوبیوں کے پیش نظر یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ صرفی نحوی اور صنعت لفظی ومعنوی کے اعتبار سے سندھی شاعری میں لفظیات کا بہترین سرمایہ شاہ کا پیام وکلام ہے۔

سچل سائیں کا لہجہ قدرے مختلف ہی سہی مگر جو زبان انہوں نے اپنے سندھی کلام میں برتی ہے اس پر شاہ جو رسالو کے اثرات کا پڑنا ایک فطری عمل ہے۔

شاعری اور موسیقی کا رشتہ شاہ لطیف کے کلام کو غنائیت کا شاہکار بناتا ہے۔ شاہ صاحب فن موسیقی پر جو عبور رکھتے تھے اس کی بدولت کلام کی روح پرور معنویت میں نغمگی کا عنصر اتنا پُر تاثیر ہے کہ چاہے ہم ان کے کلام کی تفہیم پوری طرح اپنے ذہن سے نہ کر سکیں مگر جب کوئی من موہنا بیت یا کوئی خوبصورت وائی مخصوص روایتی انداز میں گائی جاتی ہے تو اس کی بھرپور غنائیت ایک مسحور کن کیفیت طاری کر دیتی ہے۔

شاہ کی طرح سچل سائیں بھی موسیقی کے فنی آداب اور انواع واقسام سے اچھی طرح واقف تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے سندھی اور سرائیکی کلام میں نہ صرف شاہ بھٹائی کا تتبع کیا بلکہ جدت آفرینی سے سندھی موسیقی اور شاعری کے تعلق کو مزید وسعتیں عطا کیں۔

جہاں تک شاہ جو رسالو کے موضوعات کی بات ہے اس میں شک نہیں کہ ان کی تفصیلات کا کوئی جائزہ مکمل طور پر تمام تر جزئیات کا احاطہ نہیں کر سکتا تاہم تصوف کی اصطلاح

میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دائرۂ فکر میں حیات و کائنات کی جو مادی اور ماورائی توجیہات ہو سکتی ہیں شاہ کے کلام میں ان کی اَن گنت مثالیں موجود ہیں۔ کمال یہ ہے کہ دید و شنید کی ایک ایسی رنگارنگ دُنیا شاہ جو رسالو کے تمام سروں میں اپنا جادو جگاتی ہوئی نظر آتی ہے کہ بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
نظر جس شے پہ پڑتی ہے حسیں معلوم ہوتی ہے

ایک عظیم آفاقی شاعر کی حیثیت سے شاہ نے علامتی اور تمثیلی اظہار کے لئے اپنے مانوس ماحول اور سرزمین سندھ کے جغرافیائی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور عوامی زندگی کی رعنائیوں کو شاعرانہ طور پر کمالِ فن کے ساتھ برتا ہے۔

سچل سائیں کے سامنے شاہ جو رسالو کے موضوعات کی روشن مثال تھی اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے توانا اور بیباک لہجے میں اُن موضوعات سے اُس معروضیت کو تقویت دی جس کی بنا پر انہیں منصور ثانی کہا جاتا ہے۔

جتي ماڻهن ميڙ آهه، آءٌ نه تتي ناهيان
ستي ساهيان پٺيءَ شاه حلاج جي

(جہاں لوگوں کا ہجوم ہے۔ میں وہاں نہیں ہوں۔ میں تو سر بکف ہو کر منصور کی پیروی کر رہا ہوں۔)

- - - - - - - - - - -

'بیت' اور 'وائی' شاعری کی کلاسیکی اصناف ہیں۔ شاہ لطیف کے کلام نے ان دونوں ہیئتوں کو اپنی خداداد تخلیقی صلاحیتوں اور پیہم تخلیقی تجربوں سے اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔ ان کے ہمعصروں اور پھر ان کے بعد نام پیدا کرنے والے سندھی شاعروں نے 'بیت' اور 'وائی' کے ترتیبی سانچے میں کئی جدتیں اور ندرتیں پیدا کیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدتوں اور ندرتوں کے باوصف شاہ کے اختراعی اور روایتی اثرات غالب ہیں۔

شاہ کی طرح سچل سائیں کی تخلیقی صلاحیت اور وجدانی سطح بہت بلند تھی انہوں نے 'بیت' اور 'وائی' کی ہیئتوں کو ڈوھیڑوں اور کافیوں میں ایک اچھوتی طرحداری سے برتا۔ اس طرح سچل سائیں کے کلام میں سطحی تقلید اور روایتی بازگشت کی بجائے فنی ہیئتوں (Forms) کی بہت سی دل آویز صورتیں ملتی ہیں۔ انہوں نے بیت اور کافی کی ساخت و پرداخت کے فنی اسالیب میں شاہ بھٹائی کی روایت کو عصری تقاضوں کے مطابق اتنی وسعت بخشی کہ سندھی شاعری کی تاریخ میں ایک روشن اور لائقِ تحسین باب کا اضافہ ہوا

سچل سائیں کے ہمعصروں اور پھر ان کے بعد سندھی شاعری پر جو اثرات مرتب ہوئے ان میں شاہ جو رسالو کا خمیر بھی ہے اور سچل سائیں کے رسالو کی اثر پذیری بھی۔ مراد فقیر، پیر محمد راشد، صوفی دلپت، فتح فقیر، قطب شاہ، خلیفہ نبی بخش لغاری، حمل خان لغاری اور پھر فقیر بیدل اور بیکس تک شعری اصناف میں فارسی سے اخذ و قبول کے باوجود سندھی شاعری کا اصل جوہر انہیں روایات اور شعری قدروں کا مرہونِ منت رہا جو شاہ بھٹائی سے سچل سائیں تک اپنا ارتقائی سفر طے کر کے بڑی مستحکم اور دیرپا ہو چکی تھیں۔ مثلاً لفظیات کے سلسلے میں عربی، فارسی اور کئی دوسری مستعمل زبانوں سے شاہ نے سندھی زبان میں جو خوشگوار اضافہ کیا تھا اس کے زیرِ اثر آگے چل کر اخذ و قبول اور اشتراک و انجذاب کی نئی راہیں کھلیں۔

میرانِ تالپور کے عہد میں فارسی اصنافِ سخن کا فروغ اور سندھی شاعری کی روایتی ہیئتوں میں نئی نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں مگر کسی طور پر بھی شاہ جو رسالو کے اثرات ماند نہ پڑے بلکہ عہد بہ عہد ان کی ہمہ گیریت سندھی شاعری کے خاکے میں نئے رنگ بھرتی رہی۔ شاہ

کی شخصیت اور شاعری پر تحقیق کا جذبہ اور رسالو کی ترتیب و تدوین کا ذوق و شوق بڑھتا رہا۔ بیشمار قلمی نسخوں کا وجود میں آنا اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ شاہ کے بعد ان کے بصیرت افروز کلام کی اثر آفرینی میں کسی عنوان بھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ بھٹ شاہ کے علاوہ دُور دُور کے ادبی و ثقافتی مراکز میں سندھی شعر و ادب کے شائقین شاہ جو رسالو سے مستفیض ہونا اپنے تہذیبی تشخص کا ذریعہ تصوّر کرتے رہے مثال کے طور پر میر عبدالحسین سانگی کا نام لیا جا سکتا ہے جو بذاتِ خود بلند پایہ شاعر تھے اور شاہ جو رسالو سے والہانہ تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ مرزا قلیچ بیگ کا نام بھی اس سلسلے میں بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

برطانوی حکومت کے دَور میں جب طباعت کی آسانیاں ظہور میں آئیں تو شاہ جو رسالو کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۸۶۶ء میں جرمن اسکالر ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے پہلے پہل جرمنی سے چھپوا کر اسے شائع کیا۔ ڈاکٹر ٹرمپ کے مطبوعہ نسخے میں ۲۶ سروں کو شاملِ اشاعت کیا گیا تھا۔

۱۸۶۷ء میں قاضی محمد ابراہیم نے باقیماندہ سروں کا اضافہ کر کے "شاہ جو رسالو" کو بمبئی سے چھپوایا۔ ان دو اولین اشاعتوں کے بعد سے اب تک جو مطبوعہ نسخے منظرِ عام پر آئے ان کی تعداد اور نوعیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ کلامِ لطیف کی اثر آفرینی ہر زمانے میں تازہ دم رہی ہے اور ہر دور کے شاعروں نے حسبِ توفیق اس گلستانِ معنی سے خوشہ چینی کی ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے عصرِ حاضر تک "شاہ جو رسالو" کے اثرات انگریزی، فارسی، اردو، ہندی، گجراتی اور کئی دوسری زبانوں میں بھی ظاہر ہوئے۔

۱۸۹۰ء میں سندھ کے مشہور اسکالر لیلا رام وطن مل لالانی نے انگریزی میں ایک تحقیقی کتاب شاہ کی شخصیت اور شاعری پر The Life, Religion and poetry of Shah Latif کے نام سے پیش کی۔ اس کتاب نے انگریزی زبان و ادب کے حلقوں میں شاہ صاحب کا پیغام پہنچایا۔ پھر ایچ ٹی سورلے، ڈاکٹر این میری شمل، آغا یعقوب ایلسا قاضی، ڈاکٹر اکرم انصاری اور لے کے بروہی جیسے اسکالروں کے نام آتے ہیں جن کے تصنیفی کارناموں سے بین الاقوامی طور پر شاہ کی شخصیت اور شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انگریزی منظوم ترجموں کے ذریعے مغربی اسکالروں نے کسبِ فیض کیا۔

پچھلی نصف صدی اور خصوصاً قیامِ پاکستان کے بعد اردو زبان و ادب نے شاہ صاحب کی شاعری کا جو اثر قبول کیا ہے وہ بذاتِ خود ایک بھرپور مقالے کا موضوع ہے۔ اس سلسلے میں مقالات اور منظوم تراجم کی خاصی تعداد موجود ہے شاہ جو رسالو کے جستہ جستہ حصوں کے منظوم تراجم بھی ہوئے اور پورے رسالو کو بھی منظوم ترجمے کی صورت میں پیش کیا گیا۔ کچھ ایسی تصانیف منظرِ عام پر آئیں جو شاہ کی شخصیت اور شاعری کو اردو داں شاعروں اور ادیبوں سے روشناس کرانے میں پیش پیش ہیں۔

سندھی شعر و ادب اور سندھی شاعروں کے طرزِ فکر، طرزِ احساس اور طرزِ اظہار پر یوں تو ہر دَور میں شاہ کی شخصیت اور شاعری کی اثر انگیزی اپنا رنگ جماتی رہی ہے مگر موجودہ صدی میں اثرات کی نوعیت کئی جہتوں میں نمایاں ہوئی ہے اور ان جہتوں کا پھیلاؤ بھی اتنا متنوع اور ہمہ گیر ہے کہ صرف چند پہلوؤں کا بہت ہی اجمالی اور سرسری سا جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

۱۔ قومی امنگوں، حصولِ آزادی اور اپنی تہذیب و ثقافت سے گہری دلچسپی کی بناء پر سندھی زبان میں ادبی و شعری اظہار کے لئے

اُن الفاظ و اصطلاحات اور تشبیہات' استعارات اور محاورات کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کا رجحان جو شاہ جو رسالو سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ اُن اصناف شعری کو عصری تقاضوں کے مطابق برتنے کی شعوری کوششیں جو بیت اور وائی کی ہیئتوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔

۳۔ شعری مجموعوں کے نام رکھنے میں اُن لفظی مرکبات' تلمیحات اور علامات کو ترجیح دینا جو شاہ جو رسالو میں پائی جاتی ہیں۔

۴۔ فلم' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے ایسے نغموں اور گیتوں کا لکھا جانا جن کی موسیقی اور بولوں پر شاہ صاحب کے لہجے اور رنگ و آہنگ کی چھاپ ملتی ہے۔

۵۔ نئی لوک کلاسیکل شاعری میں 'شاہ جو رسالو' کے سروں سے اخذ و قبول کے رجحانات مثلاً سرکنڈا ر دسے خلیفہ نبی بخش قاسم کے کنڈا ر و اور پھر تنویر عباسی کے کنڈا ر و میں موضوعاتی لحاظ سے تو رزمیہ شاعری کا انداز قطعی مختلف ہے لیکن شاہ بھٹائی کی روایت سے اس کی پیوستگی یقینی ہے۔ اسی طرح حب وطن اور اہل وطن کی محبت کے جذبے جو جدید شاعری میں ابھرے ہیں ان میں 'شاہ جو رسالو' کے سُر مارئی' اور کئی دوسرے سُروں کی اثر انگیزی کا سُراغ ملتا ہے۔

۶۔ شاہ صاحب نے سندھ اور گرد و پیش کی عوامی کہانیوں سے جو کردار اپنے مخصوص علامتی اظہار اور روحانی ایمائیت پیدا کرنے کے لئے اجاگر کئے عصرِ حاضر کے کئی سندھی شاعروں کے کلام میں ان علامات کو نئی حسیت اور زندگی کے نئے تناظر میں برتا گیا ہے۔

۷۔ 'شاہ جو رسالو' میں مقامی رنگ آمیزی اور جغرافیائی و تاریخی شعور و آگہی کی جو فضا بڑے جزیاتی تنوع کے ساتھ ابھرتی ہے سندھی شاعری کے جدید پیکر میں حسب توفیق ان کو سمونے کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

۸۔ موجودہ دَور میں سندھی شاعری کی تحقیق و تنقید پر جہاں ایک طرف عالمی اور عصری ادب کے نئے نئے رجحانات و میلانات اثر انداز ہو رہے ہیں وہاں لسانی' موضوعاتی اور عروضی سطح پر اپنی کلاسیکی شاعری کے حوالے سے 'شاہ جو رسالو' کو ایک ایسے علمی و ادبی' تہذیبی و ثقافتی اور تمدنی و معاشرتی گنجینۂ معنی کے طور پر قبول کیا گیا ہے جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

۹۔ سندھی ادبی بورڈ' انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی اور کئی دوسرے اداروں کی طرف سے جو مطبوعات منظرِ عام پر آئیں اور تحقیق و تجسس کے نتیجے میں جس ادبی و ثقافتی ورثے کو محفوظ کیا گیا اس میں نمایاں حصہ شاہ کی شخصیت اور شاعری سے تعلق رکھتا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بھٹ دھنی نے عالم انسانیت کے لئے عموماً اور سرزمین سندھ کے لئے خصوصاً جو انمول تہذیبی خزانہ چھوڑا تھا وہ آج کے دَور میں بھی بہت پُرکشش اور دل آویز ہے۔

شاہ صاحب کے جستہ جستہ بیتوں کو رنگوں کی شاعری یعنی پینٹنگ کی صورت میں پیش کرنے کا ذوق و شوق سندھی مصوّروں میں دِن بدن بڑھ رہا ہے اس سلسلے میں ظفر کاظمی اور کئی دوسرے ممتاز مصوّروں کے شاہکار لائق تحسین ہیں۔

ان معروضات کے آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ شاہ لطیف کے بعد شعر و ادب اور متعلقہ فنون پر ان کی شخصیت اور شاعری کے جو اثرات پڑے ہیں اُن کی تحقیق کا کوئی ایسا مبسوط اور مربوط کارنامہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ ایک تحقیقی موضوع ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عارفہ فرید

# اُردو زبان اور پاکستانی کلچر

کسی قوم کے مزاج کو سمجھنے میں اس کی زبان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ زبان کلچر کی بعض روایات کی ترجمان ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان اور اس کے برتنے والے کے مزاج میں عام طور پر ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اردو زبان کا مزاج بھی اس کے برتنے والوں کے مزاج سے خاصہ ہم آہنگ ہے۔ اردو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جن مسلمانوں نے ہجرت کی وہ زیادہ تر کراچی حیدر آباد' سکھر لاہور اور اس قسم کے بڑے شہروں میں آکر بس گئے۔ دارالخلافہ کی تبدیلی کے بعد اسلام آباد میں بھی اردو بولنے والے کثیر تعداد میں پہنچ گئے۔ پنجاب' بلوچستان سندھ' سرحد میں علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ اردو بھی بولی سمجھی اور لکھی جاتی ہے۔ اردو نہ صرف پاکستان کی قومی یا سرکاری زبان ہے بلکہ اس کو تمام صوبوں نے ایک نمائندہ زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے اور اسی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ "پاکستانی کلچر کی تعمیر میں زبان کا حصہ" کے باب میں' میں نے خاص طور پر اردو زبان ہی کے مزاج اور روایت کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ پاکستان میں اردو زبان میں خاصی تبدیلی آئی ہے عام بول چال میں تو یہ تبدیلی حیرت انگیز ہے اس کے محاورہ' طرز ادائیگی' جملوں کی ساخت وغیرہ ہندوستان میں بولی جانے والی اُردو سے مختلف ہے۔ پاکستان میں یہ زبان چاروں صوبوں مقامی لہجہ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اور روزمرہ کے بعض الفاظ بھی ایک صوبے سے دوسرے صوبہ میں مختلف ہیں۔ لیکن کراچی' سکھر' حیدر آباد' اسلام آباد وغیرہ میں جہاں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے بولنے والے کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ اردو کی روزمرہ دوسرے صوبوں کی اردو سے علیحدہ پہچانی جاتی ہے۔ اگر میں ان علاقوں میں بولی جانے والی روزمرہ زبان کو پاکستانی اردو کی "نمائندہ روزمرہ" کا نام دوں تو اتنا غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ چاروں صوبوں کے ریڈیو' ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اسی زبان کا عکس نظر آتا ہے۔ اردو کی اس نمائندہ روزمرہ کا ہندوستان کی روزمرہ سے مقابلہ کریں تو فرق محسوس ہوگا۔ وی سی آر کی فراوانی کی وجہ سے ہندوستان کی اردو فلمیں بکثرت پاکستان میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کے ٹائیٹل پر زیادہ "ہندی" درج ہوتا ہے۔ لیکن اگر معاشرت مسلمانوں کی دکھائی ہو تو شاید کبھی "اُردو" بھی درج ہوتا ہے۔ بہرصورت یہاں اُردو جملوں کی ادائیگی محاورات' برجستہ فقرے وغیرہ مختلف ہیں۔ تحریری ادب میں پاکستان کے چاروں صوبوں میں معیار تقریباً ایک جیسا ہے اور وہ علاقائی رنگ سے پاک ہے۔ لیکن پاکستان اور ہندوستان کی ادبی اور تحریری اردو میں فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ البتہ فی الحال میں اس بحث کو زیادہ طول نہیں دوں گی اور اس اقرار کے بعد کہ پاکستان کی روزمرہ میں خصوصیات

---

(نوٹ ۔ ادارے کو اس مقالے کے بعض مندرجات سے اتفاق نہیں ہے)

کے ساتھ تبدیلی آئی ہے۔ اپنی بحث کا رخ اس مسئلہ کی طرف موڑنا چاہوں گی کہ

"پاکستانی اُردو پاکستانی کلچر کی کس حد تک نمائندگی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ ایک عام پاکستانی کے مزاج یا ذہنیت کو سمجھنے میں کس حد تک مدد مل سکتی ہے۔"

اردو زبان جیسا کہ ہم سب یہ جانتے ہیں سنسکرت ہندی، تامل، عربی، فارسی، انگریزی سے مل کر بنی ہے اور یہ لشکری زبان ایک کاسموپالیٹین مزاج کی مظہر ہے۔ اور شہری اور دیہاتی زندگی دونوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ یہ ایک دیہاتی کے جذبات اور احساسات اور خیالات کے اظہار پر اسی طرح قادر ہے جس طرح ایک شہری کے۔ اس میں دونوں کے مزاج اور ذہن کا خاکہ ملتا ہے۔ اردو کی بعض روایات قابلِ غور ہیں جو اس کلچر کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں

تذکیر و تانیث کی روائتیں :۔

اردو زبان میں حقیقی مذکر جانداروں میں سے بیشتر ایسے جانور جو قوت کے مظہر ہیں، مذکر سمجھے جاتے ہیں۔ طاقتور اور خونخوار درندے مثلاً "چیتا"، "بھیڑیا" "بھالو" "اژدہا" مذکر ہیں۔ خود لفظ "جانور" مذکر ہے۔ جبکہ نسبتاً کمزور جانور یا مظلوم جانور مثلاً "بھیڑ" "چھچھوندر" "چھپکلی"، "گائے" "مکھی" وغیرہ مونث تصور کی جاتی ہیں۔ طاقت کا سب سے عظیم سرچشمہ "خدا" بھی مذکر ہے اور منفی قوت کی علامت "شیطان" بھی مذکر ہے۔ اسی طرح فطرت کے طاقتور مظاہر مثلاً "آسمان" "سورج" "چاند" "ستارے" "پہاڑ" "دریا" "سمندر" مذکر ہیں۔ زبان کو یہ روایت ایک ایسے معاشرہ کی عکاسی کرتی ہے جس میں مرد قوت کی علامت ہے، اور عورت نزاکت، لطافت یا کمزوری کی۔ عورت قوت کے بل بوتے پر فائدہ یا ضرر پہنچانے سے قاصر ہے۔ البتہ "نیکی" بدی، چالاکی ہمدردی قربانی یا نرمی کے ذریعہ اپنا منشا پورا کر سکتی ہے۔ یہ ساری صفات مونث ہیں۔ چند نازک اور خوبصورت پرندے مثلاً "فاختہ" "بلبل" "مینا" مونث ہیں اور بد صورت پرندے مثلاً "کوا" مذکر ہے۔ "ہوا" "شبنم" "نسیم" "صبا" مونث ہیں اور عورت کی لطافت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ "زمین" بھی مونث ہے۔ یہ عورت کے تخلیقی عمل کی علامت ہے زمین کو ماں کی گود سے بھی تشبیہہ دی جاتی ہے جو بچے کی پرورش اور نشوونما کی ذمہ دار ہے۔ ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اُس کی گود میں بچہ پرسکون رہتا ہے۔ زمین کی گود بھی پرسکون ہے یہ پہاڑ، دریا اور سمندر کی طرح غیر محفوظ نہیں۔ اور بچے کو اس سے خوف نہیں آتا۔ البتہ جب زمین کے اندر دباؤ کی وجہ سے لاوا پھٹتا ہے تو بھونچال آ جاتا ہے۔ تب کہتے ہیں زمین نگل گئی۔ تذکیر و تانیث کی یہ روائتیں اردو بولنے والوں اور پاکستانیوں کی سوچ کی ایک جھلک ہیں۔ اب غور کیجیے ان الفاظ پر "قوت" اور "طاقت" "پستی" "ہمت" "صداقت" "غیرت" "محنت" "قدرت" یہ سب صفات ہیں اور فرد کی بالقوی حالتیں ہیں۔ یہ علامتیں مونث ہیں۔ کیونکہ مستور اور غیر تکمیل شدہ حالتوں کو ظاہر کرتی ہیں جبکہ انہی کی بالمقابل حالتیں اور مظاہر مذکر ہیں۔ چنانچہ صداقت "مونث" ہے تو "صادق"، مذکر شجاعت مونث ہے تو "شجاع" مذکر اسی طرح "قوت" اور "قوی" "قدرت" اور "قادر" "ندرت" اور "نادر" "غیرت" اور "غیور" "ہمدردی" اور "ہمدرد" "نیکی" اور "نیک" "بدی" اور "بد" "سچائی" اور "سچ" "چالاکی" اور "چالاک" "مکاری" اور "مکار" وغیرہ پاکستانی معاشرہ میں عورت کو "مستور" سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ بشریت میں مرد سے کمتر اور کسی قدر غیر مکمل۔ مرد درجۂ کمال کے لحاظ سے عورت سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ اُردو بولنے والوں کی یہی سوچ تذکیر اور تانیث کی روایتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

---

## مہمل اور ہم معنی الفاظ کا مکرر استعمال

مہمل الفاظ کا استعمال اُردو کی ایک دوسری اہم روایت ہے۔ "چائے وائے" "دانہ دُنکا" "پانی وانی" "ذات پات" یا پھر ملاحظہ ہوں ہم معنی الفاظ جو اکثر ایک ہی جملے میں استعمال ہوتے ہیں "لطف و کرم" "رنج و الم" "شعر و سخن" "شرافت و نجابت" "جاہ و حشمت" "شان و شوکت" "مال و زر" "حیلہ بہانہ" "عجز و انکسار" وغیرہ یا پھر ملاحظہ ہو ایک ہی لفظ کا جملے میں دوبار استعمال "جستہ جستہ" "خاص خاص" "روز روز" "باری باری" "الگ الگ" "چیدہ چیدہ" "صاف صاف" کیا زبان کی یہ روایت یہ ظاہر نہیں کرتی کہ اس کو برتنے والے گفتگو میں طوالت پسند ہیں؟ تحریر اور تقریر میں بھی یہی کیفیت ہے بات کی وضاحت کے لئے مکرر بیان ایک عام عادت ہے۔ اساتذہ کے عام مشاہدہ کی بات ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کے مختصر اور جامع جواب دینے کے مقابلے میں طویل جواب دینا پسند کرتے ہیں اور ایک ہی بات کئی بار دہراتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح وہ استاد کو زیادہ متاثر کرسکیں گے اور اچھے نمبر حاصل کرسکیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی یہ توقع زیادہ غلط بھی نہیں واقعی طویل جواب لکھنے والے اچھے نمبر حاصل کرلیتے ہیں خواہ وہ ایک بات مکرر بیان کریں۔ اس کے برعکس امریکہ میں طلبہ وطالبات نہایت مختصر جواب لکھتے ہیں۔ اگر طالب علم ذہین اور مضمون سے واقف ہے تو تمام اہم نکات کو مختصراً بیان کر دے گا۔ اگر اسے جواب یاد نہیں تو مختصراً جو بات یاد ہے وہ لکھ دے گا۔ لیکن مکرراً ایک ہی بات لکھنے سے گریز کرے گا۔

مکرر بیان اور اظہار میں طوالت پسندی کی روایت کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ پاکستانیوں کے مزاج میں "پراسراریت" نہیں اور وہ جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار کو پسند کرتے ہیں اور اس پر قدرت رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات اظہارِ خیال کے جوش میں قطع کلام سے بھی باز نہیں آتے۔ دوسرے کی بات توجہ سے نہ سننا اور اپنی دہرانا ایک عام روایت ہے جو صرف جہلا کے یہاں نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ شاید بچپن اور لڑکپن میں اظہار کے زیادہ مواقع نہیں ملے۔ والدین، بزرگوں اور اساتذہ کا احترام لازم تھا چنانچہ بالغ عمری میں اس گھٹن کے ردعمل کے طور پر جہاں کہیں موقع ملا پرجوش اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

زبان کے ذریعہ جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار کی عادت کی بناء پر گرمجوشی اور ملنساری بھی پاکستانی کلچر کی ایک نمایاں صفت ہے۔ امریکی سفارت خانے کے ایک سابق نائب قونصل نے جو گذشتہ ۱۵ سال سے جنوب مشرقی ایشیاء کے گردونواح میں قیام پذیر تھا مجھے بتایا کہ وہ پاکستانیوں کی جلد گھُل مِل جانے کی عادت سے بہت متاثر ہے۔ جس کی وجہ سے ان سے دوستی کرنا بہت آسان ہے۔ نائب قونصل کا کہنا تھا کہ اس کا مشاہدہ ہے کہ پاکستانیوں کے دوستانہ رویہ کے پیچھے کوئی خاص مطلب یا غرض نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ دو چار دفعہ کی ملاقات ہی کو وہ دوستی پر محمول کر لیتے ہیں۔ اور توقعات وابستہ کرنے لگتے ہیں اور اپنے غیر ملکی دوست سے کام نکالنا ہے تو اس کے اظہار میں جھجکتے نہیں اور توقع کرلیتے ہیں کہ ان کا کام کردیا جائے گا۔ جبکہ ایک امریکی دوسرے امریکی دوست سے کسی قسم کی درخواست کرنے سے قبل کافی سوچ بچار کرلیتا ہے اگر مراسم گہرے نہ ہوں تو کسی کام کی سفارش نہیں چاہے گا۔

## ہندی، فارسی اور عربی ترکیبیں

عام بول چال میں ہندی ترکیبوں کو ترجیح دی جاتی ہے جبکہ علمی اور ادبی گفتگو میں فارسی اور عربی ترکیبوں کا استعمال رائج ہے۔ مثلاً عام گفتگو کا ایک فقرہ یوں ہے "میں بھول گیا"

تو علمی گفتگو میں بھول کی جگہ لفظ "سہو" کو ترجیح دی جائے گی۔ عام بول چال میں ایک جملہ اگر یوں ادا ہوگا کہ "جان بوجھ کر ایسا نہ کرو" تو مہذب گفتگو میں "جان بوجھ" کی جگہ "قصداً" لے لیگا۔ علمی گفتگو میں الفاظ کے انتخاب میں یہ احتیاط اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اردو زبان کے بولنے والوں کی عام زندگی ہندو کلچر سے متاثر ہو رہی ہے چنانچہ ایک عام پاکستانی اور ہندوستانی کی روز مرہ کی بود و باش میں نمایاں فرق نہیں۔ مذہبی روایتوں کے سوا بیشتر روایتیں ملتی جلتی ہیں لیکن اردو زبان کے بولنے والے خصوصاً پاکستانی عربی اور فارسی کلچر کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کی زبانوں سے بھی خاص محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی مذہبی برادری سے تعلق رکھتے ہیں یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک عام پاکستانی اپنے شجرۂ نسب کو عربی یا ایرانی خاندان سے ملانے میں زیادہ فخر محسوس کرے گا بنسبت اس کے کہ اس کا تعلق کسی ہندو ذات یا برادری سے ثابت ہو۔ رسمی اور مہذب ماحول میں وہ عربی اور ایرانی روایت کو برتنا زیادہ پسند کرے گا بہ نسبت ہندوستانی روایت کے۔

## تخاطب میں مراتب کا لحاظ

اردو زبان کی ایک اہم روایت جو پاکستانی کلچر کی عکاسی کرتی ہے۔ مخاطب کے مراتب کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال ہے۔ "تو" کا استعمال کم حیثیت ملازموں اور بے تکلف دوستوں تک ہے۔ بعض غیر تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کو بھی "تو" کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ "تم" ہم عمروں، دوستوں، بچوں، شاگردوں اور چھوٹوں کے لئے مخصوص ہے۔ "آپ" والدین، اساتذہ، بزرگوں، اجنبیوں یا ایسے اصحاب کے لئے ترجیحاً استعمال ہوتا ہے جن سے رسمی ملاقات ہے یا زیادہ بے تکلفی نہیں ہے۔ جناب اور حضور انگریزی کے "سر" کے ہم معنی ہے "حضور والا" "عالی جناب" قسم کے القاب اب پاکستانی گفتگو میں کم ہی استعمال کرتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل ان کو خصوصاً تحریر میں ترجیح دی جاتی تھی۔

زبان کی یہ روایت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پاکستانی کلچر میں لوگوں میں مراتب کے لحاظ سے فرق کیا جاتا ہے۔ اقتصادی طبقہ بندی کے علاوہ عمر اور تکلفات کی بنا پر بھی ادب اور احترام کی روایتیں موجود ہیں۔ مثلاً بچوں اور بزرگوں میں حیثیت یا نسب کا فرق نہیں بلکہ عمر کا ہے۔ دوستوں یا اجنبیوں یا رسمی ملاقاتیوں میں فرق اقتصادی حیثیتوں کا نہیں بلکہ تکلفات ہے۔ البتہ گھریلو ملازمین اور ہاتھ سے کام کرنے والے طبقے کے لوگوں اور صاحب نصاب افراد میں فرق حیثیت کا ہے اور تخاطب کے آداب اور القاب اسی کی مناسبت سے ہیں۔ تاہم ان میں بھی اب تبدیلی آئی ہے۔ پاکستان کے پڑھے لکھے اور مہذب گھرانوں میں ملازموں، بڑھئی، موچی، نان بائی اور اسی قسم کے طبقوں کے لوگوں کو بھی اب "تم" اور "تو" کہنے کی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح حکومت میں کمتر درجہ کے ملازمین بھی اب اپنے اعلیٰ عہدوں پر فائز ملازمین کے ساتھ تخاطب میں ایسی خاکساری کا مظاہرہ نہیں کرتے جتنا تقسیم ہند سے پہلے کرتے تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں میں بھی عزت نفس بڑھی ہے۔ شہر میں بسنے والے نچلے درجہ کے ملازمین میں بھی اب یہ شعور بڑھ رہا ہے کہ انہیں اعلیٰ سرکاری اور غیر سرکاری عہدہ داروں سے بہت زیادہ دبنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کارکردگی اچھی رہی تو انہیں اگر کسی ملازمت سے چھٹی بھی مل گئی تو ملازمت کہیں اور بھی مل سکتی ہے۔ اس طرح مزدور طبقہ میں یہ احساس بھی جاگ رہا ہے کہ ہم اپنی محنت کی روٹی کماتے ہیں پھر بلا وجہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی ضرورت نہیں

اسی سلسلہ کی ایک اور روایت یہی ہے کہ جس طرح ایک خاندان کے افراد ایک دوسرے کو مخاطب کرتے وقت عمر اور مراتب کا لحاظ

رکھتے ہیں۔ اسی طرح اس خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے افراد بھی اس خاندان کے افراد کو مخاطب کرتے وقت وہی القاب استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً سلیم اگر "سعید بھائی" کا دوست ہے تو سعید کے چھوٹے بھائی بہن اسے "سلیم بھائی" پکاریں گے۔ جبکہ والدین "سلیم بیٹا" کہیں گے۔ اسی طرح بہن کی سہیلیاں اگر بڑی ہیں تو "شازیہ آپا" "طلعت باجی" پکاری جاتی ہیں۔ ورنہ "منی" "بے بی" وغیرہ۔

خاندان اور دوستوں کے حلقوں سے باہر بھی اس روایت کی توسیع نظر آتی ہے۔ چنانچہ اجنبیوں کو بھی "بھائی" "بھیا" "چچا" "اماں" "خالہ" "آنٹی" "بڑے میاں" کہہ کر پکارنا عام سی بات ہے۔ یہ روایت اسلامی تہذیب کا ورثہ ہے۔ جس میں قوم کو ایک برادری تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس روایت کے بعض پہلو بڑے دلچسپ ہیں مثلاً عمر رسیدہ عورت کو اجنبی نوجوان عورت یا مرد "خالہ" کہہ کر بلاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں لیکن "پھوپھی" کہنے کا کوئی رواج نہیں۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ چونکہ خالہ ماں کی بہن ہوتی ہے لہٰذا اس رشتہ کو افضل سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ پیار محبت، رواداری کی توقع کی جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے "ماں مرے تو خالہ کا گھر" گویا ماں کے بعد سب سے زیادہ ہمدرد خالہ ہے۔ پھوپھی کی محبت پر شاید کسی کو یقین نہیں لہٰذا کوئی اجنبی کسی غیر عورت کو "پھوپھی" کہہ کر مخاطب نہیں کرے گا لہٰذا پھوپھی بے چاری صرف اپنے اصلی بھتیجے یا بھتیجی کی ہی پھوپھی ہوتی ہے۔ یا اس کے چند قریبی دوستوں کی۔ گھر سے باہر اس کی کوئی مشفقانہ حیثیت نہیں۔ یہی حال چچا کے مقابلے میں ماموں کا ہے۔ گھر سے باہر بہت لوگ اسے "چچا" کہیں گے بشرطیکہ اسکے کنپٹی کے بال سفید ہو گئے ہوں۔ لیکن "ماموں" کوئی نہیں کہے گا۔ شاید ماموں کی محبت بھی چچا کے مقابلے میں کمتر سمجھی جاتی ہے۔ ماموں اور پھوپھی کے ساتھ یہ ترجیحی سلوک معاشرہ کی اس روایت کی نشاندھی کرتی ہیں جس کے مطابق باپ کے بعد چچا اور ماں کے بعد خالہ جگہ لیتی ہے۔ گو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد اکثر چچا جائداد پر قبضہ کر کے بچوں کو در بدر کر دیتے ہیں اور ماں کے مرنے کے بعد بعض اوقات پھوپھی ہی اُن کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے کیونکہ اپنے سسرال کے گھریلو مسائل میں الجھ کر خالہ بہن کے بچوں کو کبھی کبھی بالکل فراموش کر دیتی ہے۔ اردو زبان میں ایسے ماموں اور پھوپھیوں کی تحسین و آفرین کے لئے جو بُرے وقت میں کام آئے کوئی مخصوص محاورے یا الفاظ نہیں۔ ایک مشہور محاورہ "ماں بیٹی ایک ذات پھوپھی بھتیجی دو ذات" قابل غور ہے۔ اس محاورے کا موجد کون ہے؟ ماں یا پھوپھی؟ اگر ماں ہے تو اغلب ہے کہ یہ بیٹی کی بد عادتوں پر طنز ہے۔ ماں ایسے موقعوں پر سمجھتی ہے کہ بیٹی پھوپھی کی خصلت پر جا رہی ہے۔ اگر اس محاورہ کی موجد پھوپھی ہے تو غالباً یہ ماں پر ناز ہے۔ پھوپھی اپنی بھابھی سے فخریہ کہہ رہی ہے کہ تم مجھے خواہ کچھ سمجھو۔ اور اپنے آپ کو کتنا ہی برتر جانو۔ تمہاری بیٹی کی اور میری ذات ایک ہے۔ اور ہم ایک ہی خاندان کی کہلائیں گی جبکہ تم دوسرے کی ہو۔

"تمہارے چچا کا گھر ہے؟" "تمہاری خالہ کا گھر ہے؟" قسم کے طنزیہ جملے بھی چچا اور خالہ کی فضیلت اور ان سے توقعات کے ترجمان ہیں۔ لیکن ماموں اور پھوپھی سے لوگوں کی توقعات کچھ کم ہی وابستہ ہیں۔ ماموں کا راگ تو صرف بیچاری ماں الاپتی ہے جو اپنے بھائی کے گھر کو ہر مشکل کا حل سمجھتی ہے۔ جس کی طرف سسرال والے کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ ماموں کی حیثیت سمٹ کر ایک خیالی فرد کی سی رہ جاتی ہے۔ جیسے "چندا ماما" پھوپھی تو اس سعادت سے

بھی محروم ہے۔ آج تک پھوپھی کی یاد میں گایا ہوا کوئی گیت میرے
نہیں سنا نہ ہی کسی روایت یا لوک کہانی میں پھوپھی نجات کا ذریعہ بنی
ایک دوسری روایت گھریلو ملازمین کے القاب سے متعلق
ہے۔ گھروں میں کام کرنے والی غیر مستقل ملازمائیں "ماسی" کے
لقب سے پکاری جاتی ہیں۔ "ماسی" کے معنیٰ "خالہ" کے ہیں۔ آج
سے تین چار عشرہ قبل صرف عمر رسیدہ خواتین ہی گھروں میں برتن
کپڑے دھونے اور صفائی کی غرض سے آتی تھیں نوجوان خاتون
خانہ احتراماً انہیں "ماسی" پکارتی تھیں۔ نام لیکر پکارنا معیوب
سمجھا جاتا تھا لیکن اب "ماسی" کی اصطلاح اتنی عام ہو گئی کہ
ہم عمر اور بعض اوقات عمر میں چھوٹی ملازمہ کو بھی ماسی پکارنے
کا رواج پڑ گیا۔

اس کے برعکس کسی ہمسائی کو کوئی دوسری ہمسائی
"آپا" بھی کہے تو شامت آجاتی ہے۔ ماسی بے چاری کیا قیامت
ڈھا سکتی ہے۔ لہٰذا خاموشی سے اس نے یہ لقب قبول کر لیا ہے
مرد ملازم اگر عمر رسیدہ ہو تو "چچا" یا "بابا" کہلاتے ہیں ورنہ
نام سے پکارے جاتے ہیں البتہ خاتون ملازمہ کو صاحب خانہ نام
سے پکارنے سے گریز کرتا ہے۔ کیونکہ عموماً کسی مرد کا عورت کو
نام سے پکارنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نام سے پکارنا بے تکلفی
ظاہر کرتا ہے اور صاحب خانہ کا ملازمہ سے بے تکلف ہوتے کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ بھی اسے "ماسی" کہنے ہی میں
اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

## انگریزی الفاظ کا استعمال

پاکستانی اردو میں اور زبان کے واسطے کلچر میں ایک
نمایاں تبدیلی انگریزی کے زیر اثر آئی۔ قیام پاکستان کے بعد
بے شمار پاکستانیوں نے تعلیم اور اقتصادی مواقع حاصل کرنے کی غرض
سے انگلستان، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں نقل مکانی کی ان میں
سے بعض نے وہاں مستقل رہائش اختیار کی اور بعض اقتصادی اور
تعلیمی اغراض پوری ہونے کے بعد پاکستان واپس آگئے۔ پاکستان
میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما ہالوں میں انگریزی فلمیں بکثرت دکھائی
جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر انگریزی میں تبصرے بھی
ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں۔ انگریزوں نے بھی اس برصغیر
پر سو سال حکومت کر چکا تھا اور انگریزی زبان سے بھارت اور
پاکستان کے باشندے پہلے ہی مانوس تھے۔ پاکستان میں اب تک
اردو کے ساتھ انگریزی بھی ذریعہ تعلیم ہے۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے
تو صرف انگریزی کے بل بوتے پر چل رہے ہیں۔ کیونکہ اردو میں اعلیٰ
نصابی کتابیں موجود نہیں۔ ابتدائی اور ثانوی درجوں تک تعلیم دینے
والے انگریزی میڈیم اسکول کثرت سے موجود ہیں ان حالات میں
انگریزی الفاظ کا اردو میں شامل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانوں میں تو خصوصاً "بچے" بڑے
گفتگو میں انگریزی الفاظ کا استعمال بکثرت کرتے ہیں۔ خالص اردو
سیکھنا اور بولنا اب صرف ادبی اور علمی حلقوں کی روایت ہے۔
خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانوں کے بچوں کے لئے اب انگریزی الفاظ کی
ملاوٹ کے بغیر اردو بولنا تقریباً ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ملاحظہ
ہوں چند انگریزی کے الفاظ اور فقرے۔

"DUMMY"، "VOW"، "GREAT"، FANTASTIC"، "SORRY"، "PLEAS"، "SHUT"، "NUT" "REALY"، "NOT AT ALL" "BLIVE ME"، "I SWEAR" "MIND YOUR BUSINESS"، "FOR HEVEN'S SAK"، "GOOD HEAVENS"، "I AM FINE"، THANK YOU"، "MIND YOUR LANGUAGE."

وغیرہ۔ یہ اور دیگر برجستہ فقرے اب خوشحال گھرانوں کی اُردو روزمرہ کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔

حسینہ معین اپنے ڈراموں میں ایسے تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانے کے نوجوانوں کی زبان، بود و باش، احساسات اور توقعات کی بڑی خوبصورت عکاسی کرتی ہیں۔ ان برجستہ انگریزی فقروں کی وجہ سے ایک غریب اور کم حیثیت نوجوان (عورت یا مرد) اور ایک خوشحال گھرانے کے فرد میں با آسانی فرق کیا جاسکتا ہے۔

ان برجستہ انگریزی الفاظ اور فقروں نے جہاں نوجوانوں کی اردو کو ایک خوبصورت رخ دیا ہے۔ وہاں ان کی وجہ سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو اب دو طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ "کلچرڈ" طبقہ جو انگریزی الفاظ کے استعمال پر قادر بھی ہے اور مجبور بھی۔ دوسرا "ان کلچرڈ" طبقہ جو انگریزی الفاظ یا فقروں کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا اور سیدھا سادہ اردو کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے

انگریزی کے فقروں اور جملوں کے غیر محدود استعمال سے اب ہمارا نوجوان "کلچرڈ" طبقہ ایک مشکل صورتحال سے دوچار ہے یعنی اب سیدھی سادھی اردو میں چار جملے لگاتار بولنا تقریباً ناممکن سا ہوتا جارہا ہے۔ اگر بمشکل دو جملے اردو میں ادا ہوئے تو تیسرا جملہ لازماً انگریزی میں ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان "کلچرڈ" نوجوانوں کو یقین ہی نہیں کہ وہ کس زبان میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ بار بار انگریزی سے اردو اور پھر اردو سے انگریزی کی طرف پلٹنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نوجوان صحیح طور پر اپنا ثقافتی تشخص نہیں کر پا رہے اور اپنے کلچر کے معاملہ میں بے یقینی کا شکار ہیں آج سے بیس تیس برس پہلے یہ صورت حال نہ تھی۔ اس وقت پاکستان میں تعلیم یافتہ حلقوں میں دو رجحانات تھے۔ یا تو مکمل طور پر انگریزی بولنا یا اُردو روزمرہ بولنا۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے پڑھے ہوئے نوجوان عام طور پر انگریزی میں گفتگو کو ترجیح دیتے تھے جبکہ اردو ذریعہ تعلیم کے تحصیل یافتہ اردو میں گفتگو کرتے تھے۔ لیکن انگریزی سے اُردو کی طرف پلٹنا اور پھر اُردو سے انگریزی کی طرف پلٹنے والی صورت حال نہ تھی۔

پاکستان میں درمیانہ عمر کے لوگوں، بزرگوں اور سنجیدہ طبقہ میں جو تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزی اور اُردو کے درمیان جدوجہد کی یہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ غالباً سنجیدہ عمر کو پہنچنے کے بعد لوگ کسی حد تک اپنا قومی تشخص کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور اپنی ثقافت سے متعلق خود اعتمادی بھی پیدا ہو جاتی ہے اِکا دُکا انگریزی فقرے یہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن مکمل بیچارگی کی کیفیت نہیں نظر آتی۔

## علاقائی زبانوں کے الفاظ کا استعمال

پاکستانی کلچر میں ایک نمایاں تبدیلی اُردو زبان میں علاقائی زبان کے الفاظ کے شمول سے آئی بے شمار پنجابی، سندھی، بلوچی، سرائیکی اور پشتو الفاظ اردو زبان کا حصہ بن گئے۔ ملاحظہ ہوں چند الفاظ۔

"لشکارہ" (چمک) "سائیں" (صاحب، جناب) "شاوا" (کلمہ تحسین) یہ اب اردو روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ بعض الفاظ کے تو معنی ہی بدل گئے۔ "بندہ" کے معنی اردو میں غلام یا فدوی کے ہیں پنجابی کے زیر اثر اب یہ فرد یا شخص یا "آدمی" کے لیے بولا جاتا ہے۔ گو پرانے معنی بھی قائم ہیں

ٹیلی ویژن پر جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اب ان میں "ق" کی حلق سے ادائیگی پر کوئی زور نہیں اور "ق" اور "ک" کے فرق کے مٹ جانے کو ذہنی طور پر قبول کر لیا گیا ہے "میں نے کرنا ہے" یا "میں نے جانا ہے" اب غلط العام فصیح کے مصداق اردو کا حصہ بن گئے ہیں۔ "لڈی" "بھنگڑا" "ہو جمالو" جیسے الفاظ صرف

اُردو زبان کا حصّہ ہی نہیں بنے بلکہ شادی بیاہ کے موقعوں پر لڑکیاں بالیاں گھروں میں بھی رقص کرکے ہلّا گُلّا کرتی ہیں "اجرک" اب صرف اردو زبان کا حصّہ ہی نہیں بلکہ اجرک پہننے کا رواج بھی عام ہو گیا ہے اسی طرح "رلی" نے اردو کے ذخیرۂ الفاظ ہی میں اضافہ نہیں کیا بلکہ "رلی" گھروں میں سجاوٹ کے لئے بھی استعمال ہونے لگی۔

کسی بھی معاشرہ میں زبان کا لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے میں اہم حصّہ ہوتا ہے۔ اگر اردو زبان نے علاقائی زبانوں کے الفاظ قبول کرلئے تو یہ خوش آئند بات ہے۔ اس کے اثر سے علاقائی تعصب کم ہوسکتا ہے اور قومی یکجہتی کا احساس بڑھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اظہار کے لئے پیرائے پیدا ہوسکتے ہیں۔

اردو زبان کی جن روایات کا میں نے ذکر کیا اس سے میرا مقصد ایک عام پاکستانی کے ذہن کی عکاسی کرنا تھا۔ اس زبان کی اور بہت ساری روائتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ زبان اپنا ایک علیحدٰہ مقام رکھتی ہے۔ اور جن سے لسانیات کے ماہرین بحث کرتے ہیں۔ یا جن سے فہمیات کے طالب علموں کو دلچسپی ہوسکتی ہے۔ میں نے جن روایات کا ذکر کیا ان کی تحلیل سے میرا مقصد محدود دائرے میں کلچر کا ایک تنقیدی جائزہ لینا تھا۔ تاہم میں نے حتی الامکان بالواسطہ تنقید سے گریز کیا۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ تحلیل بجائے خود تنقید کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ جس سے کسی بھی معاملے کے حسین اور قبیح پہلو خود بخود اجاگر ہو جاتے ہیں۔

منظور حسین شور

# رُباعیات

سُورج کی گرہ رات کے ناخن سے نہ کھول
صبحوں کے اُجالے میں سیاہی مت گھول
اک جرم ہے اظہار صداقت میں دروغ
میزانِ سیاست میں رسالت کو نہ تول

(۲)

صابون سے دُھلتا نہیں رخسار کا رنگ
سونے کے مُلمّع سے بدلتے نہیں سنگ
سیتی ہے نبوت جو شریعت کا لباس
وہ قامتِ بوجہل پہ ہو جاتا ہے تنگ

(۳)

یوں جان کے ساکت تو نہ رہنا ہوگا
سچ کی بھی کڑی چوٹ کو سہنا ہوگا
عرفان محمد ہو تو سب سے پہلے
بوجہل کو بوجہل بھی کہنا ہوگا

(۴)

انسان سے اِنساں ہے جہاں گرم ستیز
ہر سانس ہلاکت کا ہے اِک شعلۂ تیز
ہونے کے لئے خاک سے دو انچ بلند
کرتا نہیں لاشوں پہ بھی چلنے سے گریز

حیواں کو بھی آداب سکھا سکتا ہے
یہ مُعجزہ انساں بھی دکھا سکتا ہے
جاہل سے مگر کون کرے عقل کی بات
مُردے کو دَوا کون پلا سکتا ہے

(۶)

عرفان و بصیرت کا نہ یوں خون کرو
قدرت کا نہ رسوا کوئی قانون کرو
سوُرج سے اگر آنکھ ملانا ہو محُال
سُورج کے اجالے کو نہ مطعُون کرو

(۷)

اچھّا نہیں قتل نگہ و فکر کا پاپ
دانش کو نہ پیمانۂ بازار سے ناپ
عامی کو نہ عرفان کی مسند پہ بٹھا
قرآن پہ نہ کر تہمت ابوجہل کی چھاپ

رضا ہمدانی

# دھرتی ماتا

میری دھرتی میرے پھول !
دھرتی ماتا کے چرنوں کی دھول !
میری دھرتی۔
اس ناری کو پریم گگن کی کوکھ نے اُگلا
میری دھرتی ۔
نیلے امبر کے ماتھے کی جگمگ جگمگ کرتی بندیا
جیسے بالک کی آنکھوں میں نندیا

راوی، سندھ، اٹک کے ساگر، امرت کے سب دھارے
اس امرت میں کس نے سنجو، چھوڑے لس فوّارے
رام نام کا جاپ لبوں پر، من میں پاپ کٹاری
برہمن اتیاچاری ۔ ؟

لہر لہر کی کوکھ سے لپکیں، شوں شوں کرتے ناگ
پریم لتا کی نس نس سلگے، پھوٹ گئے دھرتی کے بھاگ
چاروں کھونٹ ہے آگ

میری دھرتی میرے پھول۔
میرے پھولوں کو اس کوڑھی دھرتی پر نہ بکھیرو
یہ ہے پھولوں کا ایمان !
پھولوں کا ایمان تو میری ریت نہیں ہے
لہو میں ڈوبی ریت تو میری پیت نہیں ہے
میری دھرتی ۔ میرے پھول

عبدالعزیز خالد

# شہر آشوب

اے کراچی کی بے اماں شامو!
نوحہ و نالہ و فغاں شامو!
آتشِ آشام، خونچکاں شامو!
شعلہ، شعلہ، دُھواں دُھواں شامو!
شاہدِ مرگِ ناگہاں شامو!
مشہدِ خونِ رائیگاں شامو!
مدفنِ یادِ رفتگاں شامو!
ماتمِ شامِ دوستاں شامو!

شکل میری تو یاد ہو گی تمہیں
بھولا ہوگا نہ نام بھی میرا
میں تمھارا ندیم دیرینہ
جس پہ رمزیں تمہاری آئینہ
حال کے اس دیارِ حرماں میں
اور یادش بخیر ماضی کے
اسی معمورۂ نگاراں میں
اسی شہرِ سمن عذاراں میں
اسی یورو شلم یاراں میں
رہا برسوں قیام بھی میرا
تم نے چوری چھپے کبھی نہ کبھی
کسی شعر و سخن کی محفل میں
سُنا ہوگا کلام بھی میرا

اگلے وقتوں کا میں وہی ہمدم
رہی جس پر تمہاری چشمِ کرم
وہی خدمت گزارِ لوح و قلم
وہی مدحت نگارِ اہلِ ہمم

بہ دلِ دردمند و دیدۂ نم
ہمرکابِ ہجومِ آہ و الم

زرد رُو مثلِ زعفران شاہو!
غارتِ دل کی داستاں شاہو!
رہینِ اندیشہ ہائے جاں شاہو!
وقفِ اندوہِ این و آں شاہو!

بھینٹ کرنے تمہارے قدموں میں
دلِ آتش زدہ کی خاکستر
مجھے خوابوں کی راکھ لایا ہُوں
جس کے پُرزے اڑا دیئے ہم نے
بنی عنوان جو فضیحت کا
وہ سبکسار ساکھ لایا ہُوں

یہ تمہارا تُنپا کھچا مُکھڑا!
یہ تمہارا لٹا پٹا جوبن!

کیسے پل میں پلٹ گئی کایا!
تم پہ کس شُوم کا پڑا سایہ!
کوئی خیرالعمل نہ کام آیا؟

پھٹ نہ جائے کہیں زمینِ وطن!
گر پڑے ٹوٹ کر نہ چرخِ کہن!
ایسے حالاتِ روح فرسا میں
لگے بے جوڑ کتنا کارِ سخن!

عبدالعزیز خالد

# صریرِ قلم

(۱)

یوں قرض حیات کا ادا کرتے ہیں
یوں عہدِ الست کا وفا کرتے ہیں
احساسِ تشکر سے رُندھے لہجے میں
نادیدہ خُدا کی ہم ثنا کرتے ہیں

(۲)

سرمستِ بم و زیرِ نوا رہتا ہے
شامل سب میں، سب سے جُدا رہتا ہے
دل خوش ہے خوشی سے، نہ غمی سے مغموم
ہر حال میں راضی بہ رضا رہتا ہے

(۳)

نافہمیِ مردم کی شکایت کس سے ؟
بے مہریِ عالم کی حکایت کس سے ؟
معلوم کریں اے دلِ اندیشہ سگال؟
اس عمرِ پُرآشوب کی غایت کس سے ؟

(۴)

ہم رکھتے نہیں کسی بھی ذی نفس سے بیر
کرتے ہیں طلب کُل کا بھلا کُل کی خیر
ہر چیز چلن ہار ہے اس دُنیا کی
دیکھو جو بغور کوئی اپنا ہے نہ غیر

(۵)

سچ بات کے اظہار میں شرمانا کیا
فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّا خُلِقَ
ہے کارگر انفس و آفاق گواہ
پانی سے ہر اک شئے ہُوئی ہے پیدا

(۶)

کیسا دلِ خوردہ گیر بخشا ہے مجھے
ہر سانس پہ جو کچوکے دیتا ہے مجھے
ٹپکیں مری آنکھوں سے شرار و سیماب
کل آج کا غم تھا آج کل کا ہے مجھے

(۷)

کیا شکوۂ اوضاعِ خرابِ دُنیا!
شیرازۂ دل ورق ورق ہے میرا
صفحے مری زندگی کے خالی ہیں تمام
اے وائے حیاتے بہ بطالت رفتہ!

(۸)

رو رو کے پکارے اسے ہر سوختہ جاں
ہر سائل، محروم کرے آہ و فغاں
دے کارِ جہاں میں نہ کسی قسم کا دخل
ہیں کارِ خداوندِ جہاں میں حیراں!

(۹)

اس بات کے سچ ہونے میں گرچہ نہیں شک
ہے دیس کی مٹی میں گلابوں کی مہک
پر کوئی اسے سینچنے والا بھی تو ہو
اخلاص کی ہو کہیں تنک بھی تو جھلک!

(۱۱)

ہر چیز بنی ہے بنی آدم کے لیے
حق بات ہے اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ
اَلنَّاسُ سَوَاسِیَۃٌ کَاَسْنَانِ الْمُشْط
کافر ہے جو سب کو نہ برابر سمجھے

(۱۰)

شاید یہ مری بات لگے تم کو عجیب
اے اہلِ وطن! اے آشنایانِ لبیب!
ہٹ دھرمی ہے تم میں جاہلیّت کی وہی
اسلام سے تم کو نہ ہوا کچھ بھی نصیب

(۱۲)

بات اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً کی کریں؟
اَلشِّعْرُ مِنْ اِبْلِیْس پہ یا کان دھریں؟
اَلشِّعْرُ مِنَ السِّحْر بھی ہے قولِ جمیل
ہیں دم بخود ان تینوں میں دم کس کا بھریں؟

افسر ماہ پوری

# سمندر اور صدف

سمندر کی
تہوں کی نرم آغوشِ محبت میں
سبک، نازک
شفیق و مہرباں موجیں
صدف کی پرورش کرتی ہیں
مہتابی شعاعوں سے
مگر غوّاص کوئی
فرطِ حرص و آز سے مضطر
اُتر جاتا ہے بے خوفی سے
پانی میں سمندر کے

سمندر کی تہوں سے
وہ صدف لے کر نکلتا ہے
اور اپنی کامرانی پر
سرِ ساحل تھرکتا ہے
مگر
بے بس سمندر،
آج بھی اپنے کناروں سے
اُگلتا جھاگ،
ٹکراتا ہے سر اپنا

فارغ بخاری

# شہر لٹتا رہا

ہم عذابوں کے منحوس چہروں سے
نا آشنا تو نہ تھے
بارہا یہ سزا ہم نے پائی
قضا ہم نے دیکھی
بلا ہم نے جھیلی
مگر سانحہ تھا عجب
وہ لمحے کہ جب
حیرتیں تھیں قیامت
جبینیں ندامت
وہ لمحے کہ جب
شہر لٹتا رہا
خون بہتا رہا

اپنے رشتوں کی پہچان ہم بھول بیٹھے
فتوحات کے جشن
اور سب شکستوں کے غم بھول بیٹھے
وہ لمحے کہ جب
اپنے ہی زخموں کے ہم تماشائی تھے
اپنے ہاتھوں ہی سنگسار ہوتے رہے
ایسے دلدادۂ شوقِ رسوائی تھے
ایک مہلک سا سناٹا تھا چار سو
کس سے کہتے کہ ہم تیرے شیدائی تھے

قمر ہاشمی

# ہولی

ہولی آئی ہولی آئی
من کے سنگ
شریر بھی ناچے
ناچے انگ انگ
کوئی نہ ڈالے رنگ میں بھنگ
من کی چنتا کوئی کسی سے آج نہ پوچھے
چاروں اور ہے رنگ ہی رنگ
دھرتی ناچے گگن بھی ناچے
گلی گلی پھوٹی ہے دھنک
چاہت نے انگڑائی لی ہے
مالوتا نے آنکھ کھولی
رنگوں کی پچکاری چھوٹی
جذبوں کی پھیلی ہے آگ
بھر لو پیار کے پھولوں سے پھر اپنے من کی جھولی
ہولی آئی ہولی آئی ہولی

الیاس عشقی

# للّی پٹ

جس دن بھی پری کوئی آئے گی
سنڈریلا بھی ناچ میں جائے گی
بہنوں کا وہاں ہو گا نہ گزر
شہزادے کی ہوگی اس پہ نظر
جب بارہ۱۲ رات بجائے گی
سنڈریلا بہت گھبرائے گی
بھاگے گی تو جوتا چمکیلا
جو پاؤں میں ہو گا ڈھیلا
سیڑھی پہ کہیں گر جائے گا
اور سارا راز بتائے گا

○

یہ للّی پٹ کی لیلا ہے
باون گز کے بالشتیوں کا
اس شہر پہ ہے کب سے قبضا
یہ بات مگر ہے بالکل طے
یہ بستی کب سے سوئی نہیں
بونے ہیں گلیور کوئی نہیں
یہ نگری دیکھی بھالی ہے
یہ لنکا جلنے والی ہے
یہ للّی پٹ کی لیلا ہے
اس میں جو گلیور آئے گا
ہکا بکا رہ جائے گا
اس دنیا میں قد ہے کیا شے

یہ جن بھوتوں کی لنکا ہے
ان ہی کے نام کا ڈنکا ہے
ان میں سے ہر باشندے کا
قد باون گز کا ہے پورا
یہ نگری دیکھی بھالی ہے
یہ لنکا جلنے والی ہے
مجنوں ہے یہاں نہ کوئی لیلیٰ
کوئی شہزادہ ہے نہ سنڈریلا
سوتیلی بہنیں جتنی ہیں
ایک اک بالشت کی فتنی ہیں
شہزادہ رنگ رچاتا ہے
ہر رات کو جشن مناتا ہے

سنڈریلا خدمت کرتی ہے
روتی ہے آہیں بھرتی ہے
اس میں جو گلیور آئے گا
ہکا بکا رہ جائے گا
مجنوں ہے کوئی نہ یہاں لیلیٰ
کوئی شہزادہ ہے نہ سنڈریلا
دھرتی اس شہر کی میلی ہے
اور دور اُفق تک پھیلی ہے
آکاش یہاں بھی نیلا ہے
یہ للی پٹ کی لیلا ہے

انجم اعظمی

# جشنِ ذات

وصل کے بھید
اپنے بدن میں چھپائے
نرم لہجے میں جھرنے بہاتی رہی
حسنِ گفتار کے
وہ سراپا غزل
یہ کہا
تم سے پہلے بھی لوگ آتے تھے
دل کا نذرانہ لے کر
سرکشیدہ مرا حسن تھا
اور سینے میں بپھری ہوئی آرزوؤں کا طوفاں
کیا جوانی کا ہنگام تھا (اور آہستہ لب)
کیا جوانی کا ہنگام ہے

خواب آنکھوں میں جیسے
کہکشاں کی کسی شاخ پر
پھول تازہ کھلے روشنی کے
کس سے پوچھوں، محبت کے اسرار کیا ہیں
محوِ گفتار ہوں

وصل کی تشنگی سیل بن کر امنڈنے لگی ہے
مگر ہجر کی کوئی ساعت نہیں
اس سے کہنا پڑے گا
من و تو کا جھگڑا مٹا دو
جسم و جاں کے الگ راستے کیوں بنائیں
قرب کی آرزو کا نہ ہونا بھی اک جبر ہے
رات بھر پھول شبنم سے بھیگا کریں
اور میں
اور تم
بارشِ وصل میں ہوں شرابور، جی بھر کے بھیگیں

فاصلوں کی فصیلیں گرا کر
ذات کا جشن برپا کریں
اس مسرت کو بیدار کر دیں
کہیں سو رہی ہے جو اپنے بدن میں

ادیب سہیل

# دشمنِ جاں

جسے وہ دوست کہتا ہے
اگر اس پر کوئی احسان کرتا ہے
تو اس احسان کی تشہیر کا سامان سالوں سال کرتا ہے
اسے پادام کی صورت میں استعمال کرتا ہے

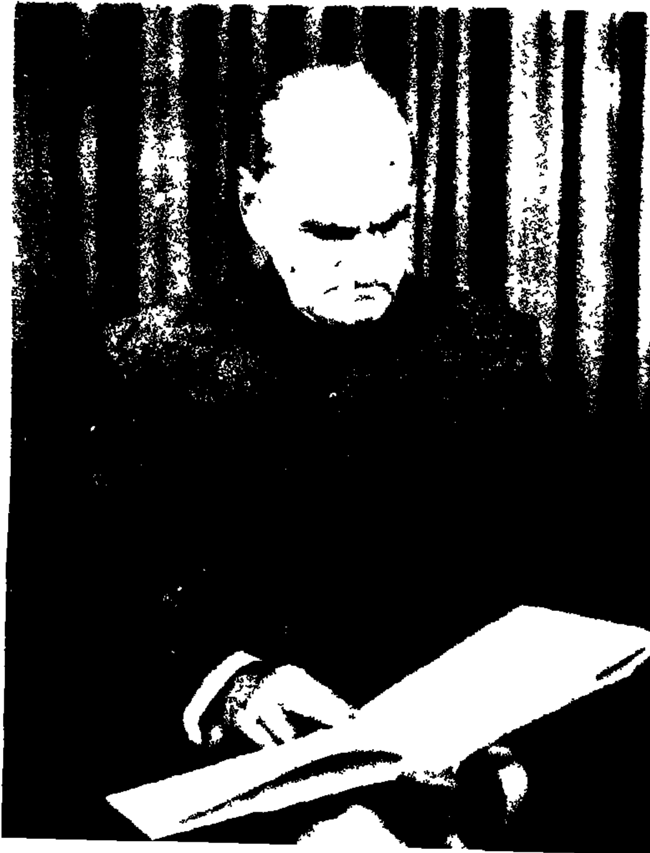
ہم اس کو دوست کہتے ہیں
بہ ہر قیمت، بہ ہر عنوان اس کو شاد کرتے ہیں
قباحت اس وساطت سے جو ہم تک راہ کرتی ہے
اسے خندہ جبینی سے نظر انداز کرتے ہیں

کبھی ہم نے جو ازراہِ رفاقت اس کے بین السطر دیکھا ہے
عجب مخلوق کا جمگھٹ نظر آیا
کوئی حشرات کے ملبوس پہنے غوخیاتا ہے
کہیں ہیئت کذائی آدمی کی لومڑی جیسی
بدن پہ جس کے گرگٹ آسماں کا منہ چڑاتا ہے
یہ منظر ہے تو پس منظر کی وحشت جانے کیا ہوگی ؟

تمہیں اس دشمن جاں کی لگی یہ دوستی کیسی ؟
مجھے تو دوستی بھی دشمنی کی طرح لگتی ہے
نہ اس کی دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی
وہ جس کو پیار دیتا ہے
اسی کو مار دیتا ہے



شکیل فاروقی۔ شوکت صدیقی۔ یونس احمر اور اقبال حیدری اپنے نواسے کو گود میں لئے ہوئے



ابوالفضا صدیقی

[illegible]





(بیٹھے ہوئے) دائیں سے ۔ حمید نسیم۔ الطاف علی بریلوی۔ مرزا ظفر الحسن۔ پروفیسر کرار حسین۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری
سیّد انور اور عباس احمد عباسی۔
(کھڑے ہوئے) دائیں سے ۔ مصطفےٰ علی بریلوی۔ سحر انصاری۔ شہزاد منظر۔ محسن بھوپالی۔ عبدالرؤف عروج۔ نامعلوم
غازی صلاح الدین۔ نامعلوم۔



سکھر کا ایک ادبی اجتماع ۔ ڈاکٹر محمد حسن فاروقی۔ احسان دانش۔ شیخ ایاز۔ ڈاکٹر خان رشید۔ رشید بھٹی۔ حسن حمیدی۔
اختر انصاری اکبر آبادی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی۔ رفیق خاور۔ آفاق صدیقی۔ مسلم شمیم۔ عبداللہ جاوید
نکہت بریلوی۔ شوکت عابدی۔ منظر ایوبی۔ محسن بھوپالی۔ ڈاکٹر نظیر الحسنین زیدی۔ اقبال قریشی اور دوسرے۔



انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں مرحوم عابد حسین کے ساتھ جناب رازق الخیری، جوش ملیح آبادی،
جلیل قدوائی۔ ابراہیم جلیس اور دیگر شرکاء۔




ہاجرہ مسرور جمیل الدین عالی محبوب العالم
ڈاکٹر اے۔ بی۔ قدوائی ابو نصر اور جمشید الرضا رحیم



کراچی میں یوم صدر الاسلام کے موقع پر حضرت جگر مراد آبادی تقریر کرتے ہوئے
فرش پر قدرت اللہ شہاب، عزیز احمد، اور جلیل قدوائی نمایاں ہیں ۔



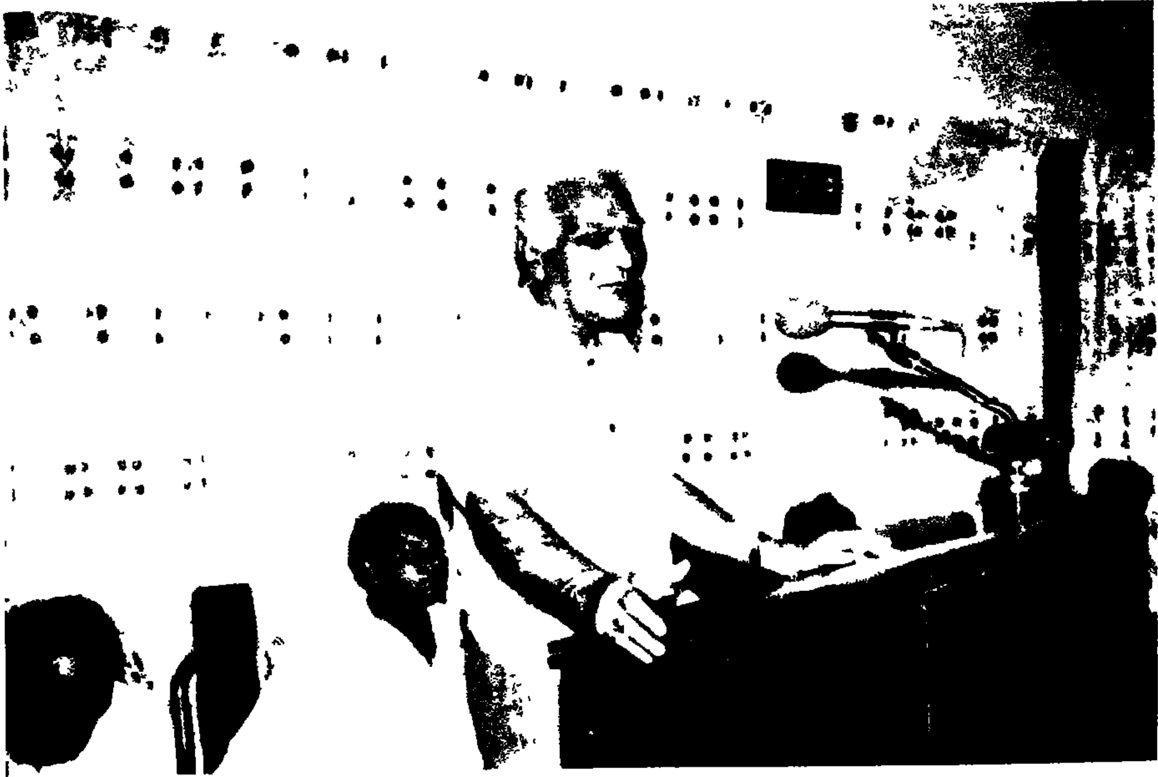
عبدالحق جوبلی کمیٹی سنہ ۱۹۶۰ء بائیں سے دائیں بیٹھے ہوئے ذکاء اللہ خان، مس آمنہ ممتاز، سید ہاشمی فرید آبادی، بیگم حسین قدوائی
اور ذکریا مائل ـــ کھڑے ہوئے نصر اللہ خاں، شجاع احمد زیبا، یوسف بخاری اور جلیل قدوائی ۔



(دائیں سے) تسکیل فاروقی۔ محمود واجد۔ انجم اعظمی۔ موسیٰ رضا۔ شوکت صدیقی۔ نعیم آروی۔ عزیز کارٹونسٹ
یاور مہدی۔ شیخ صاحب۔ یونس احمر مشرف احمد اور ادیب سہیل



جلیل قدوائی (بیٹھے ہوئے) بابائے اُردو کے ایک قدیمی خدمت گار سیّد صاحب (کھڑے ہوئے)



الفکر ادبی کمیٹی کے زیرِ اہتمام شوکت صدیقی کے ساتھ ایک شام۔ شوکت صدیقی تقریر کر رہے ہیں۔ مشرف احمد نمایاں ہیں



انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں: جلیل قدوائی۔ سید سراج الدین شمیم۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ ایڈیٹر ادبی دنیا
مشفق خواجہ (قلمی نسخہ دکھاتے ہوئے) اور ڈاکٹر اسلم فرخی۔

ہربار

# آج کے بعد...

آج کے بعد دیوارِ جاں کی طرف
مجھ کو جاتے ہوئے دیکھنا
(ایسا ہو گا نہیں
پھر بھی گر ایسا ہو )
روک لینا مجھے
میرے ماتھے پہ گردِ ندامت کی تحریر کو
خود بھی پڑھنا مجھے بھی سنانا ذرا
اس ندامت میں حصّہ تمہارا بھی ہے

وہ گھڑی کس قیامت کی تھی
مجھ کو تم بہت دیر تک
تجربے لوگ اپنے بتاتے رہے
خواب کی اصلیت اور حقیقت کی سچائی میں
فرق کرنے کی تلقین کرتے رہے

میں نے تم نے بڑے غور سے سب سُنا
میں نے تم سے یہ پوچھا کہ کیا رائے ہے
تم نے آگے کی جانب اشارہ کیا
ایک ساعت سے آگے کی ساعت تلک
لمبا وقفہ تھا۔
جب وقتِ میزان سے
اس کو ناپا گیا
رات تھی ایک تاریک اور بیکراں رات تھی
میں نے آواز دی
تم بھی بولے نہیں
آج کے بعد دیوارِ جاں کی طرف
مجھ کو جاتے ہوئے دیکھنا
(ایسا ہو گا نہیں
پھر بھی گر ایسا ہو)
روک لینا مجھے

سرشار صدیقی

# لمحۂ موجود

"کُن" کے حکمِ ازل سے پہلے
وقت تو ہوگا

وقت جسے ہم
ماہ و سال کے پیمانوں سے ناپ رہے ہیں
لیکن شاید اُن صدیوں میں اُن قرنوں میں
اِن پیمانوں کا کوئی مفہوم نہ ہوگا
پھر بھی وہ بے نام زمانہ
جامد یا سیال عدم کی کوکھ میں رہ کر
اک حرفِ معدوم نہ ہوگا

آج ہمیں اس "وقت" کا کوئی علم نہیں ہے
لیکن کیا یہ رازِ مشیّت
کل بھی ہمیں معلوم نہ ہوگا ؟

شاہد صدیقی

# بلیک وارنٹ

دار تک جانے سے پہلے ہی اگر ایسا ہو
کہ پُراسرار طریقے سے مجھے موت آجائے
تو مِرا جسم بریدہ لاشہ
" پا بہ دستِ دِگرے
دست بہ دستے دِگرے"
شب کی تاریکی میں
مقتل کی زمیں تک لاکر
تختۂ دار پہ لٹکا دینا

عدل اِس طرح سرفراز رہے گا، لوگو!
قتل کا راز تو بس راز رہے گا، لوگو!

محسن بھوپالی

# قطعات

رہے خاموش تو اک عمر کا پچھتاوا ہے
حق کا اظہار کرو جرأتِ پیکار کے ساتھ
اب کوئی دوسری صورت ہی نہیں ہے باقی
ہے عدو سامنے اور پیٹھ ہے دیوار کے ساتھ

○

تاریخ ہے گواہ کہ میں ہوں انا سرشت
خم ہے ترے حضور سرِ بے نیاز بھی
میری شناخت مجھ سے طلب کر نہ اے زمیں
پھر زیرِ بحث آئے گا تیرا جواز بھی

○

گلشنِ پاک کو میراث سمجھ کر تم نے
مژدۂ منزلِ بے نام دیا تھا تم نے
آج خود اپنی ہی نظروں سے گرے ہو پیارے
ایک مدت نظر انداز کیا تھا تم نے

○

بجا فرمودۂ اقبالؔ کب منکر ہوں میں اس سے
یقیں بھی آ ہی جائے گا مگر پہلے خبر تو ہو
کبوتر میں ہو شاہیں کا جگر، ہے دور کی کوڑی
میں کہتا ہوں کبوتر میں کبوتر کا جگر تو ہو

○

بلراج کومل

# ترسیل

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں : کہ اچھا یا برا کچھ بھی نہیں ہے
تقریب ولادت ہو یا ہنگام دمِ مرگ
اک لمحے کو تصویر میں ڈھلنا ہے' وہ ڈھل جاتا ہے آخر
وہ نغمہ ہو یا گریہ یا اندازِ تکلم
سب عکس ہیں اسرارِ فسوں کار کے شاید
یکساں ہیں مکافات کی یورش میں سبھی رنگ
سرگوشیاں کرتے ہیں گذر جاتے ہیں آنکھوں کے جہاں سے
پیمانۂ جاں سے

کیا جھوٹ ہے کیا سچ ہے کسے کون بتائے
سب شورِ سلاسل میں اتر آئے ہیں کچھ سوچ رہے ہیں
تصویر کے دو رخ تھے کبھی سنتے ہیں اب لاکھ ہوئے ہیں
جو ٹھوس تھے تجرید میں سب راکھ ہوئے ہیں
انسان یا حیوان یا بے جان ۔ کوئی نام نہیں ہے
اک رقصِ متوج ہے شبیہوں کا، ہیولوں کا، صداؤں کا، فراموش دلوں کا

اس راہ سے گذرے تھے تمہیں روک لیا اپنا سمجھ کر
باتیں بھی ہوئیں تم کو ذرا دیر کو سینے سے لگایا
آنکھوں میں دل و جاں میں بسایا
جاؤ گے تمہیں جانا ہے' معلوم تھا مجھ کو
سچ یہ ہے کہ تنویرِ ملاقات سے روشن تھا یہ لمحہ
سچ یہ ہے سرِ راہ چراغ اس نے جلایا
سچ یہ ہے کہ بے ساختہ جذبات سے روشن تھا یہ لمحہ
امروز یہ میرا تھا' مگر میری دعا ہے
یہ لمحہ ۔ یہ ہم دونوں کے امکان کا محور
کل بھی یہ کرے' دونوں کو' ہم دونوں کو سرشار منور

قمر ساحری

# فرس افگندہ

آج وہ شکر گزرانِ فرسِ افگندہ
نالہ برلب ہیں سرِ عرصۂ امروز کہ پھر
سر بہ سجدہ سرِ عرصہ امروز کہ پھر
اشک برکف ہیں سرِ عرصہ امروز کہ پھر
دیدۂ شب کی بصارت جاگے
عہدِ افیون کی قسمت جاگے
پھر پروبال ہما سے کوئی
ایسا طوفان ہوا جاگ اٹھے
گردِ محرابِ کلیسا اڑ جائے
بوئے کافورِ عمامہ اڑ جائے

قمر ساحری

# نان کناں

قسمتِ نان کناں
قلبِ تپاں، تیرہ جہاں
بس یہی نقدِ گراں
قیمتِ افسردۂ جاں
کوزہ پشتانِ جہاں کا یہی فرمانِ رواں
بس یہی تیرہ جہاں، قیمتِ جاں

میرے آشفتہ سراں، دردکشاں
تابہ ہنگامۂ شمشیر و سناں
حسرتِ فیصلۂ سود وزیاں
خوابِ گراں
وہ بھی بے لفظ و بیاں
میرے خاموش قلم، لال زباں، دیدوراں!!

---

ص ۲ روٹی کھودنے والے (قمر ساحری)

قمر ساحری

# لب بستہ

شب زدہ ذہن، وفادار غلاموں کی طرح
اپنے مسجود کے معبود کے احکام لیے
خنجر تیز لئے
زہر بھرے جام لئے

نغمہ و شعر کے غاروں پہ کھڑے ہیں کہ کہیں
شہرِ مہتاب پرستاں کی روایت کے خلاف
افقِ عہدِ رواں پر کوئی
صبح افروز ستارہ نہ دمکنے پائے
کوئی سورج نہ نکلنے پائے۔

قمر ساحری

# سفر نامہ

جانے کس وادیٔ آسیب کے نزدیک کہیں
جوئے کم آب کے پاس
خستہ و زار و زبوں
خشک دہن راہبراں
چند قطروں کے خنک زہر میں مصروفِ طرب
جام لبریز لیے، رقص کناں، سست قدم
راہِ منزل سے پرے

نغمہ و شعر و بیاں
دادِ طلب
تیشہ و تیر و سناں
منتظرِ سود و زیاں
عزمِ خوں ریز لیے راہرواں تیز قدم

جانے کب وادیٔ آسیب کے نزدیک نہیں
جوئے خوں جھوم اٹھے رقص کرے

مظفرؔ وارثی

# تقسیم

سارے غم بانٹ لیں ہر خوشی بانٹ لیں
آؤ آپس میں ہم زندگی بانٹ لیں
ڈال لیں ریت اگر بانٹ لینے کی ہم
دوگنی ہو خوشی نصف رہ جائے غم
اشک تقسیم کرلیں ہنسی بانٹ لیں ــــ آؤ آپس میں ہم
پیاس کا رابطہ بھی سمندر سے ہو
کوئی مفلس نہ اندر نہ باہر سے ہو
جتنی دولت ہے احساس کی بانٹ لیں ــــ آؤ آپس میں ہم
رکھیں بنیاد اگر، عدل کی پیار کی
کتنی اونچی عمارت ہو کردار کی
جل اٹھے ہر دیا روشنی بانٹ لیں ــــ آؤ آپس میں ہم
راستے ایک ہوں منزلیں ایک ہوں
مختلف لوگ بھی جب ملیں ایک ہوں
آئینے ہی نہیں، ذہن بھی بانٹ لیں ــــ آؤ آپس میں ہم
نقرئی صبح پر، سرمئی شام پر
سب کا حق ہو عنایات ایام پر
ہر قدم، ہر نظر، ہر گھڑی بانٹ لیں ــــ آؤ آپس میں ہم

احمد رئیس

# زمین

زمین منزل، زمیں اجالا
زمین تاریخ کا حوالہ
زمین لفظوں کی سلطنت ہے
زمین جذبوں کی مملکت ہے
زمین سوچوں کا ایک محور
زمین خوابوں کا ایک پیکر
زمین تخلیقِ دل رُبا ہے
زمین تصویرِ ارتقا ہے
زمین لمحوں کا اک سفر ہے
زمین تہذیب کا شجر ہے
زمین خوشبو کا اک ورق ہے
زمین دانائی کا سبق ہے
زمین اہلِ ہنر کی دولت
زمین اہلِ نظر کی جنّت

زمین نبیوں کا ہے ٹھکانہ
زمین ولیوں کا آستانہ
زمین دانشوروں کی دُنیا
زمین سب دلبروں کی دُنیا
زمین ہے ساحلِ محبّت
زمین سے آگہی ملی ہے
زمین سے سرخوشی ملی ہے
زمین سے رَوشنی ملی ہے
زمین سے زندگی ملی ہے
زمین سے سربلند اِنساں
زمین سے فتح مند اِنساں
زمین باقی تو سب جہاں میں
زمین باقی تو سب اَماں میں

## شاہدہ تبسم

سنو!
تم یہاں
زمرد میں ٹھہری ہوئی نیلی رگ پہ
ذرا ہاتھ رکھو
یہاں دھڑکنوں کے سبھی برق پارے
اندھیری خموشی کی زینت ہوئے
اس سے پہلے
یہاں اک طرف
ایک شاداب جنگل میں اتری ہوئی بارشیں
دوریوں تک مجھے
دھند رستوں پہ خوابوں کے سکھ میں بھگوتی رہیں
ایک جانب
کسی دشت میں
ان چھوٹے جسم و جاں نے محبت کے جذبوں میں سب جنبل
رنگ لیں
پہلی پہلی مہکتی ہوئی چاہتوں کی پھواریں لئے
میں اجالا ہوئی

اور اب
چاندنی بٹنے والے بدن میں
بہت چاند بجھ بجھ کے ڈوبے کہیں
جاں کے اس پار مجھ میں سسکتے ہوئے
سکھ کے موسم سبھی

عجب مات ہے
جان و دل ہارنے کا صلہ
ان آنکھوں کے پیچھے مسلسل برستی ہوئی
ایک برسات ہے
زمرد کے ٹکڑے کی انجان گہرائیوں تک
اکیلی انا
کون انکار کی،
لاکھ شکنوں کے دکھ بوجھ تھامے ہوئے
خود بھی ٹوٹی رہے

رد کئے جانے کا
کیسا زہراب شہ رگ کو ڈس کر گیا
نیلگوں کر گیا
سانس لیتا، دھڑکتا ہوا دل کہیں
وحشت زہر نے
زمردا ایک پتھر کیا
اب یہاں
زمرد میں ٹھہری ہوئی نیلی رگ پہ
ہاتھ رکھو ذرا
یہاں منظروں، دھڑکنوں کے سبھی برق پارے
اندھیری خموشی کی زینت ہوئے

. . . . . . . . .

امتیاز ساغر

# سالِ نو

وقت کا پہیہ گردش میں ہے
اک دو پل کی بات ہے پیارے
پھر ——
یہ سال، سُلگتے دن
اور جلتی راتیں
سب ہی قصۂ پارینہ ہو جائیں گے
تم کن سوچوں کی لہروں میں گُم ہو؟
آنے والے اچھے دنوں کا
جاؤ —— استقبال کرو
رقص کرو —— دھمال کرو
رَوشن خدّ و خال کرو
میرا کیا ہے؟

میرے لیے تو ساری راتیں ساری صبحیں
ایک ہی جیسی ہوتی ہیں
درد کا ایک الاؤ میری ذات میں روشن رہتا ہے
تنہائی ہمزاد کی صورت خانۂ دل میں رہتی ہے
سنو ——
نئے دنوں کی چاپ سنو
جاؤ —— استقبال کرو
رقص کرو —— دھمال کرو
وقت کا پہیہ گردش میں ہے

غالب عرفان

# وجودِ شکستگی

قدم قدم کے تجسس میں ذہن غلطاں ہے
میں دن کے شور سے دُور آ گیا ہوں دور بہت
میں شب کے سحر میں گم ہو رہا ہوں لب بستہ
مرے قریب سمندر کی موج رقصاں ہے
مگر وہ دُور اُجالے میں شہر ڈوبا ہے
بلندیوں سے بہت روشنی اُبلتی ہے
بھٹک رہی ہے کہیں سے کہیں نظر میں -
خطوطِ فکر کا ہر دائرہ ادھورا ہے
فضائے شہر ہواؤں میں جال پھیلا کر
دھواں دھواں سی خلاؤں کی سمت اُٹھتی ہے
اُفق اُفق کے دھندلکوں میں رقص کرتی ہے
سکوتِ شب کی ساعت لرزتی جاتی ہے
وضاحتوں کے دریچوں پہ دل کی دستک ہے۔
مری نگاہ میں اب جسم و جاں کا منظر ہے
گزر رہا ہے ہر اک حادثہ مرے اُوپر

(۲)

بپھر رہی ہے ہر ایک موج قہر کی صورت
کنارِ روح سے ٹکرا رہی ہے روز و شب
کتابِ دل کے ورق پھر اُلٹتے جاتے ہیں
بھٹک رہا ہے مرا جسم دل کی وادی میں
اذیتوں کا ہر اک وار سہتا جاتا ہے
مگر یہ جسم کہ زندہ بھی ہے توانا بھی
یہ ایک چہرہ کہ سادہ بھی ہے سوالی بھی
جبیں پہ غم کی لکیروں کی نارسائی بھی
میں سوچتا ہوں کہ پھر یہ تضاد کیا ہے؟
فصیلِ جسم کی دیوار بے دراڑ بھی
دماغ کھول رہا ہے نظر کی حدت سے
شعور بول رہا ہے تھکن کی شدت سے
مرے وجود کو محسوس ہو رہا ہے ابھی
کہ جیسے موجِ سمندر کی زد میں ساحل ہے
کنارے کٹ کے گھلے جا رہے ہیں پانی میں
مرا سراپا بھی کٹ کٹ کے گر رہا ہے کہیں
میں روز و شب کے حوادث میں پارہ پارہ ہوں

(۳)

نہ جانے کب سے میں یونہی بکھرتا آیا ہوں
نہ جانے کیوں کہاں تک بکھرتا جاؤں گا
یہ مرحلہ ہے کہاں تک قضا کے ہاتھوں میں
شکستگی کا تسلط ہر ایک ریشے پر
شکستگی کا تسلسل ہر ایک ذرّے تک

الیگزنڈر سولزے نتسن
قیصر امام گیلانی

# چند لمحے جو آزاد ہیں

رات بارش ہوئی ہے، اور اب گہرے سیاہ بادل کے ٹکڑے آسمان کی وسعتوں میں ڈولتے پھر رہے ہیں۔ گاہے گاہے پھوار بھی پڑنے لگتی ہے۔

میں سیب کے ایک ہرے بھرے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا تیز تیز سانس لے رہا ہوں۔ میرے چاروں طرف بھیگی ہوئی ہری ہری گھاس پر اور بھیگے ہوئے پیڑ کے پتوں پر آبی قطرے چمک رہے ہیں۔ میرے آس پاس کی ساری فضا اس قدر معطر ہے کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں تیز، طویل اور گہری سانس لے کر ان خوشبوؤں کو سمیٹ لینا چاہتا ہوں جنھوں نے میرے سارے وجود کو مسحور کر لیا ہے۔ کبھی میں آنکھیں موند کر گہری گہری سانس لیتا ہوں اور کبھی آنکھیں کھول کر، پر میں بتا نہیں سکتا کہ کس طرح سانس لینے میں مجھے زیادہ سکون اور طمانیت حاصل ہوتی ہے

(شاید ہر طرح)

میرا خیال ہے آزادی کے اس واحد بیش بہا لمحے کو قید و بند نے ہم سے چھین لیا ہے، ہاں! اسی لمحے کو جس میں ہم اب آزادی سے سانس لے سکتے ہیں۔ اس دھرتی کی نعمت ہائے رنگ رنگ میں بھی اتنی لذت نہ ہوگی جتنی کہ ان عطر بیز ہواؤں، رنگ برنگے پھولوں اور نمناک فضاؤں تر و تازگی میں ہے۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ محض ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے جو چاروں طرف سے پانچ منزلہ عمارتوں سے ٹھیک اسی طرح گھرا ہوا ہے جیسے چڑیا گھر کا پنجرہ۔ اسکوٹر کا شور ہو یا ریڈیو کی بلند آواز یا پھر لاؤڈ اسپیکر کا بے ہنگم واویلا، ان تمام آوازوں سے میں اپنی قوت سماعت کو اس وقت تک باز رکھنے کی کوشش کروں گا۔

جب تک اس تر و تازہ اور معطر فضا میں، اس ہرے بھرے سیب کے پیڑ کے سائے میں یہ لمحات مجھے نصیب ہیں کہ میں آزادی سے تیز، طویل اور گہری سانس لے سکوں، کیونکہ اس طرح شاید میں اپنی زیست کے چند لمحات میں اضافہ کر سکوں گا۔

**وزیر آغا**

خود سے ہوا جُدا تو ملا مرتبہ تجھے
آزاد ہو کے مجھ سے مگر کیا ملا تجھے

تھا مجھ کو تیرا پھینکا ہوا تیر ہی بہت
لفظوں کا اہتمام بھی کرنا پڑا تجھے

تو نے بھی خود کو مرکزِ عالم سمجھ لیا
لگ ہی گئی زمانے کی آخر ہوا تجھے

کیا قہر ہے کہ رنگوں کے اس اژدہام میں
جُز رنگِ زرد اور نہ کچھ بھی ملا تجھے

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا تجھے

## جوہر سعیدی

نہ سبک تھے نہ گراں تھے ہم بھی
صورتِ آبِ رواں تھے، ہم بھی

آپ کی طرح جواں تھے ہم بھی
ہاں کبھی شعلہ بجاں تھے ہم بھی

شورشِ جوششِ نمو طنز نہ کر
بند کلیوں کی زباں تھے، ہم بھی

جس قدر سہل نظر آتے ہیں
اتنے آسان کہاں تھے ہم بھی

اُس زمانے کے جفا کیشوں پر
خشتِ آزار کشاں تھے، ہم بھی

دیکھنے والو ہمیں عبرت سے
دیدۂ دیدہ وراں تھے ہم بھی

خالی خالی نہ سمجھنا ہم کو
ایک آباد جہاں تھے ہم بھی

درد کے دورِ جہانداری میں
اک اچٹتی سی فغاں تھے ہم بھی

شام ہوتے ہی دمک اٹھتے تھے
صبحِ آشفتہ سراں تھے، ہم بھی

حیرتیں ہم سے جلا پاتی تھیں
حسرتِ شیشہ گراں تھے ہم بھی

حشر تھا قامتِ زیب اُس کا
کیف و مستی کا سماں تھے ہم بھی

وہ بھی اک شہر تھا رعنائی کا
قریۂ زندہ دلاں تھے ہم بھی

وہ بھی تنہا تھا بھری دُنیا میں
خالی خالی سا مکاں تھے ہم بھی

اُس کے خوابوں کے شبستانوں میں
جان کی طرح نہاں تھے ہم بھی

وقت کے ہاتھ میں کل تک جوہر
تیر وہ تھا تو کماں تھے ہم بھی

## الیاس عشقی

کھلا رہا ہے دلوں کا حساب ایسے بھی
غلط ہوئی نہ کبھی یہ کتاب ایسے بھی
صدائیں دیتا ہے اک انقلاب ایسے بھی
ملے گا اس کو کہیں سے جواب ایسے بھی
نقیبِ شب سے یہ کہدو زمیں گردش بنی
ابھرنے والا ہے خود آفتاب ایسے بھی
لرز رہا ہے شبِ شہر و شہر یار کی خیر
ہیں جاگتی ہوئی آنکھوں خواب ایسے بھی
میں اپنا ذائچہ دیکھوں تم اپنی فردِ عمل
ہوا ہے وقتِ حساب و کتاب ایسے بھی
جنہیں نوشتۂ دیوار کی طرح پڑھ لیں
دلوں میں پلتے ہیں کچھ اضطراب ایسے بھی
قریب یوں بھی ہے پیدائشِ مسیح کا وقت
ہے پیش گوئیٔ اہلِ کتاب ایسے بھی
جو اپنے جرم کی پاداش بھی نہیں عشقی
مقدروں میں لکھے ہیں عذاب ایسے بھی

## قمر ساحری

اس دشت میں ارمانِ گلستاں تو رہے گا
ظلمت میں کوئی خواب درخشاں تو رہے گا
تریاق کی تدبیر سے غفلت نہ برتنا
یہ سلسلۂ زہر فروشاں تو رہے گا
تم لاکھ کناروں کو بدلتے رہو لیکن
دریائے مہ و سال میں طوفاں تو رہے گا
ہوتے ہیں بلند اور تو ہو جائیں اندھیرے
آنکھوں میں مگر، مہرِ درخشاں تو رہے گا
یہ سلسلۂ دار و رسن ختم نہ ہوگا
دنیا میں کوئی حق کا نگہباں تو رہے گا
میں بھول بھی جاؤں اسے پھر بھی مرے دل میں
وہ دشمنِ آرامِ دل و جاں تو رہے گا
دنیا ہے، فرشتوں سے چلی ہے نہ چلے گی
لاحول پڑھا کیجئے، شیطاں تو رہے گا

## سحر انصاری

اس بار جو پھول کھلے ہر سو کچھ رنگ سوال کے رکھتے ہیں
وہ جن کی آنکھیں خاک ہوئیں کیوں خواب سنبھال کے رکھتے ہیں

یہ شہر کہ جن کی رونق سے اک عہد نے پائی زیست نئی
ہر کالی رات کے ماتھے پر اک چاند اُجال کے رکھتے ہیں

ہر آن بدلتی دنیا میں ہر بازی جن کے ہات رہی
وہ سکہ اپنی قسمت کا کس طرح اچھال کے رکھتے ہیں

اک بار کیا تھا رُخ ان کا پھر ہوش ہی کھویا گھر در کا
یہ رستے جن میں ہم گم ہیں سب وصف ہی جال کے رکھتے ہیں

اک بار مخاطب ہو جائیں تو منہ دیکھیں افسوں منتر
یہ چپ چپ رہنے والے بھی الفاظ کمال کے رکھتے ہیں

یہ عہد نیا ہے اس کے سبھی انداز نئے، آداب نئے
اب ہجر کا دکھ دینے والے احساس وصال کے رکھتے ہیں

## شاعر صدیقی

کس کی صدا تھی، دِل تھا یا تم
گونج اُٹھے انجانے ترنّم

وجہِ شکستِ دل بھی ہوا ہے
نظروں کا بے نام تصادم

حشرِ نمو کے بعد آتا ہے
کلیوں کے ہونٹوں پہ تبسم

میرے لئے ہیں زیست کا حاصل
وہ لمحے جو بھول گئے تم

کوئی بڑا طوفاں آئے گا
ساری فضا ہے چُپ چُپ گُم صُم

انساں کی عظمت کا تصوّر
شاخِ سمن یا خوشۂ گندم؟

## شہریار

خجل چراغوں سے اہلِ وفا کو ہونا ہے
کہ سرفراز یہاں پھر ہوا کو ہونا ہے

اَب اس زمین سے انکھوا نہ کوئی پھوٹے گا
ذلیل و خوار جو کالی گھٹا کو ہونا ہے

پہاڑ ہیں کہ نمودار ہوتے جاتے ہیں
بلند اور بھی دستِ دعا کو ہونا ہے

یہ ایک بات نہیں جانتے جو ہم چپ ہیں
کہاں سکوت میں شامل صدا کو ہونا ہے

ہمارا حال بھی اس معرکے میں اَبتر ہے
اگرچہ پست تو موجِ بلا کو ہونا ہے

## شہریار

ہم اہلِ دل کی شہر میں رسوائی تو نہ ہو
اِک بے وفا کی اتنی پذیرائی تو نہ ہو

افرادِ قصہ جیسے ہیں ویسے دِکھائی دیں
زائل تماشا گاہ میں بینائی تو نہ ہو

ہر اک ادا پسند ہے معشوق کی ہمیں
ظالم ہو بد دماغ ہو ہرجائی تو نہ ہو

موجود ہوں رقیب یہ برداشت ہے ہمیں
بزمِ خیالِ ناز میں تنہائی تو نہ ہو

ہم خواب دیکھتے ہیں مخالف نہیں ترے
اے رات یوں حریف شکیبائی تو نہ ہو

## رضی اختر شوق

محفلِ شب کا سماں اک خواب سارہ جائے گا
عکس کھو جائیں گے تنہا آئینہ رہ جائے گا

خواہشوں کے ہاتھ بوجھل ہو گئے کاسے لیے
سب خزانہ کیا زمینوں میں دبارہ جائے گا

جانتی ہیں پھر بھی لکھتی جا رہی ہیں انگلیاں
ریگِ صحرا ہے یہاں کس کا لکھا رہ جائے گا

ہم نہیں ہوں گے مگر ہم جیسے دیوانوں کا نام
وقت کی دیوار پر لکھا ہوا رہ جائے گا

شام یوں گزرا وہ پلکوں سے مجھے چھوتا ہوا
مدتوں میرے بدن میں ذائقہ رہ جائے گا

کیسی اچھی بات اس جاتے ہوئے سورج نے کی
میرے پیچھے بھی دیوں کا سلسلہ رہ جائے گا

غیب کے اک تیر نے پانسہ پلٹ ڈالا ہے شوق
اب وہ خنجر اس کے ہاتھوں میں دھرا رہ جائے گا

## اختر لکھنوی

کس گلی میں عام ہم لوگوں کے افسانے نہ تھے
وقت بھی کم ہوش تھا، بس ہم ہی دیوانے نہ تھے

بات کل کی ہے کہ کل ویرانہ کا ویرانہ ہی تھا
بستیاں آنکھوں کی دل کے شہر ویرانے نہ تھے

ہم سے پہلے عاشقی کا اور ہی معیار تھا،
جسم و جاں کے ہر گلی کوچے میں نذرانے نہ تھے

شاید اب گھر گھر کشیدِ خونِ دل ہونے لگی
اس طرح چھلکے ہوئے آنکھوں کے پیمانے نہ تھے

ہو گیا تقسیم در تقسیم ہستی کا وجود،
اب سے پہلے زندگی میں ان گنت خانے نہ تھے

## مظفر حنفی

رات تکمیلِ سفر سے پیشتر ہو جائے تو
پھر کہیں رستے میں اپنا چاند بھی کھو جائے تو

ہاں یہی سکہ جو کھوٹا ہے کھرا ہو جائے گا
ملک سے باہر برادر دو برس کو جائے تو

کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں خوشبو کے لیے
تم بھی پردہ کھینچ دینا سارا گھر سو جائے تو

نام دل پر بھی لکھے ہیں ریگِ ساحل کے سوا
کوئی مد و جزر آئے تو، انھیں دھو جائے تو

کشتِ دل کی آبیاری آنسوؤں سے کیجیے
پیار اُن کا بیج کرنوں کے یہاں بو جائے تو

اس طرح ڈھل جائیں شاید خشک آنکھوں کے کھنڈر
یہ بھرا بادل ہمارے حال پر رو جائے تو

پھول کے نزدیک بھی ہو کر نہ گزرے گی ہوا
اے مظفرؔ رنگ و بو میں دشمنی ہو جائے تو

## مظفر حنفی

یاں دل سے پار غم کا پیکان ہو رہا ہے
ہر شخص مسکرائے، اعلان ہو رہا ہے

احباب سے سجاتے گُل دان کی طرح ہم
لیکن ہمارا گھر تو میدان ہو رہا ہے

مٹھی میں ریت لے کر پھر آیا وہ بگولہ
ہم جیسے سرپھروں پر احسان ہو رہا ہے

پہلے کہا تھا ہم نے دل پر لگام رکھنا
اب اشتیاق بڑھ کر ارمان ہو رہا ہے

میں اس کی حیرتوں سے محظوظ ہو رہا ہوں
وہ میری جرأتوں پر حیران ہو رہا ہے

سیٹی بجا رہا ہے اک نیم وا دریچہ
اِک پھول پھول پر وہ قربان ہو رہا ہے

آنکھوں سے اُنگلیوں نے اشعار رس لیے ہیں
سرتا قدم مظفرؔ دیوان ہو رہا ہے

## اطہر نادر

جو میرے ذہن مرے دل میں آ بھی سکتا ہے
خیال و خواب کی صورت وہ جا بھی سکتا ہے

کسی پہ جو نہ کبھی اعتبار کرتا ہو
خود اپنے آپ سے دھوکا وہ کھا بھی سکتا ہے

جو حادثات زمانہ سے کھیل سکتا ہو
وہ زخم زخم سہی مسکرا بھی سکتا ہے

مری نظر میں تو ویسے سبھی برابر ہیں
مگر کوئی مرے دل میں سما بھی سکتا ہے

یہ اعتبارِ محبت بجا سہی لیکن
رہِ وفا میں کوئی موڑ آ بھی سکتا ہے

کچھ اسقدر ہے اسے اختیار اپنے پر
بھلانا چاہے جسے وہ بھلا بھی سکتا ہے

دلوں میں جذبۂ باہم اگر سلامت ہو
بچھڑنے والوں کو اک دن ملا بھی سکتا ہے

یہ اور بات ہے منہ سے وہ کچھ نہیں کہتا
جسے وہ چاہے نظر سے گرا بھی سکتا ہے

تم اس سے مل کے بہت خوش ہوئے مگر نادرؔ
ہنسانے والا کسی دن رلا بھی سکتا ہے

## جمیل نظر

میرے ترکِ عشق کا جب اس کو غم کرنا پڑا
اِک قدم پیچھے مجھے اگلا قدم کرنا پڑا

پڑھ کے سب چہروں کو لکھنا دل پہ مشکل تھا مگر
اِک ورق پر کل کتابوں کو رقم کرنا پڑا

صلح جوئی سے ہوئے فارغ تو سب کو بیٹھ کر
رنجشوں کے دل سے ہٹ جانے کا غم کرنا پڑا

دکھ کے رستے میں ہوئی حائل جہاں دیوارِ قرب
اس کو از راہِ کرم مجھ پر ستم کرنا پڑا

بات تو کچھ بھی نہ تھی پر مسئلہ سا بن گیا
ایک کے بدلے اسے سب پر کرم کرنا پڑا

شاہ کے دربار سے چھوٹے تو قصرِ ناز میں
ہر نئی محراب پر گردن کو خم کرنا پڑا

اک توجہ اس کے لہجے میں بھی پنہاں تھی مگر
گھر کا منظر دیکھ کر آنکھوں کو نم کرنا پڑا

بھینٹ دے کر سب کو خطرے سے بچانے کے لئے
اک مسافر قافلے والوں کو کم کرنا پڑا

جب چمن کی تازگی پر غور سے سوچا نظرؔ
ہرا بھری شاخ کے سر کو قلم کرنا پڑا

## اقبال حیدر

گھنے پہاڑوں کا جنگل ہے اور میں ہوں
اونچے اونچے کہساروں کے دامن میں
سوکھے پیڑوں اجڑے کھیتوں کی رُت ہے
سنگِ میل نہیں ہے کچے رستے پر
پہلا سفر ہے پتھریلی پگڈنڈی پر
ہر پتھر نے پیاس کی اجرک اوڑھی ہے
بھیڑ ہے لیکن تنہائی نے گھیرا ہے
اس کا چہرہ اس کی آنکھیں اس کے لب
اب میں دیوانہ ہوں اک دیوانے کا
اس سے ملنا اپنے آپ سے ملنا ہے
آنے والے کل کی بات خدا جانے
تازہ منظر نامہ لکھ کر جانے کیوں
سانسوں کی زنجیر الجھتی جاتی ہے

## اقبال حیدر

سرد ہواؤں کا آنچل ہے اور میں ہوں
حدِّ نظر میداں چٹیل ہے اور میں ہوں
یادوں کا اک ٹڈی دل ہے اور میں ہوں
دھول اور مٹی کا بادل ہے اور میں ہوں
نظروں میں کوئی پھول نہ پھل ہے اور میں ہوں
قدم قدم خالی چھاگل ہے اور میں ہوں
دل دھڑکن بے کل بے کل ہے اور میں ہوں
سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہے اور میں ہوں
مجھ جیسا بھی اک پاگل ہے اور میں ہوں
من آئینے میں جل تھل ہے اور میں ہوں
آنکھوں میں گزرا ہوا کل ہے اور میں ہوں
انجانا سا خوفِ اجل ہے اور میں ہوں
شاید باقی پل دو پل ہے اور میں ہوں

## امتیاز ساغر

جہاں سے ہم گزرتے جا رہے ہیں
تجھے تصویر کرتے جا رہے ہیں

ہمیں معلوم ہے رمزِ مسافت
گھڑی بھر کو ٹھہرتے جا رہے ہیں

جمالِ زندگی لاؤ کہیں سے
یہ آئینے بکھرتے جا رہے ہیں

ہمیں اذنِ حضوری مل گیا ہے
جنوں میں رقص کرتے جا رہے ہیں

ان آنکھوں کو بصیرت مل رہی ہے
ترے جلوے نکھرتے جا رہے ہیں

وہ مل جائے تو دل کا حال کہنا
پرانے زخم بھرتے جا رہے ہیں

ہمیں آواز دو ساغر پکارو
یہ دیکھو ہم گزرتے جا رہے ہیں

## رحمان خاور

ترے علاوہ دکھوں میں کسے پکارا تھا
میں اس طرح تو کبھی حوصلہ نہ ہارا تھا

وہ ظلم کر کے پشیمان بھی ہے حیراں بھی
مجھے وفا ہی نہیں، صبر کا بھی یارا تھا

کوئی صدا مری نیندیں اڑائے رکھتی ہے
کبھی کسی نے مجھے خواب میں پکارا تھا

میں اپنے آپ میں آیا جو ایک عمر کے بعد
مرے لبوں پہ وہی نام پھر دوبارا تھا

سبھی نشیب و فرازِ جہاں ہمیں تک تھے
کہ دوسروں سے جدا راستہ ہمارا تھا

وہ ایک روز بچھڑتا نہیں تو کیا کرتا
کہ قربتوں میں بھی فاصلہ گوارا تھا

نگاہِ بحر میں خاور حریفِ طوفاں تھی
وہ موج جس نے سفینہ مرا ابھارا تھا

## انور صابر

ریت کے قبیلوں میں وَا ہمے ہی پلتے ہیں
رُت جگے سرابوں کے ہم رکاب چلتے ہیں

لمحہ لمحہ کٹتا ہے ضبط کی فصیلوں میں
ظلمتوں کی جھیلوں میں صبح و شام ڈھلتے ہیں

روشنی کہاں ہوگی خواہشوں کے جنگل میں
اے ہجومِ تیرگی ! ہم بھی ساتھ چلتے ہیں

ہم اُداس نسلوں کے ترجمان کیوں ٹھہرے
یہ نصاب صدیوں کے ساز پر مچلتے ہیں

رَوشنی، ہوَا، جگنو، پھوّل، رَنگ، تصویریں،
آپ کے تبسّم کی چاندنی سے جلتے ہیں

یہ دیارِ دل بھی تو واہموں کی بستی ہے
اک خوشی گنوا کر لوگ کیسے ہاتھ ملتے ہیں

جو وجودِ ہستی کو برف ہی کہیں صابرؔ
شبنمی خیالوں کی آنچ سے پگھلتے ہیں

## شہناز نور

غبارِ دِل کے مقابل تھی اور تنہا تھی
قدم قدم پہ میرے رَاستے میں دُنیا تھی

شمع جل تھی بالآخر اسے تو بجھنا تھا
ہوا خراج طلب تو فقط بہانا تھی

رہوں میں بے سروساماں یہی مناسب تھا
سفر بھی دھوپ میں کرنا تھا اور تنہا تھی

کسی کی یاد تھی کہ جگنوؤں کا گھیرا تھا
یہ رات کیسی تھی کہ روشنی سراپا تھی

نہ دوستی تھی کسی سے نہ دشمنی میری
میں نورؔ اپنے مقابل محاذ آرا تھی

## اشتیاق طالب

ہر قدم لاکھ خطر ہوش رُبا ہے منظر
زیست کیوں کر ہو بسر ہوش رُبا ہے منظر

پھول مُرجھائے ہوئے چاک گریباں غنچے
دیکھ لو اہلِ نظر ہوش رُبا ہے منظر

شمع خاموش ہے پروانے برافروختہ ہیں
بال بکھرائے سحر ہوش رُبا ہے منظر

یہ ہے محنت کا ثمر دردِ سر و دردِ جگر
گُل کے بدلے ہیں شرر ہوش رُبا ہے منظر

نظمِ میخانہ وہی گردشِ پیمانہ وہی
ہیں وہی شام و سحر ہوش رُبا ہے منظر

یہ وہ محفل ہے جہاں ایک دیئے کا کیا ذکر
بُجھ گئے شمس و قمر ہوش رُبا ہے منظر

کہیں رقصندہ شرر ہیں کہیں اُٹھتا ہے دُھواں
جس طرف دیکھو اُدھر ہوش رُبا ہے منظر

آرزو ہے کوئی حسرت ہے نہ ارماں طالب
یوں لٹا دل کا نگر ہوش رُبا ہے منظر

## منظور اعظمی

اے دیدہ ورو خواہشِ اورنگ نہ کرنا
خود اپنی زمیں اپنے لئے تنگ نہ کرنا

لَو بجھتے چراغوں کی بڑھاتے ہو بڑھاؤ
پندارِ شبِ غم سے مگر جنگ نہ کرنا

پھرتے ہیں ابھی شہر میں آئینہ بکف لوگ
ناگاہ کوئی حادثۂ سنگ نہ کرنا

بیگانگیٔ ہوش تو ہے سنگِ بداماں
شائستگیٔ شوق کو بے ننگ نہ کرنا

چلنا بھی پڑے گر روشِ عام سے ہٹ کر
تم دامنِ اخلاص کبھی تنگ نہ کرنا

شاید کہ مری فکر کا مفہوم بدل دو ،
لفظوں کو مرے تابعِ فرہنگ نہ کرنا

نالہ مرا منظور شبِ غم کی اذاں ہے
آلودۂ مستیٔ دف و چنگ نہ کرنا

## نسیم سحر

سخن وہ چھید بھی رہے تھے مجھ کو تیر کی طرح
مگر میں سن رہا تھا پھر بھی ناگزیر کی طرح
قلیل نقدِ جاں ملا اور اُس پہ یہ جنون بھی
کہ صرف ہم کریں اُسے زرِ کثیر کی طرح
مری تمام ظلمتیں اُسی کو ہیں اُجالنا
وہی کہ جس کا دھیان ہے مہِ منیر کی طرح
سوادِ شب میں عمرِ قید کاٹ کر ہم آئے تو
کرن ہماری آنکھ میں چبھی ہے تیر کی طرح
مرے سفر کی بھی وہی مثال ہے کہ اٹھتا ہو
بجھے ہوئے چراغ کا دھواں لکیر کی طرح
تو اب گلہ ہو کیا کہ بے سراغ ہو گیا ہوں میں!
کمان میں چڑھا ہوا تھا میں ہی تیر کی طرح
نسیم کیا عجب یہی سیاہ رات شہر کو
خبر کوئی سنائے صبح کے سفیر کی طرح

## مسعود عظیم آبادی

رات جس طور مختصر ہوگی
اب نہ ہوگی تو کب سحر ہوگی

لُٹ گیا کاروانِ شوق کہاں
ہوتے ہوتے تمہیں خبر ہوگی

تم کو پایا گنوا دیا سب کچھ
یہ شکایت تو عمر بھر ہوگی

ٹھہرنا رہروانِ منزلِ عشق
بدنصیبی بھی ہمسفر ہوگی

ملنے والے سے پوچھئے چل کر
یہ ملاقات کس کے گھر ہوگی

چاند سنّاٹا اور تنہائی
رات کس طرح سے بسر ہوگی

شام ڈھلنے لگی چلو مسعود
منتظر اپنی وہ نظر ہوگی

## اختر سعیدی

ہجومِ سلسلۂ رفتگاں دکھائی دیا
زمیں پر ہی مجھے آسماں دکھائی دیا

میں ایسے شہر میں کچھ دن گزار آیا ہوں
ہر ایک شخص جہاں بے زباں دکھائی دیا

نگار خانۂ حیرت میں ایک شب گذری
پھر اس کے بعد وہ منظر کہاں دکھائی دیا

سمجھ رہا تھا جسے اپنا ہمسفر وہ بھی
حریصِ مملکتِ جسم و جاں دکھائی دیا

فقط چراغ نہ تھے میری رہبری کے لئے
اِک آئینہ بھی پسِ کارواں دکھائی دیا

ہر ایک شخص دیارِ سخن فروشاں میں
نقیبِ فطرتِ بازی گراں دکھائی دیا

کسی نے شہر کو صحرا بنا دیا اختر
کسی کو دشت بھی اِک سائباں دکھائی دیا

## سہیل اختر

کہکشاں جیسی زمیں، بحر غزالوں جیسی
کیوں نہ ہو میری غزل زہرہ جمالوں جیسی
رنگ اور نور کا سنگم ہے کہ تیرا چہرہ
مجھ کو یہ شکل ملی میرے خیالوں جیسی
تو نہ سمجھے تو الگ بات ہے ورنہ اے دوست
میری خاموشیٔ لب بھی ہے مقالوں جیسی
ایک دن میں غمِ کاکل سے نکل جاؤں گا
ایک دن تیری نظر ہو گی سوالوں جیسی
اس کو پگھلائے گا کب تیری وفا کا سورج
یہ مری سوچ کہ ہے برف کے گالوں جیسی
کیسے طے ہو گا تری سمت یہ صدیوں کا سفر
ہر گھڑی ہجر کے صحرا میں ہے سالوں جیسی
پیش کرنے کے لئے منزلِ جاناں کے حضور
کوئی سوغات نہیں پاؤں کے چھالوں جیسی
کوئی تو آئے کرن چاند نگر سے اختر
کوئی تو رات ملے مجھ کو اُجالوں جیسی

## عاشق کیرانوی

عجب دُنیا کا افسانہ لگے ہے
کوئی اپنا نہ بیگانہ لگے ہے

صدا جو حق پرستانہ لگے ہے
زمانے کو حریفانہ لگے ہے

جبیں پر خاک ہے جو تیرے در کی
ہمیں وہ تاجِ شاہانہ لگے ہے

تمہارے آستاں کو جب سے چھوڑا
ہمیں ہر شہر ویرانہ لگے ہے

ترا جو نام لیتا ہے جہاں میں
وہ دیوانہ ہی فرزانہ لگے ہے

خیالِ زُلفِ جاناں کے تصدق
صبا ہے اور کبھی شانہ لگے ہے

کوئی بھی قصۂ غم ہو جہاں میں
ہمیں اپنا ہی افسانہ لگے ہے

بُتوں کو ہر گلی میں جب سے دیکھا
یہ دُنیا ہی صنم خانہ لگے ہے

نہ جانے کیا ہوا دنیا کو عاشقؔ
ہر اک محفل عزا خانہ لگے ہے

## احمد صغیر صدیقی

بجا کہ خاک ہیں ہم، خاکداں ہمارا نہیں
یہ وہ شکست ہے جس میں زیاں ہمارا نہیں

زمینِ کرب و بلا ہو کہ ارضِ دار و رسن
کہاں کہاں پہ رقیبو! نشاں ہمارا نہیں

جو اس میں رہتے ہیں ہم بھی تو ہیں انہی کی طرح
یہ اور بات یہ ٹوٹا مکاں ہمارا نہیں

سَروں پہ دھوپ ہے جتنی یہ دھوپ اپنی ہے
تو فکر کیا ہے اگر سائباں ہمارا نہیں

ہمیں خوشی ہے اسی کی کہ ہم کو آنکھ ملی
بَلا سے شہرِ مہ و کہکشاں ہمارا نہیں

اقبال متین

# شہر آشوب

اس پہاڑی پر آج رات جانے پھر کس نے آگ لگا دی ہے۔ قطار اندر قطار بڑھنے والی آگ کی یہ ریل گاڑی آنکھوں کے لئے روشنیوں کا ایسا منظر پیش کرتی ہے جس سے مسرتوں اور خوشیوں کے اُجلے اجلے سائے سینے میں سمٹ رہے ہیں، سکڑ رہے ہیں ـــــ یہ اداسیاں جانے کہاں سے چلی آتی ہیں۔ پہاڑی پر رینگنے والی شعلوں کی اس قطار سے کسی کے سینے میں بکھری ہوئی راکھ کا کوئی علاقہ نہیں ہے لیکن لگتا ہے پہاڑی پر سارا جنگل صبح ہونے تک راکھ کا ڈھیر بن جائے گا۔ لگتا ہے اس پہاڑی کی اب صبح نہ ہوگی۔ آگ پھیلتی جائے گی، پھیلتی جائے گی۔ ایک درخت بھی نہیں بچے گا۔ وہ جانور جن کی تیز رفتاری سے پتھر ٹکراتے اور چنگاریاں اڑتی تھیں اور جن کے منتظر سوکھے درخت اپنی سوکھی ٹہنیاں پھیلا پھیلا کر چنگاریوں سے آگ پکڑ لیتے تھے۔ جل جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ جو جانور بچ رہیں گے وہ اس پہاڑی کو چھوڑ دیں گے۔ نشیب میں کہیں اتر کر پناہ لیں گے۔ پہاڑی پر کچھ بچ رہے گا تو لوٹ آئیں گے۔ زندگی اپنے آثار کھو دیتی ہے تو درخت تنہائیوں، مایوسیوں اور حسرتوں کو مٹھی میں دبا کر جانے کہاں کہاں اڑتا پھرتا ہے۔ پھر یکایک کوئی کرن سی عین اس جگہ پھینک جاتا ہے جہاں زندگی لٹ گئی تھی۔

کون جانے صبح ہونے تک ایسا ہی کوئی کرشمہ ہو جائے۔

اسی لئے کہ کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ چنگاریاں پھینکنے والے پتھر، آگ پکڑنے والے سوکھے ٹھنٹھ اور تناور درخت، ہوا سے باتیں کرنے والے تیز رفتار جانور اور ان سے تیز چلنے والے ہوا کے جھکڑ جو شعلوں کو شعلوں کی طرح اٹھا کر پہاڑی پر جہاں تہاں پھینک دیتے ہیں اور پہاڑی وہاں وہاں بھی جلنے لگتی ہے۔ یہ سب کے سب مجبور ہیں۔ کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے۔

میں کب یہ کہتا ہوں کہ میں نے کبھی اس سے ملاقات کا کوئی پلان بنایا تھا۔ اب یہ احساس بھی تو میرے بس کا روگ نہیں تھا اس کو پہلی بار دیکھ کر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ میں نے اسے بارہا دیکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس احساس کی بنیاد کیا تھی۔ بس کچھ ایسا تھا جیسے میں تو اسے دیکھتا رہا ہوں۔ اسے تھم تھم کر آہستہ آہستہ کسی صنم کی طرح تراشا ہے۔ اسے ناز نخرے سکھائے ہیں۔ شرم و حیا سے لجا کر سمٹنے سکڑنے والے بدن کو میری نظروں ہی نے شگفتہ پھول سے ادھ کھلی کلی بن جانا سکھایا ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ میں جان بوجھ کر کرتا رہا ہوں۔ کیا یہ سب کچھ کر گزرنا میرے امکان میں تھا۔ بالکل نہیں۔ یہ سب کچھ تو ہو گیا تھا، ہوتا رہا تھا۔ میری آنکھیں دیکھنے کی گنہگار تھیں۔ اس لئے کہ وہ بنی ہی اس گناہ کے لئے تھیں اور میں اسے دیکھتا تھا، دیوانوں کی طرح۔ کچھ اس طرح کہ وہ میری آنکھوں سے بھاگ کر کہیں چھپ جانا چاہتی تھی لیکن چھپتی نہیں تھی۔ میری آنکھیں بھی دوسروں کے خوف سے اسے دیکھنا نہیں چاہتیں لیکن صرف اسی کو دیکھتیں۔

بھری محفل میں آنکھوں کا مقدر ایک ہی آدمی کیسے بن جاتا

ہے۔ رات جب میں تکیئے میں سر چھپا کر رو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ مجھے بلک بلک کر روتا ہوا دیکھے۔ کوئی سایہ میرے سرہانے بڑھتا ہوا دکھائی دے۔ پھر وہ جھک کر اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دے۔ جلتے ہوئے آنسوؤں کی نمی اپنی انگلیوں کی پوروں میں خشک کر لے لیکن ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ دن بھر میں اسے کبھی مقابل ہو کر دیکھتا، کبھی چھپ کر۔ کبھی دور سے، کبھی بہت قریب سے، اتنا قریب سے کہ اس کے بدن کی خوشبو مجھے مسحور کرنے لگتی اور میں اسے چھونے کے لئے تڑپتا۔ لمحہ بھر کے لئے قرب کی یہ نعمتیں سمیٹ کر میں اس سے دور ہو جاتا، یعنی میری آنکھیں۔ میری آنکھیں میرے ساتھ اس وقت سے نہیں تھیں جس وقت سے اسے دیکھا تھا۔

امی کہتیں "ارے تایا حضور سامنے کھڑے ہیں، قدم بوس ہوا تو"

میں چابی کے گڈے کی طرح جھک جاتا۔ تایا حضور پیلا تنگ مہری کا پاجامہ، چکن کی ٹنکی کرتی اور پہلے ہی کھڑے میں بھلا کیسے ملبوس ہو سکتے تھے۔ لیکن دکھائی دیتے۔ ارے میں تو پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ کوئی اس طرح کسی کو دیکھتا ہے کہ دوسرے بھی وہی لگیں۔

گھر کے شور شرابے تھے کہ رکتے نہ تھے۔ کل جو گہما گہمی تھی اس سے آج کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتی۔ تایا حضور کے اکلوتے فرزند کی شادی۔ اب اس کے بعد تو کوئی تقریب اس پیمانے پر کرنی نہ تھی۔ سب نزدیک و دور کے رشتہ دار جوق در جوق آ رہے تھے۔ ایک ایک دن میرے لئے قیامت بن رہا تھا۔ دن کو اپنی آنکھوں کے پیچھے پھرنا۔ رات ان ہی آنکھوں کے آنسو سو جتن سے تکیئے میں چھپاتے رہنا۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ سب کچھ آنکھوں ہی کو تج کر رکھ دیا۔ صبح آئینے کے مقابل ہوئے تو یوں لگتا جیسے کوئی بہت دور سے آواز دے رہا ہو اور ہم آنکھیں جھپکا جھپکا کر آئینے کو تک رہے ہوں کہ یہ آوازے لگانے والا کون ہے۔

بارہا میں نے اس سے نظریں ہٹا کر جب یکایک اسے دیکھا تو اس کی نظریں بھی چوری کرتی ہوئی پکڑی گئیں۔ وہ بھی مجھے چرا رہی تھی۔ پھر ہم علانیہ ایک دوسرے کو چرانے لگے۔ اس طرح نہیں جیسے کچھ دن پہلے اپنے آپ سے چھپ کر ایک دوسرے کو چراتے تھے۔ اب صرف دوسروں سے چھپنا رہ گیا تھا۔ اب تو ہم ایک دوسرے کو بس اس طرح دیکھے جاتے کہ آنکھوں آنکھوں میں سمیٹ کر اپنی اپنی زندگی میں بھر لیں گے۔

لیکن رات کو تکیئے میں منہ چھپا کر رونے والی آنکھیں جی چاہتا کہ اس کی زلفوں، اس کے رخساروں، اس کے جسم و جاں کے سارے وجود کو آنسوؤں سے بھگو سکوں۔ لیکن ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جس کے لئے آنسو امڈ امڈ کر سکتے ہیں۔ دھڑکنیں رکی رکی سی لگتی ہیں۔ جی یوں بھر آتا ہے، جیسے کبھی اس کیفیت سے آشنا ہی نہ تھا۔ ہنستے بولتے ہیں تو چھوٹے لگتے ہیں۔ بات کہتے ہیں تو بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جبر کرتے ہیں تو اپنی ہی آواز پہچانی نہیں جاتی۔ اب تو وہ سامنے ہے، بالکل پاس ہے، پھر یہ دوریاں کیسے بڑھ گئیں؟ کیسے بڑھ جاتی ہیں جیسے وہ ہے تو ہم نہیں ہیں۔

اس پہاڑی پر آج رات جانے پھر کس نے آگ لگا دی ہے لگتا ہے اس پہاڑی کی اب صبح نہ ہوگی، آگ پھیلتی جائے گی، پھیلتی جائے گی۔ ایک درخت بھی نہیں بچے گا۔ وہ جانور جس کی تیز رفتاری سے چنگاریاں اڑتی تھیں، مل جل کر سب راکھ ہو جائیں گے۔

میں زندگی کو کہاں سے جا کر چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اب تو وہ امکانات بھی میرے بس سے نکل گئے ہیں جو تسلی بن جاتے تھے۔

ساری چڑیاں کھیت چگے بنا اڑ گئیں۔ سارے نظاروں کے قوں رہ کر بھی اپنا اپنا سب کچھ اٹھائے گئے۔ وہی صبح، وہی شام، وہی در و دیوار، وہی صحن وہی گملے، وہی پنچھے، وہی چھتیں، وہی صورتیں وہی آوازیں، صرف وہ چلی گئی۔ اس کے جانے سے منظر کس طرح بدل جاتے ہیں۔ گہما گہمی، ویران ویران سی کیوں دکھائی دیتی ہے۔ شور شرابے بھی کہیں سناٹے بن سکتے ہیں؟ جیسے اس زندگی میں میرا کچھ بھی نہیں۔ سب امی کا تھا، سب ابی کا ہے۔ مجھے اس نے یہ بھی تو نہیں بتلایا کہ اب میں اپنی آنکھیں کہاں لے جاؤں؟

دوسرے دن کوئی آیا تھا۔ جانے اس نے کیا کیا کہا کہ گھر میں        اٹھ گئی تھی۔ ہنسنے ہنسانے والی آنکھیں، شگفتہ چہرے، چمکتی پیشانیاں، کلیاں کھلانے والے ہونٹ، ساری شادابیاں ایسے جھلس جھلس گئی تھیں جیسے سبھوں نے مل جل کر مجھ سے میری آنکھوں کی ندرت چھین لی تھی۔ میرے تکیوں کی نمی چھین لی تھی۔ یہ یکایک سب کو کیا ہو گیا تھا۔ سب رو رہے تھے۔ سب رو رہے ہوں تو میری آنکھیں کیوں نہیں روتیں۔ وہ سمندر رہا گہرا گہرا اور گہرا اترتا جاتا تھا۔ وہ۔ وہی جوار بھاٹا امڈ کر آنکھوں کی طرف بڑھتا تھا۔ وہ آن واحد میں کیسے خوشک ہو گیا۔ لگتا تھا میری آنکھیں اپنے اُن آنسوؤں کو ڈھونڈ رہی ہیں جنہیں وہ رو چکی ہیں۔ تاکہ میں انہیں پھر رو سکوں۔

اور گھر کے بڑے بزرگ ہم بچوں سے کچھ چھپا رہے تھے۔

امی ابا سے کہہ رہی تھیں۔

"اسے کہیں بھجوا دو۔ وہ بڑا حساس ہے۔"

"ہاں سبھی چھوٹے بڑے بچوں کو بھجوا دیتے ہیں۔"

امی پھر بلک رہی تھیں "اللہ میرے بھائی صاحب، میری بھابی! وہ میری ننھی سی گڑیا سی ۔ وہ تو نکل جائے گی نا؟ بولئے۔ کچھ تو بولئے۔ مجھ سے تو بولئے۔"

"اس کو زیادہ زخم نہیں آئے ہیں۔ لیکن دہل گئی ہے۔ آنکھوں کے سامنے ماں باپ کا!" اور ابا کی آواز اس طرح بھرا گئی کہ پہچانی نہ گئی۔

"دلہن ابھی بے ہوش ہے۔ آپ دلہا کو سمجھائیے۔ جب شہر بھر میں کرفیو لگا ہے تو وہ کس طرح" اور امی سسک سسک کر رو رہی تھیں۔

اتنا سب کچھ سن کر بھی میں کس طرح مان سکتا تھا کہ وہ کبھی دوسروں کی طرح مر سکتی ہے۔ گویا۔ گویا ۔ وہ آنسو جنہیں میں صرف چھپ چھپ کر نہیں چھپا چھپا کر روتا تھا۔ موت اس سے بھی بڑی کوئی چیز ہے!

ہم بچے جس دوسرے گھر کو بھجوائے گئے تھے ۔ وہاں ساری نعمتیں صرف اس لئے تھیں کہ ہم پر نچھاور کی جائیں۔ سارے کھلونے، ساری دلچسپیاں، سارے کھیل تماشے، صرف اس لئے تھے کہ ہمیں بہلائیں۔

خاندان کے دوسرے بچے، میرے ہم عمر، مجھ سے چھوٹے، مجھ سے بڑے کچھ ہی دیر بعد مطمئن مطمئن سے لگتے تھے۔ لیکن مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں رو نہیں رہا تھا لیکن کوئی میرے اندر چھپ چھپ کر شاید کہیں بلک رہا تھا۔ میں اس گھر سے چپکے سے نکل بھاگا۔ وہ تو ۔ وہ تو ان ساری چیزوں سے اچھی تھی۔ سارے کھیل کھلونوں سے، سارے کھیل تماشوں سے۔

مجھے اپنے گھر کے دروازے کی دہلیز پر بیٹھا ہوا دیکھ کر کسی نے ابا، امی سے کچھ کہا ہوگا۔ ان دونوں نے مجھے چوکھٹ سے اٹھایا۔ کچھ اس قدر چاؤ سے پچکار کر بات کی جیسے زخمی کو پانی پلاتے ہیں۔ لیکن چاہت کا یہ ٹھنڈا میٹھا پانی بھی آنسو نہ بن سکا۔ میں نے نظر اٹھا کر ابا، امی کو بغور دیکھا۔ شاید وہ میری آنکھوں کی

ویرانی تک آ چکے تھے۔

میں نے کہا: "مجھے منی کے پاس لے چلیے۔"

ابا نے سر پر ہاتھ رکھا۔ امی نے بھینچ بھینچ لیا۔

"ایسا نہیں کہتے۔"

اللہ تو ہی بتا۔ "ایسا نہیں کہتے۔" جب ایسا نہیں کہہ سکتے تو پھر کہنے کے لئے کیا رہ جاتا ہے، تو پھر زبان کس لئے ہے۔ تو تو جانتا ہے۔ تجھے سب معلوم کہ بے زبانی نطق سے زیادہ بولتی ہے۔ میں اس روئیں روئیں کو کہاں کہاں لئے پھروں گا۔ جو منی منی کی رٹ لگائے ہوئے ہے، جس کی یہ چیخیں کوئی نہیں سنتا۔ تو، تو سنتا ہے۔ اب تو صرف اسی لئے جینے کو رہ گیا ہے کہ تو یہ چیخیں سنتا ہے۔ سنتا ہے نا۔

اس کے بعد ماضی، حال، مستقبل۔ لگتا تھا سب مل گئے ہیں، کچھ ایسا گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ الگ الگ سے ان کی شناخت مشکل ہے۔

میں جو جی چکا تھا وہی پھر سے جی رہا تھا اور جو جینا باقی تھا وہ پہلے ہی جی چکا تھا۔ زندگی میں اتنی یکسانیت آجائے تو زندگی پہچانی نہیں جاتی۔ محسوس ہوتا ہے موت اتنی بری بھی تو نہیں۔

اب تو ہر عید، تہوار کو خوشیاں گھر گھر میں چھپ چھپ کر روتی ہیں۔ مسرتیں ہنسنا بھول کر بلکنا سیکھ گئی ہیں۔ فطرت جب اپنا سب کچھ لٹا چکتی ہے تو نہ شعاعیں روشنی پھینکتی ہیں نہ کرنیں۔ بس ایسے اندھیرے پھیلتے ہیں، ایسے اندھیرے پھیلتے ہیں کہ سورج کالا ٹھیکرا بن کر رہ جاتا ہے۔ اب یہ کالا ٹھیکرا کب طلوع ہوتا ہے، کب غروب ہوتا ہے کسی کو پتہ نہیں۔ اب میرے شہر میں کوئی آدمی کسی آدمی کو نہیں پہچانتا۔ انسانیت جب پہچانی نہیں جاتی تو دلوں کی اجڑتی بستیوں کو کون پہچانتا ہے۔ آنکھوں میں بستے ویرانوں کو کون پہچانتا ہے۔ اب تو نام پوچھ کر خنجر چلائے جاتے ہیں لیکن بدن کٹتے ہیں تو سڑک پر بہتا ہوا لہو کچھ اس طرح ایک ہو جاتا ہے کہ اسی خنجر سے لکیر کھینچ کر ہم اس کو جدا نہیں کر سکتے جس خنجر سے وہ بہایا گیا تھا۔ نام پوچھنے پر یہ خون اپنا نام بھی تو نہیں بتلاتا۔ اور میں ایسے میں ہر ارتھی، ہر جنازے کے ساتھ اپنی منی کو دفناتا پھرتا ہوں، جلاتا پھرتا ہوں۔

اس پہاڑی پر آج رات جانے پھر کس نے آگ لگا دی ہے۔ لگتا ہے اس پہاڑی کی اب صبح نہ ہوگی۔ آگ پھیلتی جائے گی۔ پھیلتی جائے گی۔ ایک درخت بھی نہیں بچے گا اور یہ پہاڑی۔ یہی پہاڑی، کچھ اس طرح جلے گی، اس طرح جلے گی کہ ہم اس کو گنج میں بھی جلتا ہوا دیکھ سکیں گے، مارکیٹ میں، عابدس اور لبرٹی پر بھی۔ جانے یہ آگ اب اور کہاں پھیلے گی۔

راؤ صاحب، نرسیا صاحب اور مولوی صاحب، ابا کے جانی دوست تھے۔ راؤ صاحب اونچی ذات کے برہمن تھے اور نرسیا صاحب چھوٹی ذات کے ہندو۔ مولوی صاحب سیدزادے تھے۔ ابا راؤ صاحب 'پنڈت جی' پکارتے اور نرسیا کو 'آپا گارو' مولوی صاحب مولانا تھے۔ ابا سارے ضلع میں اپنی خاندانی وجاہت کی بنا پر نواب ہی پکارے جاتے۔ پنڈت جی، آپا گارو، مولانا اور نواب صاحب تقریباً روز شام میں ضرور ملتے۔ ان کی دوستیاں مثالی تھیں۔ کسی شام ان میں سے ایک نہ آتا تو چپڑاسی دوڑائے جاتے کہ خیریت پوچھ آئیں۔ کچھ ہی دن بعد ڈاکٹر سالکرام بھی اسی حلقے میں آملے۔ مہاراشٹر کے برہمن تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ابا کی دوستی تو یہاں تک بڑھی کہ ابا اور امی دونوں ہی کے خونی رشتے ان کے آگے ہیچ ہوئے۔ ڈاکٹر سالکرام میرے بڑے ماموں کی طرح تھے۔ امی نے راکھی باندھی تھی۔ ہم انہیں ماموں جان پکارتے تھے۔ اب ان میں سے کوئی بھی نہیں رہا۔ سب اللہ کو پیارے ہوئے آج ہوتے تو کس طرح ایک

دوسرے کا سامنا کرتے۔ شرم ہی سے مر جاتے۔ دلوں کو چھو کر دلوں
میں اتر جانے کا فن انہیں لوگوں کے ساتھ گیا۔

آن واحد میں کسی شہر پر ظلم کے پہاڑ کس طرح ٹوٹتے ہیں۔

کیسی گہما گہمی تھی۔ ساری سڑکیں لگتا تھا' ہوا کے دوش
پر اڑی جا رہی ہیں۔ حالانکہ سڑکیں جوں کی توں شہر بھر میں بچھی ہوئی
تھیں۔ ان پر دوڑتی ہوئی موٹریں، بسیں، آٹو، اسکوٹریں، سائیکلیں،
اس طرح دوڑتی تھیں کہ سڑک نظر نہ آتی تھی۔ وہ جو ٹھہرا ہوا تھا نظروں
سے اوجھل تھا۔ اور جو مسلسل حرکت کر رہا تھا بس وہی نظارہ تھا
اسی لئے سڑکیں خود اڑتی دکھائی دیتیں۔ بڑی شاہراہوں پر آدمیوں
کا سمندر کس طرح ٹھاٹھیں مارتا تھا جیسے لوگ ابھی ابھی زمین کے اندر
سے اگ آئے ہیں۔ سجی ہوئی دکانیں، ہاکرس، ٹھیلے والے سب
مصروف تھے۔

وہ جب گئے تھے تو ٹھیلے کو نظر لگ رہی تھی۔ سارا ٹھیلا
انہوں نے "ڈیلیشن" سے بھر لیا تھا۔ اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔

رات چھوٹے بڑے سارے سیب ڈھیر سے ندی پر پڑے
تھے۔ صبح ہوتے ہوتے میں نے ہر سائز کی ڈھیریاں الگ الگ کر دی
تھیں۔ وہ ہمیشہ ہی پو' نہ پھٹتی کہ اٹھ بیٹھتے اور ملائم کپڑے سے
پونچھ پونچھ کر اس قدر تیزی سے سارے سیب ٹھیلے میں سجا دیتے
کہ سجے ہوئے ٹھیلے کو پھر چھونے طبیعت نہ چاہتی۔ سیب چمک
دمک کر گاہکوں کو خود ہی پکار لیتے۔ اب کی بار تو سارے کے سارے
سیب ڈیلیشن نکلے تھے۔ چلنے لگے تو منی اور منے کو ایک ایک سیب
بھی دیا۔ ایک بڑا سا سیب مجھے الگ سے دیا۔ میں نے ان کا اپنا
حصہ بھی مانگا۔ کہنے لگے جو بک رہیں تو میرا حصہ بھی تمہیں کو دوں گا۔
وہ جانتے ہیں کہ میں تو اپنا حصہ بھی اٹھا اٹھا کر انہیں کے لئے رکھتی ہوں۔
عالی ٹھیلا بھی بچا کر ساتھ نہ لاسکے۔"

اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

"اب تو جسم بخار سے پھنک رہا ہے۔ کہیں کہیں کو زخموں
سے خون رستا ہوا لگتا ہے بی بی!"

خالی امی آبدیدہ ہو رہی تھیں۔

"کرفیو نرم ہوتے ہی دواخانے جا رہی تھی۔ میں محمود میاں
کو ساتھ کر دوں گی۔ بچوں کو میرے پاس چھوڑ جانا۔"

منی تو میرا سب کچھ اٹھائے گئی تھی۔ سب کچھ، صرف آنکھیں
چھوڑ گئی تھی۔

رندھے ہوئے گلے، بھیگی ہوئی پلکیں۔ کہیں بھی ڈھکے چھپے ہوں۔
میری آنکھیں انہیں کھوج لیتیں۔ دن بیتے۔ مہینے بیتے۔ برس بیت
گئے۔ لیکن منی میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔

میں جب اپنا چوڑا سینہ دیکھتا ہوں تو منی کیوں یاد آتی
ہے اور دل کو کچھ ایسا سکون سا ملتا ہے کہ جیسے کچھ دیر کے لئے منی
بھی میری خوشی میں شامل ہو گئی ہو۔ جس قسم کے فساد میں منی نے
ساتھ چھوڑا تھا، آج وہی فساد روزمرہ کا وتیرہ بن گئے ہیں۔ زندگی
جب کرفیو میں سانس لینے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے تو منی کتنا قریب
آجاتی ہے۔ لگتا ہے دور دیس سے برسوں بعد آکر اس طرح دل
میں براج گئی ہے کہ اب کرفیو اٹھ جائے تب بھی نہیں جائے گی۔
جیسے اس نے خود ہی دل میں کرفیو لگا رکھا ہے۔

سسک سسک کر جینے والی زندگیاں سہی نہیں جاتیں۔
اخباروں میں کچھ نہیں ہے، صرف خون خرابے ہیں۔ انسان کی زندگی
کا ننگا رقص پردوں کے پیچھے چھپا چھپا کر دکھایا گیا ہے۔ ہنستے
ہنستے چیخ مار کر زمین پر منٹ دو منٹ کے لئے تڑپنا اور ڈھیر ہو جانا۔
پڑھا نہیں جاتا۔ دیکھا کس طرح جاتا ہوگا۔ کیا وہ آدمی ہی ہوں گے جو
آدمی کو خنجر مار دیتے ہیں۔ منی سہم سہم کر میرے دل میں دھندلائی دھندلائی

پھرتی ہے۔

خنجر کی دھار نے انسانی بدن سے رستے ہوئے خون کو گھٹا ہے چہروں پر مل دیا ہے۔ اب آدمی اپنا چہرہ آئینے میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ صرف خون دیکھتا ہے۔

وہ پہاڑ جس کو میں ہر شام اپنے ضلع میں گھر کے برآمدے سے تکا کرتا تھا، جس کی شامیں سرمائیں اور سرمئی اور سرمئی ہو ہو کر مجھے اداس کرتی تھیں اور برسات میں بھیگ بھیگ کر مجھے رلاتی تھیں، لگتا ہے اب تو صرف جلتا ہی رہتا ہے۔ شدید گرما کا جلا جلا کر راکھ کر دینے والا ایک ہی موسم آگ کی مشعلیں اٹھا کر برس کے بارہ مہینے اس پہاڑ پر ناچتا رہتا ہے۔

منی جان جاتی ہے کہ موسم اب بدلنا بھول گئے ہیں۔ اپنی تاثیر بھول گئے ہیں۔ اپنا دلاسہ، اپنی تسلیاں سب بھول گئے ہیں۔ تو وہ میرے دل کے گوشے گوشے میں ڈھونڈلاتی پھرتی ہے۔ اس کو خوف ہے کہ وہ پہاڑ جسے میں تکا کرتا ہوں اپنا جھلسا ہوا بے موسمی چہرہ دکھا دکھا کر مجھے ڈراتا ہوگا۔ اور ایسے میں میرا رواں رواں بے آواز سے منی منی پکارتا ہوگا۔ وہ جان جاتی ہے کہ اسے اب میرے آنسوؤں کی ضرورت ہے۔ وہ اپنا لگایا ہوا کرفیو نرم کرنے کے لئے میرے دل میں اتر جاتی ہے تاکہ میری حفاظت کر سکے۔

باہر گلے کرفیو میں زندگی اپنی حفاظت کے تصور کے باوجود کس درجہ بے آرام ہے ساری آدمیت چوہے کی طرح بلوں میں دبکی بیٹھی ہے چھپے ہوئے خنجروں نے جنہیں کاٹ دیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ تباہی مچی ہے کہ آدمی کی درندگی پر شرم آنے لگی ہے۔ غذا مہنگی ہے، خون ارزاں ہے۔ انسانی خون گلی کوچوں میں ضائع ہو سکتا ہے لیکن کھیل کے دانے کے لئے بچے بلک رہے ہیں۔ مکئی کے بھٹے بیچنے والی محلے کی ایک عورت نے اپنے بھوک سے بلکتے بچوں کو کبھی بھٹے بھون کر کبھی مکئی ابال کر پیٹ کا ایندھن دیا ہے۔ بھول جاتا ہے، جہاں مل جاتا، جس قیمت پر مل جاتا ہے وہ لوگ خرید لیتے ہیں جو خرید سکتے ہیں کہ پیٹ کے لئے کچھ کر سکیں۔ جو خریدنے کی سکت نہیں رکھتے وہ چنے اور مرمرے بچوں کو کھلا کر انبیل پلا کر ایک دن اور گزار دینا چاہتے ہیں کہ شاید دوسرے دن کرفیو اٹھ جائے اور وہ روزی کمانے نکل سکیں۔ کرفیو کی نرمی پر نون، تیل، اناج کے لئے جو بھی گھر کے باہر نکلتا ہے اس کو اپنی واپسی کی امید کم ہے لیکن بھوک کے بچے، چھاتیوں سے دودھ چرانے والی مائیں بغیر دوا کے موت اور زندگی کی کشمکش میں گزارنے والے بیمار۔ ان سب کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہنا اور کرفیو سے سمجھوتہ کئے ہوئے زندگی بسر کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جن کی جیبیں بالکل خالی ہیں وہ تو مجبور رہیں ہی لیکن وہ بھی مجبور ہیں جن کی جیبوں سے ضروریات کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ کیسی زندگی ہے، جو گھائل ہیں وہ موت اور زیست کا بستر مرگ پر مقابلہ کر رہے ہیں اور جو گھائل نہیں ہیں وہ موت اور زیست کا فرق بھلا بیٹھے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی ٹکر ٹکر تکتی جانوں کو، سوکھی چھاتیاں چوستے ہوئے شیر خوار کو گھائل نظروں سے تکنے والا باپ سوچ رہا ہے اے اللہ کیا وہ لوگ خوش نصیب نہیں تھے جو یہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی سڑکوں پر مارے گئے۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لئے نرم ہونے والا یہ کرفیو لگتا ہے سورج کے اجالوں میں بھی مہیب تاریکیوں سے زیادہ تاریک ہے۔ زیادہ مہیب ہے ـــ کیونکہ شہر کے رکھوالے قاتلوں سے مل گئے ہیں۔ اتنی سی دیر میں آستینوں سے چھپے ہوئے خنجر برآمد ہوتے ہیں۔ گلی کوچوں میں بدن کٹتے ہیں اور زمین خون چاٹنے لگتی ہے۔ اس ذرا سے وقفے میں جو دودھ، تیل اور اناج کی فراہمی کے کے لئے تھا کسی نہ کسی کو ختم کرنا ضروری ہے۔ وقت کم ہے، کرفیو پھر سے لگ جائے گا۔ خنجر پیاسے ہیں، ان کی پیاس بجھانی ضروری ہے۔

انسانی ہاتھ تیزی سے وار کرتا ہے۔ انسانی چیخ فضا کو چیرتی ہے۔ انسانی بدن خون میں تر بتر ہے، لاشیں زمین پر پڑی ہے۔ میں خون پی رہی ہے۔ زمین خون پی رہی ہے۔

یار، یہ تو اپنا ہی آدمی تھا۔ وہ پہچان گیا تھا ہمیں۔ کیسی نظروں سے ہمیں تک رہا تھا۔ ارے ابھی مرا نہیں ہے۔ لیکن بھاگ چلو۔

منّی وہاں کھڑی کھڑی کیا تک رہی ہو؟ بھاگ آؤ، بھاگ آؤ

منّی، تم میرے دل سے نکل کر کہاں کہاں ڈھونڈلاتی ہو۔ اب تو ہر اس نکڑ پر، ہر اس گلی کوچے میں، ہر اس شاہراہ پر میں تمہیں دیکھ لیتا ہوں جہاں کسی چاقو کی زبان گرم لہو چاٹتی ہے۔ تایا حضور، چچی امی تمہیں ڈھونڈتے ہوں گے۔ منّی۔ یا۔ یا تم ہی ان دونوں کو ہر گلی کوچے میں بار بار قتل ہوتا ہوا دیکھتی ہو۔

منّی وہ جو لڑکا پھٹے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے گھر کی چوکھٹ تک پہنچ کر گر گیا تھا۔ وہ میں نہیں تھا منّی۔ نہیں تھا میں۔ تم نے جھک کر اس کا سر اپنی آغوش میں رکھ ہی لیا ہوتا کہ دروازہ کھل گیا اور اس کے لوگوں نے اس کو اندر گھسیٹ لیا۔ لیکن ایک بات بتاؤں؟ تم سن سکوگی۔ دوسرے دن ہاسپٹل لے جانے تک بہت خون بہہ چکا تھا اور ہاسپٹل پہنچتے پہنچتے وہ لڑکا مر گیا۔ مر گیا وہ۔ وہ میں نہیں تھا منّی۔ میں تو زندہ ہوں۔ تم جانتی ہو نا ــــ میں زندہ ہوں۔

میں سوچتا تھا کہ زندگی اپنے آثار کھو دیتی ہے تو وقت تنہائیوں، مایوسیوں اور حسرتوں کو مٹھی میں دبا کر جانے کہاں کہاں اڑتا پھرتا ہے لیکن مجھے یقین بھی تھا کہ کوئی ایسے میں ایک کرن سی اس جگہ پھینک جاتا ہے جہاں زندگی لٹ گئی تھی۔

منّی میں تمہارے بعد بھی مرا نہیں تھا لیکن آج جبکہ تم ہر موڑ پر بار بار قتل کی جا رہی ہو تو لگتا ہے کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ کوئی کرن آج تک کسی نے کیوں نہیں پھینکی؟

دیکھو نا میرے ضلع کے اس پہاڑ کو جسے میں برآمدے میں بیٹھا تکتا تھا۔ اس پہاڑ نے اپنی سرمئی شامیں کھو دی ہیں۔ اس پہاڑ نے اپنے اداس اداس دھندلکے کھو دیئے ہیں۔ اس لئے شاید میں بھی اپنے آنسوؤں کو ترس گیا ہوں۔

منّی تم جس گھر سے گئی تھیں وہ بھی تو شادی ہی کا گھر تھا۔ اتنی ساری خوشیاں تم چھوڑ گئی تھیں کہ قہقہے اپنی آواز بازگشت در و دیوار سے ابھی سن ہی رہے تھے کہ سب اجڑ گیا۔ سب اجڑ گیا منّی۔ وہ غم جو تم مجھے سونپ گئی تھیں کیا وہ بہت نہ تھا۔؟

آج تو اپنے شہر کا یہ دستور بن گیا ہے کہ کوئی خوشی کسی دل میں نہ رہے گی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی بجائے خشک پپڑیاں سی ملیں گی۔ آنکھوں میں ایسی ویرانیاں ملیں گی جو تمہارے بعد صرف میں نے دیکھی ہیں۔ تمہارے بعد اپنے شہر میں مجھ سے زیادہ دکھی کون تھا لیکن آج ہر شخص مجھ سے زیادہ دکھی ہے منّی۔ اس کا غم کچھ عجیب طرح کا غم ہے۔ گھٹا گھٹا سا۔ ڈرا ڈرا سا، خائف خائف سا۔ تم ہی بتاؤ غم اپنی جگہ کتنا پاکیزہ، کتنا معصوم اور تنہا تنہا جذبہ ہے۔ بھلا اس کو کسی کا کیا ڈر۔ لیکن اپنے شہر کے لوگ اب ایک دوسرے کو رونے کے لئے بھی ڈرنے لگے ہیں۔ نہ تمہیں معلوم تھا نہ مجھے کہ اپنے شہر میں آنسوؤں پر بھی ایسی افتاد پڑے گی۔

مجھے تو اب صرف ایک بات کا یقین ہوتا جا رہا ہے۔ یقیناً تم پوچھ سکتی ہو کہ تمہارے بعد آج تک میں جن سہاروں پر زندہ تھا وہ یکایک کس طرح ٹوٹ گئے۔ میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم یہی پوچھو گی۔ اسی لئے تم سے پہلے ہی معذرت کی تھی۔ لیکن سنو منّی۔ کھلے دل سے مجھے بتاؤ؟ تمہارے بعد کیا آنسوؤں کی پونجی میرے پاس نہیں تھی۔ تھی نا۔ تم نے تو مجھے اس دولت سے مالا مال کر دیا

تھا منی۔ لیکن آج اپنے شہر کا ہر شخص اپنے آنسو رو چکا ہے۔ جب لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنسو کھو دیتے ہیں منی تو پھر کوئی کسی کے لئے نہیں جیتا۔ اس سے بڑھ کر کسی شہر پر کوئی آفت نہیں آ سکتی کہ اس شہر کے لوگ رونا بھول جائیں۔

میں اتنی چھوٹی سی بات اپنے ملک کے بڑے بڑے نیتاؤں کو جہاں سیاست والوں کو کیسے سمجھاؤں کہ ہمیں ہمارے وہ آنسو دے دو جو تم نے ہم سے چھین لئے ہیں۔

روٹی مانگتے مانگتے ہمارے اعصاب شل ہو گئے تو تم نے آنکھوں کا پانی بھی چھین لیا۔ اور کیسی سفاک نظریں اور ویران ویران آنکھیں ہمارے لئے چھوڑ دیں۔

میں سچ کہتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں منی۔ میں بھلا تم سے جھوٹ کہہ سکوں گا؟ ہمارے آنسو ہمیں مل جائیں تو ہم پھر سے ایک دوسرے کے لئے جی سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے مر سکتے ہیں کہ آنسوؤں کے بغیر انسانیت کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔

---

انور عنایت اللہ

# آفتابِ لبِ بام

جب آگ تیز ہوا اور شعلے آسمانوں کو چھو رہے ہوں تو اماوس کی رات بھی دن کا سماں پیش کرتی ہے آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں اسے اپنا گھر نظر آیا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈر کو وہاں تک پہنچ سکتا ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کا گھر مٹی کا ڈھیر بن کر پل بھر میں زمین پر آرہا۔ وہ دیوانہ وار دونوں ہاتھوں سے ملبہ ہٹانے لگا۔ اس کے نیچے اس کی ساری کائنات دب گئی تھی۔ صالحہ اس کی بیوی ندا اس کی بیٹی اور فیصل اس کا بیٹا۔ چند لمحوں کی تلاش کے بعد اسے ایک بچے کا ہاتھ نظر آیا اور پھر فیصل کا خون سے لت پت چہرہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ فیصل صالحہ ندا۔ کہاں ہو تم ؟

عین اُس وقت اس نے اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ کوئی اُسے جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔ گھبرا کر اُس نے آنکھیں کھول دیں صالحہ اس پر جھکی کہہ رہی تھی۔ پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے ؟ پانی پی لو۔ ہزار بار کہا کروٹ لے کر سویا کرو، پر تم سنتے ہی نہیں "۔

تو جو کچھ دیکھا تھا وہ خواب تھا۔ اس نے سوچا پھر پوچھا۔ بچے کہاں ہیں ؟"

"اپنے کمرے میں سو رہے ہیں "۔ صالحہ اسے پانی کا گلاس دیتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

تو رات ابھی باقی ہے۔ کمرے میں بجلی کا قمقمہ روشن ہے۔ یہ سوچ کر وہ پانی پی لیتا ہے۔

"کیا دیکھا تھا خواب میں ؟" صالحہ پوچھتی ہے۔ بھیانک خواب ہوگا۔ تم بُری طرح چیخ رہے تھے، رو بھی رہے تھے "۔

ندیم خاموش رہتا ہے اور گھڑی کی طرف دیکھتا ہے جو دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ رات کی خاموشی میں اس کی ٹِک ٹِک بڑی تیز لگتی ہے۔ دور سے کہیں آوارہ کتوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ مسلسل بھونکے جارہے ہیں۔ یکایک بجری پر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے جیسے بہت سے لوگ اس طرف آرہے ہوں۔ یہ آواز سن کر صالحہ سہم جاتی ہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے۔ یہ گلی میں کھلتی ہے ندیم اُٹھ کر وہاں جاتا ہے اور پردہ ہٹا کر دیکھتا ہے پھر مڑ کر کہتا ہے

" محلّے والے ہیں "۔

"رات بھر گشت کرتے رہے "۔ صالحہ کہتی ہے۔

"یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ کل رات میری ڈیوٹی ہے "۔ ندیم کہتا ہے۔

" کل ہی ؟ مجھے بڑا ڈر لگے گا "۔ صالحہ کی آواز گھبرائی ہوئی ہے

ڈر فضول ہے۔ ہمارا علاقہ محفوظ ہے۔ محلے والے چوکنے ہیں تو بیرونی دشمن کچھ نہیں کر سکتا "۔

وہ بیوی کو تسلی دیتا ہے۔ کل تو میرے ساتھ پندرہ سولہ لوگ اور ہوں گے۔ سب کے پاس بندوقیں ہیں

صالحہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ پانی کا گلاس میز پر رکھ دیتی ہے اور مڑ کر کہتی ہے "کچھ دیر آرام کر لو۔ صبح دفتر بھی تو جانا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کئی راتوں سے نیند اچھی طرح نہیں آئی۔ عجیب تھکن کا احساس ہے۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ جاتا ہے صالحہ بھی آکر لیٹ جاتی ہے دونوں آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ باہر مکمل خاموشی ہے اندر سناٹا ہے۔

صبح کو جب تک اخبار آتا ہے بچے اٹھ جاتے ہیں۔ ان کے اسکول تو کھلے ہوتے ہیں لیکن صالحہ انہیں نہیں بھیجتی۔ کیا پتہ ان کی غیر حاضری میں کب ہنگامے شروع ہوتے ہیں اور کب تک کرفیو لگتا ہے۔ کرفیو لگ گیا تو بچے کہاں جائیں گے؟

صالحہ چائے کا گرم پیالہ لا کر اسے دیتی ہے' وہ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اخبار کھولتا ہے۔ پہلے ہی صفحے پر فسادات کے بارے میں بڑی بڑی سرخیاں ہیں۔ دو بھیانک تصویریں بھی ہیں۔ سرخیاں ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے ہزار دو ہزار کاپیاں تو فوراً بک گئی ہوں گی۔ انہیں پڑھتے ہوئے وہ سوچتا ہے۔ آخر دنیا کو کیا ہو گیا ہے' کیا تہذیب اور تمدن اپنی انتہا کو پہنچ کر مرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں؟ اسے تو ہمیشہ سے مار دھاڑ سے نفرت ہے ہمیشہ جنگوں اور تشدد سے نفرت رہی ہے۔ پھر اسے بار بار ایسے تکلیف دہ 'خون آلود' بھیانک تجربوں سے کیوں گذرنا پڑ رہا ہے؟ ہجرت سے پہلے کے فسادات' پھر مظفر پور کی قتل و غارت گری۔ اس کے بعد دوبارہ ہجرت کی صعوبتیں۔ وہ تو اس یقین کے ساتھ کراچی آیا تھا کہ مہذب شہر ہے' امن کا گہوارہ ہے۔ پھر یکایک یہ کیا ہوا کہ اب یہ قتل و غارت کا جہنم بن گیا ہے؟

اس کے مضطرب خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہنچتا ہے کہ وہ یکایک اپنی پشت پر ایک ننھا سا ہاتھ محسوس کرتا ہے مڑ کر دیکھتا ہے تو ندا کھڑی ہے۔ اس کی چھ سالہ بیٹی۔ وہ اسے دیکھ کر پیار سے مسکراتی ہے اور پوچھتی ہے

"کل ہم نے کتنے بندے مارے ابو؟" وہ ایسی ہی اردو بولتی ہے۔ وہ چونک کر بیٹی کو دیکھتا ہے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں۔ گھبراہٹ' نہ ڈر اور نہ تشویش اور پریشانی ایسے واقعات تو وہ روز سنتی ہے۔ صرف مرنے والوں کی تعداد بدلتی ہے۔ کبھی اپنے زیادہ مارے جاتے ہیں اور کبھی دشمن کے۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے ندا" وہ اسے سمجھاتا ہے۔ یہاں کوئی دشمن نہیں ہے۔ سب بھائی بھائی ہیں۔ بس آپس میں لڑنے لگے ہیں" بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جاؤ ناشتہ کر لو۔ پھر امی سے سبق یاد کر لینا۔

ان کی باتیں سن کر فیصل اس کے پاس آتا ہے۔ وہ ندا سے صرف سال بھر بڑا ہے۔ لیکن بہت سمجھدار ہے۔ جب سے شہر میں ہنگامے شروع ہوئے ہیں' سہما سہما سا رہتا ہے۔

"کیا وہ ہمیں بھی مار ڈالیں گے ابو؟" وہ آہستہ سے پوچھتا ہے'

یہ سنتے ہی ندیم کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ آخر وقت اس کے ساتھ کیسا مذاق کر رہا ہے؟ اتنے چھوٹے بچے کے ذہن میں یہ کیسے خیالات آ رہے ہیں؟ اس نے ساری عمر انسانیت کی بقا کے لئے دنیا میں امن کی قوتوں کی تقویت کے لئے' جن تصورات کا پرچار کیا تھا' ان تصورات کو' ان عقیدوں کو کیسی نظر کھا گئی کہ اب وہ کسی اور دنیا کے لگتے ہیں؟ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اسے ٹھیک ۹ بجے دفتر پہنچنا ہے ورنہ بڑا صاحب خفا ہو گا۔ وہ ڈیفنس سوسائٹی میں رہتا ہے' جہاں کبھی ہنگامے نہیں ہوتے۔ کبھی کرفیو نہیں لگتا۔ اسے بسوں' رکشوں' اور ٹیکسی والوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اسے کیا معلوم کہ شاہ فیصل کالونی سے ویسٹ وہارف کتنی دور ہے۔ راستے میں گرین ٹاؤن ہے جہاں کرفیو لگا ہوا ہے۔

اس لئے بس ایک گھنٹے کا راستہ، دو گھنٹے میں طے کرتی ہے۔

وہ ایسے خیالوں میں ناشتہ کرتا ہے، کپڑے بدلتا ہے، صالحہ سے پان کا ایک بیڑہ لے کر منہ میں رکھتا ہے اور خدا کا نام لے کر گھر سے نکل جاتا ہے۔ دل اور دماغ دونوں وہیں چھوڑ جاتا ہے۔ خدا جانے اس کی غیر حاضری میں حالات کیسے رہیں۔

دفتر میں یہ پریشانی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہاں سب کے چہروں سے لگ رہا ہے، وہ بھی فکر مند ہیں۔ آج خلافِ معمول بڑا صاحب اب تک نہیں آیا ہے۔ اس لئے آپس میں گفت و شنید جاری ہے۔ ہر ایک بڑھا چڑھا کر اپنی اور محلے والوں کی بہادری کی فرضی کہانیاں سنا رہا ہے۔ اپنی شجاعت اور دشمن کی بزدلی کی داستانیں اسے معلوم ہے ان میں سے کوئی بھی حملے کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلا ہوگا۔ اپنی جنگ لڑنے کے لئے نچلے طبقے کے سادہ لوح جذباتی عوام کو سڑکوں پر بھیج دیا ہوگا۔ دشمن کے حملوں میں ایسے ہی معصوم جان بحق ہوتے ہیں۔ متوسط طبقے کے یہ سورما اب یہاں سکون سے بیٹھے اپنی فرضی بہادری کی کہانیاں سنا رہے ہیں۔ یہ نہ کریں تو اور کیا کریں؟ ان کے پاس کرنے کو ہے کیا؟ سوائے زبانی جمع خرچ کے دن بھر دفتر، شام کو بیوی بچوں کی جھک جھک، آٹے دال، نون کی فکر۔ ذرا مالی حالت اچھی ہو تو مغرب کے بعد ٹی وی اور وی سی آر

اُسے ایسے فضول لوگوں کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے

ندیم سوچتا ہے اسے تو مار دھاڑ سے نفرت ہے۔ وہ اپنے ارد گرد چین اور سکون اور امن کی دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے ورثے میں ایک پُر امن دُنیا چھوڑنا چاہتا ہے۔ خدا نہ کرے جو اسے کبھی ہتھیار اٹھانا پڑے۔

یکا یک دفتر میں سناٹا چھا جاتا ہے تو وہ دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ بڑا صاحب اندر آ رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی سب فائلوں پر جھک جاتے ہیں۔ جیسے کام میں بے حد مصروف ہوں۔ بڑے صاحب سب کے سلام کا سر ہلا کر جواب دیتا ہوا اپنے کمرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ سب اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ وقت ایک بار پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اوپر کی منزل سے اس کا دوست رحمت ندیم کے پاس آتا ہے۔ ندیم قلم رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگتا ہے رحمت کے عقیدے بھی ندیم ہی جیسے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ اس دُنیا کو بہتر بنانے کے لئے غریبوں کے مسائل حل کرنے کے لئے رحمت تشدد کو جائز سمجھتا ہے۔ وہ ندیم کے عدم تشدد والے فلسفے کو ناقابلِ عمل اور حماقت سمجھتا ہے، ہمیشہ ہشاش بشاش رہتا ہے۔ پر آج وہ بھی کچھ بجھا بجھا سا لگ رہا ہے۔

"رات کیسی گذری؟" ندیم آہستہ سے پوچھتا ہے

"ویسی ہی جیسے پرسوں گذری تھی۔ ساری رات لوگ نعرے لگاتے رہے" وہ جواب دیتا ہے

"تو تم بھی پریشان رہے؟" ندیم پوچھتا ہے۔

"ہاں۔ لیکن میاں یہ تو وہ قیمت ہے جو تم جیسے لوگوں کی وجہ سے پوری قوم کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری متوسط طبقے کی ذہنیت جو تمہیں خطرہ مول لینے نہیں دیتی۔ گو ہر مراد حاصل کرنے کے لئے اپنے جائز حقوق منوانے کے لئے جنگ کرنی پڑتی ہے" وہ جواب دیتا ہے

"میں نہیں مانتا۔ ندیم کہتا ہے۔ لیکن معاً اسے اپنی آواز قدرے اجنبی لگتی ہے، جیسے اس کا ایمان کمزور پڑتا جا رہا ہو۔

نہ مانو۔ لیکن جلد ہی مان لوگے۔ پر اب کے مجھے پریشانی ہو رہی ہے یار۔ اماں اور بہنیں لیاقت آباد میں رہتی ہیں۔ وہاں اڑتالیس گھنٹوں سے کرفیو لگا ہوا ہے۔ خدا جانے گھر پر کھانے پینے کا سامان ہے یا نہیں۔ آپا کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کا تازہ

دودھ پر گذارہ ہوتا ہے۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔" اس کا
لہجہ اداس ہو جاتا ہے۔

"خدا کرے ٹھیک ہی ہوں۔ پر رحمت۔ یہ سارا جھگڑا اس
لئے ہے کہ تم جیسے لوگ اختلافات تشدد کے سہارے دور کرنا چاہتے
ہیں۔" ندیم اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اپنے دوستوں کے
ہاتھوں میں کلاشنکوف دیکھ کر تمہیں وحشت نہیں ہوتی؟ جب سب
ہی مسلح ہوں تو سوچو مستقبل میں انسانیت کا وارث کون ہوگا؟ جنگلی
جانور؟ کیونکہ آپس میں لڑ بھڑ کر انسان تو کرۂ ارض سے مٹ چکا
ہوگا؟"

عین اس وقت چپراسی آکر کہتا ہے ندیم کو بڑے صاحب
بلا رہے ہیں۔ یہ سن کر رحمت ٹھنڈی سانس لیکر کہتا ہے۔ کرفیو میں وقفہ
ملا تو اماں کے پاس جاؤں گا۔ کل دفتر نہیں آیا تو سمجھ جانا کہ وہیں پھنس گیا۔

بیوی کو ساتھ لے جانا۔ ندیم اٹھتے ہوئے مشورہ دیتا ہے۔

"ارے نہیں میاں۔ کیا کرنے گی جاکر؟" رحمت فوراً جواب
دیتا ہے۔ اُسے میکے پہنچادوں گا۔ اُس کے والدین محفوظ علاقہ میں
رہتے ہیں۔ سفید پوش بورژواژی جنہیں صرف اپنی جان اور جھوٹی
شان کی فکر رہتی ہے۔"

جاتے جاتے وہ چوٹ کر جاتا ہے۔ اس کے جانے کے
بعد دن کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے۔ ہنگاموں کی وجہ سے دفتر
وقت سے پہلے بند ہو جاتا ہے۔ وہ گھر پہنچتا ہے تو صالحہ کہتی ہے
"اچھا ہوا تم جلدی آگئے۔ یہاں افواہیں گرم ہیں۔ آج رات
ضرور حملہ ہوگا۔ سنا ہے اورنگی ٹاؤن میں دو بم پھٹے۔ گرین ٹاؤن
میں شمس الدین صاحب کی کوٹھی کو آگ لگا دی گئی۔ خدا جانے گھر والوں
کا کیا ہوا۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی ہے۔ اسے تسلی دینا
ضروری ہے۔ اس لئے ندیم کہتا ہے۔

"سب بکواس ہے بھئی۔ میں اسی طرف سے آرہا ہوں۔
شمس الدین صاحب کی کوٹھی بالکل صحیح سلامت ہے۔ لوگوں کے
پاس کرنے کو کچھ نہ ہو تو وہ افواہوں ہی پر گذارہ کرتے ہیں۔ تم ان
پر دھیان نہ دو۔"

صالحہ کے چہرے سے لگتا ہے اسے تسلی نہیں ہوئی پر وہ خاموش
رہتی ہے۔

شام سے رات ہوتی ہے تو محلے پر سناٹا چھا جاتا ہے۔
جن کی ڈیوٹی رات کی ہے وہ آرام کر رہے ہیں تاکہ تازہ دم ہوکر گھر
سے نکلیں اور ٹھیک دس بجے چوک پر اکٹھے ہوں۔ سب مسلح ہیں۔
ندیم کے پاس بھی ایک غیر ملکی رائفل ہے جو اس نے قسطوں پر خریدی
ہے۔ اب تو لوگ گھروں پر آکر اس طرح اسلحہ فروخت کرتے ہیں
کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ آج اس کے ساتھ گشت کرنے والوں
میں اس کے ایسے ساتھی بھی ہیں جو اس کے خیالات سے بالکل متفق
نہیں ہیں جو عدم تشدد پر یقین نہیں رکھتے۔ جو یہ سمجھتے ہیں اینٹ کا
جواب ہمیشہ پتھر سے دینا چاہیئے۔

پونے دس بجے ندیم گھر سے نکلتا ہے۔ کارتوسوں کی پیٹی
گلے میں لٹکاتا ہے۔ رائفل ہاتھ میں لیتا ہے اور چوک کی طرف روانہ
ہو جاتا ہے۔ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے صالحہ سہمی ہوئی لگ رہی
تھی۔ آہستہ آہستہ بجری پر چلتے ہوئے اسے اپنی بیوی کا
چہرہ یاد آتا ہے تو آپ ہی آپ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو
جاتی ہے۔ بعض بڑے خطرناک خیالات ذہن میں آنے لگتے ہیں تو
وہ چلتے چلتے اپنے سر کو یوں جھٹکتا ہے جیسے اس طرح وہ دل میں
اُبھرنے والے تشدد کے جذبات کو ذہن سے نکال پھینکے گا۔

۔ چوک پر اس کے پندرہ بیس ساتھی جمع ہیں۔ بندوقوں
میں کارتوس بھرے جاتے ہیں اور اس کے بعد گشت کا سلسلہ شروع

ہو جاتا ہے۔ محلے پر اب بھی سناٹا طاری ہے۔ صرف اِدھر اُدھر سے آوارہ کتوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ خدا جانے محلّے کے کس گوشے میں وہ بھونکے جا رہے ہیں۔ بجری پر گشت کرنے والے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ گرد و پیش کے ماحول کی طرح سب خاموش ہیں جیسے سب کو بیوی بچوّں کی فکر ہو۔ گھروں کی فکر ہو جنہیں انہوں نے بڑی محبت سے، بڑے محنت سے بنایا تھا۔ وہ لوگ ندیم کے گھر سے خاصے دُور ہیں کہ یکایک گولیوں کی دھیمی سی آواز آتی ہے۔ چونک کر سب رُک جاتے ہیں، آپ ہی آپ بندوقیں تان لیتے ہیں۔ یہ آوازیں اُس طرف سے آ رہی ہیں جدھر ندیم کا چھوٹا سا گھر ہے۔ جس کی ایسبیسٹوس کی چھت کے نیچے اُس کی بیوی اور دو معصوم بچّے ہیں۔ گولیوں کی آواز کے ساتھ اب یکایک چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ سب بے اختیار اُس طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ ندیم بھی اُن کے ساتھ ہے آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور اس کا پورا وجود مکمل طور پر نفرت اور حقارت اور غصّے کی آگ کی لپیٹ میں آ گیا ہے بھاگتے بھاگتے یکایک دیوانہ وار چیخنے لگتا ہے "کمینو کتّو۔ تم میرا گھر تباہ نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں بھون کر رکھ دوں گا۔ نیست و نابود کر دوں گا! جان سے مار ڈالوں گا!!!"

اس کے ساتھ بھاگتے ہوئے اِس کے ساتھی حیرت سے ندیم کو یوں دیکھتے ہیں جیسے وہ اردو نہیں کوئی غیر ملکی زبان بول رہا ہو!!!

---

ڈاکٹر فہیم اعظمی

# آرٹسٹ کی دُوسری کوشش

اُس نے سوچا کہ وہ اُن تمام غلطیوں کا ازالہ کرے گا جو اُس نے اپنی پہلی زندگی میں کی تھیں اور پھر اُس نے اپنی آنکھیں موندلیں اور تمام غلطیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر یوں کیا ہوتا تو یہ ہوتا۔ اگر یوں نہ کیا ہوتا تو یوں ہوتا۔ لیکن ابھی تک وہ اپنی غلطیوں کا تعین تاریخ اور مقام کے مطابق نہیں کر سکا تھا بہت سے واقعات جنھیں وہ اپنی غلطیوں اور اُن کے نتائج سے تعبیر کرتا تھا آپس میں اس طرح مدغم ہوگئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا یا پہلے اور بعد کی نشاندہی کرنی صرف شاید کی حد تک ممکن تھا۔ البتہ اُس کے قد کا سہارا کارآمد ثابت ہوا اور پھر اُس نے کام شروع کیا جہاں اُسے تالاب میں صرف اپنی ہی صورت نظر آتی تھی اور کنویں میں پھینکے ہوئے پتھر کی آواز دُنیا میں سب سے خوبصورت آواز تھی اور پھر وہ سوچنے لگا: "تیرے جیسا کون ہے؟" "ساری دنیا تیرے لئے ہے" بہت سی ملی جلی آوازیں ایک ساتھ آنے لگیں۔ مینڈک کے ٹھیکروں سے لے کر بجلی کے سیل تک کی آوازیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کو بہت سی بھیڑ بکریاں نظر آئیں جو چار دیواری کے اندر دوڑ رہی تھیں مگر باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ اور کانوں میں بار بار آوازیں آتی رہیں۔

"دیکھو باہر نہ نکلنے پائیں"

"دروازہ مضبوطی سے بند ہے نا؟"

"چاروں طرف گیدڑ پھر رہے ہیں"

"اور اغوا کرنے والے آدمی بھی"

"کہیں زہریلی گھاس نہ کھالیں"

"کسی سے ٹکرا کر اپنے کو زخمی نہ کرلیں"

"سردی نہ لگ جائے!"

"انھیں اچھے بُرے کی تمیز کہاں!"

اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی بھیڑ بکریوں کے درمیان کھڑا ہے اور جو ہدایات بھیڑ بکریوں کے لئے تھیں وہی اُس کے لئے بھی تھیں۔ اُس کا جی چاہا کہ اس جبر کے خلاف احتجاج کرے مگر احتجاج کے لئے جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ اُسے نہ آتے تھے۔ جبر کا احساس شدید ہو گیا۔ وہ چار دیواری کے دروازے کی جانب بھاگا اور اُسے بند دیکھ کر دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ بھیڑیں بھی اُس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھیں اور جب وہ دروازہ کھلا تو یہ بھی کسی نہ کسی کی پناہ میں تھا۔ لا پناہی کے شوق اور بیچارگی کے احساس نے اُسے جھنجوڑنا شروع کیا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں لیکن فوراً ہی بند کرلیں کیونکہ سامنے دیوار پر لگی ہوئی سفیدی اور جھرّیوں والی تصویر اُسے بہت بُری لگی۔ اُس نے کئی جملے ادا کئے۔ کچھ زبان پر آئے اور کچھ نہیں۔

"یہاں تو دو ہی چیزیں ہیں جبر یا عصمت۔ دونوں خود مختار۔
آگے چلو۔" اور اُسے آگے چلنے کے لئے تین سو ساٹھ ڈگری کا زاویہ
بنانا پڑا کیونکہ وہ جس سمت میں دیکھ رہا تھا اُس کے آگے گہری کھائی تھی
جس میں چٹانوں پر اُگے ہوئے بانس سے شبنم کے قطرے ٹپک رہے
تھے۔ اُس کے سارے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اُس نے انگڑائی لی
اور اُس کا جی چاہا کہ شبنم کے قطروں کو پیالے میں جمع کر لے۔ اُس نے
ادھر اُدھر دیکھا اور سوچنے لگا۔ لوگ مجھے دیکھ کیوں رہے ہیں۔
کیا یہ میرے ارادوں کو سمجھ گئے ہیں۔ مگر میں بھی اب انھیں کی طرح ہوں؟
کیا مجھے حق نہیں کہ میں جو چاہوں کروں اور پھر وہ چاروں طرف پھیلے
ہوئے گیہوں کے کھیتوں کو دیکھنے لگا اور پھر درختوں میں لگے ہوئے
سیب کو للچائی نظروں سے دیکھا اور اُن کی طرف بڑھا پیچھے سے
کئی آوازیں آئیں کچھ مردانی کچھ زنانی آوازیں۔

"ٹھہرو۔ تم من مانی نہیں کر سکتے۔"

"تمہیں روایت کا پاس نہیں!"

"تم دین اور مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں کے
ماتحت ہو۔"

"کیا تم نے اِسی کرتوت کے لئے شخصیت کا لبادہ
اوڑھا ہے؟"

"تم اب جانور تو نہیں ہو انسان ہو۔"

"لوگ کیا کہیں گے۔"

اور اُسے ایسا لگا جیسے بھیڑ بکریوں کے مویشی خانے سے
نکل کر بھی وہ آزاد نہیں ہے اور پھر اُسے چاروں طرف زنجیریں
دکھائی دینے لگیں جو اُس کے ہاتھ اور پیر کو حرکت کرنے سے
روک رہی تھیں۔ اُس نے سوچا۔

"یہی تو پہلے بھی ہوا تھا۔ مگر میں نے یہی چاہا تھا کہ اِس
زندگی میں وہ نہ کروں گا جو پہلے کرتا تھا۔"

اُس نے زور کا جھٹکا دیا۔ قریب کی زنجیروں کو توڑ دیا اور
بھاگنے لگا۔ یہاں تک کہ اب اُسے زنانی اور مردانی آوازیں نہیں
سنائی دیتی تھیں۔ اب وہ ایک کھلے میدان میں کھڑا تھا۔ سورج
کی تپش سے بچنے کے لئے اُس نے ایک درخت کا سہارا لیا تھا۔
لیکن اُسے فوراً ہی احساس ہوا کہ درخت خود خزاں زدہ ہے۔
اُس کی پتیاں جھڑ رہی تھیں اور وہ زیادہ دیر اُس کی پناہ گاہ نہیں
بن سکتا تھا۔ اُس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا اور سوچنے لگا۔

"ان زنجیروں کے پیچھے جو دیواروں سے گھرا ہوا صحن تھا اُس
کے پاس والان میں تو سارا انتظام تھا۔ کھانے کا سونے
کا۔ بارش اور ہوا سے بچنے کا۔ لیکن زنجیریں!"

اور زنجیروں کا خیال آتے ہی وہ اپنے آپ بڑبڑانے
لگا "نہیں۔ یہی تو میں نے چاہا تھا اب وہ نہ ہوگا جو پہلے ہوا تھا۔
اِس جنم میں زنجیروں کے سہارے نہیں رہ سکتا" لیکن زندہ رہنا
بھی ضروری تھا۔ اپنے مادّی جسم میں میٹابولزم کے عمل کو جاری
رکھنے کے لئے۔ یہ تو ایک فطری جبر ہے جس سے چھٹکارا نہیں مل
سکتا۔ اُس نے بڑی دیر تک غور کیا۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی۔
اب اُس پر بھوک اور نیند دونوں کا غلبہ تھا۔ آخر اُس کا حوصلہ
پست ہونے لگا۔ اُس نے سوچا۔ "چلو وہی کرتے ہیں جو پہلے کیا تھا۔
یہاں بھی وہ نہ کر سکا جو کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر وہی کر رہا ہوں جو
پہلے کیا تھا۔ اُسے مجبوری کا شدید احساس ہوا۔ لیکن اُس نے
پھر اپنے ارادے کو تقویت دی۔

کوئی بات نہیں۔ ان دو منزلوں پر تو میری قوت ارادی
جبر کے تحت ہو گئی۔ آگے دیکھتا ہوں۔"

اور اِس غیر شعوری چیلنج نے اُس کے اعصاب میں کھچاؤ پیدا کر دیا۔ اس

کی آنکھ کھل گئی اور اس کی نظر اُس پنشن بک پر پڑی جو میز پر احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ اور وہ تمام تصویریں جو دیوار پر ٹنگی تھیں اُس کا منہ چڑھانے لگیں۔ پگڈنڈیوں اور اُن پر چلنے والی بیل گاڑی کی تصویر پکی سڑک اور اس پر چلنے والی سائیکل کی تصویر ہائی وے اور اس پر بھاگتی ہوئی تیز کاروں کی تصویر۔ اُس نے سوچا راستے اور چلنے کے ذرائع تو یہی ہیں۔ کیا بغیر ان راہوں پر چلے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سوچا تو یہی تھا کہ اس پر نہ چلوں گا لیکن میں فضا میں پرواز تو نہیں کر سکتا۔ اور یہ سوچتے ہی اُسے اپنے نازک بازوؤں کا خیال آیا۔ آیکیرس کی مہم جوئی اور سورج کی دشمنی اور ڈیڈیلس کی بھول بھلیاں کا خیال آیا۔ اس کے بعد اُس نے انہیں راہوں پر دھیرے دھیرے کھسکنے میں اپنی عافیت دیکھی۔ لیکن پہلے اور دوسرے جنم میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ اس نے سوچا۔ پہلے تجربے کسی کام کے اگر اُن سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ وہ پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر پکی سڑک پر چلنے لگا لیکن اُس کے جوتے کے تلے جواب دینے لگے اور ہائی وے پر چلتی ہوئی گاڑی پر چڑھنے کے لئے بیتاب ہو گیا اُسے پھر جبر کا احساس ہونے لگا۔ دائمی حرکت کے جبر کا۔ اُس کی میز پر پڑی ہوئی پنشن بک اُسے منزل کا مکروہ چہرہ دکھانے لگی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسا لگا کہ اپنے تمام جسم کے اعضا کو سکوڑ کر اُس نے ہاتھ جیب کیا اور پھر زور سے ہنسا اور بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کم سے کم میں نے ایک مقصد تو حاصل کر لیا۔
بجائے نیچے سے شروع کرنے کے بلندیوں پر چلنا شروع کیا۔
مگر کتنی بلندی؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

ابھی وہ اپنے ماتحت کو ڈانٹ ڈپٹ کر فارغ ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اُس کی فیکٹری میں آگ لگ گئی تھی اور فائر بریگیڈ کا عملہ اُسے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے دن وہ کرسی نشینوں کے سامنے اُسی طرح کھڑا تھا جس طرح پہلے اُس کا ماتحت اُس کے سامنے گردن جھکائے کھڑا تھا جملے گرامر کے لحاظ سے صحیح تھے الفاظ اور اردو کے معلے اور کنگس انگلش کے تھے مگر اُسے بندش کا احساس اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح پہلے اُس کے ماتحت کو ہوا تھا۔ مادی وسائل کے منقطع ہونے کا احساس بلندی سے نشیب میں دھکیل دیئے جانے کا احساس بلندی اور پستی کی تفاوت اور حد کا احساس اور پھر اُس کی قوتِ ارادی جبر کے تابع ہو گئی اور اُس نے زور سے چیخ کر کہا۔

"پھر دہرا رہا ہوں اُسی کہانی کو جسے بھولنا چاہتا تھا۔"

لیکن دوسرے ہی لمحہ اُسے خیال آیا کہ ایک معاملے میں وہ پہلے سے بہتر ہے۔ اُسے صرف اپنی بے مائگی کا احساس ہے مگر اپنے سے منسلک اوروں کی بے مائگی کا نہیں۔ "یہ ضرور کروں گا" اُس نے زور سے کہا۔ اپنے سے کسی کو منسلک نہ کروں گا اور کروں گا بھی تو اُن کی تعداد میں اضافہ نہ ہونے دوں گا قریب ہی شور و غل کی آواز نے اُس کی آنکھیں کھول دیں

"میں نے بڑی غلطی کی مصیبت پال لی"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایک مرالی کے ساتھ باندھی جا رہی ہوں"

"اُس سے کیا ہوتا ہے۔ اور بھی تو لوگ ہیں"

یہ میری ذمہ داری نہیں۔ میں نے تو اپنا سب کچھ لٹا دیا۔

تم نے مجھے کیا دیا"

"کاش کہ وہ ہو گیا ہوتا تو تم سے پالا نہ پڑتا"

"میں بھی کہاں گرا۔ گرنے کے لئے تو اور جگہیں تھیں"

اور پھر کہیں سے ایک گھمبیر آواز

لوگ کیا کہیں گے

دل اور مذہب کچھ بھی کہیں لوگ کیا کہیں گے

یہ تو جنم جنمان کا بندھن ہے۔

"نہیں اس جنم کا نہیں۔ اُس نے چیخ کر کہا۔

اور مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دو قدم آگے چلتا تھا

توبندھن اُسے دو قدم پیچھے جانے پر مجبور کرتا تھا۔ اُس کی رفتار بہت سست ہو گئی ایک ہی سمت' ایک ہی راستے پر اور اُس نے سوچا کتنا ہی رنگین سہی بندھن تو بندھن ہوتا ہے۔ اور اُسے پھر جبر کا احساس ہوا لیکن اُس نے بلند آواز میں کہا

"اس کے نہ کرنے پر تو مجھے اختیار ہے اور اب میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ وہ نہ کروں گا جو پہلے کیا تھا"

تنہائی بہت اچھی لگی یہ تنہائی ہی تھی جس میں اُسے سوچنے سمجھنے چلنے پھرنے کی آزادی تھی۔ وہ وقت اور جگہ کی پابندی سے آزاد تھا۔ کھانے کے اوقات خود مقرر کرتا تھا۔ کپڑوں کا انتخاب خود کرتا تھا یہاں تک کہ کپڑے پہننے اور نہ پہننے کا بھی۔ اگر وہ گاتا گاتا تھا تو کوئی یہ کہنے والا نہیں تھا کہ اس میں تکنیکی طور پر کون سی خرابی ہے۔ وہ بولتا تھا تو کوئی اُس کی گرامر یا الفاظ کی صحت پر رائے دینے والا نہیں تھا۔ کوئی اُس سے میک اپ کی تعریف کرنے کے لئے نہیں کہتا تھا۔ اس لئے وہ جھوٹ سے بھی آزاد تھا۔ اور یہ سوچ کر وہ زور سے ہنسا اور بولا۔

"یہ عصمت جبر کے تابع نہیں میرے عمل کے تابع ہے"

گھڑی کے پنڈولم میں آدھی رات کے بعد دو گھنٹے گذرنے کی آواز آئی اور اُسے سوتے میں ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "کب تک"

وہ صبح صبح گھر سے نکلا۔ تفریحاً نہیں بلکہ جبراً۔ اس لئے کہ وہ زندگی کے ہر جبر پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ اُس نے غور کیا۔ یہ زمانہ کم سے کم کا تھا۔ مینیمم ڈریس

مینیمم فورس

مینیمم سبسٹینس

اور نتیجتاً مینیمم لائف

اور مینیمم اور میکسیمم

میں فاصلہ

بہت کم تھا۔ میکسیمم رزو تھا مینیمم عام۔ اور وہ ایک عام آدمی تھا۔ اُس نے سوچا اگر سب کچھ مینیمم ہے تو جبر بھی کم سے کم ہونا چاہیئے لیکن وہ کا قائل نہیں تھا۔ اُس میں تو صرف ایک طرح کے جبر کو کم کر کے میکسیمم سکون کا راز پوشیدہ تھا' اور پھر یہ میکسیمم طرح طرح کے جبر کو جنم دیتا تھا۔ وہ تو ہر طرح کے جبر سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ وہ گلی کے موڑ سے سڑک کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ کئی آوازیں اُس کے کانوں میں آئیں۔

"بیچارہ"

"مگر کیوں!"

"معلوم نہیں۔ ہو گی کوئی بات۔ آجکل کون جوان مرد اکیلا رہتا ہے"

تجرد کیوں؟

مجھے کیا معلوم

اوں اوں۔ قہقہہ

یار کچھ کرنا پڑے گا۔ یہاں سب فیملی والے رہتے ہیں۔

یہ بھی کوئی بات ہے اور وہ دفتر پہنچا ہی تھا کہ طلبی ہو گئی۔ اُس کا باس کہہ رہا تھا

سنا ہے تم اکیلے رہتے ہو

جی کیوں؟

جناب یہ میرا ذاتی معاملہ ہے

اُس کا باس کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا

دیکھو میرے دوست ہیں۔ ڈاکٹر جی فروش۔ ماہر جنسیات و نفسیات اُنھیں چھٹی لکھ دیتا ہوں۔ مل لو اُن سے۔

"جی وہ بات نہیں"

"پھر"

"تم لبس ہے اصول"

"ارے بھائی۔ اصول وصول کچھ نہیں ہوتے۔ تم جنگل میں تو رہتے نہیں۔ لوگ کیا کہتے ہیں بس یہی کاؤنٹ کرتا ہے۔"

باہر نکلا تو غم اور غصّے کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھا وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر کوئی دوسرا اُس کی آواز نہ سُن سکتا تھا حالانکہ اُس کے چاروں طرف ہجوم تھا۔

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ کیا میں دوسروں کی زندگی جیتا ہوں؟"

"مجھے اپنی زندگی گذارنے کا حق نہیں"

میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیتا لیکن ہر شخص کو مجھ سے شکایت ہے میں غیر منسلک رہنا چاہتا ہوں لیکن دوسرے مجھ سے خواہ مخواہ منسلک ہو جاتے ہیں۔

کیا زندگی صرف رشتوں کا نام ہے۔

اور پھر اُسے محسوس ہوا کہ بہت سے ہاتھ اُس کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔ بھانت بھانت کے انجانے اور خوفناک چہرے اُسے ڈرا رہے تھے۔ زنجیریں اور رسیاں لئے لوگ اُس کی طرف بڑھ رہے تھے اور ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ زندگی صرف بندھن ہے رشتہ ہے۔ الحاق ہے اور پھر لوگوں نے بڑھ کر اُسے زنجیریں پہنا دیں۔ اور اُسے جیل خانے کے صحن میں ڈال دیا۔ پہلے خوشبو پھیلی۔ پھر پودے اگے۔ پھر پھول کھلے اور پھر اُس کی شخصیت معدوم ہو گئی۔ اب وہ صرف پودوں اور پھولوں کے رشتوں سے جانا جاتا تھا اُس کے ہاتھوں کو کوئی اور اُٹھاتا تھا۔ اُس کے پیروں کو کوئی اور چلاتا تھا۔ وہ مفلوج تھا۔ شاید اُس کی سانس اپنی تھی یا شاید وہ بھی نہیں

اُس نے بستر پر تڑپنا شروع کیا۔ کسی سانتم بولزم سے آزاد ہونے کے لئے کسی دوسری راہ کو اختیار کرنے کے لئے۔ وہ نہ کرنے کے لئے جو اُس نے پہلے کیا تھا۔ مگر ساری کوششیں بیکار تھیں۔ جبر اُس کی ساری زندگی پر حاوی ہو چکا تھا۔ راستے کھو گئے تھے صرف ایک منزل باقی تھی اور وہ سامنے کی لاشے۔ اُس کی آنکھ کھل گئی سفید بالوں والی پپڑی جمی ہوئی کھالوں والی تصویر پھر اُس کے سامنے تھی اور وہ سوچ رہا تھا۔ میں پھر جبر کا شکار ہو گیا۔ میں نے پھر وہی کیا جو پہلے کیا تھا اور شاید پھر میرا جنم ہو تو وہی کروں گا جو پہلے کیا تھا۔ میں خود راہوں پر نہیں چل سکتا۔ میرا ارادہ مفقود ہے۔ میں ایک روبوٹ ہوں۔

اور بہت سی جانی پہچانی شکلیں اُس کے سامنے سے گذرنے لگیں۔ سقراط کی، جوش ملیح آبادی کی، فراق گورکھپوری کی۔

---

نعیم آروی

# واپسی

بات عجیب اور حیرت انگیز تھی میرے لئے ہی نہیں ان سب کے لئے جو اُس وقت وہاں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے سب کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا تھا۔ لوہے کے پنجرے کا دروازہ اٹھا ہوا تھا اور سرخ چونچ والے طوطے کا خوبصورت جوڑا آگے پیچھے اندر داخل ہو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہاں سے چھٹنے والی بھیڑ دوبارہ جمع ہو چکی تھی۔

پریس کلب کی سڑک کے اس حصے پر سرور شہید روڈ نام کی تختی نصب ہے سڑک کے بائیں طرف ملٹری اکاؤنٹس کے بیرکس اور دفاتر ہیں کھپریل کی نیچی چھتوں پر پیپل، برگد اور جامن کے درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی ہیں اور ان کے نیم روشن کمروں میں کلرکوں کے سر اور فائلوں کے ڈھیر ہلتے نظر آتے ہیں۔

ملٹری اکاؤنٹس کے دفاتر کے مقابل وکٹورین ایرا کا ایک قدرے سنسان بنگلہ ہے جس کے وسیع لان میں مختلف قسم کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ لان میں خود رو گھاس اور ببول کی جھاڑیاں بے ترتیبی سے اگی ہوئی ہیں لان اور پریس کلب کی دیوار کے ساتھ لگ مینا اور کیکٹس کی جھاڑیاں بھی ہیں جن پر شاید کبھی توجہ نہیں دی گئی، مگر ان کو دیکھ کر انہیں گملوں اور ڈیکوریشن پاٹ میں سجانے کا خیال آپ ہی آپ اُبھرتا ہے بنگلہ کی سیما جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے مین سڑک گزرتی ہے۔ وہیں سگنل کا لال پیلا ہرا ویلو ایستادہ ہے یہاں سے چار راستے شہر کی چار مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہیں یہیں وہ زینب مارکیٹ بھی ہے، جس کے فٹ پاتھ پر وہ انوکھا واقعہ رونما ہوا تھا اور جس کو دیکھ کر وہاں موجود ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔

" بھئی یہ تو کمال ہو گیا۔

" کیا ایسا ممکن ہے ؟" ان آوازوں اور سوالوں میں تحیّر کا پہلو نمایاں تھا۔

زینب مارکیٹ کے اُس کشادہ دروازہ کے باہر ان ٹینگ، سمور اور چمڑے کے جیکیٹوں، ٹوپیوں، ہینڈ بیگ اور جدید قسم کے فیشن کے ملبوسات کی دوکانیں ہیں ان کے علاوہ ہاتھی دانت پیتل چاندی اور قیمتی لکڑیوں کے بنے ہوئے تحائف کی بھی دکانیں ہیں جہاں اکثر و بیشتر غیر ملکی جہازرانوں، ملاحوں اور سفید فام امریکی سیاحوں کی بھیڑ دیکھنے میں آتی ہے مقامی لوگ ادھر کا کم ہی رُخ کرتے ہیں کیونکہ ان دوکانوں سے تحائف کی خریداری کے خیال تک کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دکاندار بڑے متمول اور توہم پرست مسلمان ہیں۔

اس جگہ لوہے کی ریلنگ کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر ملیر گوٹھ سے ہر روز ایک چمرخ میلا سا چڑی مار لوہے کے تین چار پنجروں کے ساتھ وہاں آکر بیٹھ جاتا جن میں مختلف نسل و اقسام کے پرندے کبھی خاموش اور کبھی کبھی چہکاریں مار رہے ہوتے۔ زینب مارکیٹ کے متمول دوکانداروں کو پرندے خرید کر گھر لے جانے کا نہیں بلکہ جمعرات بھری مراد کا نعرہ لگا کر انہیں آزاد کرنے کا جنون ہے۔ بعض دکاندار کہتے

"اِدھر پنجرے کا دروازہ کھلتا ہے، اُدھر رحمت کا۔ بلائیں پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے بھاگ جاتی ہیں" یوں تو ہر روز چڑی مار کے دو چار طوطے اور مینائیں آزاد کر دی جاتیں، لیکن جمعرات کے روز تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ اس روز منتیں مان کر چڑیائیں آزاد کی جاتیں۔

زینب مارکیٹ کے اندرونی حصے کے دوکاندار بھی پرنس لیدر گارمنٹ کے قریب پہنچ جاتے تاکہ اس کارِ خیر میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ بڑا عجیب منظر دیکھنے میں آتا جب کوئی دوکاندار لوہے یا لکڑی کی تیلیوں کے پنجرے کا دروازہ کھولتا تو پرندے کچھ دیر احتیاط سے اپنے اطراف کا جائزہ لیتے پھر ایک دوبار اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر پنجرے کے دروازے سے باہر نکلتے اور سگنل کے قریب غوطہ لگا کر اونچی اڑان کے لئے پروں کو پھیلا دیتے آزادی کی پہلی پرواز۔

ان کی پہلی منزل تو وہی ملٹری اکاؤنٹس اور سڑک کی دوسری جانب نیم خاموش بنگلہ کے لان میں پھیلے ہوئے درختوں کی کوئی گھنی شاخ ہوتی۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا کہ وہ وہاں بیٹھ کر ایک لمبی قید و بند کے بعد خود کو حقیقی آزادی کا یقین دلاتے ہوں گے۔ ان کی دوسری منزل کون سی ہوتی ہوگی اس بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ کیونکہ اس کھیل کے آغاز اور انجام کے دوران شام کی روشنی بجھ چکی ہوتی اور درختوں کی شاخیں مکمل طور پر تاریکی میں تحلیل ہو جاتیں۔ اس کھیل میں مجھے ہمیشہ دو باتیں یاد رہ جاتیں۔ ایک تو آغاز میں پرندوں کی لڑکھڑاتی ہوئی پرواز میں جوشش پرواز اور دوسرے دوکانداروں کے چہروں پر پرندوں کی آزادی سے پیدا ہونے والی شادمانی کا گہرا احساس۔

اس کارِ خیر میں دوکانداروں کے لئے جنت کا دروازہ کھلے نہ کھلے، مگر اس چڑی مار اور اس کے افراد خاندان کے لئے معقول آمدنی کا دروازہ ضرور کھل گیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی ادھر ادھر کے گوٹھوں کے مزید دو تین چڑی مار وہاں پہنچ گئے تھے ان کے وہاں آنے سے پہلے والے چڑی مار کے دھندے پر کچھ زیادہ برا اثر نہیں پڑا، کیونکہ زینب مارکیٹ کے دوکانداروں کا منافع تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس ماہ تو کمال ہی ہو گیا تلے اوپر تین امریکی جہاز کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے اور ملاحوں نے اچھی خاصی خریداری کر ڈالی۔

یہ سب کچھ اس کارِ خیر کا نتیجہ تھا۔ جتنی تیزی سے خریداری ہوتی اتنی ہی تیزی سے پنجروں کے دروازے کھلنے لگتے۔

اس دن وہاں پہنچا تو دوکانداروں کے علاوہ تماشائیوں کی خاصی بھیڑ جمع تھی، ایک روز پہلے خلیج کے کسی ملک کا جہاز لنگر انداز ہوا تھا اور ملاحوں نے دوکانوں سے تحائف کی زبردست خریداری کی تھی۔ پرنس لیدر گارمنٹ کے مالک کا سب سے بڑا لڑکا عین الحق جوش میں آیا ہوا تھا اور ایک وہ پندرہ کے لگ بھگ پرندے آزاد کر چکا تھا۔ اس کا فربہ اور شوگر کا مریض باپ بڑی رغبت اور پسندیدگی سے بیٹے کے شوق کو دیکھ رہا تھا۔ چڑی مار کے تقریباً تین پنجرے خالی ہو چکے تھے۔ بس ایک رہ گیا تھا۔ جس میں قدرے دو نایاب طوطے باقی رہ گئے تھے۔ ان طوطوں کا قد عام طوطوں سے چھوٹا اور سروں پر سفید رنگ کی کلغی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ تل یا داغ تھے اور باقی جسم کا رنگ گہرا سبز تھا۔ طوطوں نے بھیڑ سے گھبرا کر ایک مرتبہ اپنے پروں کو پھڑپھڑایا تو سچ مچ بڑے خوبصورت دکھائی دیئے۔

عین الحق انہیں ہر قیمت پر آج ہی آزاد کرنے پر بضد تھا۔ اور چڑی مار اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہ رہا تھا چنانچہ قیمت کا معاملہ ایک جگہ آکر رک گیا تھا اور کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دوکاندار کا لڑکا ان طوطوں کو خرید کر آزاد کرنے کے مشن میں ناکام رہے گا جب مسئلہ زیادہ طول پکڑنے لگا اور شام کے سائے تیزی سے پھیلنے لگے تو اس کے باپ نے مداخلت کی اور اپنی روئی بھری موٹی صدری کی جیب سے دس دس کے دس نوٹ نکال کر چڑی مار کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"ابے او چڑی کے تلی، روز کماتا ہے، جیب بھر بھر کے جاتا ہے آج دو پیسے کم لے گا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ گھنٹہ بھر سے نہ نہ کئے جا رہا ہے، چل پکڑ سو روپے اور پنجرے کا دروازہ کھولنے دے "

بڑے سیٹھ کے سامنے چڑی مار بے بس ہو گیا۔ اسے یہ بھی ڈر لگا کہ کہیں آئندہ سیٹھ اس جگہ بیٹھنے کی اجازت نہ دے کیونکہ وہ اپنے پرندوں کے سارے پنجرے دوکان کے سامنے فٹ پاتھ پر ہی رکھتا تھا اس سے ذرا آگے ٹھنڈے پانی کی سبیل تھی جسے دوکانداروں نے چندے کی رقم سے تعمیر کرائی تھی۔ چڑی مار ڈھٹائی سے ہنس دیا۔

" سائیں آپ کی بات بھلا میں ٹالوں گا۔ نہ نہ "

عین الحق کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھل اٹھا۔ اس نے جلدی سے طوطے کا پنجرہ اپنے سر سے بلند کیا دو تین دوکانداروں نے جھٹ پٹ پنجرے کے پیندے کو تھام لیا تاکہ عین الحق اطمینان کے ساتھ دروازہ کھول کر طوطوں کو اڑنے میں مدد دے سکے۔ سب کی نگاہیں پنجرے کے دروازے پر لگی تھیں۔ آخری دو قیدی آزاد ہونے والے تھے۔

پنجرے کا دروازہ کھل گیا تھا، سرخ چونچ اور سفید کلغی والے طوطوں نے کچھ توقف کیا پھر ایک دوسرے کے پیچھے اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے پرواز کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں موجود لوگوں نے بے ساختہ نعرہ لگایا " وہ گئے۔ وہ گئے ـــ "

تماشہ ختم ہو چکا تھا، آخری دو پرندے بھی آزاد ہو چکے تھے۔ بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی اور چڑی مار اپنے میلے جھاڑن سے پنجروں کو صاف کر کے انہیں قد برابر لکڑی کے ڈنڈے کے ہکوں میں پھنسا رہا تھا۔ آخری دو پرندوں کا پنجرہ ابھی تک زمین ہی پر پڑا تھا۔ چڑی مار دوسرے پنجروں کی صفائی کر کے جب آخری پنجرے کی جانب متوجہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی وہاں باقی رہ جانے والے لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سرخ چونچ اور سفید کلغی والے طوطوں کا خوبصورت جوڑا سگنل کے ہرے پیلے سرخ رنگ کے دیو کے سر کے اوپر سے غوطہ لگا کر لوہے کی پتلی پتلی سلاخوں والے پنجرے میں دوبارہ داخل ہو رہا تھا۔

منشا یاد

# سلاٹر ہاؤس

(اپریل ۸۸ء)

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ اب یہ بستی رہنے کے قابل نہیں رہی۔"

"کیسے؟"

کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہر طرف نفرت، فساد اور تشدد"

"وہ تو ہے مگر یہ سب تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔"

"شاید اب اس کی انتہا ہو گئی ہے۔"

"جب کسی ایک جیسی صورت حال کی انتہا ہو جاتی ہے تو نئے دَور کا آغاز ہو جاتا ہے۔"

"یہ کیا ضروری ہے؟"

"یہ فطرت کا اصول ہے جب اشجار کے سارے یا بیشتر پتے جھڑ جاتے ہیں تو نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ بہار کی آمد آمد ہوتی ہے"

یہ بھی اٹل سچائی نہیں ہے۔ سدا بہار درخت خزاں میں بھی ہرے بھرے رہتے ہیں اور دیمک لگ جائے یا کلہاڑا چلے تو بھری بہار میں بھی شجر۔۔۔"

"تم نے سنا نہیں ہر کمالے را زوالے وہر زوالے۔۔"

یہ بھی ضروری نہیں۔ شاید پہلے ایسا ہوتا ہوگا۔ اب تو جنہیں ایک مرتبہ کمال حاصل ہو جاتا ہے وہ زوال کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے اور بعض لوگ زوال میں اس طرح گھر جاتے ہیں کہ نئی نسلوں کے بعد بھی اس کی گرفت سے نہیں نکل پاتے۔"

عروج و زوال کی بہت سی صورتیں ہیں ضروری نہیں کہ وہ سب آسانی سے نظر بھی آ سکیں یا ہم انہیں ظاہر کی آنکھ سے دیکھ اور ان کا ادراک کر سکیں۔ وقت ہی اس کا فیصلہ کرتا ہے کہ کسی زوال یافتہ یا عروج سے ہم کنار فرد یا معاشرے کا انجام کیا ہوا؟"

"یہاں تو حالات روز بروز ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ صورتِ حال تیزی سے تبدیلی کی طرف جا رہی ہے۔"

"تبدیلی؟۔ مجھے تو لگتا ہے وقت ٹھہر گیا ہے۔ سُورج سوا نیزے پر آ کر ٹک گیا ہے دوپہر ڈھلنے کا نام نہیں لیتی۔ اور ہم سب آہستہ آہستہ پتھر ہوتے جا رہے ہیں۔"

ایسا ہرگز نہیں ہے وقت کبھی نہیں رُکتا۔ کائنات میں تغیّر و تبدل کا عمل ہر لمحے جاری رہتا ہے اور تبدیلی ناگزیر ہے۔"

محض تبدیلی بے معنی چیز ہے۔ موسم کی تبدیلی سے ٹھٹھر کر مرنے کے بجائے آدمی آتش فشاں آگ اور لاوے میں بھسم ہو جائے یا پیاس سے مرنے کے بجائے سیلاب میں ڈوب کر ہلاک ہو جائے تو ایسی تبدیلی کا کیا فائدہ؟"

"تبدیلی مثبت بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"جب آپ منفی ہتھکنڈوں کے بیچ بوتے چلے جائیں تو مثبت تبدیلی کیسے آئے گی۔ اس بستی میں مثبت نتائج کے حصول کے لئے ہمیشہ منفی رویے اختیار کئے گئے۔ انسانی خون کو ارزاں کر دیا گیا ظلم، دہشت گردی اور تشدد کو رواج دیا گیا خوف و ہراس اور عدم تحفظ کی ایسی فضا قائم کر دی گئی کہ لوگ خودغرض حریص اور کمینے ہوتے چلے گئے۔"

یہ سب ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کوئی نئی بات نہیں۔ کیا تم بھول گئے کہ اس وقت بھی جب دُنیا میں صرف چار یا پانچ لوگ تھے۔ بھائی نے بھائی کا خون بہایا میں نے کہیں پڑھا ہے کہ انسانی تاریخ کے چار ہزار برسوں میں مجموعی طور پر صرف 234 برس ایسے برس گزرے ہیں کسی ملک میں جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔"

ہاں مگر پہلے زمانے کی جنگیں اور طرح کی ہوتی تھیں یہ شہریوں کے خلاف نہیں فوجیوں کے خلاف لڑی جاتی تھیں ان میں کسی حد تک بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ بھی ہوتا تھا۔ اب ایک کمزور ناتواں اور کمینہ شخص بھی بم یا راکٹ پھینک کر اور کسی مشین کا بٹن دبا کر ان گنت بہادروں کو موت کی نیند سلا سکتا ہے"

"کیا تم اِن جنگوں کو بھول گئے جن کے سلسلے طویل مدت تک چلے اور وہ جنگیں۔ جن میں کھوپڑیوں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ بستیوں کو تاراج کر دیا جاتا تھا۔ پکی ہوئی فصلوں اور پھلوں سے لدے اشجار کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ مردوں کو تہہ و تیغ کر دیا جاتا تھا اور عورتوں اور بچوں کو کنیزیں اور غلام بنا لیا جاتا تھا۔ ان کی خرید و فروخت کی منڈیاں لگتی تھیں۔ پھر عالمی جنگیں۔۔۔۔"

میں اس سے پہلے زمانے کی بات کر رہا ہوں جب جنگ بستیوں سے دُور کھلے میدانوں میں لڑی جاتی تھی۔ تلوار سے ایک آدمی ایک وقت میں ایک ہی آدمی کو قتل یا زخمی کر سکتا تھا۔ لڑنے والے کے ہاتھ میں تیر کمان یا تلوار ہوتی تھی بم نہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ اونٹ گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہوتا تھا ٹینک اور طیارے میں نہیں۔"

قتل و غارت اب بھی ہوتا ہے تب بھی ہوتا تھا۔ یہ دُنیا جب سے بنی ہے اور جب تک رہے گی یہ سب اس کے ساتھ اسی طرح چلے گا اور ہم سب کو اسی طرح کے حالات میں جینا اور زندگی گذارنا ہے اگر ہم قتل و غارت سے گھبرانے لگیں تو زندگی وبال ہو جائے۔ دراصل یہ دُنیا ایک بڑی قتل گاہ ہے جہاں ہر لمحے لاکھوں کروڑوں زندگیوں کو موت کی آغوش سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔ طبعی موت تو قدرت کا تسلیم شدہ اصول ہے لیکن اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ہابیل قابیل کے زمانے سے لیکر اب تک تہہ تیغ کئے جانے والے تمام انسانوں کی صحیح تعداد معلوم ہو سکے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ یہ دُنیا واقعی ایک سلاٹر ہاؤس ہے ایک بوچڑخانہ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی ہر دم آگے بڑھتی رہی ہے اور اس نے موت کو شکست دی ہے۔

میں ظلم، ناانصافی اور تشدد سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ تشدد بدصورتی اور بدذوقی ہے۔ اور موجودہ دَور میں بدذوقی کی انتہا ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے تشدد کی موجودہ فضا کا آغاز اس روز سے ہوا جب ہم آپ جیسے ایک شخص کو کڑاہی میں باندھ کر اس کی کھال ادھیڑی گئی تھی۔ تمہیں خوفزدہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا وہ میدان یاد ہے اور وہ منظر بھی؟ سب کی چیخیں نکل گئی تھیں لیکن کچھ دیر بعد آخرکار وہ سب ہنسنے لگے تھے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سفاکی کے ایسے مظاہروں کے عادی ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے سفاکی کی تربیت حاصل کر لی اور اب ہر شخص خود ہاتھ میں کوڑا لئے ننگی پیٹھ کی تلاش میں ہے۔"

یہ بھی درست ہے مگر ہم ایک لمبی بحث میں پڑ گئے ہیں۔
جس کا چارہ ہمارے پاس فی الحال کوئی حل نہیں ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تم اپنا ارادہ بدل دو وہ اس لئے بھی کہ یہ خرابی صرف اس ایک بستی تک محدود نہیں۔ پوری دُنیا اس کی لپیٹ میں ہے تم ہر روز اخبارات پڑھتے، ریڈیو سنتے اور ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہو کہ دُنیا میں کہیں نہ کہیں جنگ ہو رہی ہے۔ شہری آبادیوں پر بم گرائے جاتے ہیں۔ کیمیاوی ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں۔ مسافر طیاروں کو نشانۂ ستم بنایا جاتا ہے۔ سمندری جہازوں کو عملے سمیت غرق کر دیا جاتا ہے دُنیا میں ہر طرف دھماکے ہو رہے ہیں۔ بس کے اڈوں ریلوے اسٹیشنوں، ہوائی اڈوں، بازاروں ہوٹلوں اور سبزی کی دکانوں میں کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ چلتی ٹرینیں، نجی کاریں، اڑتے جہاز بے گناہ اور معصوم شہریوں کے پرخچے اڑ جاتے ہیں ان کی کھوپڑیاں ہوا میں اچھلتی اور ہڈیاں دُور دُور تک بکھر جاتی ہیں۔

میں نے اسی وجہ سے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں نہیں رہوں گا میں قتل و غارت، دہشت گردی اور ظلم و تشدد کو مزید برداشت نہیں کر سکتا میں اس سے دُور بھاگ جانا چاہتا ہوں۔"

"بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ کوئی شہر قصبہ اور ملک ایسے حادثات اور المیوں سے محفوظ نہیں ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کچھ عرصہ کے لئے اخبار پڑھنا اور ریڈیو ٹی وی سے خبریں اور حالات حاضرہ کے پروگرام دیکھنا سننا بند کر دو۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کیا میرے خبریں نہ سننے سے دُنیا میں امن قائم ہو جائے گا؟ اور پھر محض خبریں ہی نہیں ہر جگہ اور ہر وقت ایسے لوگ ملتے ہیں جو تشدد کے مرتکب یا شکار ہو چکے ہوتے ہیں یا ہو رہے ہوتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ تفریح کے پروگرام اور لٹریچر بھی تشدد کے اظہار و بیان سے خالی نہیں ہے ویڈیو کیسٹ کی دکانوں اور اخبارات میں چھپنے والے فلموں کے اشتہار دیکھ کر بھی وحشت ہونے لگتی ہے۔ موت کے سوداگر۔ کرائے کے قاتل، ہنڈرڈ راؤنڈز، خوفناک، انتقام، ظلم دا بدلہ، آگ ہی آگ کل لینڈ کل اگین۔"

اشتہاروں اور پوسٹروں میں جو تصویریں دکھائی جاتی ہیں ان کے ہیرو اور ولینز چہرے لہراتے، گولیاں چلاتے، غیض و غضب سے چنگھارتے اور للکارتے نظر آتے ہیں شاید ہم ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے اور انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ہم اور ہمارے بچے ایسی فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ غالباً ان سے ہمارے ایسے جذبوں کی تسکین ہوتی ہے جو اپنے ساتھیوں، مخالفین اور رقیبوں کے لئے ہمارے اندر موجود ہوتے ہیں۔ ہماری سیاست جلتی پر تیل چھڑکتی رہتی ہے۔ ہر آنے والا جانے والے کے احتساب پر تلا رہتا ہے برسوں تک ہر صبح اخبار کے پہلے صفحے پر نظر آنے والا ہر دلعزیز لیڈر ایک روز اچانک "مجرم" قرار پاتا ہے اور اچانک ساری تصویروں خبروں اور افواہوں سے خارج ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اسے برسر عام اور بعض اوقات خفیہ طریقے سے قتل کر دیا جاتا ہے قتل نہ کیا جا سکے تو اس کی زندگی ضرور عذاب بنا دی جاتی ہے سیاسی لیڈروں کے بیانات پڑھ کر ہول آتا ہے۔

"منہ کی کھانی پڑے گی۔"
"اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"
"کیفر کردار کو پہنچا دیا جائے گا۔"
زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔
"احتساب کیا جائے۔"
"سزائے موت دی جائے۔"

مذہبی پیشواؤں کا کام خیر و برکت کی نوید سنانا

امن و آشتی اور محبت کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے مطالبہ کرتے ہیں۔

درّے لگائے جائیں!

ہاتھ کاٹ دیئے جائیں!

سولی پر چڑھایا جائے!

"سنگسار کیا جائے!"

اخبارات تشدّد کی خبروں کو خاص طور پر دلچسپ سرخیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ناک کاٹ دی۔

تیزاب پھینک کر چہرہ بگاڑ دیا

کم سن بچّے سے بدفعلی کے بعد گلا گھونٹ دیا۔

چھری مار کر آنتیں باہر نکال دیں۔

جہیز نہ لانے پر زندہ جلا ڈالا۔

کھانے میں زہر دے دیا۔

اب تم ہی بتاؤ کیا یہ بستی رہنے کے قابل ہے۔ کم از کم میں تو اب یہاں بالکل نہیں ٹھہر سکتا۔

"لیکن تم جاؤ گے کہاں؟ کیا واپس گاؤں جانے کا ارادہ ہے؟"

نہیں۔ میں گاؤں سے بھاگ کر تو یہاں آیا تھا۔ وہاں آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے جن کا محض تصوّر کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارا گاؤں بہت خوبصورت ہے جگہ جگہ باغات پانی کے تالاب اور درختوں کے جھنڈ۔ قریب ہی نہر بہتی ہے جس کے دونوں جانب ہرے بھرے خوبصورت کھیت حدّ نظر تک پھیلے نظر آتے ہیں۔ لیکن گاؤں کے دو قبیلوں میں پچھلے پچاس ساٹھ برس سے دشمنی چلی آتی ہے۔ ان بد ذوقوں نے انتقام در انتقام کے سلسلے میں بے شمار خونریزیاں کی ہیں۔ انہوں نے زمین کا کوئی خوبصورت ٹکڑا ایسا نہیں چھوڑا جو خون آلود نہ ہو۔ سب سے پہلا قتل پانی کی باری پر کھیتوں میں ہوا تھا۔ دوسرا قتل مخالفین نے اناروں والے باغ کے قریب اس وقت کیا جب چاندنی رات میں مقتول اپنے دھان کے بوہل کے قریب سویا ہوا تھا۔ وہ اُسے گنڈاسوں، برچھیوں سے چھلنی کر کے بوہل پر سسکتا چھوڑ آئے تھے یقیناً اس کی موت نہایت اذیت ناک تھی اس کے جواب میں مخالفین نے ان کے ایک نوجوان کو نہر کے کنارے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک اور لڑکے کو جب وہ اسکول سے واپس آ رہا تھا گلی میں پکڑ کر دن دہاڑے ذبح کر دیا گیا۔ جب وہ اس پر چھریاں چلا رہے تھے اس کی ماں سامنے چھت پر کھڑی دو ہتڑوں سے چھاتی پیٹ رہی تھی اور واسطے دے رہی تھی۔ لڑھا رحمان آم کے باغ میں قتل ہوا۔ وہ پیٹ سے باہر نکلی آنتوں کو سنبھالے خود اپنے پاؤں چل کر گھر کی چوکھٹ تک آ گیا۔ مگر چوکھٹ عبور نہ کر سکا۔ علیا کو ایک کمہار لڑکے سے قتل کرایا گیا۔ جس نے ٹوکا مار کر اس کی گردن اڑا دی کہتے ہیں یہ وار اتنا اچانک، بھرپور اور خلاف توقع تھا کہ بے سر کے جسم نے اُچھل کر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور اس کے کٹے ہوئے سر پر کھلی آنکھیں دیر تک حیرت اور غصّے سے قاتل کو گھورتی رہیں۔ علیا کے بھائیوں نے جب کمہاروں کے لڑکے کو قتل کیا تو پہلے اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے۔ پھر ناک، پھر کان۔ اس کے بعد وہ اس بچے کھچے آدمی کو گنڈاسے میں پرو کر رات بھر کھیتوں اور کھلیانوں میں لئے پھرے اور اس سے علیا کے قتل پر اکسانے والوں کے نام پوچھتے اور اسے ایذا پہنچا کر انتقام لیتے رہے۔ وہ ان کی منت سماجت کرتا انہیں خدا رسول کا واسطہ دیتا کہ وہ اس کے گلے پر ٹوکا مار کر اسے اس عذاب سے نجات دلائیں مگر وہ اسے زیادہ سے زیادہ دیر تک اذیت دینا چاہتے تھے۔ پھر وہ انہیں فحش گالیاں

دینے لگا تاکہ وہ طیش میں آ کر اس کا گلا کاٹ دیں یا گولی دیں۔ مگر وہ اس کے جسم میں خنجر کی نوک اتار کر نکال لیتے۔ آخر کار خون بہہ جانے کی وجہ سے اس پر غشی طاری ہو گئی اور وہ ختم ہو گیا۔ قاتلوں کی اس بنا پر بھی تشفی نہ ہوئی انہوں نے اس کا قیمہ کیا اور بستی نہر میں دُور تک بکھیر دیا تاکہ اس کا کوئی سُراغ نہ مِل سکے۔"

"یار یہ تو بہت ہولناک واقعات ہیں۔"

ایسے واقعات دیہات میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں اسی لئے میں وہاں سے بھاگ آیا تھا خود میرے ایک چچا نے کسی کا خون کر دیا تھا اور اب اشتہاری ملزم تھے۔ اگر میں تعلیم کے بہانے گاؤں سے بھاگ کر نہ آتا تو کسی کے خون سے ہاتھ رنگتا یا مجھے کوئی مار ڈالتا

گاؤں میں وقت کے ساتھ تبدیلی نہیں آئی؟"

تبدیلی آئی ہے۔ اب وہاں گنڈاسوں اور برچھیوں کی جگہ رائفلوں اور کلاشنکوفوں کا استعمال ہوتا ہے۔ دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ پہلے قاتل گرفتار ہو جاتے یا خود پیش ہو جاتے تھے۔ اب انہیں وڈیروں اور سیاسی لیڈروں کی پشت پناہی حاصل ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم گاؤں نہیں جاؤ گے؟"

"بالکل نہیں۔"

"اور تم نے یہاں نہ رہنے کا بھی اٹل فیصلہ کر لیا ہے؟"

ہاں۔ اس بستی میں مَیں نے اتنا عرصہ گزارا ہے مجھے یہ بہت اچھی لگتی تھی مگر جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ سب تمہارے سامنے ہے۔ یہاں قتل و غارت اور سفاکی کا چلن عام ہو رہا ہے یہاں کوڑوں سے کھال ادھیڑی گئی۔ کند آلات سے لوگوں کے سر کچلے گئے۔ دھماکے لاشیں، خون اور مجروحین کی چیخ و پکار روزمرہ زندگی کا معمول بن گئے۔ مجھے لگتا ہے یہ دنیا ایک بڑا اسلاٹر ہاؤس ہو نہ ہو لیکن ہم سب ضرور ایک بوچڑ خانے میں رہتے ہیں۔ لسانی سیاسی علاقائی اور فرقہ وارانہ اختلافات اور فسادات نے بستی کی فضا کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہیں، ہر کسی کے ہاتھ میں خنجر اور بندوق ہے جگہ جگہ اسلحہ خانے ہیں وڈیو کیسٹ کی طرح کلاشنکوف بھی کرایہ پر مِل جاتی ہے"

ہاں سنا ہے بستی میں اکثر ایسی گاڑیاں گھومتی رہتی ہیں جن میں سوار نامعلوم لوگ راہگیروں پر اندھا دھند فائرنگ کرتے گزر جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ اور میں ایسی موت سے ڈرتا ہوں پناہ مانگتا ہوں"

"اچھا تو کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"ایسی جگہ جہاں امن ہو، سکون ہو۔ جہاں کوئی کسی سے نفرت نہ کرتا ہو انتقام لینا نہ جانتا ہو۔"

"ایسی تو کوئی جگہ نہیں سوائے ۔۔۔۔ ؟"

"ہاں تم ٹھیک سمجھے"

"کیا یہ بذاتِ خود تشدد اور بد ذوقی نہیں ہے؟"

"ہاں کسی حد تک۔ مگر اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں"

"ٹھہرو۔ یہ ہیبت ناک گڑگڑاہٹ کیسی ہے؟"

شاید صُور پھونکا جا رہا ہے۔ چلو خلاصی ہو گئی۔

اُف اتنا بڑا دھماکہ۔ یقیناً بہت بڑا نقصان ہوا ہو گا۔

ہاں مسلسل دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں!

پتہ نہیں ان لوگوں پر کیا گزری ہو گی جو ان دھماکوں کے آس پاس تھے۔ پتہ نہیں کتنے لوگوں کی کھوپڑیاں اڑ گئی ہوں گی۔ بوٹیاں ہوا میں بکھر گئی ہوں گی اور کتنے ہی لوگ ملبے کے نیچے دبے اور جلتے ہوئے مدد کے لئے پکار رہے ہوں گے۔ چلو چل کر ان کی مدد کریں۔

"ہاں چلو ۔ جلدی کرو۔"

میرا خیال ہے کہ اتنا بڑا دھماکہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔

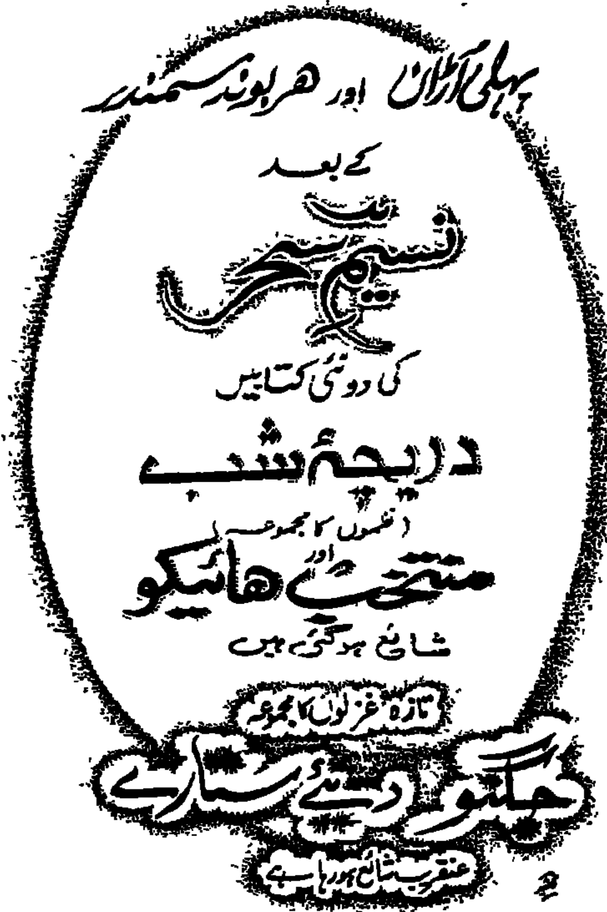
ہاں واقعی ۔ اب تو انتہا ہو گئی ہے ۔

اگر واقعی یہ انتہا ہے تو پھر تم یقین کر لو کہ تبدیلی ناگزیر ہے

یقیناً اب نئے دور کا آغاز دور نہیں ہے ۔

خدا کرے ایسا ہی ہو!!

---



ناصر بغدادی

# دل ڈوبنے کا منظر

"ہر منظر کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ ہر نظارہ انسانی ذات کی تکمیل کی طرف ایک قدم ہے مگر۔۔۔۔ ـــــ"
وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کی آنکھوں کی تیز یاقوتی چمک میں جیسے عہدِ عتیق کے کسی مصلوب پیغمبر کا علامتی پیغام تھا کہ جس کا مفہوم میں سمجھ نہ سکا۔ میں چپ چاپ گمبھیر سیمابی کشش و پیچ کا شکار اس کی طرف دیکھتا رہ گیا اس نے شاید میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے میرے چہرے پر لکھے ہوئے اس سوال کو پڑھ لیا تھا جو میں پوچھنے کی خواہش کے باوجود پوچھ نہ سکا تھا۔ اچانک ایک پراسرار سی مسکراہٹ سانپ کی طرح سرسراتی ہوئی اس کے ہونٹوں کی پگڈنڈی پر سے گزر گئی۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو!" اس نے شانِ استغنا کے ساتھ گردن کو ہلکے سے جھٹک دیا۔ "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے میں ایک ایسے ہی منظر کی تلاش میں ہوں جس کو میں نے بارہا محسوس کیا ہے مگر بیکراں خواہش کے باوجود دیکھ نہیں سکا ہوں۔"

"کون سا منظر؟" میرے اشتیاق کو مہمیز لگ گئی۔

"دل ڈوبنے کا منظر!"

میں نے بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ اُسے دیکھا میرے ردِّ عمل نے جیسے اُسے خاصا مایوس کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے یاقوتی شعلے اچانک راکھ بن کر بکھرنے لگے!

"تم بھی دوسروں سے مختلف نہیں!" اس نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔ "ہر آدمی دوسرے کی طرح ہے۔ کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کوئی یہ جاننا بھی نہیں چاہتا۔ تم سب کا یہ خیال ہے کہ میرا دماغ چل گیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ میں صداقت کا متلاشی ہوں۔ مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں خود کو دریافت کر لوں۔"

میں نے پُرخیال انداز میں اپنا سر ہلایا اور پھر چپ چاپ اسے دیکھنے لگا۔

"زندگی کے ان دیکھے گوشوں پر سے میرے تجسّس نے پردہ اٹھایا۔" وہ پھر گویا ہوا۔ "ہر نادیدہ گوشے پر سے جب پردہ اٹھا تو ایک نظارہ میرے سامنے آیا جس نے طمانیت کے گریز پا لمحوں سے مجھے

روشناس کرایا۔ مگر میری شناخت اس وقت مکمل ہو گی جب میں اپنی زندگی سے متعلق ہر نظارے کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لوں گا اور اس وقت ابد کے اسرار درموز میری مٹھی میں ہوں گے۔"

"کیا تمھاری ذات کی تکمیل کسی خاص نظارے کی رہین منت ہے؟" میری بات نے جیسے اُسے گہری تنویمی کیفیت سے جگا دیا ہو ——— میری اپنی ہستی چند لمحوں تک ایک بے بس معمول کی طرح اس کی آنکھوں کی مقناطیسی طاقت کے زیر اثر رہی وہ ایک نہایت پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ آہستگی سے بولا۔

"ہاں ——— ایک منظر ایسا بھی ہے ——— دل ڈوبنے کا منظر ——— اور میری ذات کی تکمیل اس کے بغیر ممکن نہیں۔"

بحث کے ذریعے کسی کو قائل کرنا میری عادت نہیں اور نہ میں اس سلسلے میں اپنا وقت برباد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُسے چُپ چاپ کمرے سے نکلتے دیکھا اور صرف گہری سانس لے کر رہ گیا ——— ایک دنیا نے اُسے ناقابلِ علاج کیس قرار دے دیا تھا اب پتا نہیں یہ اس کی بے پایاں ذہانت تھی یا اُفتادِ طبع کا نتیجہ کہ اس کی باتیں تجریدی کہانیوں کی طرح سننے والوں کو اُلجھا کر رکھ دیتی تھیں ——— تھوڑا سا اسکرو تو شاید بچپن ہی سے ڈھیلا تھا مگر کالج پہنچنے کے بعد تو جیسے وہ بالکل ہی بے لگام ہو کر رہ گیا! اس کی باتوں کی بالائی اور زیریں پرتوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا تھا۔ اس کی بہت کم باتیں سماعت سے ٹکرا کر واضح مفہوم کا سبز سگنل دیتی تھیں ورنہ ہوتا یوں کہ سننے والا اس کی باتوں کا سر پیر کچھ سمجھ نہ پاتا اور انہیں مجذوب کی بڑ سمجھ کر سنی ان سنی کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا۔ کچھ لوگ اس کی باتوں کو لطف اندوز ہونے کی حد تک دلچسپی سے سنتے اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتے۔ مگر اس کی تجریدی گفتگو کے بے ربط فلسفہ نے اس کے بوڑھے والدین کو غضبناک حد تک اس سے متنفر کر دیا تھا۔ وہ اس کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ گھر میں اس کی حیثیت ایک اجنبی سے زیادہ نہ تھی حد تو یہ ہے کہ اس کے چھوٹے بھائی بہن بھی اس انداز سے دیکھتے جیسے اُن کے سامنے دنیا کا آٹھواں عجوبہ آ گیا ہو۔

"کیا تمھیں اس کی پروا نہیں کہ تمھارے خیالات نے ہر شخص کو تم سے دُور کر دیا ہے" ایک بار میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میری بات سُن کر کچھ اس فراخدلی سے ہنسا کہ میں متوحش ہو کر رہ گیا۔

"مجھ سے دُور جا کر ہی لوگ ایک دن میرے پاس آئیں گے"! اُس کے ادق فلسفہ نے میری قوتِ فہم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "میرا اسلوب فکر میری نمائندگی کرتا ہے۔ لوگ کیوں چاہتے ہیں کہ میں دوسروں کی نقل بنکر زندہ رہوں! اگر میرے خیالات نزاعی ہیں تو لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر بڑے خیال کی یہی ایک خوبی ہوتی ہے۔"

"مگر تمھارے خیالات عصری روح سے ہم آہنگ نہیں" میں نے اُسے ٹوکا۔

"کیا یہ زندہ رہنے کی کوئی شرط ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ میرے خیالات میری اپنی روح سے ہم آہنگ ہیں؟"

"مگر معاشرتی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اکثریت کا ساتھ دیا جائے۔" میں نے اسے حقیقت کی طرف لانے کی کوشش کی۔

"مجھے معاشرتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اپنی زندگی اپنے انداز سے گزارنا چاہتا ہوں۔" یہ اس کا ناقابلِ تسخیر جواب تھا اور میں نے بھی مناسب سمجھا کہ اسے قسمت کے حوالے کر دیا جائے۔

ان دنوں اس کے فلسفیانہ خیالات اور اچھوتے نظریات کا چرچا دُور دُور تک تھا۔ جہاں کہیں وہ بیٹھ جاتا نئے مباحث، مناظرے اور مجادلے کی بھرپور کیفیات کے ساتھ لوگوں کی تفریحِ طبع کا سامان بن جاتے۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ بحث و تمحیص سے پیدا شدہ تلخی کے سبب ایک بڑے میاں نے جذباتیت سے مغلوب ہو کر ایسا پتھر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا بات صرف اتنی تھی کہ بڑے میاں اپنی نسل کے باب میں نئی نسل کی بڑھتی بے حسی کی شکایت کر رہے تھے کہ اس نے ایک غیر متعلق بات کے ساتھ دخل درمعقولات سے کام لیا۔

"بڑی عمر کے لوگ بے وفائی کی خواہش کے باوجود بے وفائی کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔" بڑھاپے کے متعلق یہ اس کا اچھوتا نظریہ تھا۔ "نوجوان چاہے ابتذال کا شکار ہو یا جذب و سلوک کی منزلوں کا مسافر ___ ایک مخصوص اور تعین شدہ مستقبل اس کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے مگر بڑھاپے کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کا کوئی مستقبل نہیں۔"

بڑے میاں ویسے ہی نئی نسل کی حرکتوں سے نالاں تھے۔ اُس کی جب یہ بات سُنی تو ان کے صبر و ضبط نے آخری ہچکی کے ساتھ دم توڑ دیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک نوکیلے پتھر سے اُس کا سر پھوڑ دیا۔ آس پاس کھڑے لوگوں کا کہنا تھا کہ ردِ عمل کے طور پر اس نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ بس کچھ دیر تک ہنستا رہا اور پھر آستین سے خون پونچھتا ہوا بڑے میاں کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

پھر ایسا ہوا کہ وہ کالج سے غائب رہنے لگا۔ شروع شروع میں تو اُس کی غیر حاضری کو شدومد سے محسوس کیا جانے لگا۔ اس کی باغ و بہار شخصیت کے بوقلموں پہلوؤں کو اتنی جلدی بھول جانا اتنی آسان بات بھی نہ تھی مگر زندگی تو ایک وشال اور بیکراں سمندر ہے۔ ایک لہر کے کھو جانے سے سمندر کے معمولات میں فرق تو نہیں آتا نئے ہنگاموں اور نئی رونقوں کے پس منظر میں کب تک پُرانے لوگوں سے وابستہ یادوں کی پرچھائیاں اپنی انمٹ نقوش چھوڑ سکتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید اس نے تعلیم کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا ہے۔ فراست بِن منزل کی راہی ہو تو صاحبِ فراست راستوں کے پیچ و خم میں بھٹک بھی سکتا ہے ___ ایک دن سرِ راہے اس کے والد سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اس کی بابت دریافت کیا تو اُن کا چہرہ دکھ اور ذہنی اذیت سے پیدا شدہ

جذبات کی آماجگاہ بن گیا!

"میاں! اب وہ بھلا کیسے کالج آسکتا ہے وہ تو اپنے حواس میں نہیں!"

"قبلہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!"

"وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے"! انھوں نے گہری سانس لی "اب اُس کے فلسفہ نے دیوانگی کی بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔ پتا نہیں دن رات کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے۔ چند روز قبل مجھ سے کہنے لگا ابا جان میں نے وجدان اور بصیرت کی ساری قوت صرف کر دی ہے مگر اس کے باوجود ہنوز میری ذات نامکمل ہے آپ کو پتا ہے اباجان اس کی کیا وجہ ہے؟ میں دل ڈوبنے کے منظر کو مجسّم نہیں کر سکا ہوں"۔

"آپ حوصلہ سے کام لیں چچا جان"۔ میں نے ڈھارس دینے کی کوشش کی ــــ "وہ ٹھیک ہو جائے گا"۔

"بیٹا! میری عمر ایسی نہیں کہ طفل تسلیوں سے بہل سکے۔ اب دعا کرو کہ اس کی اور ہماری دونوں کی مشکل آسان ہو جائے۔ روز روز کے رونے سے چند روز کا رونا زیادہ بہتر ہے"۔

اُس شام میں اس کے گھر گیا۔ اس کی حالت ناقابلِ شناخت حد تک بدل گئی تھی۔ داڑھی اس نے چھوڑ رکھی تھی۔ سر کے بال تارِ عنکبوت کا منظر پیش کر رہے تھے۔ میلے کپڑوں سے عجیب قسم کی ناقابلِ برداشت بدبو آرہی تھی ــــ پہلے تو مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ پھر چند لمحوں تک بے ساختگی کے انداز میں ہنستا رہا۔ پھر بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

مگر اس حالت میں بھی اس کا انداز ایسا نہ تھا کہ کوئی اسے ہوش و حواس سے ماورا سمجھتا۔ میں بڑی دیر تک اس کی باتیں ضبط و تحمل سے سنتا رہا۔

"دُنیا والوں سے سمجھوتہ کے لیے روح کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دنیا میں کوئی سچا نظریہ کوئی صادق جذبہ پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اگر آج کراتسؔ بھی دنیا میں دوبارہ آکر اپنے نظریات کا پرچار کرتے تو وہ بھی فنتہ کالمسٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیے جاتے! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہمیں اپنے حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے جب کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ کر نہیں پاتے!"

"ہم کیا کرنے کے خواہش مند ہیں!" میری بات سن کر وہ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"اس کا جواب ہر شخص یہی دینا چاہے گا کہ ہم جس قسم کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے مگر لوگ منافقت کی حد تک جھوٹے اور ڈرپوک ہیں۔ سب میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہے کوئی یہ بات ہرگز نہیں کہے گا اور چپ چاپ وہی زندگی گزارے گا جو وہ گزارنا نہیں چاہتا۔

"اپنے متعلق بھی کیا تم یہی کہوگے!"

"نہیں میں منافق نہیں۔" وہ تیقن کے ساتھ بولا "میں اپنی پسند کی زندگی گزار رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مجھے مصلوب کیا جا رہا ہے۔!!"

میں نے محسوس کیا کہ میرا اعصابی نظام بڑی طرح متاثر ہو رہا ہے۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ

میں خداحافظ کہے بغیر اس کا کمرہ چھوڑ دوں !!
پھر نہ معلوم وقت کی ایک طویل زقند نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ میں گن گن کر قدم اٹھاتے ہوئے دشوار گزار منزل کو عبور کرنے کی طرف بڑھتا گیا مگر اس نے کالج سے ہمیشہ کے لیے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کے لایعنی فلسفہ کی موشگافیوں نے مجھے لاجواب کر دیا۔

"شیکسپیئر ڈگری یافتہ نہیں تھا لیکن ذہانت کی میزان کے ایک پلڑے میں اگر ہم اسے بٹھا دیں اور دوسرے میں ایک درجن قابل ترین ڈاکٹرز آف فلاسفی کو ـــــ تو تم خوب جانتے ہو کہ کون سا پلڑا زیادہ وزنی ہوگا۔!!" اس کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں دل برداشتگی کی تلخیوں کو ہمرکاب لیے گھر لوٹ آیا۔ ایک ڈوبتے شخص نے اس یقین کی بنیاد پر میری مدد کی پیش کش ٹھکرا دی کہ ڈوب جانے پر ہی اسے ابدی نجات کی زرنگار دہلیز پر قدم رکھنے کا موقع حاصل ہوگا۔ میرے نزدیک یہ انسانی المیہ کی ایک ایسی کہانی تھی جس کا کوئی عنوان نہ تھا۔!!

مجھے وقتاً فوقتاً اس کی بابت معلومات ملتی رہیں میں نے سنا ہے کہ ایک بار اس کے والد صاحب نے اسے پاگل خانہ پہنچانے کے سارے انتظامات مکمل کر لیے تھے مگر قریبی رشتہ داروں اور محلے والوں کے سمجھانے پر بادل نخواستہ اپنے ارادے سے باز آگئے۔ اس کے گھر کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اس کے فلسفہ کی غیر منطقی کوکھ سے جو آگ بھڑکی تھی اس کے شعلوں نے اس کے سارے گھر والوں کے چین و سکون کو خشک لکڑیوں کی طرح جلا کر بھسم کر دیا تھا۔

پھر ایک بار جب میں گھر لوٹا تو مجھے اس کا پیغام ملا وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میرے گھر والے ضرورت سے کچھ زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میرا اس سے ملنا عاقبت نااندیشی کا برملا ثبوت ہوسکتا ہے۔ مجھے دبے الفاظ میں سمجھانے کی بھی کوشش کی گئی مگر دوسرے دن میں اس سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے وجود کا محض سایہ بن کر رہ گیا ہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم آہستہ آہستہ اس کی عقل کی غذا بنتا جا رہا ہو ـــــ ہم بہت دیر تک گزرے ہوئے وقت سے وابستہ یادوں کو خوشگوار انداز میں دہراتے رہے۔ اس کی گفتگو اس کا پیرایہ اظہار اور اس کا طرز عمل اس وقت ایک نارمل آدمی کی ذہنی و جذباتی کیفیت کا آئینہ دار تھے۔ اس کے اعصاب مکمل طور پر اس کے قابو میں نظر آرہے تھے۔ میں یہ سوچ کر خوشی محسوس کرنے لگا کہ اس کی پرانی ذہنی تندرستی بحال ہو گئی ہے۔ لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ بات چیت کرنے کے دوران اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ حلقوں کے اندر اس کی آنکھوں نے تیزی سے گردش کرنا شروع کر دیا۔ اس کی زبان میں یوں لکنت آگئی کہ اس کی آواز کسی اجنبی کے لب و لہجہ میں ڈھل کر جیسے کسی اندھے کنویں کے پاتال سے آہستہ آہستہ ابھرنے لگی۔ مجھے احساس ہوا کہ خود پر قابو پانے کی بے انتہا کوشش نے ردعمل کے

طور پر اس کے جسم کو بید مجنوں کی طرح لرزنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میرے ذہن کے کسی کونے میں خوف کی پرچھائیوں نے سر اٹھایا مگر میں چند لفظوں میں اپنے حواس کے بکھرے ہوئے تار و پود کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا ــــ کچھ دیر بعد جب اس کی حالت میں کچھ افاقہ ہوا تو وہ ایک اجنبی کی طرح چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا پھر بولا ۔

" تم نے سمندر کے سینے پر مچلتے ہوئے طوفانوں کو دیکھا ہے ؟ کبھی تمھیں احساس ہوا کہ یہ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں ؟ اُفق پر سورج طلوع ہونے سے ہمیں زندگی میں ایک نئے دن کا پیغام ملتا ہے پھر غروبِ آفتاب دن کے زوال کا ایک جیتا جاگتا اعلان ہے ــــ بہار میں سبز پتوں کی اوٹ سے جھانکنے والی پھولوں کی تر و تازہ مسکراہٹیں، خزاں میں رنگ بدلتے ہوئے خشک پتوں کو بے وطنی پر مجبور کرنے والی بیدرد ہوائیں ــــ بدلتے ہوئے موسموں کے بدلتے ہوئے مناظر ــــ یہ سب کیا ہیں ؟ ہماری زندگیوں کے مختلف دیکھے اور اَن دیکھے پہلوؤں کی عکاسی ہی تو کرتے ہیں ! ہر منظر کے پسِ منظر میں ہماری زندگی کا کوئی نہ کوئی حصہ اجاگر ہے ۔ قدرت اشاروں میں ہم سے باتیں کرتی ہے ۔ مگر ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ان اشاروں کو سمجھ کر انہیں عملی زندگی کی جزئیات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؟ "

وہ باتیں کرتے کرتے توقف پر مجبور ہو گیا ۔ اُس کی سانسیں دھونکنی کی طرح تیز رفتاری سے چل رہی تھیں ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندیں عرقِ انفعال کے قطروں کی طرح رقصاں ہو گئی تھیں اور چہرہ تھکے ہوئے اعصابی مریض کا آئینہ بنا ہُوا تھا ــــ میں نے چاہا کہ اس کا دھیان اس مخصوص موضوع سے ہٹا کر ایسی باتوں کی طرف لگا دوں جو اعصاب پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں ۔ مگر اس وقت اس کا انداز بالک ہٹ کی منھ بولتی تصویر نظر آ رہا تھا ــــ اس نے میری باتوں کو سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی اعصاب شکن گفتگو کے سلسلے کو مزید آگے بڑھایا ۔

" ہم سب ابد کے تنہا مسافر ہیں ۔ موت کس نئی زندگی کا نام ہے اس کے متعلق کوئی نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے ۔ مگر میری اپنی زندگی صداقت کا دوسرا نام ہے ۔ میں نے دیکھے اَن دیکھے نظاروں کے پس منظر میں اپنی زندگی کے شناسا اور اجنبی پہلوؤں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے ہر نیا منظر میری ذات کی تکمیل کی طرف ایک قدم رہا ہے تمھیں یاد ہے نا کہ آج سے چند سال قبل میں نے تم سے کہا تھا کہ میری ذات کی تکمیل ایک ایسے منظر کی رہینِ منت ہے جو میرے محسوسات کا ہمزاد تو ہے مگر میں جسے مجسّم کرنے سے قاصر رہا ہوں ۔"

" ہاں مجھے یاد ہے "۔ میں نے اثبات میں جواب دیا ۔ "تم دل ڈوبنے کے منظر کی بات کر رہے ہو نا ؟ "

" تمھارا اندازہ سو فیصد ٹھیک ہے ۔" اس کا چہرہ خوشی کی تمازت سے سُرخ ہو گیا ۔ " میں اُسی

کی بہت ساری باتیں غلط نہیں تھیں۔" اُن کے لہجے میں ہچکچاہٹ سی تھی۔" میں تمھارے چہرے پر حیرت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہا ہوں مگر تمھیں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ دمِ واپسیں میں نے اُس کی آنکھوں میں جو کچھ دیکھا اُس کے بعد ہی کچھ کہنے پر مجبور ہوں۔"

"آپ نے کیا دیکھا چچا جان؟" میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرے استفسار پر ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر تند جذبے کے رنگوں کا فوارہ اُبل پڑا۔ وہ پھر بولے۔

"حالت تو اُس کی نہ معلوم کب سے خراب تھی مگر اس دن اچانک بگڑ گئی۔ وہ نہ معلوم کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی آواز تیز ہو جاتی۔ اس کی باتوں کا سر پیر کچھ سمجھ میں نہیں آیا ــــ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے دم توڑ دیا۔ بس ایک دو باتیں مجھے ہنوز یاد ہیں اور وہ بھی شاید اس لیے کہ اس نے متعدد بار انھیں دہرایا تھا۔"

"کون سی باتیں چچا جان؟" میرا دل اچانک سینے کے پنجرے میں زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

"وہ میری طرف دیکھتا اور بار بار یہی کہتا ابا جان! ذات کی تکمیل کے بعد زندہ رہنے کا کیا جواز ہے! مرتے وقت تو آدمی کی آواز کمزور پڑ جاتی ہے مگر میاں! اس کی آواز میں اتنی توانائی نامعلوم کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ پھر کہنے لگا ابا جان! اس وقت میرے سامنے جو منظر ہے آپ اس کو میری آنکھوں میں مجسم دیکھ سکتے ہیں۔ یہ منظر میری تمام زندگی کی تگ و دو کا حاصل ہے پھر اس کے چہرے پر ایک پُراسرار سی غیر ماورائی مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ بیٹا! یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ جس شخص نے طوفانی سمندروں سے زیادہ ہنگامہ خیز اور کرب سے بھرپور زندگی گزاری تھی وہ طمانیت اور سکون سے موت کی آغوش میں چلا گیا جیسے بچّہ ماں کی محبت آمیز لوریوں کو سنتا ہُوا چُپ چاپ سو گیا ہو ـــ موت کے بعد بھی اس کی آنکھیں وا تھیں۔ میں نے آگے جھک کر جب اس کی آنکھوں کو بند کرنا چاہا تو بے اختیار چونک کر رہ گیا۔ میں نے اس کی مُردہ آنکھوں میں ایک ایسے زندہ منظر کو دیکھا جو کیمرے کے فوٹو کی طرح تمام تر جزئیات لیے ہوئے تھا۔"

وہ اچانک چُپ ہو گئے۔ اس موڑ پر میں چونک کر ان کی طرف کچھ زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر بہت ساری نازک چیزوں نے ٹوٹ پھوٹ کر مجھے لہولہان کر دیا ہو!

"یہ منظر وہی منظر تھا جس کے متعلق جب کبھی اس نے بات کی تھی تو میں اُسے مجذوب کی بڑ ہی سمجھتا رہا تھا۔" ان کا چہرہ اجنبی احساسات اور بے نام جذبات کی آماجگاہ بن گیا۔ اُن کی بھرّائی ہوئی آواز میں اُن کی زندگی بھر کا درد اپنی تمام تر شدّت کے ساتھ موجود تھا۔ انھوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ایک لمحے کا سہارا لیا پھر بولے۔

"بیٹا! تم سوچتے ہوگے کہ وہ میرا واہمہ تھا۔ اگر

منظر کی بات کر رہا ہوں۔ میرے دوست! شاید تم میری بات پر یقین نہ کرو مگر یہ حقیقت ہے کہ آج میری ذات کی تکمیل ہو چکی ہے۔"

"کیا مطلب! کیا..... " میں غیر ارادی طور پر بے اختیار چونک پڑا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دیا۔ خوشی شرارتی بچوں کی طرح اس کے چہرے پر اُچھل کود رہی تھی۔

"آج پس منظر کا ہر منظر میرے پیشِ نظر ہے۔" متانت کی متوازی شکنیں پھر اس کے چہرے پر نمودار ہو گئیں۔ "جس آخری منظر کی تلاش مجھے تنگ و دو کے صحراؤں میں بھٹکا رہی تھی اس کو میری نظروں نے مقیّد کر لیا ہے۔ آج میں کائنات کے اسرار و رموز کا امین ہوں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا ذات کی تکمیل کے بعد بھی زندہ رہنے کا کوئی جواز ہے؟"

اس کے ہر پچھلے سوال کی طرح اس سوال کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں حیران و پریشان اس کے چہرے پر بے قابو خوشی کو بے لگام ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آج جیسے اس کی ذات ابد کی پھیلتی ہوئی سرحدوں سے ملنے کے لیے بیکراں ہوتی جا رہی تھی میرے سامنے ایک ایسا جیتا جاگتا عجیب و غریب منظر آنکھیں مل رہا تھا جس نے ایک اعصابی مریض کے اعصاب شکن خواب کی طرح شعور اور لاشعور کی ساری صلاحیتوں کو چند ثانیوں کے لیے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا تھا! وہاں پر مزید بیٹھنا اب میرے لیے ناممکن تھا۔

یہ وہ زمانہ جب تعلیمی ڈگریوں کا بوجھ سر پر اٹھائے میں عملی زندگی کے دشوار گزار راستوں پر بھٹکتے ہوئے اپنے آپ سے کچھ ایسے سوالات پوچھ رہا تھا جن کے جواب شاید کسی کے پاس نہ تھے۔ ملازمت کی تلاش سرابوں کا تعاقب ثابت ہو رہی تھی۔ زندگی فلسفۂ وجودیت کا نمونہ نظر آ رہی تھی۔ میں اُس سے دوبارہ ملنے کی منھ زور خواہش کے باوجود مل نہ سکا۔ کارِ جہاں دراز کی گوناگوں مگر ناخوشگوار مصروفیات نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ روز یہی سوچتا کہ کل اس سے ضرور ملوں گا مگر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کل کبھی نہیں آتا۔ بس یہی کچھ ہوا اور یوں میری اس سے وہ آخری ملاقات ثابت ہوئی ـــــ پھر ایک دن جب مجھے اس کی موت کی خبر ملی تو یہ خبر بھی دو دن پرانی ہو چکی تھی اور تب جیسے میں زندگی کی اہم ترین مصروفیات کو بھی بھول چکا تھا۔ میں نے اس کے گھر پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ حالات وہاں غیر معمولی نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید کسی نے اس کی موت پر رونے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی یا ممکن ہے رو دھو کر سب کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ ویسے میں نے اس کے والد کے جھرّیوں سے لدے ہوئے چہرے پر گہری اداسی کی ایک ایسی کالی گھٹا کو دیکھا جس کو کھل کر برسنے میں شاید تھوڑا بہت تامل تھا! میں رسمی تعزیت کے بعد کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھا رہا پھر چلنے کے لیے اجازت طلب کی تو وہ بولے۔

"میاں! اب تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اُس

میں اپنی آنکھوں سے اس منظر کو نہ دیکھتا تو یقیناً یہی کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا مگر......"

اس کے آگے بھی انہوں نے بہت کچھ کہا تھا مگر اس وقت جیسے میں کسی اور دنیا کی راہوں کا بھٹکا ہوا مسافر بن چکا تھا۔ اُن کی باتیں میری سماعت سے ٹکرا تی تو رہیں مگر اُن کا مفہوم سمجھنے سے جیسے میں قطعاً قاصر تھا ـــــ میں جانتا تھا وہ کس منظر کی بات کر رہے تھے مگر میرے لاشعور میں دبکے ہوئے نامعلوم خوف نے جیسے اُس لمحے میری قوت گوئی کو سلب کر لیا تھا۔ لاکھ پوچھنے کی خواہش کے باوجود میں اس منظر کی تفصیلات ان سے نہ پوچھ سکا جو موت کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں بھرپور توانائی کے ساتھ زندہ تھا!

بلقیس شاہین

# سارک

[الفاظ اور اصطلاحات کے معنوں کی مختلف سطحیں تشریح پر منحصر ہوتی ہیں لہٰذا اس اصطلاح کی تفہیم کی تمام تر ذمہ داری صرف قاری پر ہے]

انسانوں کو شاید اپنے کمزور بچوں کی طرح اپنی بعض کمزوریوں سے بھی زیادہ پیار ہوتا ہے وہ بھی باوجود اپنی اور گھر والوں کی کوشش کے اپنی اس کمزوری پر کبھی قابو نہ پا سکی کہ باقاعدہ میز کرسی یا تخت پہ بیٹھ کے قاعدے سے لکھ پڑھ سکے۔ اس کو تو صرف دروازے سے ٹیک لگا کر درمیانی در کی دہلیز پہ بیٹھ کے لکھنا اچھا لگتا تھا۔ پڑھنے کے لئے کسی جگہ کی قید نہیں تھی باورچی خانے سے لے کر بستر تک اور بس سے لے کر ہوائی جہاز تک وہ بے تحاشہ پڑھنے کی ماہر تھی، البتہ لکھنا ہر جگہ اس کے لئے مشکل تھا۔ بہت عمدہ رواں قلم، عمدہ ترین کاغذ، اردگرد خوبصورت ماحول اور یہ خوبصورتی وہ قطرے سے لے کر دجلہ تک میں پا لیتی تھی۔ کبھی صرف ایک پھول اس کے لئے ماحول کو حسین بنا دیتا تھا اور کبھی حسن کی فراوانی میں بھی وہ ماحول کی بدصورتی پہ کڑھتی رہتی، لیکن اپنے گھر کے اس درمیانی دہلیز کے جادوئی اثر کا وہ خود تجزیہ نہیں کر پاتی تھی۔ بہت سوچنے پہ صرف یہ احساس ہوتا تھا کہ اس جگہ سے پورا بیرونی منظر اور سارا گھر اس کی نظر میں ہوتے ہیں۔ شاید ذہن کی رسائی دونوں جہاں کے تصور تک ہو جاتی ہوگی۔ دھوبی کے کپڑے، گھر کا حساب کتاب، خط اور ان کے جواب، اپنا ہر اظہار خواہ افسانوی ہو یا تنقیدی، ہلکا پھلکا مزاحیہ ہو یا دقیق فلسفیانہ مذہبی ہو یا اخلاقی سب اسی دہلیز کے مرہون منت تھے۔ باہر کے سب موسم، سارے رنگ اور اندر کا سکون اس کی ہر تحریر میں جھلک اٹھتا تھا۔

وہ آج بھی اس دہلیز پہ بیٹھی قلم کاغذ سے کھیل رہی تھی۔ قلم کبھی کاغذ پہ رواں ہوتا، کبھی اس کی سوچ کا عصا بن جاتا.... اس کی بیٹی دبے قدموں آئی اور ماں کو لکھتے سوچتے دیکھ کر واپس لوٹ گئی۔ وہ سب سے باخبر اور بظاہر بے خبر بیٹھی سوچتی اور لکھتی رہی تھوڑی دیر بعد اس کے بچوں کے ابو آئے اس کو مصروف دیکھا.... پھر غور سے اس کا چہرہ دیکھا.... اور بولے۔ بظاہر فکر کی کوئی بات تو نہیں، کوئی تخلیقی کام کرتی بھی نہیں لگ رہیں پھر کیا شغل ہے؟

اس نے تھکے ہوئے انداز میں قلم کاغذ الگ رکھ دیا۔

یہ کیا ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ "لسٹ"

"لسٹ ؟"

"جی ہاں فہرست"۔ !

"کیسی" ساتھ لے جانے والے تحائف اور فرمائشوں کی اور پھر جو آیا وہاں سے لائی جانے والی چیزوں اور تحفوں کی !"

"کیا مطلب؟"

مطلب آپ نہیں سمجھیں گے اور مرد سمجھ بھی نہیں سکتے ۔ اور وہ بھی آپ جیسے قلندر جو ہر لمحہ ہاتھ جھاڑے قلب سلیم لئے ہوئے ہوں"۔ اچھا جی تو یہ خالص زنانہ مسئلہ ہے ! "وہ بے نیازانہ بولے اور اپنی میز کی طرف مڑ گئے ۔۔۔۔ وہ بھی اٹھنا چاہ رہی تھی کہ اس کی بیٹی چائے کی پیالیاں دونوں ہاتھوں میں لئے اندر آ گئی ۔ اس کے سامنے والی پڑوسن کی خوش باش چہچہاتی بیٹی بھی ہنستی ہوئی آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی ۔ بچی نے ماں کے ہاتھ میں پیالی تھمائی اور اپنے بابا کی میز کی طرف گئی ۔ پڑوسن کی بیٹی نے پوچھا سنا ہے آنٹی آپ انڈیا جا رہی ہیں ؟

ہاں بیٹا ! اس نے جواب دیا ۔

"تم کو کیوں بے چینی ہو رہی ہے تمہارے لئے تو سب جگہیں برابر ہیں خواہ وہ انڈیا ہو یا ہانگ کانگ ، امریکہ ہو یا جاپان" اس کی بیٹی نے ہنس کر کہا ۔ اس نے تنبیہی نظروں سے بیٹی کو دیکھا تو وہ بولی ۔

"سچ امی میں نے آج تک ایسی بین الاقوامی فیملی نہیں دیکھی جیسی ان کی ہے ۔ جب بھی کسی شئے کا پوچھو یہی جواب ملتا ہے ۔ یہ فلاں نے ہانگ کانگ سے بھیجا ہے ۔ یہ چچا امریکہ سے لائے ہیں یہ پھپو انڈیا سے لائی تھیں یہ آپا جاپان سے لائی تھیں یہ انکل سنگاپور سے لائے تھے وغیرہ وغیرہ حسرت ہی ہے" .... اس نے بیٹی کی بات جلدی سے کاٹ دی اور اس بچی سے مخاطب ہوئی ۔

بیٹا اس کی بات کا برا نہ ماننا یہ تو بس تنقید کرنا چاہتی ہے ۔ اس نے نرمی سے بچی سے پوچھا کہ تم کو کچھ منگانا ہے ؟ نہیں نہیں آنٹی وہ جلدی سے ہنستے ہوئے بولی میں ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی" اور یہ کہتے ہوئے اس کے گال اور تمتما اٹھے آنکھیں کچھ زیادہ روشن ہو گئیں ۔۔۔۔ میں تو اس لئے پوچھ رہی تھی کہ ہمارے بھی رشتے دار چند روز میں انڈیا سے آنے والے ہیں ۔۔۔

اچھا کہاں سے آ رہے ہیں ؟

پتہ نہیں کہاں کہاں سے !

اسی وقت اس کی چھوٹی بیٹی نے دروازے سے پکارا ۔

باجی آپ کے گھر سے نوکر آیا ہے بلانے ۔۔۔۔

ویسے آنٹی میں ان لوگوں کو بلانے آئی تھی بڑی اچھی ایک فلم آئی ہوئی ہے پلیز آپ بھیج دیں نا ۔ ہم سب مل کر دیکھیں گے

"وہ بیٹا ۔۔۔" ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پائی تھی کہ اس کی بیٹی بول اٹھی نہیں بھئی ۔ اصل میں امی ابو کے سفر کی تیاریوں میں ہمیں امی ابو سے زیادہ مصروف ہونا پڑتا ہے ۔ ویسے بھی ہم لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ اتنے گھنٹے لگاتار ٹک کے بیٹھ سکیں اور دونوں چھوٹیوں کے امتحان سر پر ہیں ۔۔۔

بس ایک تو آپ لوگ بہانے بنا لیتی ہیں" اس کے کٹے ہوئے بال ماتھے پہ آ پڑے تھے جن کو اس نے بڑی ادا سے پیچھے کیا ۔

آنٹی اصل میں آپ ہی شاید ہمارے ہاں آنا نہیں چاہتیں ۔

نہیں بی بی میں آؤں گی بس ذرا وقت ہی بھاگ جاتا ہے ۔ اچھا وعدہ رہا جانے سے پہلے سب سے ملنے ضرور آؤں گی

اچھا خدا حافظ ۔ اور دونوں لڑکیاں ساتھ ساتھ باہر چلی گئیں ۔

"ملنے جلنے کی چور ہو ۔۔۔ خواہ مخواہ جھوٹ بول کے ۔۔۔"

پھر آپ نے وہی ستانے والی بات کی" ۔ اس نے میاں کی بات پوری نہیں ہونے دی آپ ہی بتائیں ۔۔۔۔ پڑوس میں گھومنے

کے لئے کون سا وقت نکالوں اور چلیں وقت نکال کے چلی بھی جاؤں تو ان کے ہاں کس سے کیا بات کروں؟ نہ مجھ کو کپڑوں کے دام پتہ نہ فیشن سے دلچسپی نہ سونے کا بھاؤ پتہ، بازار کا رنگ ڈھنگ نہ نئی اشیا کی آمد کی اطلاع نہ پرانی چیزوں کے آؤٹ آف فیشن ہونے کی خبر اور پھر مجھے تو پاس پڑوس والوں کے عیب ثواب بھی نہیں پتہ نہ ساس سسر اور نندوں دیوروں کی شکائتیں ہیں پھر کس موضوع پہ گفتگو کروں؟"

"بس بھی بس.... ذرا سا چھیڑا تھا"

بس چھیڑنا ہی تو غضب ہوتا ہے.... نے نواز.... لفظوں سے کیوں گھبراتے ہیں... اب بتائیے اتنے سارے جھوٹ سے غیبت سے لغویت سے اگر بچا جا سکتا ہے کیوں نہ بچوں؟ ویسے کون سا سماجی موقع ہے جس میں میں سب کے ساتھ شریک نہیں آرے بھئی معاف کردو.... میں تو تمہیں ذرا سوشل بنانے کی کوشش کر رہا تھا"

"بڑے خسارے میں رہیں گے! اگر ایسا کیا تو.... ! ہاتھی کے دانت نکلے تو نکلے!"

امی آپ ذرا میز کا جائزہ لے لیجئے.... بیٹی نے آواز لگائی اور وہ دونوں ہنستے ہوئے بچوں کے پاس چلے گئے۔

زندگی کی رنگین تصویر کے دونوں رخوں کی طرح تاریک روشن پہلوؤں کو دونوں باہوں میں سمیٹ کر ساتھ بڑھتی اور چلتی ہے ایماندارانہ اصولوں کو اپنانے والے تنخواہ دار طبقے کے سارے مسائل یکساں اور فکریں عالمی ہیں.... اُس نے چند روز میں اپنے جانے کی سب تیاریاں مکمل کر لیں جانے سے ایک روز پہلے اس نے اپنی بیٹی سے کہا میں ذرا سامنے والی پڑوسن آنٹی کے ہاں جا رہی ہوں سب سے مل کر ابھی آتی ہوں۔ بیٹی نے کہا ضرور جائیے لیکن شال اوڑھ لیجئے۔ شاید وہ لوگ آپ کو لان پہ ہی مل جائیں۔

اس نے بیٹی سے شال لانے کو کہا اور اپنی سوچ میں گم وہیں کرسی پر ٹک گئی اور یہ غور بھی نہ کیا کہ بیٹی کو کیسے پتہ کہ سب لان پہ ہی مل جائیں گے! یہ تو اُسے ان کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر پتہ چلا کہ واقعی سب لان پہ ہی ہیں میزیں کھانے پینے کی چیزوں سے بھری تھیں اور لوگ ٹکڑیوں میں چل پھر کے کھا رہے تھے ہنس رہے تھے باتیں کر رہے تھے ارے شاید اُن کے ہاں کوئی تقریب ہے اُسے خود پہ غصہ بھی آیا کہ اپنی دھن میں اس نے باہر سے ہی اندازہ کیوں نہ لگایا۔ اُس نے مڑنا چاہا لیکن پڑوسن کی بہو اُسے دیکھ چکی تھی وہ جلدی سے دوڑ کر اُس کے پاس آ گئی ارے آنٹی آپ کہاں جا رہی ہیں سچ برسوں کے بعد تو آپ نظر آتی ہیں آئیے آئیے سب آپ سے مل کر خوش ہوں گے.... اس نے دلہن سے پوچھا دلہن بیٹا کیا تمہارے ہاں کوئی تقریب ہے.... لفظ دلہن پر اس لڑکی کی آنکھوں میں قندیل سی چمکی اور چہرے پر نور سا بکھر آگیا.... لفظوں کا اپنا جادو ہوتا ہے اس نے لمحہ بھر کو سوچا.... اس کی سوچ کو دلہن کے جواب نے ختم کر دیا وہ کہہ رہی تھی نہیں آنٹی ہمارے کچھ رشتے دار انڈیا سے آئے ہوئے ہیں ان کے لئے گھر میں کچھ پروگرام بنائے ہیں ایک دن ابا جان کے رشتہ دار مدعو کئے گئے ہیں ایک دن اماں جان کا میکا آئے گا ایک دن خاندان کے سب نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہلا گلا ہوگا۔ یہ سب بتاتی ہوئی وہ اُسے لئے لاؤنج میں پہنچ گئی۔ اندر پہنچ کے اُسے لگا کہ گھر میں آرائش پر خصوصی سے بھی کچھ زیادہ توجہ دی گئی ہے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہر شے ابلی پڑ رہی ہے۔ روشنی بھی زیادہ لوگ بھی زیادہ سامان بھی زیادہ.... باتیں، حرکتیں، قہقہے.... آوازیں.... ہر شے کی زیادتی، کپڑوں

میں خالص ذیولوں میں بھی یہ ہی جذبہ کارفرما باتیں یعنی اظہار سب مصنوعی.... اس کا جی گھبرانے لگا.... پڑوسن نے اُسے دیکھا اُن کی بیٹی نے دیکھا اور لوگوں نے دیکھا سب

اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے لیکن پڑوسن اپنے ساتھ ایک خاتون کو لئے ہوئے اور ان کی بیٹی اپنے ہاتھ کی پلیٹ میز پہ رکھ کے جلدی سے قدم بڑھاتے ماں کے ساتھ اس کے پاس آئی اور باہیں گلے میں ڈال کے گال آگے بڑھا دیا.... اُس نے نرمی سے اُس کو پیار کیا۔ پڑوسن نے ہاتھ ملایا آیئے جی آپ تو عید کا چاند ہو گئی ہیں یہ میری بہن بھی ہیں اور نند بھی اور بھاوج بھی اور رشتے کی دیورانی بھی انہوں نے ہنستے ہوئے اک خاتون کا تعارف کرایا۔ اس نے ان خاتون کو بھی سلام کیا انہوں نے ذرا حیرت سے اس کو دیکھا بیٹی ابھی تک اس کے پاس کھڑی تھی اس نے پوچھا آنٹی آپ ان لوگوں کو نہیں لائیں؟ اس کی مراد اس کی بیٹیوں سے تھی۔

نہیں بیٹا میں بھی بس کھڑے کھڑے ملنے آئی ہوں اصل میں کام کافی ہے تم سے وعدہ کر لیا تھا اس لئے آ گئی ہوں اب اجازت دو تفصیلی ملاقات انشاءاللہ واپسی پر ہو جائے گی اس نے پڑوسن کی طرف پھر ہاتھ بڑھا دیا.... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے آپ بغیر کچھ کھائے پیئے نہیں جا سکتیں.... پیچھے سے بہو کی آواز آئی اس نے پلٹ کر بہو سے معذرت کی سب کے چہرے چکدار روشنی میں دمک رہے تھے۔ بیٹی بہو ماں سب کے گالوں کی چمک میزبانی انداز سب کو غور سے دیکھتی نرم مسکراہٹ سے اور چھوٹے چھوٹے تعریفی جملوں سے ان کو خوش کرتی وہ دروازے تک آ گئی....

بیٹی دروازے کے باہر آنا چاہ رہی تھی اُس نے روک دیا نہ.... بیٹا تم اندر جاؤ اپنے مہمانوں میں.... اچھا خدا حافظ سڑک پار کر کے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے

اس نے بڑی گہری سانس لی۔ اُس کی بیٹی نے داخل ہوتے ہی ہنس کے کہا۔ امی نے سانس بھی گھر آ کے لی ہے۔ کیوں امّی میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہی۔ اس کو اپنا غصہ یاد آ گیا.... کہہ تو سچ رہی ہو لیکن یہ بتاؤ تم نے مجھے جانتے ہوئے کیوں نہیں بتایا تھا کہ ان کے ہاں مہمانداری ہے....

اصل میں امّی میں نے شرارتاً آپ کو نہیں بتایا تھا.... خیر چلیئے آپ مل تو آئیں۔

اب وہ اس "ملنے" کی کیا وضاحت کرتی.... اپنی سوچوں کی گھڑی سنبھالے وہ پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی....

سفر شروع ہوا.... ہوائی اڈے کے تمام مراحل سے گزر کر جب اس نے جہاز میں اپنی سیٹ سنبھالی تو احساس ہوا کہ دُنیا سمٹ رہی ہے بقول لوگوں کے سفر مختصر ترین ہوتا جا رہا ہے لیکن تھکن.... ؟ اِس کے ذہن میں تھکن کی مثال روئی اور نمک کے ڈلے والی آئی یا پھر اس تھکن کی کاٹ اس کے ذہن کو توپ کے گولے یا سیسے کی گولی کی طرف لے گئی.... کون زیادہ کام تمام کرنے والی ہے؟

یہ اختصار.... ترقی ہے ؟ - ؟

اس کی سوچ کو جہاز میں اُبھرنے والی نرم آواز نے ختم کر دیا۔ ایک ہوائی اڈے سے دوسرے ہوائی اڈے تک فضا کی چھلانگ نے اُسے سرحدیں عبور کرا دیں....

ہوائی اڈے پہ اترتے ہی اُسے احساس ہوا.... واقعی ہم پسماندہ لوگ ہیں "عزت نفس" "احترام آدمیت" "بین الاقوامی انسانی حقوق" "امن" "پڑوس" یہ سب خوشنما لفظ ہیں ورنہ اُس ہوائی اڈے پر ایک سرحد پار کے لوگوں سے سلوک ان سے قطعی مختلف ہوتا ہے جو دوسری سرحدوں کے

پار سے آتے ہیں اور اپنی اجلی ململی پیلی چمڑیوں سمیت حیرت سے اس افراتفری کا مظاہرہ دیکھتے ہیں... اور پھر اور بھی بُرا حال خود اُسی ملک کے ان باشندوں کا دیکھتے ہیں جو سماجی اور معاشرتی رشتوں کو نبھانے پڑوس کے ملک ہو کر واپس آتے ہیں

لا اینڈ آرڈر کی پابندی ہر مہذب عالمی شہری کا وطیرہ ہے لہٰذا وہ بھی مقامی لوگوں کی لائن سے الگ اپنے ملک کے نام والی لائن میں لگ گئی۔ سب سے پہلے برٹش پاسپورٹ اور دیگر... والی لائن فٹا فٹ ختم .... لوگ خوش باش... پھر مقامی اور اس کے ملک والی لائنیں .... ریں ریں... سودیشی ریل کی رفتار سے اور اسی رویے کے ساتھ نمٹنے لگیں .... کیا وقت ہمارے لئے بالکل اہم نہیں ؟ کیا ہم لوگ ایک دوسرے کے لئے صرف .... سرحد پار کے "لوگ" ہیں؟ کیا صرف "شک" ہماری پہچان ہے؟ .... دوسروں کے ساتھ برتاؤ دیکھ دیکھ کر اس کا بلڈ پریشر ہائی ہوتا جا رہا تھا لیکن پھر بھی فکر اس کو اپنے "ساتھی" کی تھی جو ہر جگہ صرف اور صرف ساتھ ہی رہتا...

ہاں جی آپ فرماؤ ؟ بلبے چوڑے سردار جی سے اُسے قطعی نرم لہجے کی توقع نہ تھی لہٰذا وہ چونک پڑی۔

اس نے پاسپورٹ اور مزدوری کاغذات اپنے اور اپنے میاں کے ایک ساتھ آگے بڑھا دیئے

رشتے داروں سے ملنے آئے ہیں ؟

ہاں جی !

بہت لوگ یہاں ہیں ؟

ہاں جی کافی ہیں۔

پھر آپ لوگ کیوں چلے گئے ؟

اصل میں ہم میں بہت کچھ کھونے اور بہت کچھ کرنے کا حوصلہ تھا !

کیا جی !

سردار جی ہمیں اپنا مقصد عزیز تھا ! اس مرتبہ اس کے میاں نے جواب دیا !

آپ .... اوہو .... اچھا جی .... یہ لیجئے انہوں نے جلدی سے کاغذات بڑھا دیئے۔ اب سامان کا مرحلہ تھا اُسے کسٹم کا کا تو خوف نہ تھا لیکن سامان کھولنا اور پھر باندھنا ایک مسئلہ لگتا کیونکہ گھر سے تو یہ سارا کام بیٹیاں کر دیتی تھیں۔

شاید "چیل کے گھونسلے میں ماس" والی مثل کسٹم والوں کو یاد تھی اس لئے انہوں نے "استاد" کے سامان پر بغیر کھولے "چاک پھیر دی"۔

وہ لوگ باہر نکل آئے۔ آدمی۔ آدمیوں سے ملے۔ وہی دکھی چہرے۔ حیران آنکھیں۔ تھکے جسم و ذہن جو وہ سرحد پار دوسرے پیمانے پر چھوڑ کے آئی تھی... وہی یہاں بھی موجود لیکن پھر بھی ایک کچھ اور چیز بھی تھی جس کو وہ دریافت نہیں کر پا رہی تھی....

ایک شہر سے دوسرے شہر ابھی ان کے ہاں ابھی اُن کے ہاں سب جگہ.... محبت .... نرمی خلوص ... عزت .... قناعت .... مسائل .... پژمردگی .... مستقبل کا سوالیہ نشان .... جوان کنواری اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں... بے کار کم پڑھے لکھے روزگار کی جدوجہد میں مارے مارے پھرنے والے لڑکے .... ماضی کی یادوں اور باتوں میں گم بوڑھے ادھیڑ .... مرد اور عورتیں .... جھکی جھکی کمر والیاں۔ باورچی خانوں میں مٹی کے چولہوں یا تیل کے چولہوں پہ بیٹھ پوجا کا سامان کرتی خواتین .... گلیوں میں گالیوں کی بوچھاڑ اور فلمی گانوں کی چھاؤں

میں پلتے رستے بچے..... دھونکنی کی طرح سانس کھینچنے والے رکشہ چلاتے.... مزدوری کرتے... یا دوکانوں کے تھڑے پہ بیٹھے سگریٹ کے کش لیتے پان کھا کھا کے پیک تھوکتے...

یا چھوٹی دوکانوں پہ کامدانی کے پھول کاڑھتے۔ روئی دھنکتے درزی بنے لکڑی کی کیبن میں ہاتھ کی مشین کے سامنے بیٹھے یہ سب لوگ.... اپنے تھے.... اس کے میاں نے ایک شہر میں اُس سے بڑی حیرت سے پوچھا۔ تم تو اس شہر میں پہلی مرتبہ آئی ہو تم کو کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا علاقہ شروع ہو گیا؟

اس نے جواب دیا۔

جیسے ہی فضا میں گالیوں اور فلمی گانوں کی آواز گونجتی ہے اور اپنی آسانی سے گن لی جانے والی پسلیوں کے ساتھ بغلیں پھلائے لوگ چلتے نظر آتے ہیں دکھتی ہوئی مگر بے نور آنکھوں والے بڈھے پر سڑک کے کناروں پر چھوٹی چھوٹی کوٹھری نما دوکانوں سے جھانکتے ہیں تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ دوسرے نمبر کے شہریوں کا علاقہ آ گیا۔

.... یہ بھی کون جانے کہ یہ تبصرہ کتنا غیر حقیقی ہے....

پکی مٹی سے لپے دالانوں میں کھری چارپائیوں پہ بیٹھ کے اس نے ماضی کی کہانیاں بھی سنیں۔ حسن کو مٹتے بھی دیکھا.. کج کلاہی کی شان بھی دیکھی.... غیرت کا لہجہ بھی سنا۔

اس نے اپنی دیورانی کے گھر میں آنکھوں میں ساون بھادوں چھپائے اس ماں کو بھی دیکھا..... جس کی کہانی اس کے جانے کے بعد اس کی دیورانی نے سنائی تھی... ان خاتون نے بھی بڑی محنت سے اپنے بچے پالے تھے.... بیوہ تو نوجوانی میں ہو گئی تھیں اور خاندان والے باہر چلے گئے۔ ایک غریب بھائی بھاوج آسرا دیئے رہے..... بچے بھی ماشاءاللہ شیر جیسے اٹھے تھے۔

.... ان کا بڑا لڑکا چاند جدھر سے نکلتا تھا مسلمانوں کی گردن اونچی ہو جاتی تھی اس کی وجہ سے محلہ در محلہ کے جوانوں میں امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ بس لگتا ہے کہ جیسے کسی کی آنکھ "ہر دروازے" پہ ہے۔

"آخر ہوا کیا؟"

کچھ نہیں!

ابھی جو شیعہ سُنی فساد ہوئے تھے اُس میں اس کی وجہ سے اس علاقے میں ہنگامہ نہ ہو سکا.... اُس نے للکار کے کہہ دیا تھا۔ آپس میں نہ کٹ مرنا۔ یہ لہجہ بھلا کسی کو کیوں بھاتا؟

پھر....؟

پھر کیا ایک دن گھر کے دروازے پہ آئے اُسے آواز دی سینے میں گولی اتار چلے گئے۔ وہ تو شکل بھی نہ دیکھ پایا ہو گا۔ اس کے بھائی نے گلی میں سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے جا کر جواب میں ایسا ہی کیا.... ان کو توقع نہ تھی کہ چیونٹی ایسے کاٹ لے گی۔ اب وہ جیل میں ہے اور ماں بے چاری۔ خالی جھولی خالی جگر لئے۔ کچھ مجھ سے ملنے آ جاتی ہے.... مُنہ سے کچھ نہیں کہتی۔

پھر..... پھر کچھ نہیں.... اب تو فسادوں نے اتنا کیچڑ گارا کر دیا کہ..... قدم جمنے لگے ہیں.... یہیں جینا یہیں مرنا..... وہ..... وہاں سے کہانیاں سمیٹے..... نند سے ملنے اس کے شہر چلی گئی.... اللہ اکبر.... محبتوں کی فراوانی.... نہ دن اپنا نہ رات.... بچے ہیں تو شکل تکے جا رہے ہیں نندوئی ہیں تو میوے چُن رہے ہیں ہدیہ کر پاس پڑوس والے تک ایسے کہ بچھے جا رہے ہیں.... اور پھر روز روز کے پروگرام ہیں بھابی! اگر فلاں آپا کے ہاں لے کر نہیں گئی تو ان کو شکایت ہو گی۔ ارے بڑے ابا سے تو ملنا ضروری

ہے ... فلاں بھائی آ کے کہہ گئے ہیں دوپہر ان کے ہاں ہوگی۔ وہاں شام کو ان کے بھائیوں جیسے دوست کے ہاں جانا ہے۔ اور وہ زندگی کے اس محبت بھرے بھنور میں چکر لگاتی رہی۔ ایک دن اس کی نند اُسے لے کر اپنے ان ملنے والوں میں گئی جن کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ بھابھی ان لوگوں کو دیکھ کے جینے کا حوصلہ اور سلیقہ ملتا ہے۔

پہلے گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے دوکان میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے اس کا تعارف کرایا.... بھائی یہ ہماری بھابھی ہیں۔ پاکستان سے آئی ہیں۔ اچھا اچھا.... ان کے شفیق چہرے پہ لہر سی دوڑ گئی ہاں بیٹی کیا حال چال ہیں؟

بس جی اللہ کا شکر ہے! اس نے اپنے ہاں کی زندگی کے تصنع کا خیال کیا اور ان کی سادگی کو دیکھا۔

ہاں اللہ کا شکر تو ہر لمحہ ہونا چاہیئے۔ ارے بھئی تم گھر چلو... میں نماز پڑھ کے گھر آتا ہوں وہیں باتیں ہونگی

جی اچھا۔!

راستے میں نند نے بتایا یہ دل کے ایسے مریض ہیں جن کا ریکارڈ عالمی ماہرینِ قلب کے پاس بھیجا گیا اور جو اس حیرت میں ہیں کہ یہ زندہ کیسے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان کو تو ہل کر کروٹ بھی نہیں لینی چاہیئے کجا کہ یہ پریس چلاتے ہیں۔ اخبار نکالتے ہیں۔ گھر کا سودا سلف لاتے ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں.... اُن ماہرین سے بھائی نے کہا موت کا ایک وقت مقرر ہے اس سے ایک سانس زیادہ نہ کم۔ اور دنیا میں بھیجنے والے نے "کام" کے لئے بھیجا ہے جب اُسے "چھٹی" دینا ہوتی ہے تو وہ چھٹی کر دیتا ہے ورنہ کام کام اور صرف کام کرنا چاہیئے

وہ حیرت سے اپنی نند کی باتیں سنتی ہوئی اُس گھر میں داخل ہوئی جہاں ایک چوکی پہ روشن چہرے والی خاتون نماز شروع کرنے والی تھیں.... جہازی پلنگ درمیان میں بڑے طاقوں کے سامنے بچھا تھا۔ سفید تکیہ غلاف اور چادر خوبصورت رنگوں سے کڑھی ہوئی صفائی اور حسن کا عجیب امتزاج نظر آ رہی تھی۔ طاقوں اور بریکٹوں پر سلیقے سے کتابیں جمی ہوئی تھیں۔ پلنگ کے قریب گول میز بچھی تھی جس پہ ایک تصویر لگی تھی۔ کالی شیروانی میں ایک خوبصورت نوجوان مسکرا رہا تھا۔ تصویر کے پاس ایک خط کھلا رکھا تھا ایک پیڈ اور ایک قلم رکھا تھا۔ دو ایک کتابیں بھی تھیں.... نند نے اُسے لے جا کر ان خاتون سے متعارف کرایا.... بڑی بھابھی یہ ہماری بھابھی پاکستان سے آئی ہیں... انہوں نے محبت سے ہاتھ ملایا کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی بچیوں کو آواز دی۔ چھنے ہوئے دوپٹے غرارے جمپر میں نکھرے چمکیلے چہرے دیکھ کر وہ اندر اندر سے بڑی خوش ہوئی اُسے یوں لگا جیسے وہ کسی مسلم سوشل فلم کے خوبصورت سین میں داخل ہو گئی ہو۔

لمبی سیاہ چوٹیاں، سُلجھے لہجے۔ پڑھائی لکھائی کی باتیں خلوص سے مہکتا لہجہ۔ اس کو وقت کا اندازہ بھی نہ ہوا۔ دن کیسے گذر گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد اُس کی نند نے کہا... چلئے بھابھی ایک جگہ اور بس دس منٹ کے لئے۔ پھر گھر چلیں گے گلیوں در گلیوں رکشہ سے گذرتے ہوئے وہ ایک گھر کے دروازے پہ رُکی .... وہاں محلے کی بجلی گئی ہوئی تھی۔ اسی لئے اندھیرا تھا۔

خیر کوئی بات نہیں ویسے بھی یہاں کے بلبوں میں اجالا کتنا۔ اُس کو اپنے شہر کے روشن بلب یاد آ گئے....

اس گھر میں جاکر اس کی نند نے صاحبِ خانہ سے گلہ شکوہ کیا
کہ اتنے دن سے پلٹ کے خبر نہ لی۔
اس پہ وہ بولیں بس بہن کیا بتاؤں وہی مسئلہ تھا۔
اچھا..... ! میری نند کا جوش بھرا لہجہ جاگ بیٹھا
یہ کون ہیں ؟ .... انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ۔
ایک ٹمٹماتی بتی دور جل رہی تھی۔
ارے ہماری بھابھی ہیں کان پور سے آئی ہیں۔
وہ چونک پڑی..... !
ابھی تک اس کا ہر جگہ اس کے ملک کے ساتھ تعارف
کرایا گیا تھا۔
اس نے کچھ بولنا چاہا.... تو نند نے گھٹنا دبا دیا۔
"اچھا تو اب چلتے ہیں...."
"ارے بیٹھو ابھی بجلی آجائے گی۔"
"نہیں نہیں پھر آئیں گے۔ ویسے بھی آج بھابھی کو میں
نے بہت تھکا دیا۔" نند کا لہجہ.... اُسے خود عجیب سا لگنے لگا۔
گھر واپس پہنچ کر برقع اتارتے ہوئے اس کی نند نے کہا معاف
کیجئے گا بھابھی آپ بھی سوچ رہی ہوں گی کہ کیا معاملہ ہے.....
میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی۔
رات کو بچوں وغیرہ کو سلانے کے بعد نند نے پوری کہانی
سنائی کہ ان کے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی گاؤں میں رہتے ہیں
آپ کے ملک سے ان کے رشتہ دار آئے سب نے خاطر تواضع کی
محبت دی اور انہوں نے یہاں فلموں کے "پردیسی ہیرو" والا کام کیا
ان کی چھوٹی بہن کو آزمائش میں مبتلا کر خود ماں باپ کو لینے گئے
تو لوٹ کے نہ آئے۔ ادھر ماں باپ بچی کو ان کے "تحفے" سے نجات
دلانے شہر لائے۔ غریبی کمزوری اور یہاں کا ماحول تو آپ نے
دیکھ ہی لیا۔ وہ لڑکی گزر گئی۔ اب ان لوگوں کو آپ کے ملک کے نام سے
کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ لرز گئی! اب ان لوگوں کو آپ کے ملک کے
نام سے کچھ ہونے لگتا ہے وہ لرز گئی۔ اس گھر کی اندھیری گھٹن نے
رات بھر اُسے بے چین رکھا۔ دوسرے دن اس کی روانگی تھی۔
اسٹیشن پہ سب لوگ تھے۔ اس کے نندوئی کسی کام سے گئے
ہوئے تھے ان کا انتظار تھا.... ریل چلنے والی ہوئی تو وہ
دوڑتے ہوئے کھڑکی تک پہنچے معاف کیجئے گا بھابھی بات ہی ایسی
تھی وہ .... پڑوس والے بھائی کا بچہ وہ یونیورسٹی میں پریذیڈنٹ
بننے والا تھا۔ وہ جل کر مر گیا.... اس کی آنکھوں میں کالی
شیروانی والا خوبصورت مسکراتا چہرہ گھوم گیا۔ ۔ ۔
کیسے ؟
کچھ نہیں معلوم.... کوئی گواہی نہیں بس اس کا
ایک مقامی ساتھی کہہ رہا تھا چولہے سے آگ لگ گئی۔..
بھلا ایسے کیسے آگ لگ سکتی ہے جسے اس جیسا
نوجوان بجھا نہ سکے صرف کمبل میں لپٹی ایسی لاش ملی ہے
جسے اس کے بھائی چچا گھر میں لانا نہیں چاہ رہے کہ باپ
ماں بہنوں پہ کیا گذرے گی ؟
کیا گذرے گی۔
کیا گذرے گی۔ اُسے ریل کی پٹڑیوں سے مسلسل یہ
ہی صدا آتی رہی۔ کہانیاں اور فاصلے سمٹتے اور چھپتے رہے۔
اور یوں ہوا کہ وہ.... اداس..... بیمار تھکی ہوئی۔ اپنے
شہر اپنے گھر لوٹ آئی۔ ۔ ۔ چند دن بعد اس کا جی گھبرایا۔
اور وہ آہستہ آہستہ اپنی ان پڑوسن کے ہاں چلی گئی۔ شاید وہ
اپنے اس سفری ساتھی" کو توڑنا چاہ رہی تھی۔
وہاں جا کر اُسے احساس ہوا کہ ایک عجیب چپ سی
وہاں کی فضا پہ طاری ہے۔

کہاں ہو بھئی دلہن ؟ ! اُس نے آواز دی ۔ پڑوسن کے ہوتے پہلے ان کی بڑی بہو کی خوبصورت سی چہکنے والی سات آٹھ سالہ بیٹی آگئی ۔

آیئے آنٹی بیٹھئے ، چچی ابھی آتی ہیں !

اور تمہاری پھپو کہاں ہیں ؟ دادی کہاں ہیں ؟ اور سب کہاں گئے ؟

کون ارے وہ امینا بھر جیسے انکل ہاں وہ لوگ تو چلے گئے اور پھپو اور دادی ہسپتال میں ہیں ۔

کیوں خیریت ؟

کیسی آنٹی ..... وہ پھپو کی طبیعت خراب ہو گئی تھی !

کیا ہوا تھا ؟ ___ کیا بخار وغیرہ

نہیں آنٹی پھپو تو بہت اچھی تھیں وہ اور لمبو انکل ہم سب خوب خوش رہتے ! نے خوب گھومتے پھرتے تھے

پھر ان لوگوں کے جانے کے بعد پھپو بیمار پڑ گئیں .... دادی انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئیں ۔

اب کیسی ہیں ؟

آداب آنٹی ... بہو نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا ۔ بچی" چچی کو دیکھ کر .... چپ ہو گئی ۔

ارے بھئی تمہاری نند کی کیا طبیعت خراب ہے ؟

جی جی .... بہو کا چہرہ سفید پڑ گیا ۔ اس نے

کیا کیا ہے ؟ اس نے بچی" کو دیکھتے ہوئے پوچھا ۔

کچھ نہیں میں تو تم سے پوچھ رہی ہوں ؟

جی بس کیا کہیں آجکل کے رشتے دار کیسے ہیں ... !

وہ انڈیا سے جو کزن آئے تھے انہوں نے اپنا پکا حق ادا کر دیا ۔ خود کو ہیرو بنا کر پیش کیا .... یہ لڑکیاں بھی .... وہ جھوٹ بھی بولنا چاہ رہی تھی اور سچ بھی نہیں چھپ رہا تھا ۔

اسی وقت پڑوسن بیٹی کو سنبھالتی اندر آئیں اسے بیٹھا دیکھ کر گھبرا سی گئیں ۔

وہ چہکتی مہکتی لڑکی .... آنکھوں میں حلقے چہرے پہ پیلاہٹ لئے نظریں جھکائے ماں کے ساتھ کمرے میں چلی گئی ۔

اُسے آکر شرمندگی ہو رہی تھی لیکن پھر بھی اُس کے سینے سے دبی ہوئی ایک گہری ٹھنڈی سانس نکلی جیسے سینے پہ رکھا بوجھ ہٹ گیا ہو ۔

اُسے وہ گھٹن والا اندھیرا گھر یاد آ گیا تھا جہاں ایک بوڑھے ماں باپ اور بہن بہنوئی اُس محلے کا نام سننا پسند نہیں کرتے تھے ۔ یہاں لڑکی لوٹ آئی ہے شاید اس لئے کہ یہاں روشنی زیادہ گھر کشادہ اور لوگ ..... لوگ .... جانے کیسے ہیں ....

جمیل زبیری

# ادائے خود فریبی

وہ دونوں آہستہ آہستہ ایک پگڈنڈی پر خاموش چل رہے تھے۔ بوڑھے کے چہرے پر وقت اور دکھوں نے گہری کھائیاں کھود دی تھیں۔ نوجوان نے کئی دفعہ بوڑھے سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ہر مرتبہ اسے اشارے سے منع کر دیا۔

آخر نوجوان اس خاموشی سے اکتا گیا اور اس نے زور دے کر پوچھا "ابھی ہمیں کتنا اور چلنا ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا "بس جتنی میری عمر ہے۔"

"تو بھلا یہ کیا بات ہوئی؟" بہر حال نوجوان خوش تھا کہ وہ خاموشی کے سمندر سے دونوں کو باہر نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

نوجوان نے پھر پوچھا "بتاؤ تو پھر اس شخص کا کیا انجام ہوا جس نے اپنی انا پر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا؟"

"وہ مر گیا۔" بوڑھے نے سر جھکا کر جواب دیا۔

مشرق سے سورج آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔ رات اپنی تاریکی کی چادر سمیٹ رہی تھی۔ اب اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ پہاڑوں کے طویل سلسلے نظر آنے لگے تھے۔

"وہ کیسے مر گیا؟" نوجوان نے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بس تم یوں سمجھو کہ لڑکی کے باپ نے جس کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا ایک رات مجھ سے کہا۔ تم میری بیٹی لے لو اور تمہارے پاس جتنا روپیہ ہے وہ مجھے دے دو — مجھے باہر جانے کے لئے روپیہ چاہیئے۔"

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا — اور اس کے چہرے پر دکھوں کی لکیریں کچھ اور گہری ہو گئیں۔

"پھر کیا ہوا —" نوجوان نے بے تابی سے پوچھا۔

پیشتر اس کے کہ بوڑھا جواب دیتا نوجوان نے ایک سوال اور کر دیا۔

"کیا تم نے اسے دیکھا تھا۔ کیا وہ تمہیں پسند تھی؟"

بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"ہاں — وہ مجھے بہت پسند تھی۔ میں نے ایک صبح اسے جھونپڑی سے باہر اس وقت نکلتے دیکھا تھا جب مشرق سے آج ہی کی طرح سورج نکل رہا تھا۔ اس وقت سورج کی شعاعیں جب اس کے گورے چمکدار چہرے پر پڑی تھیں تو وہ مجھے افق سے اترنے والی کوئی انجانی مخلوق لگی تھی۔

"میں نے ایسا حسن کبھی نہیں دیکھا تھا۔" بوڑھا اتنا کہہ کر پھر چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا۔ آگے بھی تو بتاؤ۔" نوجوان نے پوچھا۔

"میرے پاس رقم تھی میں اسے دینے کو تیار تھا۔ مگر"

"مگر کیا؟" پھر نوجوان بول پڑا۔

لڑکی نے اپنے باپ کی بات سن لی تھی جب اس کا باپ پانی لینے باہر گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگی — اگر تم روپیہ نہ دے سکو تو مجھے بتاؤ — میں تمہیں پیسے دیتی ہوں۔ وہ تم میرے باپ کو

دے دینا۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"مجھے اس کی بات سے دھچکا لگا ـــ میں خاموش ہو گیا اور میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

"کیا" نوجوان نے پھر بے تابی سے پوچھا۔

"میں اس رات چپ چاپ ان لوگوں کو بغیر کچھ بتائے وہاں سے چلا آیا۔"

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ میری اَنا کا مسئلہ تھا۔"

"کیا تم اپنی خوشی کی خاطر اپنی اَنا کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔"

"نہیں نہ معلوم مجھے اس وقت کیا ہو گیا تھا ـــ میں پاگل ہو گیا تھا ـــ میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی، میں نے اپنے گلے پر چھری پھیر لی تھی۔

"پھر کیا ہوا ـــ ؟ اس کا کیا بنا ـــ ؟

اس دوران انہیں دور سے دو انسان اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جب وہ بالکل قریب آ گئے تو بڈھا ایکدم چونک پڑا۔

وہی .... بالکل وہی چہرہ ـــ مگر..... اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے پر گہری لکیریں پڑ گئی تھیں اس کے ساتھ چلنے والا شاید اس کا شوہر تھا جس نے اس کے باپ کو پیسے دے کر اسے خرید لیا تھا ـــ اور اس کا باپ پیسے کمانے باہر چلا گیا تھا۔

جب وہ بالکل اس کے قریب سے گزری تو بڈھا چلتے چلتے رک گیا ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔

جب وہ گزر گئے تو بڈھے نے کہا "تم نے دیکھا کچھ لوگ کس طرح چپ چاپ مر جاتے ہیں۔

قدرت نقوی

گوشۂ غالب

# غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

کافی دن ہوئے کچھ مخطوطات دیکھنے قومی عجائب گھر کراچی جایا کرتا تھا۔ ایک روز ناظم کتب خانہ نے مجھے غالب کا ایک خط دکھایا جو عجائب گھر میں فروخت کے لئے آیا تھا۔ ناظم کتب خانہ نے تصدیق چاہی کہ یہ غالب ہی کا خط ہے اور کیا تحریر بھی غالب ہی کی ہے؟ میں نے خط دیکھا پڑھا اور تصدیق کردی کہ واقعی غالب ہی کا خط ہے اور انہی کی تحریر ہے۔ غالب کے قلم کی بہت سی تحریریں، تحریروں کے عکس میری نظر سے گزر چکے تھے، مجھے یہ خط اور اس کا رسم الخط غالب کا تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوا۔

خط پڑھا تو اس بات سے بے حد مسرت ہوئی کہ یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔ میں ۱۹۵۷ء سے غالب کے خطوط پر کام کر رہا تھا اس لئے یہ یقین ہو گیا کہ یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔ یہ اب تک شائع شدہ خطوط کے کسی مجموعے میں شامل نہیں اور کسی رسالے میں بھی نہیں چھپا۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر خلیق انجم بھارت سے آئے۔ وہ غالب کے خطوط پر کافی دنوں سے کام کر رہے ہیں۔ "غالب کے خطوط" تین جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور چوتھی جلد چھپنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ان سے میں نے اس خط کا ذکر کیا اور وعدہ کیا کہ میں کاغذات میں تلاش کروں گا اور اس کی نقل بھیج دوں گا۔

میں نے یہ خط اب تک اس لئے پیش نہیں کیا تھا کہ اس کے مکتوب الیہ کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ جن صاحب نے یہ پیش کیا تھا ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کے کسی بزرگ کے نام ہے۔ مگر مجھے یہ بات درست معلوم نہیں ہوئی۔ کیونکہ خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ اور ان کے لواحقین و متعلقین سے کافی گہرے مراسم تھے۔ اور یہ کہ یہ پہلا خط نہیں ہے۔ بلکہ خط و کتابت کا سلسلہ دیرینہ ہے۔ اس کا ثبوت احسان حسین خاں کی بیماری اور نوروز علی خاں کی وفات کے ذکر سے ملتا ہے۔ اس لئے اور بھی خطوط ہونے چاہئیں۔ غالباً یہ خط کہیں سے ہاتھ لگ گیا جسے اپنے بزرگ کے نام کا بتا دیا۔

مکتوب الیہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ وہ کسی کام سے کلکتے جا رہے تھے۔ ابھی کانپور ہی میں تھے کہ احسان حسین خاں کی علالت کی وجہ سے کانپور ہی سے لکھنؤ کے لئے مراجعت کرنی پڑی۔ غالب نے لکھنؤ سے کلکتے اور دہلی سے لکھنؤ جانے کے راستے کی تفصیل بیان کی ہے۔

مکتوب الیہ احسان حسین خاں اور نوروز علی خاں کی شخصیتیں تحقیق طلب ہیں۔ اب جب کہ مجھے ان شخصیتوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا

مناسب یہی سمجھا کہ اس خط کو شائع کر دیا جائے۔ شاید کوئی ان ہستیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے۔

غالب اعراب بالحروف استعمال کیا کرتے تھے۔ بالخصوص الف مضموم کے ساتھ "و" اظہار ضمہ کے طور پر لکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے ان الفاظ میں "و" کے ساتھ املا کی ہے۔

اون ۔ = اُن ؛ اوس = اُس ؛ اودھر = اُدھر

ہم نے اس املا کو برقرار رکھا ہے۔

قدما اور متوسطین کی یہ روش تھی کہ جب "مجھ" کا الحاق "کو" کے ساتھ کرتے تو اسے ملا کر لکھتے اور "جھ" کی جگہ "ج" لا کر "مجکو" املا کرتے۔ غالب نے اسی قدیم روش کے مطابق "مجکو" لکھا ہے۔ ہم نے بھی یہی املا برقرار رکھی ہے۔

موجودہ دَور سے پہلے یائے معروف و یائے مجہول میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ غالب نے اس خط میں چھ جگہ یائے معروف کے بجائے یائے مجہول استعمال کی ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

کوئے = کوئی ؛ اتنے = اتنی ؛ کے = کی

آئے = آئی ؛ تلمے = قلمی ؛ کوئے = کوئی

غالب عبارت میں بارہ (۱۲) کا ہندسہ لکھ کر ایک مطلب ختم ہونے کی نشاندہی کرنے کے عادی تھے۔ یہ بارہ کا ہندسہ "حد" کے اعداد ہیں۔ اس خط میں جہاں غالب نے ۱۲ کا عدد لکھا ہے۔ ہم نے بھی وہ برقرار رکھا ہے۔ اس طرح ایک پیراگراف ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا نیا پیرا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی حساب سے ہم نے بھی پیراگراف قرار دیئے ہیں۔

علامات رموز او قاف ہم نے دَور جدید کے مطابق استعمال کی ہیں۔ ان سے غالب کا کوئی واسطہ نہیں ہے آجکل ان کا استعمال ناگزیر ہے۔

میرے نزدیک حرف علت الف، واؤ اور یا کے بعد جب یائے اضافت و توصیف آتی ہے تو اس پر ہمزہ لگانا ضروری ہے۔ مگر غالب اس کے قائل نہ تھے۔ لہٰذا ہم نے اس خط کے متن میں غالب کی روش کو برقرار رکھا ہے۔

ان وضاحتوں کے بعد اب غالب کا خط ملاحظہ فرمایئے۔

خاں صاحب! جمیل المناقب عمیم الاحسان سعادت و اقبال توامان، سلمہ اللہ تعالیٰ!

بعد اہدائے ہدیۂ سلام مسنون و دعائے ترقی دولت روز افزوں، غالب خونیں جگر کہتا ہے۔ اللہ اللہ! میرے آقائے نامدار صاحب دلدل و ذوالفقار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول حق ہے!

"عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِم"

آپ کا قصد تھا کہ کانپور سے الہ آباد اور وہاں سے کلکتے جائیں، سو یہ واقع ہوا کہ کانپور سے آپ پھر لکھنؤ آئیں۔ ۱۲

واللہ! احسان حسین خان بہادر کا حال سن کر بیتاب ہو گیا۔ اتنی طاقت کہاں؟ کہ یہاں سے علیگڑھ تک ڈاک اور وہاں سے آگرہ تک اور کانپور تک ریل اور پھر کانپور سے لکھنؤ تک ڈاک میں پہنچوں اور اون کو دیکھوں! ناچار دعا پہ مدار ہے۔ خداوندا جلد جناب کی صحت کی نوید بھیجو۔ ۱۲

یہ نہ جاننا کہ غالب نے اس خدمت مقرر میں قصور کیا۔ کتاب فروشوں کو کہہ رکھا ہے۔ مولویوں سے سوال کر چکا۔ تفہیمات شیخ ولی اللہ کا کہیں پتا نہ لگا۔ یہ کتاب معرض انطباع میں نہیں آئی۔ قلمی کہیں موجود نہیں۔ ۱۲

ہائے ہائے! میرا دوست نوروز علی خاں خدا بخشے اوس کو، کیسا لطیف اور خلیق اور دانا آدمی تھا۔ میں کیوں افسوس کروں؟ کیا مجکو ہمیشہ یہاں رہنا ہے؟ بموجب قول شیخ علی حزیں ؎

در کاروان ما قدے نیست استوار  مست گرا۔ وایم چوں موج از قفائے ہم

آگے پیچھے سب اودھر کو چلے جاتے ہیں۔ کوئی دو دن رہ گیا کوئی دو دن پیچھے چل نکلا۔ ۱۲

نجات کا طالب

غالب ۱۲

۱۴ فروری ۱۸۶۴ء

استدراک: غالب کی نثر و نظم کے آثار کی جستجو جاری ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میرے علاوہ بھی کسی اور کی رسائی اِس خط تک ہو گئی ہو اور اس نے اسے چھپوا دیا ہو۔ اس کی اشاعت کا اگر کسی صاحب کو علم ہو تو مطلع فرمائیں

سید قدرت نقوی

۲۹ جنوری ۱۹۸۹ء

صبا اکبر آبادی

# تضمینِ غالب

(حضرت صبا اکبر آبادی اساتذۂ فن میں سر فہرست ہیں۔ انھوں نے پچاس برس قبل غالب کی تمام اُردو غزلوں پر تضمین مکمل کی۔ مولانا حامد حسن قادری نے حضرت صبا کی اس کوشش کے بارے میں فرمایا تھا کہ غالب کی غزلوں پر جتنی تضمینیں بھی کہی گئی ہیں جناب صبا کی کوشش ان میں سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ فروری غالب کی وفات کا مہینہ ہے اسی حوالے سے حضرت صبا کی تضمینیں پیشِ خدمت ہیں)

ہے تحیّر میں مرقع شکوہ تقدیر کا ہر خموشی پہ ہے دھوکا عالمِ تقریر کا
رنگ ہر خاکے میں ہے بیرنگیٔ تدبیر کا نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کس طرح جیتے ہیں فرصت میں تمنائی نہ پوچھ کیسے کٹتا ہے یہ دورِ ناشکیبائی نہ پوچھ
کچھ نہ پوچھ اے بے نیازِ حالِ شیدائی نہ پوچھ کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کا کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دستِ قاتل میں ہے جنبش سر جھکانا چاہیئے اب اُمیدِ سر فروشی کے لیے کیا چاہیئے
کم سے کم ہر آرزو میں زور اتنا چاہیئے جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

بے خودی میں رازِ اُلفت کا جو کوئی لب تک آئے سننے والوں کو مری ہر بات دیوانہ بنائے
گفتگوئے عشق کا اِک حرف بھی سمجھا نہ جائے آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اس طلسمِ آب و گِل سے مخلصی دشوار کیا درد دل میں بس مجھے پہلو بدلنا ہے ذرا
رشتۂ تارِ نفس تک سوزِ غم سے جل گیا بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آئی ہوائے دشت کسی کو نہ سازگار	اہلِ خرد سے دل میں بیاباں کے ہے غبار
لیکن نہیں جنونِ مکمل پہ اختیار	جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

بیتابیوں سے ہوگئی دل کی فضا درست	جو کچھ اب اضطراب کو کہیے، بجا درست
تصویرِ یاس کی ہوئی ایک اک ادا درست	آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا

تخییل نے دکھائی تھی شب کو عجب ادا	منظر مری نظر میں تھا بازارِ عشق کا
دل دے چکا تھا اور تقاضا وفا کا تھا	تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

ہوں مبتدیٔ درسِ غم و صد قلق ہنوز	باطل کا ہے خیال نہ تمییزِ حق ہنوز
اُلٹا نہیں ہے چاکِ جگر کا ورق ہنوز	لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مجھ پہ جہاں کی کوئی بھی خلعت نہیں سجی	تھی تنگ میرے واسطے پوشاکِ عنصری
صد شکر پردہ پوشیٔ وحشت قضا نے کی	ڈھانپے کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

دنیا سے کیا تعلقِ اربابِ فن اسدؔ	جلتے ہیں مثلِ شمع سرِ انجمن اسدؔ
اس طرزِ مرگ پر ہے صبا حرف زن اسدؔ	تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عرصہ ہوا ہے ہوش کو قرباں کیے ہوئے	گزری ہے عمر دل کو پرستاں کیے ہوئے
برسوں ہوئے ہیں عیش کا ساماں کیے ہوئے	مدت ہوئی یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

یاد آرہے ہیں زیست کے ارماں کئے ہوئے — عرصہ ہوا نظر کو گلستاں کئے ہوئے
مدت سے ہوں امید کو ویراں کئے ہوئے — مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

ٹھکرا رہا ہوں پھر ہوسِ تاج و تخت کو — پھر ہیچ جانتا ہوں ہر اک نرم و سخت کو
پھر سینچنا ہے باغِ وفا کے درخت کو — کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

آنکھوں کو خشک دیکھ کے طعنے مجھے نہ دو — بے رنگ آنسوؤں کا مزہ کیا ہے دوستو
رنگینیٔ حیات میں کوئی کمی نہ ہو — کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر عقلِ خام کو ہوا دیوانگی کا غم — ویرانیوں کی سمت پھر اٹھنے لگے قدم
پھر یاد آرہا ہے جنوں ہوش کی قسم — پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

لیل و نہارِ عشق پہ چلتا نہیں ہے بس — تاریکیٔ فراق میں گزرے کئی برس
پھر ہر قدم پہ آگ لگانے کی ہے ہوس — پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر زندگی میں درپۂ آزار سا ہے عشق — پھر اہتمامِ دردِ خلش کر رہا ہے عشق
پھر مہربان زخمِ جگر پر ہوا ہے عشق — پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر ہے چمن چمن میں بہاروں کی دیکھ بھال — پھر ہے کلی کلی پہ تبسم کا احتمال
میں چاہتا ہوں باغ میں گلچینیٔ جمال — موڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہیے پیامِ محبت کا سلسلہ — پھر بھیجتا ہے قاصدِ جاں سوئے دل رُبا
ارمان ہے وہ پھر مجھے لکھے مرے صبا — پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

چھڑکے ہے پھر اُمید پہ خونِ جگر ہوس — کرتی ہے پھر حواس کو زیر و زبر ہوس
پھر چاہتی ہے ایک فریبِ نظر ہوس — مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

پھر چاہیے نظر کو تجلی پہ دسترس — پھر اپنی وحشتوں میں نہیں کوئی پیش و پس
پھر ہے وہی مذاق نگاہوں کا ہم نفس — مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

ارماں ہے کہ پھر کوئی قاتل ہو رُو برو — کام آئے میرے شوقِ جراحت کی آبرو
ہو مجھ سے اُس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو — چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

پھر سادگیٔ شوق ہے قرباں بہ خونِ دل — ہے اہتمامِ دورِ گلستاں بہ خونِ دل
رنگینیٔ نظر کا ہے ساماں بہ خونِ دل — پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں خونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں لئے ہوئے

پھر آج اضطراب طلب ہے سکونِ دل — پھر آشکارِ دہر ہے حالِ زبونِ دل
پھر آنسوؤں کے بھیس میں اُبھرا جنونِ دل — پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں خونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

پھر مبتلائے حسن ہوا ہے دلِ غریب — پھر جلوے چاہئیں نگۂ شوق کے قریب
پھر دیکھئے جمال ہو اُس کا کسے نصیب — باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

پھر ننگ و نامِ عشق ستم گر مٹائے ہے    خود داریوں کو پھر مری وحشت اٹھائے ہے
ایوانِ عقل و ہوش کو پھر شوق ڈھائے ہے    دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر ہے گلوئے خشک کو تلوار کی طلب    پھر ہے سکونِ قلب کو آزار کی طلب
جنسِ وفا کو پھر ہوئی بازار کی طلب    پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

پیدا ہوئی ہے قتل کی پھر دل میں آرزو    پھر لے چلی ہے کوچۂ قاتل میں آرزو
ہے پھر حجابِ ناز سے مشکل میں آرزو    چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں حسن کو آلودۂ گناہ    پھر پی کے سامنے کوئی آجائے رشکِ ماہ
پھر چاہتا ہوں کیف و جوانی کی رسم و راہ    اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر دل میں ہے کہ عشق کی سب ذلتیں سہیں    پھر آرزو ہے آنکھ سے اشکِ الم بہیں
پھر گالیاں سنا کریں اور کچھ نہیں کہیں    پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

پھر یادِ یار پہ ہوں فدا اپنے سال و سن    پھر اے نگاہِ یاس ذرا دل کے داغ گن
پھر چاہتا ہے قلب وہی دورِ مطمئن    جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ابرِ بہار ضبط کے طعنے ہمیں نہ دے    ہیں یادِ چشمِ تر نے جو طوفاں اٹھائے تھے
بہتر یہی ہے امن دو عالم کے واسطے    غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

نورالحسن جعفری

# کچھ تذکرہ نثار کا

نثار سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میری بڑی بیٹی تین سال کی تھی اور اب وہ ماشاء اللہ دو بچوں کی ماں ہے اور میں گزشتہ ماہ (اپریل ۸۸ء) نثار کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لئے لاہور گیا۔ یہ تقریباً ۳۴ سال کا عرصہ بنتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں تو یہ عرصہ ایک لمحے سے بھی کم ہے لیکن پاکستان جس کی عمر ابھی صرف اکتالیس سال ہے اور جہاں شہریوں کی اوسط زندگی ۵۲ سال ہے یہ تین چوتھائی اوسط زندگی سے بھی زیادہ ہے۔

یوں تو نثار کی وجہ سے کبھی الجھن پیدا نہیں ہوئی لیکن جب آج اس تحریر کے لئے عنوان کی تلاش ہوئی تو نام کی وجہ سے کافی دشواری پیش آئی۔ صرف نثار لکھوں یا نثار عزیز یا نثار عزیز بٹ۔ میں ان کو نثار یا کبھی کبھی نثار بہن کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔ لیکن نثار مردانہ نام بھی ہے۔ ایک ماسٹر نثار مشہور کرکٹر گزرے ہیں اور ایک نے موسیقی میں نام پیدا کیا تھا۔ قریبی دوستوں کے حلقے میں وہ صرف نثار یا عزیز کے نام سے پکاری جاتی ہیں لیکن ادبی حلقوں میں ان کا پورا نام لیا جاتا ہے۔ نثار عزیز بٹ اور اسی نام سے ان کی تینوں ناولیں شائع ہوئی ہیں اس لئے تو میں نے یہ پورا نام دے دیا ہے۔

سن ۵۳ کے شروع کی بات ہے میں لاہور میں تعینات تھا اور ایک چھوٹے سے دفتر کا سربراہ تھا معلوم ہوا کہ ایک نئے افسر کو تربیت کے لئے دفتر میں بھیجا جا رہا ہے نام سرتاج عزیز مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ نام سن کر میں کچھ چونکا پرانی اردو ناولوں میں سرتاج من سلامت تو پڑھا تھا لیکن سرتاج کسی مرد کا نام بھی ہو سکتا ہے یہ خیال نہیں آیا تھا۔ تین چار دن بعد درمیانہ قد، کھلتا ہوا رنگ اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ایک صاحب دفتر میں لائے گئے اور انھوں نے اپنا تعارف کرایا میرا نام سرتاج ہے۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ باتیں ہوئیں زیادہ تر ذاتی سرکاری کم۔ اگر ذاتی کوائف معلوم ہوں تو انسان کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے سرتاج نے بتایا کہ شادی ہو چکی ہے اس سے قبل وہ صوبہ سرحد کے محکمہ اطلاعات سے منسلک تھے۔ مکان کی فوری ضرورت ہے۔ کچھ محکمہ کی بات ہوئی کہ ترقی کے امکانات کیا ہیں۔ ٹریننگ کس قسم کی ہوگی۔ یہ صاحب آج کل مرکز میں وزیر زراعت ہیں (ملٹری اکاؤنٹس کے افسروں کو فوج سے مکان مل جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد سرتاج کو چھاؤنی میں ایک مکان مل گیا۔ سرتاج کا مکان میرے مکان سے دور نہیں تھا۔ میں ادا کے ساتھ ایک شام سرتاج کے گھر گیا اور ان کی بیوی لالی سے ملاقات ہوئی کھلتا ہوا رنگ اور ہنس مکھ چہرہ باتوں باتوں میں سرتاج نے بتایا کہ

جلد ہی اس کی بڑی بہن آنے والی ہے۔ وہ علیل تھی اب صحتیاب ہُوئی ہے اس کا نام نثار ہے پورا نام نثار عزیز اور ادا کا اصل نام بھی عزیز جہاں ہے عزیز اور نثار دونوں مردوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ نثار احمد، عزیز احمد، نثار عزیز کے نام سے معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خاتون کا نام ہے۔ سرحد کے لوگوں سے میں زیادہ واقف نہیں تھا اور نثار عزیز کسی لڑکی کا نام مجھے غیر مانوس لگا۔ سرتاج نے بتایا کہ اس نے بھی ایم۔اے پاس کیا ہے مضمون کی بابت میں نے نہیں پوچھا تقریبًا ۲۶ سال بعد کسی سلسلے میں نثار کے کوائف کی ضرورت ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس نے پنجاب یونیورسٹی سے (ریاضی) حساب میں ایم ایس۔سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ اس کی ناولیں اتنی مشکل کیوں ہوتی ہیں۔ ایم۔ایس سی کے درجہ پر حساب اور فلسفہ تقریبًا ایک ہو جاتے ہیں صرف دو اور دو چار کی بات نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ بعد ہم لوگ پھر سرتاج کے یہاں گئے تو نثار آ چکی تھیں۔ لاہور میں گرمی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے شام کے وقت لوگ باہر ہی بیٹھتے ہیں کمروں میں پنکھا چلا کر بیٹھنا تقریبًا ناممکن ہوتا ہے دیواروں کی تپش کمرے کو بھٹی بنا دیتی ہے

ہم لوگ باہر بیٹھے تھے اور سرتاج نثار کو بلا کر لائے میانہ قد دبلی پتلی چہرے پر اضمحلال اور تکان کے آثار لیکن آنکھیں نہایت شفاف جن میں ایک خاص چمک تھی۔ اِدھر اُدھر کی بھی باتیں ہوتی رہیں میں کسی کی علالت کی بابت سوال نہیں کرتا لیکن نثار نے خود دھیمی آواز میں مختصراً اپنے سینی ٹوریم کے قیام کی بابت بتایا نثار کی باتیں نپی تلی تھیں اور اس کا لہجہ بہت دھیما تھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ نثار نے ادا سے اسکی شاعری کی بات کی، اس کی پہلی کتاب شائع ہو چکی تھی۔ ادا نے کہا غیر شعوری طور پر وہ اب شاعری ترک کر چکی ہے اسکی ساری دلچسپی اب اپنی تین سالہ بیٹی صبیحہ پر مرکوز ہے شاعری کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور فی الحال اس کا ذہن اس کی طرف قطعی مائل نہیں اس پر نثار نے بہت سارے سوالات کئے نثار نے بتایا کہ وہ خود بھی کچھ لکھتی ہے۔ نثر لیکن تفصیل نہیں بتائی

سرتاج کے یہاں ہمارا خاصا آنا جانا ہو گیا اب نثار کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ چہرہ کا اضمحلال دُور ہو گیا تھا آنکھوں کی چمک اور زیادہ ہو گئی تھی اور وہ بہت جم کر گفتگو میں حصّہ لیتی اور بحث کرتی اس کا زندگی کا ایک خاص نظریہ تھا جو عام لڑکیوں سے مجھے الگ لگا۔ خود اعتمادی کا عنصر غالب تھا۔ وہ آسانی سے اپنے مؤقف کو نہیں چھوڑتی اور کبھی کبھی بحث میں اس کی آواز تیز بھی ہو جاتی لیکن اس میں کٹ حجتی کا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ اس کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ اس نے بہت کچھ پڑھا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے اس کو سمجھا بھی ہے۔ زندگی اور خصوصًا لڑکیوں کی زندگی کی بابت اور معاشرہ میں اس کے مقام کی بابت اس کے خیالات بہت واضح تھے۔ لڑکی کی اپنی شخصیت ہوتی ہے اور شادی کے بعد بھی اس کی شخصیت برقرار رہتی ہے اندازہ ہوا کہ وہ صرف کسی کی بیوی کے نام سے پہچانے جانے پر تیار نہیں ہوتی۔

رفتہ رفتہ نثار کی طبیعت بہتر ہوتی گئی۔ اس کا رنگ نکھر آیا اور آنکھوں کی چمک میں تیزی آ گئی اب وہ زیر لب مسکرانے کے علاوہ دل کھول کر قہقہہ بھی لگاتی۔ قہقہے نثار کی فطرت ثانیہ ہیں وہ اپنے اوپر بھی ہنس لیتی ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ اگر نثار قہقہہ نہ لگائے تو آپ سمجھ لیجئے کہ وہ علیل ہے۔ میں نے غور کیا کہ نثار کو کپڑوں کا بہت شوق ہے اور اس کی طبیعت کی نفاست پسندی اسکے کپڑوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ صاف شفاف ہلکے رنگ۔

میں نے ادا سے کہا کہ جس خوش قسمت کی وہ نصف بہتر ہوگی اسے کپڑوں کے مد میں کافی خرچ کرنا پڑے گا۔ ادا کو بھی کپڑوں کا شوق ہے۔ شروع کی ملاقات میں ان دونوں میں یہی بات مجھے قدر مشترک دکھائی دی۔ کپڑوں کے شوق کے علاوہ دوران گفتگو یہ معلوم ہوا کہ اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے خصوصاً انگریزی اور فرانسیسی ادب کا میں خاصا مرعوب ہوا۔ مجھے یونیورسٹی چھوڑے کئی سال ہو چکے تھے اور عصری انگریزی ادب سے واقف نہیں تھا لیکن نثار کی گفتگو سے کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ ہم لوگوں پر رعب ڈالنے کے لئے انگریزی ادب کے حوالہ سے بات کرتی ہے۔ بس یوں ہی ضمناً گفتگو میں تذکرہ آجاتا۔ سیاست پر بھی گفتگو ہوتی۔ اس کے خیالات باغیانہ تو نہیں لیکن عام ڈگر سے ہٹ کر تھے جب اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو کبھی کبھی اس کا چہرہ تمتما جاتا اور یہ معلوم ہوتا کہ اس کو غصہ آرہا ہے لیکن وہ بہت کوشش کر کے اس پر قابو پا رہی ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ ابھی مارشل لا کا دور نہیں شروع ہوا صرف دستور بنانے کے مراحل کا سامنا تھا مشرقی پاکستان کے مسائل سامنے آچکے تھے۔

اس دوران میں ایک بار ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جس کا نام اصغر بٹ بتایا گیا وہ سائیکل پر آئے مصافحہ ہوا اور تعارف اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئے دراز قد، دبلے پتلے، کھلتا رنگ باریک نقشہ چشمہ لگائے ہوئے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں، انہوں نے گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لیا بس اتنا معلوم ہوا کہ وہ ریڈیو سے منسلک ہیں پھر سرتاج کے یہاں کسی شام ان سے ملاقات ہوئی میں نے دیکھا کہ وہ آنکھیں بچا کر زیادہ وقت نثار کو دیکھا کرتے تھے۔ چھاؤنی کو پہنچنے کے لئے ایک پل پار کرنا پڑتا ہے اور اس پل کی چڑھائی پر سائیکل چلانا خاصا دشوار طلب کام تھا ایک مرتبہ میں نے اصغر صاحب کو اس پل پر سائیکل سوار دیکھا میں نے ادا سے کہا کہ اتنی محنت صرف نثار کو حاصل کرنے کے لئے کی جاسکتی ہے میرا اندازہ صحیح نکلا اور معلوم ہوا کہ نثار کی شادی ہو رہی ہے۔ ہم لوگوں نے مبارکباد دی اور نثار کو میں نے پہلی بار شرماتے ہوئے دیکھا۔ بہت دنوں بعد نثار نے بتایا کہ اصغر بٹ صاحب کو پیروی میں کئی سال لگے۔ وہ پشاور میں ریڈیو پر کسی پروگرام میں حصہ لیتی تھی اور اس زمانہ میں شریف لڑکیوں کی طرح اپنے ایم ایس سی ہونے کے باوجود برقع پوش تھی۔ اصغر بٹ صاحب ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے اور وہیں سے انہوں نے نثار کی غلامی کی زنجیروں کو نہایت خوشی سے اپنے گلے میں ڈالنے کے لئے ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ کم گو لیکن ذہین اور سمجھدار ان کو معلوم تھا کہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ خود کشمیری ہیں اور کشمیر کی سرحدیں صوبہ سرحد سے ملتی ہیں پٹھان رفیق حیات کے لئے محاصرے یا پاپڑ بیلنے پڑے غالباً چار پانچ سال پیروی کی تب مراد حاصل ہوئی۔

ہم لوگ شادی میں شریک تھے اس زمانہ میں شادی کا کاروبار اتنا گراں اور رسوم اتنی طویل نہیں ہوتی تھیں۔ نثار کے والد کا انتقال ہو چکا تھا وہ خود سب سے بڑی تھی لیکن شادی کی ذمہ داری سرتاج کی تھی جو اس نے بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دی۔ دلہنیں تمام خوبصورت لگتی ہیں اور نثار کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگ رہی تھی میں نے ادا سے کہا کہ مجھے اصغر بٹ صاحب سے ہمدردی ہے اس پر وہ بہت خفا ہوئی۔ میں نے کہا اصغر بٹ کو بیوی تو بہت اچھی ملی ہے لیکن اس کی اپنی شخصیت ہے اور وہ صرف مسز اصغر ہو کر زندگی نہیں گزارے گی روایتی بیوی جس کی زندگی کا واحد مقصد پتی ورتا ہو خانہ داری بچوں کی کھیپ اور کنجیوں کا گچھا اس کی زندگی کا حاصل نہیں۔ یہ بات میں اپنے تجربہ سے کہہ رہا تھا گو کہ ادا نے شاعری

ترک کر رکھی تھی لیکن وہ صرف خاتون خانہ بن کر زندگی بسر کرنے پر تیار نہیں تھی۔ میں کبھی اس کے معمولات میں دخیل نہیں ہوا۔ شاعری ترک کرنے کے بعد بھی اس کا شاعرانہ مزاج بدستور قائم تھا اور ہے وہ اپنی مرضی کی مالک ہے خصوصاً جہاں وقت کے صرف کا سوال ہو یا سماجی تعلقات کا۔

سن ۵۵ کے آخر میں ہم لوگ تبدیل ہو کر کراچی آ گئے۔ نثار اور اصغر بٹ بھی کراچی میں تھے۔ ہم نیپئر بیرک میں تھے اور نثار پی۔ ای۔ سی۔ ایچ میں ایک مکان کے حصّہ میں تھیں۔ نثار نے مکان کو خوبصورتی سے آراستہ کیا تھا اور ہر چیز سے اس کی نفاست پسندی ظاہر تھی۔ چیزیں گو قیمتی نہیں تھیں اور ہو بھی نہیں سکتی تھیں لیکن جو کچھ بھی تھا منفرد تھا۔ غیر معمولی خاص تلاش کے بعد اس نے ان کو مہیا کیا ہو گا۔ پتہ نہیں کیوں کراچی میں نثار سے زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں۔ جب رائٹرز گلڈ بنا ہم لوگ کراچی میں تھے لیکن نثار افتتاحی جلسہ میں شریک نہیں ہوئی تھیں۔

کراچی میں بھی جب ہم اسکے گھر گئے تو اس نے بہت گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اخلاص نثار کی طبیعت کا جز ولاینفک ہے۔ اگر رشتہ داروں کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا حلقۂ احباب بہت مختصر ہے۔ وہ کم آمیز ہے لیکن جن لوگوں سے ملتی ہے تو ٹوٹ کر ملتی ہے۔ یہ ادا کے ساتھ اس کی دوسری قدر مشترک ہے اگر نثار کو آپ سے اختلاف ہے تو وہ اس کا برملا اظہار کرے گی۔ اگر زیادہ تعلقات ہیں تو آپ سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جائے گی لیکن ذاتی تعلقات میں فرق نہیں آئے گا۔

گو کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی لیکن اگر انسانی قدروں کے معیار پر کسی بات کو ظلم سمجھے تو وہ جذباتی ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں وہ کسی سیاسی ثوقف کا سہارا نہیں لے گی۔

اب ہماری ملاقات کو تیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے گو کہ اسے سیاست سے کوئی خاص لگائو نہیں ہے وہ فوجی حکومتوں کے سخت خلاف ہے صرف بحث کی حد تک میرے علم میں اسے عملی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں نہ اس نے جلسے جلوسوں میں حصّہ لیا نہ بیان بازی کی اور نہ بیانات پر دستخط کئے۔ اس کے خیالات میں یہ سب کچھ صرف شہرت کمانے کے آسان ذرائع ہیں۔ اس نے میرے علم میں آج تک کسی منشور پر دستخط نہیں کئے لیکن انسانی قدروں کے لئے وہ ذاتی سطح پر لڑے گی۔

ایک زمانہ میں وہ ڈان کے لئے کالم لکھتی تھی یہ ادبی و کلچرل نوعیت کے تھے اور بڑی محنت اور لگن کے ساتھ لکھے جاتے تھے لیکن خاصے مشکل۔ پوری توجہ سے پڑھنا پڑتا تھا۔ ان تحریروں سے ان کالموں سے اس کے سیاسی خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یوں وہ ہنری کسنگر کے سیمینار میں شرکت کے لئے ہارورڈ گئی۔ ایک زمانہ میں ان سیمینار کی بہت شہرت تھی اور نثار پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے گئی تھی۔ جس کے بارے میں یہ ایک عام تاثر تھا کہ اگر وہ حکومت کا ذیلی ادارہ نہیں تو حکومت کی ہمدردیاں اسے ضرور حاصل ہیں۔

سن ۷۸ء میں امریکی حکومت نے ایک ملاقاتی پروگرام کی تشکیل دی جس میں مہمانوں کو یہ آزادی تھی کہ وہ اپنی دلچسپی کی چیزوں میں امریکہ کے مختلف اداروں کا دورہ کریں۔ میں ان دنوں وفاقی حکومت میں ایسٹیبلشمنٹ سیکریٹری تھا۔ اس کا نام تجویز کرنے سے پیشتر میں نے اس سے بات کی وہ جانے پر تیار نہ تھی کہ حکومت کی تعریف میں وہ کسی قسم کی تقریر کرنے یا پالیسی پر مضمون لکھنے پر اس نے معذوری کا اظہار کیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کو راضی کیا کہ اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے سارے کاغذات دکھلائے وہ اس شرط پر تیار ہوئی کہ امریکہ پہنچنے کے بعد بھی اگر اس

رسم کی پابندی عائد کی گئی تو وہ فوراً واپس آجائے گی۔ اس سلسلے میں بھی میں نے اسے مطلع کر دیا اس کو جھجک یہ تھی کہ اس دوڑ کے بعد وہ حکومت کی وفادار شمار ہو جائے گی میں نے کہا کہ وہ آخر پاکستان کی شہری ہے۔ اصغر بٹ سرکاری ملازم ہیں وہ کسی سیاسی پارٹی کی ممبر نہیں ہے وہ کبھی بغاوت کے الزام میں پکڑی نہیں گئی جہاں تک مجھے علم ہے وہ کسی تخریبی کارروائی میں بھی ملوث نہیں۔ بہت مشکل سے وہ جانے پر تیار ہوئی اور خوش واپس آئی اس کی دیانت پر کسی قسم کا فرق نہیں آیا تھا وہ اصول پر سمجھوتہ نہیں کر سکتی لیکن مخالفت برائے مخالفت کی وہ قائل نہیں۔

اب تک نثار کے تین ناول شائع ہو چکے ہیں ان کو وہ شہرت نہیں ملی جس کی وہ حقدار ہے۔ اردو ادب گروہ بندی کا شکار ہے۔ ان میں نقادوں سے لے کر کالم نگار سب شریک ہیں۔ ادا کی طرح وہ کسی دبستان سے وابستہ نہیں اس لئے پذیرائی کس طرح ممکن ہے دونوں معاصر ادیبوں کا احترام تو کرتے ہیں لیکن زانوئے ادب تہہ کرنے کے لئے تیار نہیں اس کی ناولوں پر تو ناشر ریویو بھی نہیں کرواتے لیکن نثار کو اس سلسلے میں کوئی تردد نہیں۔ زندگی میں تو یوں وہ مستغنی نہیں لیکن اس معاملہ میں وہ قطعی غنی دکھائی دیتی ہے جب وہ اسلام آباد میں تھی اس وقت بھی اسے اہم قلم کانفرنس میں نہیں بلایا جاتا تھا گو کہ اس نے کوئی نظریاتی لبادہ نہیں اوڑھا ہے اور نہ وہ کسی قسم کی بلیک لسٹ میں ہے۔

تعلقاتِ عامہ کے معاملہ میں وہ بہت کمزور ہے گو کہ اصغر بٹ کا تعلق ریڈیو پاکستان اور صحافت سے رہا ہے لیکن میاں بیوی نے کتابوں کی تشہیر کے معاملہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اگر اسے کچھ دکھ ہوتا ہے تو اس کا برملا اظہار نہیں کرتی۔ ادا کا بیان ہے کہ اس کو اس بات کا ملال ضرور ہے اور بس اس ناپذیرائی کو اس نے غم بنا کر اپنے اوپر طاری نہیں کیا وہ اب بھی بدستور لکھتی رہتی ہے۔ ادا کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ادبی تخلیق کا عمل ان دونوں کے لئے ایک ذاتی آسودگی کا ذریعہ ہے جب تک وہ خود اپنے سے مطمئن ہیں وہ لکھتی رہیں گی۔ قبولیت حاصل کرنے کے لئے یہ دونوں کسی کا وثیقہ لئے تیار نہیں ان کے تخلیق کے سوتے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ تعریفی کالموں کے محتاج نہیں ہیں۔ دونوں نے اپنی کسی کتاب کی رونمائی نہیں کروائی۔ دونوں اپنے اپنے انا کے گنبد میں محصور ہیں اور خاصی لگی ہے

نثار گوشہ نشین نہیں اس کو محفل آرائی کا شوق ہے۔

وہ عرف عام میں بڑشدا طبیعت کی مالک ہے جس طرح وہ کپڑے بہت احتیاط اور نفاست سے پہنتی ہے اسی طرح سے دوستوں کے لئے اس کا اپنا معیار ہے۔ نثار کے ماتھے پر تو آپ کو شکن نظر آجائے گی لیکن کپڑوں پر کیا مجال کہ ایک شکن یا دھبہ ہو۔ جوتے تو سب ہی پیچ کرتے ہیں وہ تو چھتریوں کو بھی اپنے کپڑے سے پیچ کرتی ہے یوں اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رہتے ہیں لیکن جب ادب کے ناتے سے کوئی اس سے ملنا چاہے تو پھر وہ اس کی چھان پھٹک کرے گی۔ وہ ادبی جلسوں میں قطعی نظر نہیں آتی۔ یہ بھی اس کی ادا کے ساتھ ایک قدر مشترک ہے۔ ہاں وہ لائبریریوں کا چکر بہت لگاتی ہے۔

اسلام آباد کے قیام میں ہم اس کے گھر گئے اور جب وہ نہیں ملی تو پھر ہم نے برٹش کونسل یا امریکن سینٹر کا رخ کیا وہاں وہ مل جائے گی یا پھر گرم دوپہر میں سڑکوں پر چکر لگاتے ہوئے گھومتے ہوئے اسے پیدل چلنے کا بہت شوق ہے۔ اس شوق میں گرمی سردی اور برسات کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ ادا دو فرلانگ سے زیادہ نہیں چلتی دو سال بعد جب بچوں سے ملنے امریکہ جاتی ہے تب وہ چلنے کا کوٹا پورا کر لیتی ہے۔ نثار کو تاریخ کا گہرا شعور بھی ہے

اور شوق بھی اس کے دوسرے ناول میں پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ کی اتنی تفصیلات ہیں کہ ناول بوجھل ہوجاتا ہے اس ناول کی تیاری کے لئے اس نے ہندوستان کا سفر کیا تاکہ وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کرسکے وہ انہیں مطالعاتی دوروں کے لئے لندن اور پیرس بھی گئی۔ اگر وہ اس قدر تحقیق نہ کرتی تو ناول زیادہ آسانی سے پڑھا جاتا۔ دریا کے سنگ اس کا تیسرا ناول ہے۔ بنیادی طور پر نثار اکیلی ہے کیا اپنے تیسرے ناول کی ہیروئن وہ خود ہے۔

ادا اور اس کے بہت گہرے تعلقات ہیں اسلام آباد میں وہ تقریباً ہر روز ایک دوسرے سے ملاقات کرتی تھیں دو دو گھنٹے فون لیکن وہ اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتی وہ کبھی کبھی کم دکھائی دیتی ہے سوچتی رہتی ہے "کیا" میں یہ آج تک معلوم نہیں کرسکا جب وہ اس کیفیت میں ہو اور میں نے منہ پھاڑ کر اس سے پوچھ لیا کہ وہ کس خیال میں مستغرق ہے تو وہ چونکی اور خوبصورتی سے بات ٹال گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا کوئی ہمدم و ہمراز ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک فلسفیانہ عنصر موجود ہے اس کے ناولوں سے اس کا خاصا اظہار ملتا ہے۔ اپنے مختصر سے حلقہ احباب میں بہت خوش رہتی ہے اور بس۔

ادب کے رشتے سے وہ ملاقات میں محتاط ہے۔ ایک شام ہم اس کے گھر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ادبی شخصیت کا فون آیا۔ نثار نے بہت خلوص سے خیریت دریافت کی۔ قیام کی بابت پوچھا کہ کب تک اسلام آباد میں رونق رہے گی۔ جب دوسری طرف سے فوراً ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو معذرت کی کہ وہ باہر جارہی ہے اور دو تین دن کی مصروفیات کا پروگرام تفصیل سے بتایا جس میں ڈاکٹر سے ملاقات اور رشتہ داروں کے کام سب ہی شامل تھے۔ دوستوں کے لئے اس کے پاس بہت وقت ہے لیکن بور ہونے کے لئے وہ قطعی تیار نہیں ہوتی جاڑوں کا موسم شروع ہوگیا تھا ہم لوکا گیس برنر جل رہا تھا اور ہم لوگ گپ شپ میں مشغول تھے۔ نثار نے فون پر کہا کہ انشاء اللہ وہ خود وقت مقرر کرے گی وہ صاف ٹال دے گئی جب میں نے استفسار کیا تو اس نے صفائی پیش کی کہ اتنی اچھی محفل کو کیسے درہم برہم کرسکتی ہے۔ اچھی تخلیق تو فرصت کے وقت زیادہ اطمینان اور آرام سے پڑھی جا سکتی ہے لیکن ملاقات توبہ توبہ زندگی میں اتنی فرصت کہاں کہ تکلفاً بوجھل محفل کے لئے وقت نکالا جاسکے کیا مجبوری ہے کہ اس شام کو خراب کیا جائے۔

اس نے شعوری طور پر اس حلقہ کو بہت مختصر رکھا ہے اس کو یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ حلقہ بڑھ گیا تو پھر وہ چھان پھٹک نہیں کرسکے گی اور ممکن ہے کہ طبیعتاً غیر معیاری لوگ اس میں شریک ہوجائیں۔

اس کی دوسری ناول پر کراچی کے ایک رسالہ میں ایک افسانہ نگار کی تنقید شائع ہوئی جو میرے خیال میں نہایت لچر تھی۔ مجھے پڑھ کر غصہ آیا کیونکہ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ صاحب مضمون احساس کمتری کا شکار ہیں ان کا اپنے فن میں باوجود کوشش اور تعلقات عامہ کے کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ ہلکے جاڑے کا موسم تھا ہم لوگوں نے اسلام آباد کلب کے سامنے اپنی گاڑی چھوڑی اور راول جھیل کی طرف جنگلوں کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ اصغر بٹ پیچھے تھے۔ وہ زیادہ گفتگو نہیں کرتے اور راستے کچھ ایسے تھے کہ صرف تین اشخاص ساتھ چل سکتے تھے۔ ادا کو جاسوسی ناولوں کا خصوصاً اگاتھا کرسٹی کا بہت شوق ہے۔ اس مضمون کا تذکرہ آگیا اور جاسوسی ناولوں کی طرح ہم نے بہت سارے منصوبے بنائے جن میں مجرم کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔ قتل تو زیادہ سخت سزا معلوم ہوئی کچھ ہاتھ قلم کرنے کے

مختلف طریقوں پر گفتگو ہوتی رہی لیکن شرط یہ تھی کہ سراغ نہ مل سکے۔ ہلکے ہلکے قہقہے لگتے رہے، کبھی کبھی مجھے راستے کی تنگی کی وجہ سے اصغر بٹ صاحب کے ساتھ ہنسا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے آہستہ خرامی کے بعد ہم لوگ ایک گیلی جگہ پر جھیل کے کنارے بیٹھ گئے اور تنقید کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں نثار نے دریادلی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ مضمون نگار کو معاف کیا جائے۔ یہ سزا کیا کم ہے کہ اس کو ایک ایسا ناول پڑھنا پڑا جو برا ہے اور اس کو پسند بھی نہیں آیا۔ یہ سزا کافی سمجھی گئی۔ نور بھائی بات کیا ہے بس ناول ان کو پسند نہیں اب ہم ان پر زبردستی کیوں کریں اور ہاتھ کاٹنے کی سزا کیوں دیں یہ تو صریحاً ظلم ہے "آزادی نسواں" نثار کا ایک پسندیدہ موضوع ہے اس پر وہ دھواں دار تقریر کر سکتی ہے اور جم کر بحث کر سکتی ہے

یہ ایک مغربی تحریک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ 'آزادی نسواں' اس کا لفظی ترجمہ تو ہے لیکن پورے طور پر مغرب کی اس تحریک کا احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔ نثار کا کہنا ہے کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے اور انہوں نے عورتوں کا استحصال کیا ہے۔ دبے زبان سے وہ مجھ غریب کو بھی شریک کرتی ہے۔ ادا بھی اس کی ہمنوا ہے لیکن دونوں عملی طور پر اس تحریک میں شریک نہیں ہیں جب وہ تقریر کر چکتی ہے اور میں پوچھتا ہوں کہ اصغر بٹ نے یا میں نے کس طرح اس کا یا ادا کا استحصال کیا ہے تو پھر وہ کہتی ہے میں آپ لوگوں کی بات تو نہیں کر رہی ہوں میں تو ایک عام بات کر رہی ہوں لیکن آزادئ نسواں کی یہ مقرر خالصتاً مشرقی اقدار کی خاتون ہیں۔ ادا کی طرح دونوں شادی سے پہلے برقع پوش تھیں۔ نثار برقع پوش پشاور ریڈیو پر کام کرتی تھی جو خاصا باغیانہ قدم تھا۔ جس طرح ادا نے رومان میں اپنی نظمیں چھپوائیں۔ اسلام آباد میں ادبی محفلوں میں نثار کبھی اکیلے شریک نہیں ہوتی تھیں حالانکہ یہ خالص شرفا کا شہر ہے ادا کو ساتھ لیتی تھی۔ وہ اب چار پانچ سال سے لاہور میں مقیم ہے لیکن ادبی محفلوں میں شریک نہیں ہوتی۔ اصغر بٹ خود ادیب ہیں مانے ہوئے ڈرامہ نگار لیکن مجلسی آدمی قطعی نہیں ہیں اور جلسوں سے احتراز کرتے ہیں اور نثار ادبی محفلوں میں اکیلی نہیں جاتی اگر نثار سے کچھ عرصے اور ملاقات ہوتی تو اس کی فرمائش ہوتی کہ نور بھائی کوئی "مزہ دار افواہ" سنائیے لیکن یہ بہت معصوم فرمائش ہوتی ہے صرف تھوڑی سی غیبت۔ ادا اور نثار نجی محفل میں مبتذل لطیفہ سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتیں۔ لطیفے تو الگ رہے کچھ پاکستانی شاعرات کی خاص نظمیں جو مطبوعہ ہیں ان کو بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتیں وہ لوگ بھی جن کے نثار سے دیرینہ تعلقات ہیں ان کے ساتھ بھی نثار ایک خاص رکھ رکھاؤ کا برتاؤ رکھتی ہے کیا مجال ہے کہ کسی عام محفل میں کوئی نثار سے بے تکلفی کا اظہار کر دے اگر حامی خاتون کے بارے میں کوئی بدنصیب غلط فہمی میں مبتلا ہو کر نثار کا ہاتھ پکڑ لے یا کاندھے پر ہاتھ رکھ دے جو مغرب میں ایک عام بات ہے اور پاکستان کی کچھ ادبی اور اعلیٰ سطح کی مخصوص محفلوں میں بھی رائج ہے تو یہ خاتون اتنے زناٹے کا تھپڑ مارے گی کہ اس کی آواز پشاور سے کراچی تک سنائی دے گی۔ سمجھدار لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

میں نے اس کو دو مرتبہ محفلوں میں غصہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ تو مرحوم ابن انشاء پر وجہ مجھ کو یاد نہیں اور ایک مرتبہ ایک اور مشہور ادیب پر۔ نثار نے غصہ میں اپنا پرس پٹک دیا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ادا نے مشکل سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا جن صاحب پر وہ غصہ کر رہی تھی وہ اپنی جگہ پر بہت مشہور ہیں۔ نثار کے غصہ پر وہ قطعی بھونچکارہ گئے اور ایک مرتبہ تو ان کو اپنے بارے میں اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ خواتین ان کے سلسلے میں مختلف رائے بھی رکھ سکتی ہیں اور اظہار پر بھی قادر ہیں۔ صرف ادبی نظریہ پر کچھ

اختلاف ہوگیا تھا۔

ادا کی طرح نثار نے بھی اپنی شخصیت کو دو حصّوں میں بانٹا ہوا ہے۔ ایک تو سگھڑ بیوی گھر دار خاتون اور دوسری نثار ناول نگار جس کی اپنی قطعی الگ شخصیّت ہے دونوں میں کبھی کبھی تصادم ہوتا ہے تو پھر وہ اپنی ادبی حیثیت کی قربانی دیتی ہیں عورت ہونے کی وجہ سے انہیں ایثار کرنا پڑتا ہے میں ذاتی طور پر یہ بات دونوں سلسلے میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اختر بٹ اور میں دونوں اس تصادم کے اندیشے سے خوفزدہ رہتے ہیں اور مُوڈ دیکھ کر ہی خاتون خانہ سے کسی گھریلو قسم کی فرمائش کی جرأت کرتے ہیں مثلاً کسی پرانے دوست کی دعوت جس میں ہر دو بیگمات کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔

نثار تعلقات کا خواہ وہ خویش واقارب کے ہوں یا سماجی دونوں کا بہت خیال رکھتی ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ لاہور میں اس نے اپنی نندوں کے پاس کوشش کرکے مکان لیا ہے دوستوں کی پریشانی میں وہ پوری طرح شریک ہوتی ہے۔ اختر جمال بہن نے جب اپنی بچّی کا صدمہ سہا تو خود اُن کے بیان کے مطابق سب سے زیادہ تقویت اُن کو نثار سے پہنچی۔ جب اس سانحہ کے بعد میری نثار سے ملاقات ہوئی اور اس نے تفصیلات بتائیں تو اس کی آواز میں بڑا دکھ تھا اور وقت گزرنے کے بعد بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ خوشی میں تو تمام احباب دل کھول کر شریک ہوتے ہیں لیکن نثار تو دوستوں کی خوشی میں اس طرح کھِل پڑتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی رشتوں کا انحصار صرف خون پر نہیں ہے یہ ایسی مری طاقتیں ہیں جس کا ذہنی تجزیہ یا ادراک ممکن نہیں صرف محسوس کئے جاسکتے ہیں اور ان کا اظہار بھی ہوسکتا ہے۔

نثار ماشاءاللہ ایک مطمئن زندگی گزار رہی ہے ابھی کچھ عرصہ ہوا میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے معافی مانگی کہ پانچ منٹ کے لئے مجھے اکیلے رہنا پڑے گا وہ چائے بنا کر لاتی ہے۔ اصغر بٹ دفتر نہیں آئے تھے میں نے پوچھا کہ نوکر کیوں نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ لاہور آنے کے بعد اس نے نوکر نہیں رکھا صفائی اور گھر کا سارا کام وہ خود کرتی ہے۔ میں نے خفگی کا اظہار کیا کہ اسے اس عمر میں آرام کی ضرورت ہے۔ اس نے نہایت بے تکلّفی سے مجھے بتایا کہ چونکہ اس نے مکان خریدا ہے اس لئے ایک بچت کے منصوبے کے تحت اس نے ایسا کیا ہے۔ پھر اس نے ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہا نور بھائی اس میں کچھ مہمانداری بھی کم ہوجاتی ہے۔ سمجھدار لوگ کچھ تکلف بھی کرتے ہیں مہمان بھی کم ٹھہرتے ہیں۔ دعوتیں بھی کم مجبوراً کم کرنا پڑتی ہیں آپ کے لئے بھی میں نے صرف ایک چیز بنائی ہے

نثار کو اچھی چیزوں کا شوق ہے کپڑے قیمتی خوش بو مکان کی آرائش کی چیزیں۔ ستھرا مکان اچھا کھانا لیکن کپڑے اور خوشبو کے علاوہ اس نے کسی چیز کو اپنی مجبوری نہیں بنایا۔ یعنی رشک کی عادت سے بہت دُور ہے گھر کو آراستہ کرنے کیلئے وہ کبھی مقروض نہیں سے بہت دور ہے۔ گھر کو آراستہ کرنے کے لئے وہ کبھی مقروض نہیں ہوتی اپنی بساط میں جو ممکن تھا وہ کیا اور میں اس کے گھر کو اب تقریباً تیس سال سے دیکھ رہا ہوں۔ گھومنے کا البتہ اس کو شوق ہے اور ممکن ہے کہ اس نے جو بہت سارے غیر ملکی سفر کئے ہیں اس کے لئے اس نے اپنا پیٹ کاٹ کر بھی کچھ کفایت شعاری کی ہو۔ ادا کو اور مجھ کو یہ مغالطہ ہے کہ ہم دونوں کے ساتھ اس کو خاص سب سے الگ محبت ہے۔ ہماری منفرد حیثیت ہے ممکن ہے کہ اس کے اور دوستوں کو بھی یہ تاثر ہو جس سے وہ ملتی ہے کھلے دل سے ملتی ہے۔ برائیاں یقیناً ہوں گی ہونا چاہیئے آخر کار وہ انسان ہے لیکن سسرال والوں سے اس کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ دوستوں میں بھی وہ ہر دلعزیز

ہے اس نے اپنی برائیاں بہت احتیاط سے چھپا کر رکھی ہیں میرا خیال ہے کہ وہ اصغر بٹ سے لڑنے کے بعد کمرہ بند کر کے روتی ہوگی۔ خدا کے فضل سے وہ ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہی ہے اس کے ماشاء اللہ دو بچے ہیں جو تعلیم ختم کر چکے ہیں ایک کی اس نے شادی بھی کر دی اب اگر اس کی بہو سے ملاقات ہو تو اس کی برائیاں معلوم کی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے وہ دادی بھی ہو گئی ہے اور ہر وقت پوتے میں مصروف رہتی ہے۔

وہ خود سر ہے۔ غصہ ور ہے گو کہ غصہ جلد دور ہو جاتا ہے۔

وہ وعدہ پورا نہیں کرتی۔ پانچ سال سے کراچی نہیں آئی۔ خطوں کا جواب تاخیر سے دیتی ہے گول بھی کر جاتی ہے نثار عزیز بٹ ایک اچھی سلیقہ مند بیوی ہونے کے باوجود اپنی علیحدہ شخصیت رکھتی ہے۔ اس پر کسی کی چھاپ نہیں ہے وہ آسانی سے دوست نہیں بناتی وہ اپنے تمام ترقی پسندانہ خیالات کے باوجود سخت بورژوا ہے۔ قیمتی کپڑے اور خوشبوئیں اس کا گھر اور اس کا حلقہ احباب اس کا واضح ثبوت ہیں۔ بے ترتیبی، گندگی، گرد اور بوجھل ماحول کو وہ برداشت نہیں کر سکتی اس نے اپنے گرد کچھ فصیلیں کھڑی کر رکھی ہیں لیکن یہ فصیلیں دوستی اور محبت کے راستے میں حائل نہیں اس کی تنہائی کے راز کی حفاظت کرتی ہیں۔ ذات کی تنہائی نے اسے رشتہ داروں، دوستوں اور معاشرہ سے دور نہیں کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ریاضی میں ایم ایس سی بھی اسی وجہ سے کیا اس سطح پر انسانی ذہن الفاظ کا نہیں ہندسوں کا ادراک کرتے ہیں اور ہندسوں کی زبان نہیں ہوتی وہ صرف حقیقت ہیں جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا سمجھنے کے لئے اور ہندسوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن فلسفی نثار کوئی معمہ نہیں وہ تقریباً ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کو اس بیان میں تضاد دکھائی دے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ لوگ جو نثار کو قریب سے جانتے ہیں مجھ سے اتفاق کریں گے وہ ترقی پسند بھی ہے اور نیک دین بھی تنہا بھی ہے اور مجلسی بھی۔

(یہ تذکرہ مئی ۱۹۸۸ء میں شروع کیا گیا اور نومبر ۱۹۸۸ء میں ختم ہوا)

---

ادیب سہیل

# اس سال غالب کی خیر نہیں

ڈھاکے میں ہماری عمر کے تمام شعراء انہیں استاد کہتے تھے میں نے کبھی ان کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے وہ اسی طرح مخاطب کرتے ہوئے اچھے لگتے تھے۔ استاد کا حلیہ بشرہ بھی استادانہ تھا۔ کھدر کا ایک کرتہ اور ڈھیلا پائجامہ، کچی پکی زلفیں شانوں پر جھولتی ہوئی کھدر ہی کی ایک چادر آنجہانی رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح شانے سے لپٹی ہوئی پیروں میں برٹ تاتر کی چپلیں۔ استاد کا حلیہ اگر ٹیگور کا سا تھا تو ان سے کم کسی شاعر اور ادیب کو خاطر میں بھی نہ لاتے تھے۔ استاد کی گفتگو کبھی بھولے بھٹکے اس طرح سے نیچے اترتی اور اگر اس وقت ان کا موڈ ناقدانہ ہوتا تو ڈاکٹر شہید اللہ اور قاضی مطہر حسین یا اسی پائے کے عالموں تک آکے رکتی۔ استاد کو ہم نے ہمیشہ اسی حلیے میں دیکھا، نہ اس سے زائد نہ کم۔ زائد نام کی کوئی چیز تھی تو ایک پھولی ہوئی ڈائری جو پچھلے کئی سالوں سے ان کے ہاتھ میں دیکھی جاتی تھی اس کے علاوہ کبھی ڈائری کے اندر تہہ کیا ہوا اور کبھی باہر اس کے پہلو سے چپکا ہوا کوئی تازہ اخبار ہوتا تھا۔ اخبار خرید کر پڑھنے کے معاملے میں ایسے پابند کہ کوئی صوم صلوٰۃ کا بھی اتنا پابند نہ ہوتا ہوگا۔

استاد طبیعتاً خلیق، دوست نواز، یار باش اور ایک عجیب استغنا کے مالک۔ مجرد، بلکہ تجرد کی زندگی پر فریفتہ۔ گزر اوقات کے لئے وہ ایک معمولی ٹیوشن، دٹیوشن میں بھی اس بات کی کوشش کہ طالب علم کسی کتب فروش کا لڑکا ہو۔) اللہ اللہ خیر صلیٰ۔ ڈھلکے تک ساٹھ ستر روپوں کی آمدنی میں استاد کا کام چلتا تھا۔ اسی میں نوشاد نوری کی خاطر مدارات اور اس کے صدقے میں کبھی ہماری بھی عید ہو جاتی تھی۔ استاد کا ادب ہی اوڑھنا بچھونا تھا اور وہ ادب ہی پر گاڑھی گاڑھی باتیں کرتے تھے۔ اور باوثوق طور پر ادب اور ادیب سے باخبر تھے۔ دورانِ گفتگو اُن کے یارِ غار نوشاد نوری کبھی شرارت کے طور پر گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش بھی کرتے تو استاد بجانب کر مسکرا دیتے اور نوشاد زچ ہو جاتے۔ اور پھر پلٹ کر پرانے موضوع پر آجاتے تھے۔ کم سے کم میں نے کبھی استاد کو کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں سُنا اگر کسی اور نے سنا ہو تو ہم نہیں کہہ سکتے۔

استاد غزل کہتے تھے اور غزل میں ان کا اسلوب بہ قول اُن کے میرزا اسد اللہ خاں غالب کے آس پاس تھا، غالب شکن میرزا یاس یگانہ چنگیزی نے ان کی غزل کے ایک مصرعے پر اصلاح فرمائی تھی، تب ہی سے استاد انہیں اپنا استاد مانتے تھے۔ استاد کو اس بات پر بھی فخر تھا کہ ہندوستانی شکسپیئر آغا حشر کاشمیری ان کے پڑوس میں رہتے تھے اور انہیں گود میں کھلایا تھا۔

استاد اکثر سر شام بیت المکرم مسجد ڈھاکہ کی سیڑھیوں

کے پاس پائے جاتے تھے۔ اس سے خدانخواستہ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ استاد کو مسجد سے خدا واسطے کا تعلق تھا۔ بیت المکرم کی سب سے نچلی سیڑھی کے آس پاس ان کی دلچسپی کے دو سامان تھے۔ ایک "مالش مالش" کی خاص انداز میں صدا لگاتے ہوئے چمکیلے بالشیئے، دوسری وہ کھلی نما دکان جس میں پرانی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔

سرور بارہ بنکوی ہوں یا عطاء الرحمٰن جمیل، نوشاد نوری ہوں یا کوئی اور ادیب و شاعر، استاد کا سب احترام کرتے تھے۔ ایک شام سرور اپنی مشغولیت سے بور ہوکر "پاکستان فیچر سنڈیکیٹ" آئے اور بولے "میں آج تفریح کے موڈ میں ہوں، نارائن گنج جانے کا ارادہ ہے، دریا کی لہروں اور غروب آفتاب کے منظر کو قریب سے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ چلو آؤ ساتھ چلیں۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھ، ہم اور نوشاد، سرور کے ساتھ ہو گئے۔ سرور جب فلم کی شوٹنگ سے اکتاتے تو یاروں کو اسی طرح ورغلایا کرتے تھے۔ ہم دونوں سرور کے ساتھ ان کی کار کی پچھلی نشست پر "ری لیکس" ہوکر بیٹھے کیا گویا دراز ہوگئے۔ اور ڈرائیور نے لمبی چمکتی گاڑی کو اسٹارٹ کر دیا، کار پریس کلب کے پاس سے گزر رہی تھی کہ سرور کی نظر استاد پر پڑ گئی بولے "نوشاد، استاد جا رہے ہیں" اور پھر ڈرائیور سے مخاطب ہوکر کہا۔ "گاڑی ذرا کنارے کر کے روک لو"۔ اتنے میں استاد گاڑی کے قریب آ گئے۔ سرور نے آواز دی ۔ "استاد آئیے میں آپ کو بیت المکرم تک چھوڑتا جاؤں۔"

سرور کی اس بات پر وہ مسکرائے اور بولے "تم جاؤ، جہاں جا رہے ہو، بیت المکرم پاس ہی تو ہے، میں چلا جاؤں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے استاد۔ آپ کیوں مجھ سے گستاخی کروا رہے ہیں" سرور نے کہا۔ استاد مسکرائے اور آگے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد بیت المکرم کے پاس گاڑی رکی استاد اتر گئے۔

جب ہم لوگ نارائن گنج پہنچے تو اس وقت عجب منظر تھا دونوں وقت گلے مل رہے تھے، سرور آج واقعی "ری لیکس" کے موڈ میں تھے۔ وقفہ وقفہ سے تازہ شعر سناتے رہے۔ پھر اپنی فلم آخری اسٹیشن کا ذکر کیا، کہانی کے حوالے سے ہاجرہ مسرور صاحبہ کا ذکر آیا، پھر نارا (شبنم) کے ٹیلنٹ کو سراہتے رہے۔ اور جب غروب آفتاب کا منظر ختم ہوا تو تازہ دم ہوکر واپس چل پڑے۔ اب جو رکے تو ہوٹل شاہ باغ کا دربان خیر مقدم کو کھڑا تھا۔ چاندنی رات تھی، دھلے دھلائے آسمان کی چاندنی غضب لگ رہی تھی۔ ہم لوگ شاہ باغ کے لان کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ سرور نے کچھ کھانے پینے کا آرڈر دیا۔ نوشاد ویسے دوسرے "افعال قبیحہ" کو خشوع و خضوع کے ساتھ برتتے ہیں، لیکن کھانے پینے کے معاملے میں خود کو کھانے تک محدود رکھتے، یہ ان کی عجب انفرادیت تھی، جو میری سمجھ سے بالاتر تھی، پتہ نہیں ان کی یہ انفرادیت اب بھی قائم ہے کہ نہیں۔

استاد اور استاد کے یار غار نوشاد نوری کو "بیت المکرم" اور اس کے پہلو سے لگے ہوئے اسٹیڈیم سے سر شام کا عشق تھا کچھ دیر کے لئے ہی سہی یہ دونوں ہر روز وہاں جاتے ضرور تھے۔ اسی ناتے ہر دو چار دنوں کے بعد استاد بہ نفس نفیس پاکستان فیچر سنڈیکیٹ، نوشاد کا حال احوال پوچھنے کے لئے آ جاتے تھے۔ ان دنوں نوشاد اور خاکسار اس ادارے کے "وظیفہ خوار" تھے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ استاد، نوشاد کے پاس خالی ہاتھ آئے ہوں، گرم گرم پکوڑے اور چٹنی ایک پیکٹ میں تواضع کے لئے ضرور ساتھ لاتے تھے۔

استاد ایک دن جب گرم گرم پکوڑے لے کر آئے تو شعر و ادب کی گرما گرم خبریں بھی ساتھ لائے۔ خبر یہ تھی کہ کل پاکستان بنیاد پر پچھلی شب گلستان سینما میں مشاعرہ ہوا! تھا استاد کا اس پر تبصرہ یہ تھا کہ مشاعرہ میں پائے کے اشعار پڑھے ہی نہیں گئے۔ میری شامت آئی اور میں نے کہا "استاد کچھ اچھے شعرا بھی تو شریک مشاعرہ تھے" اس پر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "چھوڑیئے ..... ہوں ... گے" پھر ایک لمحہ رک کر بولے۔ "مجھے تو اب آپ کے ذوق شعری پر شبہ ہونے لگا ہے"

نوشاد نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "استاد جب شعری معیار کی بات چل ہی نکلی ہے تو دو اشتہ آید بکار کے طور پر آپ سے ہم عصر شعرا کی بابت رائے معلوم کرلی جائے" استاد کچھ دیر خلا میں گھورتے ہوئے کچھ سوچتے رہے۔ پھر بولے "بڑے توپ بنتے ہیں اپنے عندلیب شادانی، شاعری کا خانہ خالی ہی سمجھئے ہاں تنقید کی بات اور ہے، در اصل اس میں ان کا رنگ کھلتا ہے۔ وہ آدمی بھی اسی کام کے ہیں"

میں نے پوچھا۔ "استاد سرور کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

بولے۔ "آواز ہے"

اور "صلاح الدین محمد"؟

"ابھی بچے ہیں"

"اور نوشاد"

"نوشاد کا پورا شعری سرمایہ کھنگال دیکھئے، اک آدھ مصرع کام کا ملے گا"

"اور سہیل کے متعلق بھی فرما دیجئے استاد" نوشاد نے کہا

"ہاں..... آں..... کہتے ہیں۔ ان کے متعلق کوئی رائے قبل از وقت ہوگی"

اور پھر استاد نے میری طرف مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں سہیل صاحب آپ کے متعلق کچھ غلط کہا؟"

"استاد میرے لئے یہی عزت افزائی کی بات ہے کہ آپ کی نقد و نظر میں ہوں، کسی بھی شکل میں سہی" میری اس بات پر استاد اندر سے خوش ہوئے اور پھر وہی مسکراہٹ۔

ہما شما کس قطار شمار میں ہیں جب استاد اساتذہ کے متعلق اپنا ایک خاص رویہ رکھتے ہیں۔ وہ میر تقی میر کے بہتر نشتر کے قائل ہیں۔ غالب ان کے عتاب میں ہیں جوش لفظوں کے بازی گر اور فیض غنیمت کے زمرے میں آتے ہیں اور آگے آیت۔!

استاد کے ساتھ میرا رویہ لئے دیئے قسم کا تھا، البتہ نوشاد تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہم دونوں کو بہت خاطر میں رکھتے تھے۔ ایک دن استاد سنڈیکیٹ آئے تو خلاف معمول پکوڑے ساتھ نہیں لائے تھے۔ ہم نے سوچا، مہینے کا آخری ہفتہ ہے ممکن ہے استاد کڑکی میں مبتلا ہوں۔ نوشاد نے ان کے بیٹھتے ہی دفتر کے پیون کو آواز دی اور کہا۔ "استاد آئے ہیں، جاؤ نیچے کسی دکان سے گرم گرم پکوڑے لے آؤ" اس پر استاد نے پیون سے کہا۔ "صاحبزادے جاؤ اپنا کام کرو" پھر نوشاد سے کہا "یہ میرے ساتھ زیادتی ہوگی" نوشاد نے متانت سے کہا "استاد ہمیشہ تو آپ زیادتیاں کرتے ہی رہتے ہیں، کبھی ہم لوگوں کو بھی یہ موقع فراہم کیجئے" "نہیں بھائی نوشاد۔ پکوڑے لانے کو تو میں بھی لاسکتا تھا۔ آج میرا پروگرام کچھ اور ہے۔ دہی اور بڑی کھانے کا۔ چلو آؤ ایسی جگہ لے چلتا ہوں جہاں "دل ما شاد نظر ما خوش" کا پورا لطف اٹھاؤ گے" یہ کہہ کر استاد اپنے طرز خاص سے مسکرائے۔

ادھر کئی دنوں سے استاد نظر نہیں آئے تھے۔ خیال آیا کہیں نصیب دشمناں استاد کی طبیعت علیل تو نہیں ہو گئی۔ اس کی تصدیق

کے لئے پہلے سرِ شام "بیت المکرم" تک گیا۔ انتظار کیا۔ جب شام رات کی آغوش میں ڈھل گئی انجمن ترقی اردو (ڈھاکہ) کی طرف چل پڑا کہ یہ اُستاد کا دوسرا اڈا تھا۔ انجمن میں داخل ہونے کی نوبت بھی نہیں آئی دیکھا کہ اُستاد زینے سے نیچے اتر رہے ہیں۔ اُستاد کے بغل میں ایک چوڑی چکلی ضخیم کتاب دبی ہوئی تھی، میں نے پوچھا "اُستاد یہ کون سی کتاب ہے؟ لغت ہے" اُستاد نے جواب دیا "میں ان دنوں لغت کا مطالعہ کر رہا ہوں" پھر انہوں نے ایک درجن لغات کے نام گنوا دیئے جو اُن کے مطالعہ سے گذر چکی تھیں۔ اور اپنا حال یہ کہ اُن میں سے بیشتر کے نام پہلی بار سُننے میں آئے تھے۔ اس باب میں اپنا علم مبلغِ علم "لغات کشوری" تک محدود تھا۔ وہاں سے بس اسٹینڈ تک اُستاد لغات اور لغات نویسی کے فن پر لکچر پلاتے رہے اور چند مروجہ لغات کی ، ایسی کی تیسی کی کہ جی جانتا ہے۔ وہ تو بس اسٹینڈ آ گیا اور اُستاد کو وہ بس کھڑی مل گئی جو انہیں اس گھر تک لے جاتی تھی جہاں وہ ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اُستاد اپنی گفتگو تک کو نظر انداز کر دیتے تھے اُن کا کہنا تھا کہ ٹیوشن ہو یا کوئی اور کام وقت کی پابندی ضروری ہے۔

ایک شام میں گلستان سینما کے نزدیک خالی الذہن کھڑا تھا، نوشاد نوری کا انتظار تھا اور وہ آ کے نہیں دے رہا تھا — ایک جی چاہا، پکچر دیکھ لوں پھر خیال آیا، تنہا پکچر دیکھنے کا کیا لطف ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ اُستاد میری طرف آتے دکھائی دیئے۔ سوچا چلو نوشاد کی کمی اُستاد سے پوری ہو جائے گی۔ لیکن اُستاد تو آج کچھ اور ہی موڈ میں نظر آتے تھے۔ قریب آتے آتے آدھے ہی سے مسکرائے اور ٹاٹا کہنے کے سے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے لوٹ گئے۔ سڑک کے پار جا کر پھر نہ جانے اُستاد کے کیا جی میں آیا کہ میری طرف پلٹے اور قریب آ کر بولے۔ "سہیل صاحب آپ نے سُنا" ابھی خبر منہ سے کیا نکلنے ہی والا تھا کہ انہوں نے لپک کر کہا" میں نے قلم اٹھا لیا ہے۔ اس سال غالب کی خیر نہیں" میں نے فوراً کہا۔ "اُستاد مبارک ہو" اُستاد مسکرائے اور الٹے پیروں لوٹ گئے۔

اس کے بعد ڈھاکہ میں اُستاد سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی یحییٰ خان کا مارشل لاء آ گیا' "روزنامہ پاسبان" ڈھاکہ کی اشاعت بند اور میری اسسٹنٹ ایڈیٹری ساقط ہو گئی۔ میں بادلِ ناخواستہ سید پور واپس لوٹ گیا' اور پھر ہمارے درمیان افراتفری اور خون خرابے کا زمانہ داخل ہو گیا۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بے خبر ہو گئے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ۱۹۷۲ء کے شروع میں' ہجرت کر کے میں کراچی آ گیا' نوشاد نوری ڈھاکہ میں رہ گئے (تا حال وہیں ہیں) اور اُستاد کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے کیا قدم اُٹھایا' بنگلہ دیش ہی میں رہے' ہجرت کرنے والوں کے ساتھ پاکستان آ گئے' یا اپنے متروکہ وطن بنارس کو دوبارہ آباد کیا۔

سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے میں اور میرے ایک رفیق انیس الحق صاحب ریڈیو پاکستان کراچی کے قریب سے گزر رہے تھے' مجھے دفتر افکار اور اُنہیں ریڈیو اسٹیشن جانا تھا کہ اچانک میری نگاہ اُستاد پر پڑی۔ میں خوشی سے نہال ہو گیا' ہم دونوں ہی اُستاد کے قریب گئے۔ جھپٹ کر بغل گیر ہوئے۔ اُستاد جب معانقہ کے بعد جُدا ہوئے تو بولے۔ "اچھا تو آپ سب نے یہاں آکر چولا بدل لیا مجھے دیکھئے میں نے سرمو اپنی وضع قطع سے انحراف نہیں کیا ہے"

واقعی اُستاد اپنے حلیے لبشرے اور لباس سے بالکل نہیں بدلے تھے۔ میں نے پوچھا ۔ "اُستاد شہر کراچی آپ کو کیسا لگا؟ "غنیمت ہے..... میکنگ میں ہے" اُستاد رُک رُک کر خاص لہجے میں بولے۔ "اُستاد یہاں کے ادبی حلقے سے آپ کا کچھ رابطہ بنا؟" میں نے پھر پوچھا جواب میں اُستاد نے سید سبطِ حسن صاحب اور دوسرے کئی ادبی لوگوں کے نام گنوائے۔ انیس الحق صاحب کو ریڈیو نیوز کے

تب مجھے کی جلدی تھی، وہ معذرت کر کے چلے گئے۔ پھر اُستاد نے ناقدانہ انداز میں اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "سہیل صاحب یہاں ادب میں ایک بھگدڑ مچی ہوتی ہے۔ مجھے تو یہاں اب تک کوئی عندلیب شادانی بھی نہیں ملا تمنا عمادی اور شہید اللہ لو دور کی بات ہے۔

میں اُستاد کے ساتھ ریڈیو پاکستان کے مقابل تھیوسوفیکل ہال کے ایک فٹ پاتھی چائے خانے کے پاس آگیا۔ دو پیالی چائے کا آرڈر دے کر وہیں میز پر بیٹھ گئے۔ خلاف معمول اُستاد نے میرے چائے کے آرڈر پر نہ مجھے روکا نہ یہ کہا کہ میاں چائے کے پیسے مجھ سے لینا۔ اُستاد نے آج یہ بات بھی خلاف معمول کی کہ مجھے اپنے شعر سننے کو کہا۔ حالانکہ اس سے پہلے نہ کبھی انہوں نے اپنا کوئی کلام سنایا نہ مجھے سنانے کو کہا تھا، میں نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "اُستاد، ارشاد"

"دیکھیئے فیض کی زمین میں" استاد نے کہا

انقلاب اس سے عظیم آئے گا کب عالم میں
دعوتِ امنِ جہاں قتلِ جہاں ٹھہری ہے
کشمکش پوچھ نہ کچھ بعدِ رہائی میری
ذمہ داریٔ نظر قیدِ گراں ٹھہری ہے

مست و سرشار تو ہے پھر بھی فضا کی خاطر
نکہتِ گل قفسِ باغ میں گھبرائی ہے

گرمیٔ زر ہے کہاں مانعِ اظہارِ ہنر
پیشِ خورشید زمیں رقص کناں آئی ہے

اُستاد نے چائے کے گھونٹ کے درمیان یہ اشعار سنائے پھر دریافت کیا "آپ کو کیسے لگے یہ اشعار"؟

"ایسے مواقع شاذ ہی نصیب ہوتے ہیں۔ یہ تو میرے لئے اعزاز ہے اُستاد" میرے جواب سے اُستاد کا چہرہ چمک اُٹھا۔ پھر نہایت تکلّف سے بولے۔ "آپ جلدی میں ہوں گے، میں نے خواہ مخواہ سمع خراشی کو روک لیا" "کمال کرتے ہیں اُستاد، آپ کا کلام سننے کیلئے تو میں اپنے سو کام کو لات مار دوں"

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے، اُستاد "ایمپریس مارکیٹ" میں بس اسٹینڈ کے پاس دستیاب ہو گئے، وہ بس پر سوار ہونے کو پر تول رہے تھے مجھے دیکھ کر رک گئے۔ اپنے گرد لپٹی ہوئی چادر کے اندر سے ایک نئی نویلی کتاب نکالی اور سرورق الٹ کر دکھایا۔ استاد کے نام یہ کتاب ان الفاظ کے ساتھ نذر کی گئی تھی "بڑے ادب سے جگت گرو کی خدمت میں" اور پھر اُستاد مہک کر گویا ہوئے۔ "سہیل صاحب دیکھئے میں نے یہاں خود کو منوالیا نا آخر" اور اُچک کر سامنے سے آتی ہوئی بس پر چڑھ گئے۔ نہ دعا سلام نہ خدا حافظ نہ ٹاٹا۔ اُستاد سے میں یہ بھی نہ پوچھ سکا۔ کہ اُستاد جس سال آپ نے ہاتھ میں قلم تھاما یا اس سال آپکے ہاتھوں غالب کا کیا حشر ہوا؟

اظہر حسن صدیقی

# کلیدِ بیان بازی (مکمل)

اگر آپ اخبارات کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتے رہتے ہیں تو آپ نے یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اخبارات میں ایک چیز بڑی باقاعدگی اور یکسانیت سے روزانہ نظر آئے گی، اور وہ ہیں بیانات۔ اگر آپ میں اتنی استطاعت اور صبر کی طاقت ہے اور آپ کے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ ان کا مطالعہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مدت مدید سے یہ سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری و ساری ہے۔ اکثر بیان جاری کرنے والے خواتین و حضرات وہ ہی ہیں جو برسوں سے یہ کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بیانوں کا متن بھی کم و بیش وہی ہوتا ہے، تھوڑی بہت تبدیلی کبھی کبھار ناموں اور اداروں یا تنظیموں کے سلسلے میں بوقت ضرورت اور موقعہ محل دیکھ کر کر دی جاتی ہے۔ یوں تو بیانات کی بہت سی اقسام ہیں جو ہم آگے چل کر بیان کریں گے لیکن ان کی دو بہت عام بنیادی اقسام ہیں جو بہت زیادہ مستعمل ہیں اور وہ ہیں موافقت اور مخالفت میں جاری ہونے والے بیانات اگر کسی حکم، تحریک، عمل، پروگرام یا ضابطہ اور قانون کی حمایت میں کسی طرف سے کوئی بیان چھپا ہے تو یہ لازم ہے کہ دوسرے روز اس کی مخالفت میں کم از کم ایک ورنہ دو تین بیان جاری ہوں یہ موافقت اور مخالفت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ یا تو اخبار ان بیانات کو چھاپنا بند نہ کر دیں یا پھر کوئی اور نیا شوشہ یا سلسلہ پیدا نہ ہو جائے جس کی طرف بیان دینے والے متوجہ ہو جائیں ان بیانات کے الفاظ اور مفہوم ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں صرف چند الفاظ کا فرق ہوتا ہے اور کبھی وہ بھی نہیں اگر آپ پچھلے چند برسوں کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں تو بعض موضوعات پر جاری ہونے والے بیانات کا متن من و عن وہی پائیں گے جو پہلے کسی اور نام سے چھپ چکے ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ بیانات جاری کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ساتھ ہی ساتھ بیانات کے موضوع بھی بدلتے جا رہے ہیں اور ان کی تعداد بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کے فائدے اور اپنے گاہکوں کے آرام نیز کمپنی کی مشہوری کی خاطر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر موضوع کے تیار بیانات تھوک اور خوردہ قیمتوں پر اپنے سرپرستوں کو مہیا کریں اس کے کئی فائدے ہوں گے۔ اوّل یہ کہ اس میدان میں نئے آنے والے پرانے لوگوں کے مرہون منت نہیں رہیں گے۔ دوئم یہ کہ پیشہ ور بیان لکھنے والوں کے محتاج نہیں رہیں گے۔ سوئم یہ کہ کم خرچ پر عمدہ کام ہوگا چہارم یہ کہ ہم اخبارات کے ذریعہ مناسب کمیشن پر ان بیانات کے چھپوانے کا انتظام بھی کر دیں گے پنجم یہ کہ آپ کو بیان لکھنے پڑھنے اور دے جا کر چھپوانے کی زحمت نہیں ہوگی۔ ہمارے تیار کردہ بیانات کے موضوعات اور ان کی تفصیل کی مکمل فہرست آپ کو مہیا کر دی جائے گی۔ اپنے سرپرستوں کی آسانی کے لئے ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ آرڈر فون پر بھی

بک کرائے جا سکتے ہیں صرف ہمارے دفتر کو بیان کا فہرست نمبر بتانا ہوگا اور فوٹو گراف کی طرح آپ کا بیان آپ کے نام سے چھپوانے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اگر آپ کو تیار شدہ حاضر مال کا متن پسند نہ ہو تو اس میں وقت اور موقعہ کے لحاظ سے مناسب قیمت پر حسب منشا تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے آرٹسٹ، خوشنویس اور کاتب حضرات کی خدمات بھی آپ کے لئے ہمہ وقت حاضر ہیں، ہمارے ادارہ نے ایسے تجربہ کار حضرات کی خدمات بھی آپ کے لئے حاصل کی ہوئی ہیں جنھیں بیان بازی اور بیان نویسی کا تیس سال سے اوپر کا تجربہ ہے۔ وہ آپ کو مشورہ بھی دے سکتے ہیں کہ کس وقت کس قسم کا بیان موضوع رہے گا۔ آپ چاہیں تو کئی قسم کے بیانات ایک ساتھ بھی تیار کرائے جا سکتے ہیں۔ خیال رہے کہ تین سے زیادہ بیانات ایک ساتھ لینے والے کو خاص رعایت دی جائیگی اور تحفہ میں اس کی پسند کا ایک عدد بیان مفت دیا جائے گا، اس کے علاوہ اگر آپ چاہیں کہ بیان کے ساتھ آپ کی تصویر بھی چھپے تو اس کا انتظام بھی مناسب فیس ادا کرنے پر ہو سکتا ہے۔

ہمارے تیار کردہ بیانات میں دو باتیں خاص ہیں ایک تو یہ کہ یہ بیانات آپ کو قانون کی زد سے محفوظ رکھیں گے۔ کیونکہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس کی قانونی گرفت ہو سکے۔ دوسری بات یہ کہ ان کا مفہوم ایسا ہوگا کہ جو شخص بھی جیسا چاہے مطلب اخذ کرے اور اس طرح آپ لوگوں کی بلاوجہ تنقید سے بھی محفوظ رہیں گے۔ لیکن ساتھ ہی آپ کے بیان اور آپ کی تصویر اخباروں کی زینت بھی بنتے رہیں گے۔ بڑے غور و خوض اور ایک مدت مدید تک ریسرچ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت چھپنے والے بیانات بیان دینے والوں میں بہت مقبول ہیں اور ہر موقعہ کی مناسبت سے چھپوائے جا سکتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اگر آپ اکثر بار بار چھپنے والے بیانات کا غور سے مطالعہ کریں تو انھیں کافی حد تک مضحکہ خیز پائیں گے۔ اپنے معاشرتی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیانات کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

**سیاسی** :- ہمارے ملک میں سب سے زیادہ تعداد سیاسی بیانوں کی چھپتی اور پڑھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کے ہر آدمی میں ایک سیاست داں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس جذبے کو دبائے یا چھپائے بیٹھا رہے مگر یہ جذبہ کم یا زیادہ ہوتا ضرور ہے کوئی بھی تقریب یا محفل ہو جہاں دوست احباب اکٹھے ہوں ہیر پھیر کے کسی نہ کسی بہانے اکثر جگہ بات سیاست حاضرہ تک ضرور پہنچے گی۔ سب سے اچھی بات سیاست پر گفتگو کرنے میں یہ ہے کہ آپ کا سیاست داں ہونا یا سیاست کی شد بد رکھنا قطعی ضروری نہیں ہے پبلک کے رجحان اور ضروریات کو مدنظر رکھ کر ہم نے سیاست سے متعلق ہر قسم کے بیان تیار کرائے ہیں آپ کی آسانی کے لئے چند ایک بیانات کی خصوصیات ہم بتائے دیتے ہیں۔

(۱) **تعریفی** :- مختلف اقدامات اور احکامات کی تعریف میں واہ واہ سبحان اللہ اور زمین آسمان کے قلابے ملانے والا بیان

(۲) **مذمتی** :- پہلے بیان کا بالکل الٹ ہر قسم کی خرابیوں اور برائیوں کی نشاندہی کرنے والا اور ہر بات میں کیڑے نکالنے والا بیان۔

(۳) حکومت وقت کے ہاتھ مضبوط کرنے والا بیان (یہ بیان بہت مقبول اور مستعمل ہے)

(۴) قوم میں اتحاد کی ضرورت پر زور دینے والا بیان ۔

(۵) کسی کو قانون شکنی اور بدامنی پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی (آج تک کوشش بسیار کے باوجود یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اجازت کس ادارے سے اور کس طرح ملتی ہے) ۔

(۶) بے مطلب بیان جس کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ عوام اور خصوصاً خواص کو پتہ چل جائے کہ بیان جاری کرنے والا ابھی زندہ ہے اور سیاست سے کنارہ کش نہیں ہوا ہے اور اگر کوئی عہدہ بھی مل جائے تو دعا دیں گے یا دوسرے الفاظ میں سے .... پھر تو ادھر بھی یا ؟

؎ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں ۔

(۷) ایک دوسرے کو غیر نمائندہ یا غیر جمہوری جماعت بتانے والا بیان ۔

(۸) ایک دوسرے کو غیر ملکی ایجنٹ ، ملک دشمن یا غدار قرار دینے والا بیان (یہ دونوں بیان بھی بہت مقبول ہیں اور بار بار ایک دوسرے کے خلاف جاری ہوتے رہتے ہیں)

(۹) ملک بہت نازک دور سے گزر رہا ہے (پچھلے چالیس سال سے یہ بیان متواتر چھپ رہا ہے اور ہنوز اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے ۔

(۱۰) اصولوں پر کوئی سودے بازی نہیں ہوگی یا سمجھوتہ نہیں ہوگا (یہ بیان بھی بہت پسندیدہ اور مستعمل ہے ۔)

(۱۱) کسی کو ملک توڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی (آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اجازت کس ادارے سے ملتی اور اس کی فیس کیا ہے اور اب تک جنہوں نے ایسا کیا ہے انہوں نے کس سے اجازت لی تھی)

**معاشی :۔** معاشی بیانات کا زیادہ تعلق قیمتوں میں استحکام معاشی ناہمواری کم کرنے یا امیر و غریب کا فرق مٹانے تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ وغیرہ سے ہوتا ہے اس کے علاوہ کچھ کارروائی کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے اور کچھ درپردہ دھونس بھی ہوتی ہے ۔ ہمارے پاس اس قسم کے متعدد بیانات تیار ہیں مثلاً :

(۱) قیمتوں میں استحکام پیدا کرو (کون کرے یہ بتانا قطعی ضروری نہیں)

(۲) ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کے خلاف عبرت آموز کارروائی کا مطالبہ (یہ بیان رمضان اور عید کے موقع پر بہت زیادہ تعداد میں جاری ہوتے ہیں ۔ ویسے بجٹ کے موقع پر بھی ان کی مانگ میں اضافہ ہو جاتا ہے)

(۳) مزدوروں کا استحصال بند کرو ۔

(۴) محنت کش کو اس کی محنت کا صلہ دو ۔

(۵) مہنگائی کی مخالفت میں بیان ۔

(۶) ہڑتال کی حمایت اور مخالفت میں بیان ۔

**مذہبی** :- اس سلسلے کے بیانات میں سب سے زیادہ چھپنے والا بیان ایک دوسرے کو اسلام سے خارج کر دینے اور کافر قرار دینے والا بیان ہے۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ بیان سنتے اور پڑھتے چلے آرہے ہیں اور اب تو ہمیں اس بیان کا متن لفظ بہ لفظ یاد ہوگیا ہے کوئی ہفتہ یا مہینہ مشکل سے ہی گزرتا ہوگا جب یہ بیان کسی نہ کسی شکل میں نہ چھپتا ہو۔
اسی کے ساتھ ایک اور بیان ہے جو اتنا ہی مقبول ہے اور جس دن سے ہم نے اخبار پڑھنا شروع کیا ہے اس بیان سے مفر نہیں اور وہ ہے "اسلام نازک دور سے گزر رہا ہے" کبھی کبھی اس کے ساتھ تمام عالم اسلام یا اسلامی ممالک کا اضافہ ہوجاتا ہے "مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت" "اسلامی نظام نافذ کرو" ان عنوانات کے تحت جاری ہونے والے بیانات بھی بہت پسند کئے جاتے ہیں۔

**سماجی** :- اس زمرہ میں وہ بیانات آتے ہیں جو سوشل ورکر یا ان کے لیڈر وقتاً فوقتاً اپنی اہمیت اور زندگی کا ثبوت دینے کے لئے جاری کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی سماجی مسئلہ یا منصوبہ کے حق میں یا اس کے خلاف بیان۔ کسی بھی ٹی وی یا ریڈیو پروگرام کو جاری رکھنے یا بند کرنے کے متعلق یا کسی فلم کے خلاف بیان۔ ان تمام بیانات کی زبان ایک سی ہوتی ہے صرف نام اور مقامات بدلتے رہتے ہیں مثلاً "سماج دشمن عناصر کا سر کچل دیا جائے" آج تک یہ نہیں پتہ چل سکا کہ یہ کہاں پائے جاتے ہیں اور ان کے سر ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

**تعلیمی** :- تعلیم اور طلبار کے سلسلہ میں چھپنے والے بیانات کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جن کا تعلق طلبار کے مطالبات سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اساتذہ کے مطالبات سے واسطہ ہوتا ہے طلبائے کے بیانات زیادہ تر ان عنوانات کے تحت چھپتے ہیں

(۱) امتحان ملتوی کرو۔
(۲) تعلیمی ادارے کھولو یا بند کرو۔
(۳) طلبار کی سزائیں معاف کرو۔
(۴) ایشیا سرخ ہے یا سبز ہے (پتہ نہیں ان دونوں رنگوں کے علاوہ اور دوسرے رنگ ہمارے طلبار میں کیوں نہیں مقبول ہوئے۔

**کھیل** :- کھیلوں سے متعلق زیادہ تر بیانات یا تو کسی تنظیم کی مخالفت یا موافقت میں ہوتے ہیں یا پھر ٹیم کے چناؤ کے وقت کسی مخصوص کھلاڑی کو ٹیم میں شامل نہ کئے جانے کے خلاف ہوتے ہیں، یا جن کو شامل کیا گیا ہے ان کے چناؤ کے خلاف ہوتے ہیں خصوصاً ٹیم کے کپتان مقرر کئے جانے کے خلاف اور حمایت میں۔

**تعزیتی** :- تعزیتی بیانات کا چھپنا اور جاری ہونا بھی اسی قدر اہم اور ضروری خیال کیا جاتا ہے جتنا دیگر اور بیانات کا اور یہ بھی اسی قدر اہتمام اور باقاعدگی سے چھپتے ہیں جتنے اور قسم کے بیانات چھپتے ہیں چند ایک کے عنوانات سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ ان میں کس طرح کی زبان استعمال کی گئی ہوگی۔

(۱) خراج عقیدت پیش کرنے والا یا خدمات سے اعتراف کا بیان ۔

(۲) گہرے رنج و غم کا اظہار ۔

(۳) موصوف کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے (یا کبھی بھی نہیں یہ آپ کے تعلقات پر منحصر ہے) پُر ہو سکے گا ۔

(۴) مرنے والے میں وہی خوبیاں ہوں گی جو عام طور پر پسند کی جاتی ہیں اور وہی صفات گنوائی جائیں گی جو عام طور پر گنوائی جاتی ہیں ۔

اس قسم کے بیانات میں استعمال کئے جانے والے مشہور و معروف اشعار کا کافی ذخیرہ بھی ہم نے مہیا کیا ہے ۔ مثال کے طور پر چند ایک بہت مستعمل مصرعے درج ذیل ہیں ۔

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے (اس کے استعمال کے لئے ضروری نہیں کہ مرحوم کا انتقال کم عمری میں ہوا ہو)

ان نمونوں کے اشعار کے علاوہ ہم نے ہر وقت اور موقعہ کی مناسبت سے استعمال کئے جانے والے اشعار کی ایک بڑی تعداد بھی جمع کی ہے ۔ دیکھا گیا ہے جب تک موقعہ محل کے اشعار نہ سنائے جائیں لوگوں پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ مصرعے یا اشعار پرانے ریکارڈوں کی طرح بالکل گھس پٹ گئے ہوں جیسا کہ مندرجہ ذیل کا حشر ہوا ہے ۔

ع دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ع اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

ع پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

ع نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

ع نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے . . . . . .

ع بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

ع ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہمارے جمع شدہ ذخیرۂ اشعار میں سے آپ اپنی پسند کے مطابق اشعار منتخب کر سکتے ہیں اگر آپ کو اپنے بیان کے لئے ہمارے مہیا کردہ اشعار میں سے کوئی بھی پسند نہ آئے تو آپ اپنے بیان کی مناسبت سے مضمون دے کر شعر تیار کرا سکتے ہیں ۔ اس کام کے لئے ہم نے آزمودہ اور ماہر شعراء کی خدمات حاصل کی ہیں جو وقت اور موقعہ کی مناسبت سے قصیدہ ، مرثیہ ، قطعہ تاریخ پیدائش وفات وغیرہ لکھ سکتے ہیں اور ہم صرف معمولی کمیشن پر آپ کی تمام ضروریات پوری کر سکتے ہیں ۔

ہم نہ صرف بیان تیار کرتے اور چھپواتے ہیں بلکہ جواب دو آں غزل کے طور پر جوابی بیان بھی تیار رکھتے ہیں تاکہ ہمارے گاہکوں کو

اس کے لئے دوڑ بھاگ نہ کرنی پڑے اسی طرح جواب الجواب بھی آپ کو ہمارے ہاں تیار ملے گا۔ آپ نے بعض اوقات دیکھا ہوگا کہ بعض بیانات کا مقصد کچھ نہیں ہوتا صرف عوام کو یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ہم نے ابھی لنگر نہیں کھولا ہے۔ آپ کی آسانی کے لئے ہم نے بیانات کی نورا کشتی کا بھی انتظام کیا ہوا ہے۔ صرف تھوڑے خرچ پر ہم دونوں طرف سے گولہ باری اور جوابی کارروائی کا بھی اہتمام کر سکتے ہیں اور اگر آپ کو کیچڑ اچھالنے سے بھی دلچسپی ہو تو اس کا بھی معقول انتظام ہے۔

ہم بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ کیوں نہ ایک اخبار اسی مقصد کے لئے نکالا جائے جس میں تمام ایسے حضرات کے بیانات اور جوابی بیانات چھاپے جائیں جو اس کام میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہر قسم کے بیانات کے لئے الگ الگ صفحے مخصوص ہوں جہاں یہ بیانات اور ان کے جوابات چھپیں۔ عوام کو بھی بڑی آسانی ہو جائے گی کیونکہ انہیں بھی یہ معلوم ہوگا کہ کس قسم کا بیان کس صفحے پر ہوگا اور اس طرح وہ "بقیہ دیکھئے صفحہ فلاں" کی زحمت سے بھی محفوظ رہیں گے۔ جب تک ہماری یہ تجویز عملی جامہ پہنے اخبارات کو چاہیئے کہ وہ فی الحال ایک آدھ صفحہ مختلف سرخیوں کے تحت موافقت اور مخالفت میں چھپنے والے بیانات کے لئے مخصوص کر دیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ بہت سے لوگ ہماری اس تجویز کی پرزور تائید کریں گے۔ ایسی تجویز پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت خصوصاً ایسے زمانے میں اور زیادہ ہو جاتی ہے جب کسی مسئلہ یا موضوع پر اخباروں میں گرما گرم بحث جاری ہو ویسے ہمارے ہاں کچھ موضوع تو ہمیشہ ہی زیر بحث رہتے ہیں اور کچھ لوگوں کے لئے وقت گزاری کا اچھا مشغلہ ثابت ہوتے ہیں۔

**ادبی بیانات :۔** زیادہ تر ادبی تحریکوں اور تنظیموں کی حمایت یا مخالفت میں جاری ہوتے ہیں جن میں ترقی پسند، رجعت پسند اور اسلام پسند سرفہرست ہیں البتہ ادب پسند کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے پسندیدہ ادیب یا شاعر کی مستند حیثیت یا عظمت منوانے کے سلسلے میں جاری ہونے والے بیانات اسی زمرہ میں آتے ہیں اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے خلاف بیانات بھی جاری ہوں اس لئے کہ کسی بات پر متفق ہونا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں ہے اور نہ غالباً ہماری سرشت میں ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار "دانشوروں" کی طرف سے بھی اجتماعی بیانات کسی تحریک کی حمایت یا مخالفت میں جاری ہوتے رہتے ہیں ان سب میں شائع ہونے والے مواد کا مضمون اکثر ایک جیسا ہی ہوتا ہے اور وہی الفاظ اکثر و بیشتر استعمال کئے جاتے ہیں، ہم اس سلسلے میں بھی آپ کے لئے آسانیاں مہیا کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہر قسم کے عملی ادبی معرکے سر کرنے کے لئے ہم سے رجوع کریں۔

**اپیل :۔** بیانات کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو اپیل کی شکل میں شائع ہوتی ہے۔ چندہ کی اپیل کو چھوڑ کر بقیہ تمام اپیلیں کسی نہ کسی کے نام پر کی جاتی ہیں۔ چندہ کی اپیلیں تو زیادہ تر خدا کے نام پر ہی ہوتی ہیں ورنہ اپیل مذہب کے نام پر۔ اسلام کے نام پر شرافت کے نام پر۔ انسانیت کے نام پر (اگر اس نام کی کوئی چیز ہوتی ہے تو) وغیرہ وغیرہ بعض لوگ ہمدردی کے نام پر بھی اپیل کرنا پسند کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ شاید اس طرح کسی کا دل پسیج جائے یا بقول شاعر شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات۔

**موسمی بیانات :۔** یہ بیانات عام طور پر خصوصی موقعوں پر جاری ہوتے ہیں مگر ہوتے بڑی باقاعدگی سے ہیں۔ ان میں بھی استعمال کئے جانے والے الفاظ اور فقرے عام طور پر وہی ہوتے ہیں جو برس ہا برس سے چھپتے چلے آ رہے ہیں صرف جاری کرنے والے لوگوں اور تنظیموں

کے نام بدلتے رہتے ہیں اور وہ بھی صرف اس صورت میں جب کہ پہلے لوگ داغ مفارقت دے گئے ہوں ورنہ وہی بیانات ہر سال انہی لوگوں کے نام سے چھپتے ہیں۔ عید پر فطرہ کی رقم اکٹھی کرنے کے لئے اور قوم کو عید کی مبارک باد دینے کے لئے اور عید کی فضیلت بیان کرنے کے لیے بھی بیان کا جاری ہونا بہت ضروری ہے اسی طرح عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر بھی قوم سے کھالیں مانگنے اور سنت ابراہیمی کے مطابق قربانی دینے کے لئے تیار رہنے کے لئے بھی بیانات ضرور جاری کئے جاتے ہیں۔

ایک بہت اہم موقعہ بیانات جاری کرنے کا سالانہ بجٹ کا وقت ہوتا۔ جب بجٹ کی تجاویز کی موافقت اور مخالفت میں بیانات کا انبار لگ جاتا ہے اور کوئی بھی متعلقہ اور غیر متعلقہ شخص اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ان بیانات میں ہمارا پسندیدہ بیان وہ ہے جو تجارتی سیاست دانوں کی طرف سے برس ہا برس سے چھپ رہا اور جس کا متن کچھ یوں ہے "موجودہ حالات میں اس سے بہتر بجٹ تجاویز نہیں پیش کی جاسکتی تھیں" اس کے علاوہ قوم میں امن و امان اور قوم میں اتحاد کی تلقین" "۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کو اتحاد اور عزم و ہمت قائم رکھنے کا عہد" "۲۵ دسمبر کو قائداعظم کے نقش قدم پر چلنے کا عزم، اتحاد ایمان اور تنظیم کا سبق دہرانا" اس قسم کے بیانات بھی موسمی بیانات کے زمرے میں آتے ہیں۔

مایوسی سے بچنے کے لئے آج ہی ایک نسخہ "کلید بیان بازی مکمل" ہم سے طلب فرمائیں۔ اس میں بیان چھپنے کے ایسے ایسے گُر بتائے گئے ہیں کہ آپ کا بیان فوراً چھپ جائے اور آپ کو زحمت بھی نہ ہو۔

بقیہ صـ ۳۰۴

موت کا کوئی کھٹکا تھا بلکہ میر کی طرح وہ بھی موت کو ایک ایسا وقفہ سمجھتے تھے جس کے ذریعے کوئی مسافر ایک منزل کا سفر طے کرتے ہوئے دوسری منزل کے سفر میں داخل ہوتا ہے۔ شیدا صاحب نے موت کا انتظار تو کیا ہے لیکن وہ زندگی سے شکستہ ہو کر مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے ایک تہذیبی انسان کی طرح موت کی صداقت کو بھی زندگی سے جوڑ رکھا تھا جس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مذہبی زندہ عقائد ان کی روحانی، فکری، عملی اور تخلیقی وجود میں گردش کر رہے تھے۔ شیدا صاحب کے یہاں احساسِ مرگ کی صورت ایک ایسی رجائی اور آسودہ صورت ہے جو محبتوں کے یقین اور دکھوں کی بے خوفی سے پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے انتقال سے ایک دن پہلے وہ قطعہ لکھا تھا جو ان کے کتبہ پر کندہ ہے انھوں نے لکھا تھا۔

اب مدد فرمایئے ربِّ غفور — میرے مولا حکم کا ہے انتظار
میں تو شیدا لائقِ بخشش نہیں — مغفرت کا پھر بھی ہوں امیدوار

زندگی کے شہر سے موت کے دروازے میں داخل ہونے کی دعا کرنا پورے وجود کو سمیٹ کر اپنے بنانے والے کے سپرد کر دینا شیدا صاحب کی وہ خواہش تھی جس کے لیے انہوں نے زندگی کو اختیار کیا تھا۔ شیدا صاحب کی شخصیت کو اور ان کی روحانی و فکری قوت تخلیق کو دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے روشنی کا وہ رستہ پالیا تھا جو "زادِ راہ" میں ان کے پڑھنے والوں کو جسم و جان کی ایک تسکینی بشارت دیتا رہے گا۔

منظوم سفرنامہ

اقبال حیدری

# لندن ہتھرو

مجھ کو لینے کون آئے گا لندن میں ہے کون مرا
کس سے میری یاد اللہ ہے کس سے میری یاری ہے
مجھ کو چھوڑ کے مت جاؤ تم رک جاؤ اے ہم سفرو
حیرت کا وہ عالم ہے کہ سکتہ مجھ پر طاری ہے
رہ نہ جاؤں کھو نہ جاؤں یارو میرے ساتھ رہو
حالت یہ ہے ذہن مرا اب سوچ سے بالکل عاری ہے
شدت سے احساس ہے مجھ کو سو فیصد میں مانتا ہوں
مغرب کے معیار سے میری چال میں کج رفتاری ہے
انگریزوں کی انگریزی کب مجھ کو سمجھ میں آئی ہے
کچھ تو میری کم علمی ہے کچھ لہجہ کی دشواری ہے
اپنا بوجھ کمر پہ لادے مانا میں اک ٹورسٹ ہوں
اک دو دن یاں ٹھیروں گا پھر چلنے کی تیاری ہے
میں ہوں مسافر میرا کوئی دیس نہیں ہے ٹھور نہیں
آوارہ ہوں میرا کوئی دین نہ دُنیاداری ہے

سامان میرا مت دیکھو کہ کچھ بھی نہیں ہے پاس میرے
میری بات کو سچ مانو ہے جھوٹ نہ یہ عیاری ہے
میرا اثاثہ بس اک دیواں باقی میری ذہانت ہے
جس پر اک مدت پہلے ہی سے ملک میں میرے جاری ہے
تحفے کس کے واسطے لاتا کون ہے میرا دوست یہاں
میری گرہ میں مال کہاں ہے مجبوری لاچاری ہے
لکھنا پڑھنا کام ہے میرا یہ بھی کوئی کام ہوا
اس لئے میں نے بتلایا ہے شغل مرا بیکاری ہے
جانے کیوں یہ جی چاہتا ہے طیارہ کے رکتے ہی
کوئی مونس کوئی ہمدم لندن جیسے شہر میں بھی
بے چینی سے گھڑیاں گنتا پل پل میری آمد کی
مجھ کو دیکھ کے خوش ہوتا اور مجھ سے آکے لپٹ جاتا
یوں دیکھو تو لگتا ہے ہر چہرہ جانا پہچانا
مجھ کو لینے کون آئے گا لندن میں ہے کون مرا

(۲)

# لندن میں شیلےؔ کی یاد

شیلے نے کیا خوب کہا تھا ایک سو پینسٹھ سال ہوئے
دوزخ بھی ہے لندن جیسی لندن کی آبادی جب
ملین تھی یا ملین سے کچھ اوپر ہوگی لیکن اب
لندن میں ہیں سیکڑوں دوزخ جنکی آگ میں روز و شب
دیوانے کچھ ہم جیسے بھی جلتے ہیں بے نام و نسب
میں بھی جلنے آیا ہوں اس آگ میں جانے کب
نکلوں گا اس دوزخ سے یا جل کے بھسم ہو جاؤں گا
شیلےؔ نے کیا خوب کہا تھا گیت ہمارے گیتوں میں
سب سے اچھے گیت وہی ہیں جن میں درد کی شدت ہے
قہقہے جن میں خوشیوں کی محسوس حلاوت ہوتی ہے
شیلے نے کیا خوب کہا تھا رنج و الم کے مظہر ہیں
تیز ہوائیں چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ
وادی وادی دُنیا کے آلام کا ماتم کرتی ہیں
صحراؤں میں دُکھ کا مارا سنّاٹا کچھ کہتا ہے
انساں کے اندوہ پہ لوگو کان لگاؤ اور سنو
شیلےؔ نے کیا خوب کہا تھا دور سمندر روتا ہے
دائم بہتے رہنے والے ٹیمز کی ہلکی موجوں میں
اونچے سبز درختوں میں اور سُرخ گلابی پھولوں میں
ٹرافل گر کے چوراہے پہ ہنستے گاتے چہروں میں
واٹرلو کے پل کے اوپر گلیوں میں اور کوچوں میں
شیلےؔ مجھ کو یاد آیا ہے لندن کے سب رنگوں میں

(۳۰)

# ہری اوم ہری

دُنیا کے ہر گوشے میں تھی جس کی اک نو آبادی
سُورج جس کی شاہی میں ہر وقت فروزاں رہتا تھا
دبدبے والا مرتبے والا طاقتور انگریز وہی
ٹوٹے پھوٹے پب میں بیٹھا اپنے حال کو روتا ہے
شاہوں کا جو شاہ تھا اور خود ہندوستان کا پربھو تھا
سر کو منڈھا وہ سادھو بن کر ہاتھوں میں زنّار لئے
لندن کے بازاروں میں اب جے جے پربھو کرتا ہے
ملک میں اس کے گھس آئے ہیں کالے پیلے لوگ سبھی
ختم کبھی نہ ہونے والے جن انمول خزانوں میں
ہندوستان کی چاندی تھی اور افریقہ کا سونا تھا
ہیرے نگ یمن کے تھے اور دُرّ و لعل بدخشاں کے
دولت تھی اور اتنی تھی کہ جس کی کوئی حد نہ تھی
گوہر لعل زمرّد کے وہ سارے خزانے خالی ہیں
صدیوں پہلے مصر میں جو فرعون حکومت کرتے تھے

مرتے تھے تو دولت اپنی زیرِ زمیں رکھ دیتے تھے
ریگستاں میں خاک اُڑاتا سینہ چیر کے صحرا کا
مصر کی مدفون دولت بھی وہ خیر سے گھر لے آیا تھا
لیکن اب یہ حالت ہے کہ اس کا مقدر سوتا ہے
خود وہ اکیلا پب میں بیٹھا اپنے حال کو روتا ہے
اس کے بیٹے سڑکوں پر کہرام مچاتے پھرتے ہیں
کالے پیلے لوگوں کے گھر بار جلاتے پھرتے ہیں
روشنی جس کے تاج میں ہر دم کوہ نور کا ہیرا تھا
قسمت اس کی اچھی وہ اب بھی اسکے تاج میں ہے
لیکن اس کو کیا کہیے کہ ہند و پاک کے باشندے
آج تلک حق اپنا وہ اس ہیرے پہ جتلاتے ہیں
ماضی کا وہ ہندوستان جو سونے کی اک چڑیا تھی
جس پہ اس کا قبضہ تھا اب یاد بہت وہ آتا ہے

(منظوم سفرنامے کے تیسرے حصّے کا ایک ورق)

مشرف احمد

# اردو تحقیق
## مشفق خواجہ سے ایک گفتگو

سوال :۔ خواجہ صاحب ہم دائرے کے قارئین کے لئے آپ سے اردو میں تحقیق اور اس کے ماضی حال مستقبل اور مستقبل کے امکانات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل آپ سے آپ کے تحقیقی کاموں کے بارے میں بھی کچھ باتیں دریافت کرنا مناسب ہوگا۔ آپ صاحب دیوان شاعر ہیں "ابیات" کے نام سے آپ کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے آپ نے بعض بڑے خوبصورت مزاحیہ مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ غریب شہر کے قلمی نام سے ایک روزنامہ اخبار میں کالم بھی لکھے ہیں۔ نیز خامہ بگوش کے نام سے آپ ایک طویل عرصے سے ادبی کالم نویسی کر رہے ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کی ایک جہت تحقیق بھی ہے "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" غالب اور صفیر بلگرامی "جائزہ مخطوطات اردو" "اقبال" از احمد دین کتابی شکل میں شائع ہو کر علمی و تحقیقی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ شاعری طنز و مزاح اور تحقیق جیسے خشک کام میں بعد المشرقین ہے آپ نے ان سب چیزوں میں ایک توازن کو کیونکر برقرار رکھا

جواب :۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعر آزاد خیال ہوتا ہے اس لیے وہ تحقیق کی خارزار وادی میں قدم نہیں رکھتا۔ کیونکہ تحقیق دماغ سے تعلق رکھتی ہے اور شاعری کا زیادہ تر تعلق دل سے ہوتا ہے گویا شاعری اور تحقیق کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ لیا گیا ہے اور طنز و مزاح کو ان دونوں کی ضد سمجھ لیا گیا ہے شاعری اور تحقیق سنجیدہ کام ہیں۔ طنز و مزاح غیر سنجیدہ۔ لیکن یہ سارے تضادات فرضی ہیں۔ طنز و مزاح غیر سنجیدہ کام نہیں ہے۔ یہ بھی دوسرے سنجیدہ کاموں کی طرح گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ معاشرے یا ادب کی کسی خرابی کی طرف منطقی انداز میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں اور شگفتہ انداز میں بھی۔ میں بیک وقت شاعر، محقق اور طنز و مزاح نگار اس لیے ہوں کہ میرا مزاج ہی کچھ اس قسم کا ہے۔ اس موضوع پر ایک مرتبہ گفتگو کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ شاعری کے ذریعے میں اپنا سراغ لگاتا ہوں اور تحقیق کے ذریعے دوسروں کا۔ جو باتیں شاعری اور تحقیق کے دائرہ کار میں نہیں آتیں انھیں میں طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کر دیتا ہوں۔ مثلاً جب کوئی خراب کتاب میری نظر سے گزرتی ہے تو غصے میں آنے کی بجائے ہنستا ہوں اور ہنسی ہنسی میں وہ سب کچھ کہہ دیتا ہوں جو اگر میں سنجیدہ پیرائے میں کہتا تو شاید اُسے کوئی نہ پڑھتا۔ مختصر یہ کہ ایک آدمی بیک وقت بہت سے کاموں سے دلچسپی لے سکتا ہے بشرطیکہ اُسے معلوم ہو کہ کسی کام کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔

سوال : وہ کیا اسباب و عوامل تھے جنھوں نے آپ کو تحقیقی کاموں کی طرف راغب کیا

جواب: انسان اپنے لیے جب کوئی راستہ متعین کرتا ہے تو اس کے اسباب خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں یا یوں کہیے مخصوص حالات میں انسان ایک مخصوص راستہ اختیار کرتا ہے میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں اُس میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ میرے دادا مرحوم فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے تھے میرے والد مرحوم کو ادب اور علوم اسلامی سے دلچسپی تھی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ مطالعے کے بے حد شائق تھے۔ اس لیے وہ کتابوں کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں مجھے بھی کتابوں سے دلچسپی پیدا ہونی ضروری تھی۔ ہمارے گھر میں رسالہ "معارف" اعظم گڑھ باقاعدگی سے آتا تھا۔ اس کی ورق گردانی سے مجھے علمی و تحقیقی مضامین سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پنڈت کیفی کی "کیفیہ" پہلی کتاب تھی جسے میں نے دلچسپی سے پڑھا۔ اس کتاب کی وجہ سے مجھے زبان کے مسائل سے دلچسپی ہوئی۔ پھر بعض ادبی تاریخیں نظر سے گزریں۔ رفتہ رفتہ مجھے قدیم ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پرانے شاعروں کے دیوان پڑھے تو اُن کے حالات جاننے کا شوق بھی ہوا۔ اور یوں شعرا کے تذکروں سے رابطہ پیدا ہوا۔ یہ سب ۱۶ سے ۱۷ برس کی عمر تک کی باتیں ہیں۔ ۲۰ برس کی عمر تک اردو کے کلاسیکی ادب اور اُس کی تاریخ سے میری دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ میں اسی کام کا ہو کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے گوشے ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ بہت سے شاعر ایسے ہیں جن کے کلام اور حالات تک عام اہلِ اردو کی رسائی نہیں۔ جب ۱۹۵۷ میں میں نے مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن ترقی اردو میں کام شروع کیا تو اُن کے کتب خانہ خاص میں مجھے ایک نئی دنیا نظر آئی۔ قلمی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ وہاں موجود تھا۔ یہ میرے لیے ایک نئی دنیا کا درجہ رکھتا تھا۔ میں اس نئی دنیا میں کھو گیا اور ابھی تک کھویا ہوا ہوں

سوال :۔ اردو زبان میں ادبی تحقیق کے ماضی اور نامور محققوں اور اُن کی خدمات کے بارے میں کچھ بتایئے۔

جواب: اس مختصر صحبت میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں اردو تحقیق کی مکمل تاریخ آپ کے سامنے پیش کردوں۔ خاص خاص محققوں کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔ سب سے پہلے اردو تحقیق کے ماضی کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔ اردو کی ادبی تحقیق کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اردو کا پہلا محقق مولانا محمد حسین آزاد کو کہا جاسکتا ہے ان کی کتاب "آبِ حیات" پہلی مرتبہ ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اسے ہم پہلی تحقیقی کتاب اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ شعرا کے حالات جمع کرنے میں خاصی محنت کی ہے۔ کئی شاعروں کے بارے میں انھوں نے پہلی مرتبہ ضروری معلومات پیش کیں۔ انہوں نے تذکروں اور دیگر کتابوں سے مدد لی، اور اب اُن کے جو ذاتی کاغذات محفوظ ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شعرا کے جاننے والوں اور اُنکے اہل خاندان سے مراسلت کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔ مولانا نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ اسی خامی کی وجہ سے "آبِ حیات" اردو کی مقبول ترین کتاب ہونے کے باوجود تحقیقی اعتبار سے کمزور سمجھی جاتی رہی ہے۔ لیکن اب جدید تحقیق نے ہمیں بتا دیا ہے کہ مولانا کے پیشِ نظر کون کون سے تذکرے اور کتابیں تھیں، اس طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مولانا کی ساری تحقیق کمزور نہیں ہے۔ "آبِ حیات" کے تحقیقی مقام و مرتبہ کے بارے میں کچھ بھی کہا جائے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو تحقیق کا سنگِ بنیاد یہی کتاب ہے اور اسی کی وجہ سے اردو میں ادبی تحقیق کا رواج ہوا۔

اردو میں دوسرا تحقیقی کام مرزا علی لطف کے تذکرے گلشنِ ہند کا تدوین کا ہے جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے متن کی تصحیح مولانا شبلی نعمانی نے کی ہے اور مقدمہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے اب تو اس تذکرے کے درجنوں قلمی نسخے دریافت ہو چکے ہیں لیکن ۱۹۰۶ء میں وہی ایک نسخہ دریافت ہوا تھا جس پر مطبوعہ نسخے کی بنیاد رکھی گئی۔ اردو میں تدوینِ متن کی یہ پہلی مثال ہے اور مولوی عبدالحق کا مقدمہ ادبی تحقیق کا پہلا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق اردو ادب کے پہلے باقاعدہ محقق ہیں انھوں نے بیسیوں تحقیقی مقالے لکھے، درجنوں کتابیں مرتب کیں اور تحقیقی موضوعات پر مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو دنیا میں تحقیقی کاموں سے دلچسپی لینے کا راستہ مولوی عبدالحق ہی نے دکھایا خصوصیت سے پرانے تذکروں اور دکنی ادب کو منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں اُن کا کام بے مثال ہے، یہ صحیح ہے کہ اُن کے بعض مرتبہ متن اعلیٰ معیار کے نہیں ہیں اور انہیں ازسرِنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے، لیکن اس سے مولوی عبدالحق کے تحقیقی کاموں کی وقعت کم نہیں ہوتی۔ تحقیق میں کوئی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا اور پھر مولوی عبدالحق تو اس میدان میں پہلے آدمی تھے ہم اُن کے کاموں ہی سے نہیں، اُن کی غلطیوں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں

اردو تحقیق میں دوسرا بڑا نام حافظ محمود شیرانی کا ہے اگرچہ اُن کا زیادہ کام فارسی ادب سے متعلق ہے لیکن اردو ادب کے تعلق سے بھی اُنہوں نے بہت عمدہ کام انجام دیے ہیں "پنجاب میں اردو" کے حوالے سے اردو کے قدیم ادب کے بعض تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ قدیم اردو ادب پر انھوں نے متعدد مقالات لکھے ہیں یہ مقالات کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ "مقالاتِ شیرانی" کی پہلی تین جلدیں اُردو ادب کے بارے میں ہیں۔ ان سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیرانی نے کیسی کیسی نادر و نایاب کتابوں کو متعارف کرایا ہے۔ تدوینِ متن کے سلسلے میں شیرانی کا کام بے مثال ہے۔ قدرت اللہ قاسم کا "مجموعہ نغز" انھوں نے مرتب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو ادب کی کوئی قدیم کتاب ایسے محتاط انداز میں مرتب نہیں کی گئی۔ شیرانی کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اگر مخطوطے میں کسی لفظ کا کوئی حصہ غائب ہو گیا ہے تو اس کی بھی صراحت کر دی ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب بھی ہمارے بڑے محققوں میں سے ہیں۔ انھوں نے لکھنوی ادیبوں پر متعدد ایسے مقالے لکھے ہیں جو اپنے موضوع پر اب تک پہلی اور آخری تحریریں ہیں۔ لکھنؤ کے شاہی اور عوامی اسٹیج پر اُن کا کام اپنی مثال آپ ہے انھوں نے بعض اہم کتابیں بھی مرتب کی ہیں خصوصاً "دیوانِ فائز" یہ اُن کی ایسی دریافت ہے جس سے شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کی بحث بہت آگے بڑھی ہے۔

اردو تحقیق میں قاضی عبدالودود کا نام ایک روایت کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ اُن کا علم بے پایاں تھا۔ اردو کے قدیم ادب کے جتنے نمونے اُن کی نظر سے گزرے، شاید ہی کسی دوسرے محقق کی نظر سے گزرے ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسرے محققوں کو علمِ تحقیق کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار سے بھی سابقہ رہتا تھا لیکن قاضی صاحب کا یہ سارا وقت تحقیق کے لیے وقف تھا اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو تحقیق میں تن آسانی اور سہل پسندی کے خلاف مسلسل جنگ لڑی۔ محققوں کی بے شمار غلطیوں کی نشاندہی کی۔ قاضی صاحب کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے خود کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ قاضی صاحب قدیم شاعروں پر اعلیٰ درجے کے تحقیقی مقالے لکھ سکتے تھے اور بہت سی اہم کتابوں کو مرتب کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس جہت میں کوئی خاص کام نہیں کیا جو تین چار کتابیں مرتب کیں انھیں بھی تدوین کا مثالی کام نہیں کہا جا سکتا۔ قاضی صاحب باوجود اِس

کے کہ بہت بڑے محقق تھے لیکن خود تحقیق میں وہ اہم اور غیر اہم کی تفریق نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے شاعروں پر تحقیقی مواد فراہم کیا جن کی کوئی اہمیت نہیں۔ انھوں نے جو کتابیں مرتب کیں اُن میں "قطعات دلدار" جیسی غیر اہم کتاب بھی ہے۔ شاہ قدرت اُردو کے ایک اہم شاعر تھے۔ قاضی صاحب اُن کے دیوان کو مرتب کرنے میں مصروف رہے لیکن "متفرق نگاری" کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے مصحفی کے بارے میں اُن کی معلومات بہت زیادہ تھیں، وہ اس پر ایک مکمل کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ بہر حال اِن باتوں سے قاضی صاحب کے ایک بڑے محقق ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اُنھوں نے اردو کے محققوں کو غلط نویسی سے بچانے میں تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی کا دائرہ تحقیق بہت وسیع تھا۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں کے ادب سے انہیں دلچسپی تھی۔ تاریخ ہند اور اسلامیات سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اردو ادب کے تعلق سے اُن کے کام نہایت وقیع ہیں۔ مکاتیب غالب اور غالب کے اردو کلام کی تدوین کے علاوہ غالب پر اُن کا اور بھی بہت سا کام ہے۔ رضا لائبریری رامپور کے اردو مخطوطات کی فہرست بھی اعلیٰ درجے کی تحقیقی کتاب ہے۔ یہ معروف معنوں میں فہرست نہیں ہے بلکہ ہر مخطوطے پر انھوں نے ایک عالمانہ مقالہ لکھا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے دکنیات پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اگرچہ اُن کا زیادہ کام دکنیات پر ہے شمالی ہند کے ادب پر بھی اُن کی گہری نظر تھی جس کا اندازہ اُن کی کتاب "تذکرہ مخطوطات اُردو" سے ہوتا ہے جو کئی جلدوں میں ہے۔

ماضی کے ایک اور اہم محقق شیخ چاند تھے۔ جن کی شہرت اُن کے تحقیقی مقالے "سودا" کی وجہ سے ہے۔ مولوی عبدالحق کی "نصرتی" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس میں کسی شاعر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ بعد میں افراد پر جتنے بھی مقالے لکھے گئے، اُن کے سامنے کام کا نمونہ یہی کتاب رہی ہے۔ شیخ چاند نے قدیم شعرا پر بعض اچھے مقالے بھی لکھے ہیں۔

پرانے محققوں میں اور بھی کئی نام اہمیت رکھتے ہیں لیکن یہاں سب کا تذکرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اب آئیے موجودہ عہد کے محققوں کی طرف۔ ان میں سرِ فہرست مالک رام ہیں جنھوں نے ماہرِ غالبیات کی حیثیت سے بے مثال شہرت حاصل کی ہے غالب پر ان کا کام اتنا متنوع اور وقیع ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب خوش قسمت تھا کہ اُسے مالک رام جیسا محقق ملا۔ مالک رام نے دیگر موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے جس میں "تذکرۂ معاصرین" اپنی نوعیت کا ایک منفرد کارنامہ ہے اس کی چار یا پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اس میں اُن معاصر ادیبوں کے حالات ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ آج تو شاید اس کتاب کی اہمیت کو لوگ پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن آئندہ چل کر یہ ہمارے عہد کے ادیبوں کے بارے میں بنیادی ماخذ کی اہمیت اختیار کرے گی۔

مالک رام صاحب کے بعد کے محققوں کو اگر ہم گفتگو میں آسانی کی خاطر دو حصوں میں تقسیم کر لیں تو بہتر ہوگا پاکستانی محقق اور ہندوستانی محقق۔ پاکستان میں اس وقت بزرگ ترین محقق ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ہیں اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا بیشتر کام فارسی ادب اور تصوف سے متعلق ہے تاہم اُن کے اردو ادب سے متعلق بعض تحقیقی مقالے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی میرے نزدیک پاکستان میں اردو کے سب سے بڑے محقق ہیں ان کا کام مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے فارسی اور پنجابی ادب پر بھی کام کیا ہے

تاریخ برصغیر اور تحریک پاکستان پر بھی وقیع کتابیں لکھی ہیں، لیکن اُن کی اصل شناخت اردو ادب ہے ۔ انھوں نے قدیم ادب کی متعدد کتابیں مرتب کی ہیں ۔ بے شمار مقالے لکھے ہیں

میر حسن اور اُن کے خاندان پر مستقل کتاب لکھی ہے ۔

اردو کے ادبی مشاہیر پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ کتاب اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں میر حسن کے حوالے سے بے شمار ادبی شخصیات کے بارے میں تحقیقی مواد پیش کیا گیا ہے نیز لکھنوی ادب، معاشرت اور تاریخ کے بارے میں اس میں بہت کچھ ہے ۔ میر حسن اور ان کے اہل خاندان کے متعلق یہ کتاب درجۂ استناد رکھتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کتابیں مرتب کی ہیں ان میں دیوان جہاندار، مثنویات میر حسن اور مقدمہ شعر و شاعری (حالی) تدوین متن کے نہایت عمدہ نمونے ہیں ۔

کلب علی خاں فائق، افسر امروہوی اور سخاوت مرزا نے بھی کئی اچھے تحقیقی کام پیش کیے ہیں ۔ فائق نے مومن پر، افسر امروہوی نے انجمن ترقی اردو کے مخطوطات پر اور سخاوت مرزا نے دکنی ادب پر زندہ رہنے والا کام کیا ہے ۔ افسوس کہ سخاوت مرزا کے مقالات کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ۔ میرے اندازے کے مطابق انھوں نے ڈیڑھ سو سے زائد مقالے لکھے ہیں، اگر یہ کتابی صورت میں مرتب ہو جائیں تو دکنیات پر ان کے کام کو مولوی عبدالحق اور زور کے کام کے برابر رکھا جا سکتا ہے ۔

جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو بیک وقت تحقیقی و تنقیدی حیثیت رکھتی ہے ۔ اردو میں ادبی تاریخیں یوں تو بہت ہیں، لیکن صحیح معنوں میں ادبی تاریخ جمیل جالبی ہی نے لکھی ہے ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو کے اُن چند محققوں یا نقادوں میں سے ہیں جو تنقید و تحقیق دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں ۔ ان کی تحقیق تنقید سے توانائی حاصل کرتی ہے ۔ اردو میں اس قسم کے "نقاد محقق" یا "محقق نقاد" چند ہی ملتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر وحید قریشی اور مظفر علی سید ۔ جمیل جالبی نے چند متن بھی مرتب کیے ہیں جن میں مثنوی کدم راؤ پدم راؤ خاص اہمیت رکھتی ہے ۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر صدرالحق، ڈاکٹر سلطانہ بخش، خلیل الرحمن داؤدی اور ڈاکٹر معین الدین عقیل قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں ۔ ان سب کے کاموں کی تفصیل کو آئندہ کسی صحبت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں ورنہ یہ بات چیت بہت طویل ہو جائے گی ۔ ہاں دو جواں سال محققوں کا ذکر ضروری ہے ۔ ایک اکرام چغتائی اور دوسرے عارف نوشاہی ۔ ان دونوں کا کام اردو ادب تک محدود نہیں ہے ۔ عارف نوشاہی کا میدان فارسی ادب ہے اور اکرام چغتائی کا کام حلاج، البیرونی اور بعض مستشرقین کا احاطہ بھی کرتا ہے ۔ عارف نوشاہی نے اردو مخطوطات اور مخطوطات کی فہرستوں پر کام کیا ہے ۔ اکرام چغتائی نے بعض قدیم شاعروں اور شاہان اودھ کے کتب خانوں پر بہت اچھا کام کیا ہے ۔ بعض علمی و ادبی نوادر بھی انھوں نے تلاش کر کے شائع کرائے ہیں ۔

اب آئیے ہندوستان کی طرف پاکستان کے مقابلے پر وہاں تحقیقی کام زیادہ ہو رہا ہے اور محققوں کی تعداد بھی زیادہ ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں ایسی یونیورسٹیوں کی تعداد خاصی ہے جہاں اُردو کے شعبے ہیں اور ان شعبوں میں تحقیق کا کام ہوتا رہتا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تحقیق کرنے کی آسانیاں بہت ہیں ۔ ایسی کئی لائبریریاں ہیں جہاں مخطوطات و مطبوعات کے بڑے ذخیرے ہیں ۔ ہندوستان کے محققوں میں سرفہرست ڈاکٹر گیان چند ہیں میرے

نزدیک وہ اُردو کے اُن دو چار بڑے محققوں میں سے ہیں جنھوں نے بنیادی نوعیت کے کام کیے ہیں۔ داستانوں اور شمالی ہند کی مثنویوں پر اُن کے کام تحقیق و تنقید کے عمدہ نمونے ہیں۔ دیگر موضوعات پر بھی اُن کا کام اردو تحقیق میں اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین نے تذکروں کی تدوین کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں "گلشن ہند" از حیدری اور "تذکرۂ آزردہ" منحصر بفرد نسخوں سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ان پر ڈاکٹر مختار الدین نے مفصل حواشی لکھے ہیں۔ اُن سے پہلے تذکروں کو اس انداز سے مرتب نہیں کیا گیا۔

ہندوستان میں تدوینِ متن کے سلسلے میں خاصا کام ہوا ہے ڈاکٹر تنویر علوی نے ذوق اور شاہ نصیر کے کلام کو، ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے مصحفی و جرأت کے کلام کو، ڈاکٹر مسعود حسین خان نے قصۂ مہر افروز و دلبر کے علاوہ بعض دیگر متون کو، عبدالرزاق قریشی نے دیوانِ عدالت اور عزلت کی مثنوی راگ مالا کو بہت عمدگی سے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کا تذکروں پر، حسینی شاہد کا شاہ امین الدین اعلیٰ پر اور ڈاکٹر نیر مسعود کا رجب علی بیگ سرور پر ایسے کام ہیں کہ انھیں پی ایچ ڈی کے لئے لکھے جانے والے مقالوں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے لکھے جانے والے سیکڑوں مقالے اسی معیار کے ہوتے تو آج اردو تحقیق کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے سودا اور غالب پر جو کام کیے ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ خصوصاً حال ہی میں انھوں نے خطوط غالب کو مرتب کر کے تدوینِ متن کا نہایت عمدہ معیار پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں کئی ایسے محقق ہیں جن کا مجھے تفصیلی ذکر کرنا چاہیے مگر اس مختصر گفتگو میں ممکن نہیں، مثلاً رشید حسن خان، ڈاکٹر محمد انصار اللہ، نثار احمد فاروقی، عبدالستار دلوی، ڈاکٹر نذیر احمد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر محمود الہٰی، ڈاکٹر ابو محمد سحر، عابد رضا بیدار اکبر علی خاں عرشی زادہ، کاظم علی خاں، ڈاکٹر سلیمان حسین، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر حکم چند نیر اور بہت سے دوسرے۔ یہ نام وہ ہیں جو فوری طور پر ذہن میں آ گئے اور کسی خاص ترتیب کے بغیر۔

ہندوستان میں پچھلے دس پندرہ برسوں میں جن محققوں نے سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا ہے اُن میں ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری کالی داس گپتا رضا اور ڈاکٹر عابد پشاوری خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے مضامین کا انبار لگا دیا ہے، بہت سی نایاب کتابیں مرتب کی ہیں۔ کئی شاعروں کے حالات پر تحقیق کی ہے، خصوصاً دبستانِ لکھنؤ کے بہت سے نوادر اُن کی وجہ سے منظر عام پر آئے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا نے غالبیات پر اتنا کام کیا ہے کہ اس کی بنا پر اب اُن کا شمار ماہرینِ غالبیات میں ہوتا ہے۔ جکبست پر بھی ان کا کام بہت اچھا ہے۔ ڈاکٹر عابد پشاوری نے انشاء اللہ خاں انشا پر بہت عمدہ کام کیا ہے۔

سوال: خواجہ صاحب ادبی تحقیق کے دائرے میں کیا کیا کچھ آجاتا ہے تحقیق کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیے اور آپ کے نزدیک اس اہم فریضے کی بجا آوری اور تحقیق کا حق ادا کرنے کے لیے ایک محقق کے لئے کون سی شرائط اور معیار ضروری ہے۔

جواب: اگر آپ زبان اور ادب کا فرق ملحوظ رکھیں تو لسانی تحقیق ادبی تحقیق سے مختلف ہے۔ لغت، زبان و بیان، املا، قواعد اور لسانیات سے متعلق مباحث کو ادبی تحقیق میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ باقی جو کچھ ہے وہ ادبی تحقیق ہے۔ ادبی تاریخیں، صنف وار یا عہد وار یا علاقہ وار، مصنفین کے حالات زندگی اور قدیم متون کی تدوین ادبی تحقیق کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔

ادبی تحقیق کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہم ادب کو اس کے

زمانۂ تخلیق سے مربوط کر کے دیکھیں تاکہ ادب اور معاشرے کا باہمی تعلق واضح ہو سکے اور یہ معلوم ہو سکے کہ لکھنے والا اپنے عہد کی کس حد تک اور کس طرح نمائندگی کرتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بہت سے منجھی کام کرنے پڑتے ہیں۔ زمانہ قدیم کے اہم ادیبوں کے بارے میں معلومات مختلف ماخذ میں بکھری ہوئی ہیں، اُن کو یک جا کر کے ہر ادیب کی مکمل تصویر بنائی جائے۔ وہ تخلیقات جو قلمی صورت میں موجود ہیں انہیں مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق "دریافت" بھی ہے اور "بازیافت" بھی جہاں تک اُردو ادب کا معاملہ ہے ہمارے بڑے شاعروں میرؔ سوداؔ اور نظیرؔ وغیرہ کے کلام کے صحیح متون بھی ہمارے سامنے نہیں ہیں نقل در نقل ، کے عمل نے ان شاعروں کے کلام کو کسی حد تک مطابق اصل نہیں رہنے دیا۔ تحقیق کا یہ فرض ہے کہ وہ شاعروں کے کلام کو ان کی اصل صورت میں پیش کرے۔ اس وقت اردو ادب کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کلاسیکی ادب کو صحت کے ساتھ شائع کیا جائے غالب اور دو ایک دوسرے شاعروں کے علاوہ شاید ہی کسی کا کلام صحیح صورت میں ہمارے سامنے ہو۔ اردو کے سب سے بڑے شاعر میر ہی کی مثال لیجئے میر کے کلام کی طباعت اُن کی زندگی ہی میں شروع ہو گئی تھی اُن کی وفات کے ایک برس بعد یعنی ۱۸۱۱ء میں فورٹ ولیم کالج سے اُن کی کلیات کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن کمیاب ہے اور پھر اس میں میر کا سارا کلام بھی نہیں ہے۔ میر کی شہرت کا سارا دار و مدار نول کشوری ایڈیشنوں پر ہے۔ کلیات میر نول کشور پریس سے کئی مرتبہ چھپی ہے اس میں طرح طرح کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ بعض اشعار کی صورت ایسی مسخ ہوئی ہے کہ وہ اصل سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں بہت سے اشعار اس میں ایسے ہیں جو میر کے نہیں اور میر کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اس میں شامل نہیں۔

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ تحقیق کا حق ادا کرنے کے لئے ایک محقق کے لیے کیا شرائط ضروری ہیں تو اس سلسلے میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے لئے ایک خاص ذہنی مزاج کی ضرورت ہے۔ پرانی چیزوں کے انبار میں سے کام کی چیزیں ڈھونڈنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ محنت اور لگن کے ساتھ تنقیدی نظر کا ہونا بھی ضروری ہے اگر محقق تنقیدی نظر سے محروم ہو گا تو وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے گا کہ اسے کس موضوع پر کام کرنا چاہیئے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ محقق کا مطالعہ وسیع ہو، صرف ادب ہی کا نہیں، اُس ادب سے متعلق عہد کی سیاسی و معاشرتی تحریکوں اور اُس خطے کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے اردو ادب پر تحقیق کا مطلب یہ ہے کہ آپ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ سے پوری طرح واقف ہوں یہاں کی سیاسی تحریکوں اور معاشرتی ڈھانچوں سے آگاہ ہوں چونکہ ایک طویل عرصے تک اردو ادب فارسی ادب کے زیر اثر رہا ہے اس لیے فارسی زبان اور ادب سے آگاہی بھی ضروری ہے محقق ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پورا ادب اور اس ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی سرمایہ نظر میں ہو، ماخذ و منابع سے واقفیت ہو۔ صرف اردو کی حد تک نہیں، فارسی اور انگریزی ماخذ تک رسائی بھی ضروری ہے۔

سوال ۹۔ مختلف متون کی ترتیب، تدوین اور ایک سے زائد نسخوں کا موازنہ بھی تحقیق کی غرض و غایت رہا ہے ہمارے محققوں نے کس حد تک ماضی کے مصنفوں کے تحریر کردہ نسخوں کے موازنے اور مطالعے کا تحقیقی جائزہ لیا ہے قلمی مخطوطات کے مطالعے اور موازنے اور ان کو قارئین کے سامنے لانے کا جو فریضہ محققوں کو ادا کرنا چاہیئے کیا وہ یہ فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ ابھی اردو میں بے شمار مخطوطات موجود ہیں۔ ان کی ترتیب، تدوین، اور ایک سے زیادہ نسخوں کی صورت میں ان کا موازنہ و مطالعہ ضروری ہے۔ کیا جامعات اپنے ریسرچ سکالرز سے ان موضوعات پر کام نہیں کرا سکتیں۔

جواب ۔ تدوینِ متن کے سلسلے میں ہمارے ہاں بہت کم کام ہوا ہے، اور جو ہوا ہے اُس میں بھی معیاری اور مثالی کام کم ہے۔ مثلاً مولانا عرشی کے مرتبہ دیوانِ غالب اور حافظ محمود شیرانی کے مرتبہ تذکرہ مجموعۂ نغز جیسے کام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ تدوینِ متن کے لیے ضروری ہے کہ کسی مخطوطے کے تمام نسخے پیشِ نظر رکھے جائیں اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ کن کن نسخوں سے کام لیا جا سکتا ہے ہمارے ہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ صرف اُنھیں نسخوں کو سامنے رکھا جاتا ہے جو بہ سہولت مل جائیں۔ ہمارے ادب کا بڑا حصّہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام ادارے یا یونیورسٹیاں ہی کر سکتی ہیں۔ چونکہ یہ بہت ضروری کام ہے۔ اس لیے ہمیں اس طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔ سب سے پہلے اُن تصانیف کی فہرست بنائی چاہیے جن کی اشاعت ضروری ہے۔ پھر اُن کے تمام معلومہ مخطوطے یکجا کیے جائیں۔ اور پھر تدوین کا کام ایسے لوگوں کو سونپا جائے جو اس کا حق ادا کر سکیں۔ ہماری یونی ورسٹیوں میں عموماً بے کار موضوعات پر تحقیق ہوتی ہے۔ اگر یونیورسٹیاں تدوینِ متون کی طرف توجہ کریں تو اس سے اردو زبان و اردو ادب کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

سوال ۔ تحقیق کو براہِ راست ادب کے زمرے میں شامل کرنا چاہیے یا یہ ادب تک پہنچنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔

جواب ۔ اس سلسلے میں میری جو رائے ہے، اُس کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ تحقیق تخلیق کے دائرے میں نہیں آتی۔ یہ ادب کی تاریخ تک رسائی کا ایک وسیلہ ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے عام سماجی علوم ادب اور ادبی مسائل کی تفہیم کا وسیلہ ہوتے ہیں، اور اُن سے آگاہی کے بغیر ادبی مسائل سے آگاہی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جن معنوں میں سماجی علوم سے متعلق تحریریں ادب کا حصّہ نہیں اُن معنوں میں ادبی تحقیق بھی بذاتِ خود ادب نہیں ہے۔

سوال ۔ ہندوستان پاکستان کی مختلف جامعات کے شعبہ ہائے اردو میں جو تحقیقی کام ہوئے ہیں ان کی رفتار و معیار کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں۔

جواب ۔ یونیورسٹیوں میں اردو ادب کے حوالے سے جو تحقیقی کام ہوئے ہیں، اُن سے میں ہی کیا، خود یونیورسٹیوں والے بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ ایسے مقالے بہت کم لکھے گئے ہیں جن میں تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہو۔ بعض اچھے مقالوں کا ذکر آپ سے کر چکا ہوں دو چار اور ایسے ہوں گے جن کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا جا سکتا ہے مثلاً ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مقالے جو بالترتیب نذیر احمد، اکبر الہ آبادی اور اقبال پر لکھے گئے ہیں۔ ایسے معیاری چند اور مقالے بھی ہوں گے۔ باقی جو کچھ ہے اس کا بڑا حصّہ لائقِ تذکرہ بھی نہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستانی یونیورسٹیوں نے اب تک جن تحقیقی مقالوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے، اُن کی تعداد سوا سو کے قریب ہے۔ ان میں سے بمشکل ۱۳-۱۴ مقالے شائع ہوئے ہیں۔ باقی مقالے کیوں شائع نہیں ہوئے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خود مقالہ نگار انھیں اس لائق نہیں سمجھتے کہ شائع کرائیں۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ بات آئے، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ناشر انھیں چھاپنے پر آمادہ نہ ہو کیونکہ تحقیقی مقالے تجارتی نقطۂ نظر سے غیر مفید ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ چند سال پہلے انجمن ترقی اُردو نے پی ایچ ڈی کے مقالوں کی اشاعت کا ایک منصوبہ تیار کیا تھا۔ یونیورسٹیوں کو خط لکھے گئے لیکن کسی یونیورسٹی نے جواب نہ دیا انفرادی طور پر انجمن نے کچھ مقالے حاصل کیے جو شائع کیے گئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی تحقیق کا کیا فائدہ جو منظرِ عام پر نہ آئے۔

دراصل ان مقالوں کے ناقص ہونے کا خود یونیورسٹیوں کے ارباب اقتدار کو بھی علم ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اخبارات میں ایک مرتبہ یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ پنجاب یونیورسٹی نے ڈاکٹر زور پر ایک مقالے کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے منظور کیا ہے لیکن شرط یہ لگا دی ہے کہ یہ مقالہ شائع نہ کیا جائے۔

اس خرابی کے کئی سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ عام طور پر پی ایچ ڈی کا مقصد تحقیق کرنا نہیں ہے بلکہ اس ڈگری کے ذریعے مادی فوائد حاصل کرنا ہے اس لیے "محقق" سیدھا کام کر کے ڈگری حاصل کر لیتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہر ایم اے پاس کو پی ایچ ڈی میں داخلہ مل جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ داخلہ لینے والے میں تحقیق کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ آپ خود انصاف کیجیے کہ ایک شخص جس نے زندگی میں پانچ صفحے کا کوئی مضمون بھی نہ لکھا ہو وہ پانچ سو صفحے کا مقالہ کس طرح لکھ سکتا ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے جو اساتذہ ہیں ان میں سے بیشتر خود محتاج دعا ہیں۔ اس کے باوجود ایک ایک استاد کی نگرانی میں چار چار پانچ پانچ ریسرچ اسکالر کام کرتے ہیں۔ ایک نگراں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس موضوع پر خود بھی مطالعہ کرتا رہے جس پر اُس کا کوئی طالب علم تحقیق کر رہا ہے۔ لیکن ہمارے اساتذہ صرف اسی بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ ریسرچ اسکالر کا نام اُن کے نام سے وابستہ ہے۔ پی ایچ ڈی کے بعض غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں ایسے ایسے انکشافات نظر آتے ہیں کہ حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ مثلاً فکشن کے بارے میں ایک مقالہ ایسا بھی میں نے دیکھا ہے جس میں ایک طویل باب ڈرامے کے بارے میں ہے۔ ایک صاحب نے ایک مشہور شاعر کے دیوان کو نقل کیا پچاس صفحے بطور دیباچہ لکھے۔ اس نقل کے کام کے کام پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ ایسے مقالوں کا ادب کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ڈگری یافتہ کی تنخواہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور نگراں کی سالانہ رپورٹ میں درج ہو جاتا ہے کہ ایک عدد ریسرچ اسکالر نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اس خرابی کے سدباب کی صورت صرف یہ ہے کہ پی ایچ ڈی میں داخلہ صرف انھیں لوگوں کو دیا جائے جو تحقیق کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس کا ثبوت تحریری طور پر پیش کر سکتے ہوں۔ پی ایچ ڈی میں داخلے کے لیے یہ شرط ہونی چاہیے کہ امیدوار نے دس دس پندرہ پندرہ صفحات کے کم از کم ایک درجن مقالے لکھے ہوں اور انھیں معتبر علمی جرائد میں شائع کرایا ہو۔ مقالوں کی نگرانی پر صرف انہیں اساتذہ کو متعین کیا جائے جو تحقیق کا تجربہ رکھتے ہوں۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے جب کوئی مقالہ منظور کیا جائے تو اس کے ساتھ ہی اُسے شائع کرنے کی شرط لگائی جائے۔ یونیورسٹیوں کو خود یہ چاہیے کہ وہ اپنے تحقیقی مقالوں کو شائع کریں۔

تنقید و تحقیق کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک نقاد کے لیے محقق ہونا اور ایک محقق کے لیے نقاد ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی نقاد تحقیق سے دلچسپی نہیں رکھتا تو وہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ جس قدیم کتاب پر وہ لکھ رہا ہے اُس کا مستند متن اُس کے سامنے ہے یا نہیں؛ جس قدیم مصنف کے بارے میں وہ اظہارِ خیال کر رہا ہے اُس کا زمانہ اُسے معلوم ہے یا نہیں۔ اسی طرح ایک محقق کا نقاد ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تنقیدی بصیرت کے ذریعے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس موضوع پر وہ تحقیق کر رہا ہے اُس کا کوئی فائدہ ہے یا نہیں؛ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ بعض "محقق" ایسی کتابیں مرتب کرتے ہیں جن کی کوئی افادیت نہیں ہوتی ہر قدیم چیز اس لائق نہیں ہوتی کہ اُس پر تحقیق کی جائے۔ اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ آج کراچی میں ہزاروں شاعر

ہیں جن میں سے بیشتر ایسے ہیں کہ اُن کا ایک شعر بھی دامنِ کش دل نہیں ہوتا۔ کیا سو سال بعد یہ سب تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں، بالکل نہیں۔ اس کا فیصلہ وہ نقاد کرتا ہے جو ہر محقق کے اندر موجود ہونا چاہیے اور اگر کسی "محقق" کے اندر یہ نقاد موجود نہیں ہے تو اسے تحقیق کی بجائے کوئی اور کام کرنا چاہیے۔

سوال ۶ کرنے کے کام؟

جواب ۶: کرنے کے کام تو بہت سے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کرنے کے کام سبھی تو باقی ہیں، اب تک تو وہ کام ہوئے ہیں جو نہ کرنے کے تھے

تحقیق کے لیے سب سے پہلی ضرورت کتبِ حوالہ کی ہوتی ہے۔ اردو میں اس نوعیت کی کتابیں موجود نہیں ہیں۔ اردو میں صحیح خطوط پر تحقیقی کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم حوالے کی کتابیں تیار نہ کر لیں۔ ان کتابوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے محقق کا بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اُس کی حالت اُس پیاسے کی سی ہوتی ہے جسے ہر مرتبہ پانی پینے کے لئے ایک نیا کنواں کھودنا پڑے۔ جن کتبِ حوالہ کی فوری ضرورت ہے، وہ میرے نزدیک یہ ہیں۔

(۱) ادبی لغت۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دُنیا کی کئی زبانوں کے ادبیات کی الگ الگ لغات شائع ہو چکی ہیں، مثلاً
فرانسیسی اور انگریزی ادب وغیرہ کی لغات آپ نے دیکھی ہوں گی ان میں اہم ادیبوں، کتابوں، کرداروں وغیرہ کے متعلق مختصر معلومات دی جاتی ہیں۔ اس قسم کی لغت اردو میں بھی ہونی چاہیے تاکہ تحقیق کے دوران کسی کتاب یا مصنف کے بارے میں فوری طور پر معلومات حاصل کی جا سکیں اور محقق کو بہت سی کتابیں دیکھنے میں وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔

(۲) سوانحی لغت۔ اُردو کے آغاز سے لے کر اب تک کے تمام لکھنے والوں کے مختصر حالات پر مشتمل ایک ایسی سوانحی لغت تیار ہونی چاہیے جس میں مفصل کتابیات بھی ہو۔ یعنی ہر مصنف کے بارے میں بتایا جائے کہ اس کا ذکر کن کن مآخذ میں موجود ہے

(۳) اردو رسائل کا اشاریہ۔ اردو کے علمی و ادبی رسائل میں جس قدر بھی مضامین شائع ہوئے ہیں اُن کا موضوع وار اشاریہ بنانا چاہیے۔ کچھ رسائل کے الگ الگ اشاریے شائع ہوئے ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک مجموعی اشاریہ تیار کیا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ محقق اپنے موضوع سے متعلق مضامین کی تلاش آسانی سے کر سکے گا۔

(۴) اردو مخطوطات کی ایک جامع فہرست: اردو کے مخطوطات دُنیا بھر کے کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان مخطوطات کی ایک جامع فہرست تیار ہونی چاہیے تاکہ ایک نظر میں معلوم ہو سکے کہ کسی مخطوطے کے کتنے نسخے دستیاب ہیں اور وہ کہاں کہاں ہیں۔

مشرف احمد

# زبان و ادب کی تدریس کے مسائل

## ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفیؒ سے ایک گفتگو

سوال :۔ ڈاکٹر صاحب حسب دستور سب سے پہلے تو آپ اپنے حالات زندگی بیان فرمایئے

جواب :۔ چلئے حالات قیام پاکستان سے شروع کریں ہندوستان میں بظاہر کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ جس کی بنا پر پناہ گیر کے طور پر پاکستان آتا، سوائے اس کے کہ ایک خواب دیکھا تھا پاکستان ۔ اور اپنی ارض موعود میں کون رہنا نہیں چاہتا ۔ پھر حنین (حنین کاظمی) چلے آئے تھے ہمارے تعلقات ایسے تھے کہ الگ الگ رہنے کا تصور ہی نہیں آتا تھا ۔ ۱۹۴۸ء میں آ گیا ایس ایم کالج، اردو کالج اور اسلامیہ کالج میں پڑھا ۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کالج طالب علموں کو دیکھتے تھے کہ کس کی پوزیشن آ سکتی تھی ۔ اسلامیہ کالج میں اسٹوڈنٹ لکچرر ہوا ۔ اور باضابطہ یونیورسٹی نے پڑھانے کی اجازت دی تھی ۔ پڑھتا بھی تھا پڑھاتا بھی تھا ۔ ایسی شاید کوئی اور مثال نہیں ۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ہمایوں، ساقی، ادب لطیف، اردو اور ماہ نو میں خاصے مضامین شائع ہو چکے تھے ۔ شاہد بھائی (شاہد احمد دہلوی) ایک ادارہ تھے اور انہوں نے بہت ہمت افزائی کی ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک اسلامیہ کالج میں پڑھایا ۔ پھر اردو کالج چلا گیا ۔ ۱۹۵۹ء سے کراچی یونیورسٹی میں ہوں ۔ اپنے بارے میں بات کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے ۔ دگر ڈاکٹر صاحب بعض دفعہ یہ مجبوری ہو جاتی ہے ۔ اور اس وقت بھی یہی مرحلہ درپیش ہے ۔ (مشرف احمد) ۱۹۶۶ء سے ۶۸ تک امریکہ میں رہا ۔ کولمبیا یونیورسٹی سے ایم ۔ اے لسانیات کی سند لی ۔ پھر دو سال کے لئے پاکستان واپس آیا اور پی ایچ ڈی کی سند لی ۔ پھر جاپان چلا گیا ۔ اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک اوساکا یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف فارن اسٹڈیز میں اردو اور مطالعہ پاکستان کا پروفیسر رہا ۔

زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے اقتدار سے یا منصب سے طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں ۔ اس میں میرا کوئی دخل نہیں، اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ایسی طبیعت دی جو بنیادی مسائل پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا ۔ اس میں میری خاندانی روایات اور خانقاہی مزاج کا بھی دخل ہے آپ کو شاید معلوم ہو کہ حضرت ثاقب کانپوری مرحوم میرے والد تھے ۔ وہ بڑے شاعر تھے اور اس سے بھی بڑے انسان تھے مومن کی فنات میں آفاق کیسے گم ہوتے ہیں ۔ اس کی مثال ۔

سوال :- اکیڈمی آف لیٹرز سے بھی تو آپ نے استعفیٰ دے دیا تھا اور ابھی کراچی یونیورسٹی کے صدر شعبہ کے منصب سے بھی آپ نے علیحدگی اختیار کر لی۔

جواب :- جی ہاں اکادمی والی بات تو پرانی ہو گئی۔ وہ بھی ایک اصولی اختلاف تھا۔ حال میں شعبے میں ایک لیکچرار کا تقرر ہوا تو میں نے تکنیکی وجوہ پر اس تقرر کو رکوانے کی جگہ صدارت شعبہ سے استعفیٰ دے دیا۔ بعض صاحبان طنزاً کہتے ہیں کہ مجلسِ انتخاب کی کارروائی پر تو آپ نے دستخط کر دیئے۔ یہ ایک تکنیکی غلطی تھی۔ مگر میں نے دانستہ اپنے لئے یہ راہ عمل چن لی تھی۔ جلسے سے باہر آتے ہی استعفیٰ دے دیا۔ اس تقرر میں ملوث لوگوں سے میں وہی کہتا ہوں جو ابسن کے ڈرامہ سوسائٹی کے ستون کی ہیروئن نے ہیرو سے کہا تھا کہ کیا تم میں کوئی ایسا جذبہ نہیں کہ تمہیں جھوٹ کے زنداں سے نجات دلائے۔

سوال :- ڈاکٹر صاحب ہمارے ملک میں مختلف سطحوں پر زبان و ادب کی تعلیم دی جا رہی ہے ان کے درمیان کوئی ربط ہے یا نہیں ؟ ۔

جواب :- اس کا جواب نفی میں ہے اور میں آپ کی بات کو پھیلاتے ہوئے یہ کہوں گا کہ ابتدائی مدارس میں زبان کی تدریس کے لئے جو وقت دیا جاتا ہے وہ ناکافی ہے ہمارے بچے کتابوں کا بوجھ لے کر چلتے ہیں۔ اور مشہور فلم "ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم" یاد آنے لگتی ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم میں زبان کی کتاب کے ذریعے ہم تاریخ جغرافیہ، اخلاقیات اور ماحولیات کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ یوں نصاب اور کتابوں کا بوجھ کم ہو سکتا ہے۔ جیسے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اردو کتابوں میں زبان کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ، نباتیات اور حیوانات پر کافی اچھا مواد ہوتا تھا۔ اگر زبان یوں پڑھائی جائے تو پھر ریاضی کی کتاب درکار ہوگی۔ ہماری ایک اور مجبوری یہ ہے کہ ہم ایک مزید زبان پڑھاتے ہیں۔ آج کتابیں خوبصورت چھپ رہی ہیں لیکن ان کا معیار بہت پست ہے۔ زبان کی اغلاط بہت ہیں بچوں کے لئے ہمارے ہاں بہت نہیں لکھا گیا۔ بچوں کے لئے جو اچھی نظمیں لکھی گئیں وہ ہماری کتابوں میں نہیں۔ ہماری کتابوں کے مولف ادبی ماضی اور نصابی کتابوں کی روایت سے واقف نہیں ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کا نام مرتبین کے لئے قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ میرے خیال میں کلاسیکی ادب سے شناسائی مڈل اسکول میں ساتویں آٹھویں میں ہونی چاہیئے یہاں ہم زبان کی تبدیلیوں کے ساتھ کلاسیکی ادب سے بچوں کو روشناس کر سکتے ہیں۔

چارلس لیمب جیسے آدمی نے شکسپیئر کی کہانیاں بچوں کے لئے لکھیں "شکسپیئر ری ٹولڈ" (Re-told)

میری تجویز یہ ہے کہ اس (وسطانیہ) سطح پر درسی کتاب کے علاوہ سرسری مطالعے کے لئے اڑتالیس سے لے کر اسی صفحات تک کی کم سے کم چھ کتابیں شامل ہوں اور ان کتابوں سے بیس فیصد کے سوال پوچھے جائیں۔

میری بات اس سے واضح ہو جائے گی کہ باغ و بہار، الف لیلیٰ کی کہانیوں، نذیر احمد کے ناولوں کی تلخیص بچوں کے لئے کی جائے یہ چند نام مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں نویں اور دسویں جماعت سے ہمیں اصناف ادب سے موثر طور پر روشناس کرانا چاہیئے مثلاً

مثنوی، رباعی، افسانہ، ڈرامہ

میں نے غزل کا دانستہ یہاں ذکر نہیں کیا غزل کا آپ تعارف حالی کی بعض اخلاقی غزلوں سے کرا سکتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس سطح پر غزل کے موضوعات طالب علم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ادب محض تفہیم زبان کا مسئلہ نہیں۔ انسان کی زندگی کی تفہیم کا مسئلہ ہے اب وہ بچہ جس کا زندگی میں عشق کا تجربہ آیا ہی نہیں وہ ایسے شعر کیسے سمجھے گا۔

دل پُر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

اس میں کوئی لفظ مشکل نہیں ہے لیکن بچے کا اس تجربہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ہم غزل کو لے سکتے ہیں، فکری شاعری کو لے سکتے ہیں ہمارے ہاں بدقسمتی سے ہائی اسکول ہو یا انٹرمیڈیٹ وہی مصنف وہی اصناف، صرف انتخاب بدل جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی نظمیں، غزلیں اور نثر پارے بھی مشترک ہوتے ہیں۔ تو یوں سمجھئے کہ درسی کتابوں کی تیاری میں اکتالیس سال میں ہم نے کھویا ہے پایا نہیں۔ میں جب طالب علم تھا تو ہمیں میں سرسری مطالعہ کی کتاب افسانے کا مجموعہ تھی۔ پریم چند سے لے کر عصمت چغتائی تک سب ہی اس میں تھے۔ تو اب ہمارے ہاں یہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہونا یہ چاہیئے کہ ہائی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تدریسی کتابوں میں ایک ربط ہو۔ مثلاً بی اے کی سطح پر میں سمجھتا ہوں کہ شخصی خاکوں کا ایک انتخاب لازمی اُردو کورس میں ہونا چاہیئے کیونکہ اچھے آدمیوں کی زندگی اور کردار کی جھلکیاں اخلاقیات کا موثر ترین سبق بن سکتی ہیں۔ بی اے میں اختیاری اُردو میں ہم اردو میں پاکستانی نثر کا اور اردو پاکستانی نثر کا اور اُردو پاکستانی نظم کا ایک اچھا انتخاب دے سکتے ہیں ــــ پاکستان بننے سے کئی اصناف نے فروغ پایا ہے، جیسے مزاح، سفرنامہ، خاکہ نگاری اور انشائیہ بہت اچھی خود نوشتیں لکھی گئی ہیں اور ثقافت کے مسائل پر بھی کسی اور دور میں اتنا غور نہیں کیا گیا تھا۔ پاکستانی اردو نثر سے متعلق مجموعے میں ان ساری اصناف کا ایک چھوٹا سا انتخاب ہو سکتا ہے ادب کی تدریس کے مسائل سے پہلے یہ طے ہونا چاہیئے کہ ہمیں کیا پڑھانا ہے۔ پہلا اور سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہی ہے کہ کیا پڑھانا ہے۔

اب ایم اے کے نصاب کی طرف آجائیں۔ وہی ۲۵، ۳۰ سال پہلے کا نصاب جاری و ساری ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ طالب علموں کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ دوسرے خارجی امیدوار۔ میں نے اپنی صدارت کے دوران مجلس نصاب کو بارہا اس طرف متوجہ کیا۔ مجلس کے ارکان نے اتفاق تو کیا لیکن کام نہیں کیا بی اے اختیاری اور بی اے لازمی کے کورس پر کام ہو گیا لیکن بوجوہ وہ کتابیں ابھی نہیں چھپیں۔

ایم۔ اے میں خارجی یا بیرونی طلبہ کا تو وہی کورس چل رہا ہے لیکن یونیورسٹی کے باضابطہ طلباء کے نصاب میں میں نے اپنے دور میں تبدیلیاں کرائیں پہلی بات تو یہ کہ اختیاری کورس شروع ہوئے۔ مثلاً پہلے سرسید کا مطالعہ ہوتا تھا۔ ہم نے یہ کیا کہ لڑکا اپنے مزاج کے مطابق سرسید، میر، غالب، اقبال میں سے کسی ایک کا مطالعہ کرے اسی طرح ایسے نئے کورس ہم نے کرائے جیسے "ادب کا دوسرے

علوم سے تعلق" یا "پاکستان میں ادب کے مسائل"
یہ سب اختیاری ہیں، اسی طرح کراچی یونیورسٹی نے زندہ
لوگوں کی طرف سب سے پہلے توجہ دی۔ بی اے اور ایم اے
کی حد تک۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب اب مسئلہ یہ آتا ہے کہ کیا ڈگری کالجوں اور
جامعہ میں ادب کی تدریس کے طریقے سے آپ متفق ہیں
اور کیا وجہ ہے کہ لوگوں کا ادبی ذوق، ان کا لکھنا پڑھنا
یا زبان سے ان کی شناسائی اتنی کمزور ہے آج معاشرہ
میں کتنے لوگ ہیں جو زبان کو مؤثر طریقے سے استعمال
کر رہے ہیں آخر یہ کیوں؟

جواب۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال ہے اور اس کی وجہ یہ ہے
کہ کثیر اللسانی معاشرے میں زبان کی تحصیل اور تدریس
کے مسائل مختلف ہوتے ہیں، ہم نے ایک اردو ماحول میں
پرورش پائی۔ زبان اور شعر و ادب کا ماحول اسکول ہی سے
نہیں گھر سے بھی ملا۔ پاکستان میں صورتحال کچھ مختلف
ہے اب زبان کی تدریس کے طریقے انقلابی تبدیلی چاہتے
ہیں۔ نصاب کے بارے میں میں نے جو کچھ کہا اس پر آپ
نے غور کیا ہوگا کہ میں نے ابتدائی یعنی پرائمری تعلیم میں
زبان کی تدریس اور اس کے موضوعات کی توسیع کی طرف توجہ
مبذول کرائی ہے۔ زبان دراصل ایک بہتر معاشرے کی تعمیر
میں فرد کے کردار کو بھی متعین کرتی ہے۔ مثلاً ہمیں اپنے
بچے کو ابتدائی مدارس میں یہ سکھانا چاہیے کہ ٹیلی فون پر
گفتگو کیسے کرے۔ چاہے اصلی ٹیلی فون نہ ہو۔ کھلونا ٹیلی
فون استعمال کئے جاسکتے ہیں یوں طالب علم کو سکھایا جائے کہ
جو بات کرنی ہو تین منٹ کے اندر کیسے اختصار سے کی جاتی
ہے پہلے اسکول میں بچوں کے جلسے ہوتے تھے۔ صدر
بھی بچہ، معلن بھی بچہ، مضامین بچے پڑھتے تھے اساتذہ
سنتے تھے اور مشورے دیتے تھے۔ ہر کلاس کے قلمی اخبار
نکلتے تھے آج بھی یہ عمل لازم ہے۔ بچے ہی سب کچھ نہیں
کرلیں گے۔ ان کے مضامین کی اصلاح کیجئے پانچویں جماعت
سے ہر کلاس کا ماہانہ آٹھ صفحے کا اسکول میگزین لکھا جانا
چاہیئے۔ ہمیں اپنے بچپن میں کلاس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے
میگزین کی یاد آتی ہے اس کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ یہ طریقہ
اب اگر ہم لے آئیں تو بچوں کا تخلیقی جوہر ابھرے گا۔
اردو کے اساتذہ اگر دلچسپی لیں تو ان تحریروں میں سے
بہتر تحریریں منتخب کرکے بچوں کے رسالوں کو بھیجی
جاسکتی ہیں۔ اس سے بچوں کا معاشرے سے رشتہ قائم
ہو جاتا ہے گا۔ اسی طرح میگزین کے علاوہ اساتذہ اور
بچوں کے اشتراک سے کتابوں کی اشاعت بھی ممکن ہے
مثلاً مینوالا گرلز اسکول کراچی نے بچوں کی تین کتابیں
شائع کی ہیں۔ بچوں نے اپنے بزرگوں سے، نانیوں
دادیوں سے پاکستان بننے کی جو کہانیاں سنی تھیں انہوں
نے اپنے طور پر وہ کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کے بعد اساتذہ
اور طالبات دونوں کی کہانیوں پر مشتمل دو کتابیں اور چھپیں۔
آج اساتذہ میں مطالعے کا کوئی ذوق نہیں۔ اسکول
سے لے کر یونیورسٹی تک جو پڑھتے ہیں یا لکھتے بھی ہیں
مجبوراً مثلاً یونیورسٹی کے اساتذہ مضامین اس لئے
لکھتے ہیں کہ وہ اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر
اور پروفیسر بن سکیں۔ لیکن لکھنے کے عمل میں ان
کے لئے کوئی لذت نہیں ہے۔ سب کچھ فائلوں کی

خانہ پُری کے لئے کیا جا رہا ہے۔ پھر اساتذہ کے اپنے تلفظ اور متن پڑھانے کا مسئلہ ہے۔ ایم۔ اے کی سطح پر متن تو بالکل ثانوی بن گیا ہے۔ زیادہ تر تنقیدی سوالات کئے جاتے ہیں۔ یہی نتیجہ ہے کہ میر و غالب پر تنقید تو ہو رہی ہے لیکن ان کے اشعار کا مطلب نہیں لکھ سکتے۔ متن کے مطالعے اور اس کی تدریس پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ ادب میں جو استعارے آتے ہیں۔ تلمیحات آتی ہیں ان کے پس منظر سے اساتذہ بھی پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ ضروری ہے کہ مختلف سطحوں پر اساتذہ کے ریفریشر کورس ہوں۔ جن میں تدریسی پہلوؤں سے انہیں روشناس کرایا جائے۔ انجمن اساتذۂ اردو قائم کی گئی تھی، افسوس یہ کہ ہم نے شروع میں تو بہت زیادہ معرکے کے جلسے کئے جن میں مجنوں صاحب لیث صاحب جیسے لوگوں نے بہت اچھی اور مفید تقریریں کیں لیکن پھر دیار رزق کو چاٹنے والے اساتذہ کو اس کی فرصت نہیں ملی۔ ان کو مورد الزام بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ایک بڑا نثری سا شعر ہے عارف جلالی کا اور جو مجھے بہت زیادہ پسند ہے ہماری زندگی کی صورت حال اسی پیرایۂ بیان میں ہی ادا کی جا سکتی ہے ؎

وہاں خاک عہد وفا نبھے وہاں خاک دل کا کنول کھلے
جہاں زندگی کی ضرورتوں کا بھی حسرتوں میں شمار ہے

اب تنائج لتنے بھیانک ہیں کہ ایک دفعہ اچانک میں نے ایم اے پریویس کے طلبا سے پوچھا کہ ردیف اور قافیہ کیا ہے۔ تو آپ یقین جانیئے کہ پچاس میں سے صرف دو طلبا جانتے تھے۔ اس دن مجھے یہ احساس ہوا کہ زندگی کے چالیس، بیالیس سال یوں ہی ضائع ہو گئے جب کہ قیام پاکستان سے پہلے ہر مہذب آدمی جس نے اردو ادب باضابطہ پڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو یہ باتیں جانتا تھا۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اساتذہ کو خود ذوق و شوق نہیں، اور دوسرے یہ کہ نصاب کے ایک مرحلے کا دوسرے مرحلے سے کوئی تعلق نہیں۔

سوال۔ آج کالج میں اور جامعات میں اردو ادب کی تدریس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور اردو لازمی کیوں ہے سائنس والوں کے لئے بھی اردو لازمی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سائنس کے طلبا کے لئے اردو پڑھنا کیوں ضروری ہے؟

جواب۔ اصل میں سائنس کے ذریعے انسان نے کائنات کو مسخر کیا ہے اور بشری علوم اور ادب کے ذریعے وہ اپنی کائنات کو سمجھ سکتا اور خود غرضیوں اور شہوات (یہاں یہ لفظ میں عربی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) پر قابو پا سکتا ہے۔ اپنی تہذیب کر سکتا ہے اور یہ تہذیب بعض بشری علوم اور ادب ہی کے ذریعے ممکن ہے اپنی معرفت اور اپنے آپ کو جاننا انسان کے لئے ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے لئے اور کائنات کیلئے خطرہ نہ بن سکے۔ جب کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ خلا تک پہنچ گیا ہے، آپ دیکھئے کہ مغرب کی سائنس کی یونیورسٹیوں میں بھی ادب کی تعلیم وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔ مغرب کا سب سے بڑا ماہر لسانیات چومسکی کسی عام یونیورسٹی میں نہیں بلکہ ایم۔ آئی۔ ٹی میں ہے۔

کامرس میں بی کام میں اردو شامل نہیں ہے وہاں بھی

شامل ہونی چاہیئے۔ اس سوال کے جواب کا پہلو یہ بھی ہے کہ بہر حال ہر فرد خواہ اس کا پیشہ کچھ بھی ہو معاشرے کا رکن ہوتا ہے اور معاشرے میں ارتباط اور باہمی ربط کا سب سے موثر وسیلہ زبان ہے۔ تو کالجوں میں یہی آگہی اور ربط، ادب کی تعلیم کا سبب ہے۔ یہی اس کا مقصد بھی ہے اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ ہے تحقیق۔ تو یہاں تحقیق اور تدریس ادب کے دو مقاصد ہیں۔ ادب کا جو طالبعلم ہوگا وہ ایک مہذب اور ایسا تہذیب یافتہ فرد ہوگا جو اپنی تاریخ سے واقف ہوگا، حال کے چیلنجوں کو سمجھتا ہوگا، مستقبل پر نظر ہوگی۔

آج ہم ایک صدی سے دوسری صدی میں داخل ہو رہے ہیں جتنے بڑے چیلنج سامنے آ رہے ہیں ان کو حل کرنے کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ ادب کی بھی ضرورت پڑے گی تاکہ دنیا ایک زیادہ محفوظ جگہ بن سکے آنے والی نسلوں کے لئے۔

سوال۔ جو تحقیق ہو رہی ہے اور جس انداز سے ہماری درسگاہوں میں تدریس ہو رہی ہے اس سے یہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جو آپ نے ابھی بتائے ہیں؟

جواب۔ میرا جواب نفی میں ہے۔ ایک لگے بندھے طور پر اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں بہت سے اساتذہ کو آپ دیکھیں گے ان کے ہاتھوں میں اپنے زمانۂ طالب علمی کی نوٹ بکیں ہیں۔ علم کو تازہ کرنے کی طرف توجہ نہیں۔ کیا نئی کتابیں نہیں آ رہی ہیں؟ اور اساتذہ مل کر کوئی ایسا اجتماع نہیں کرتے جس میں تدریس کے مسائل پر غور کریں۔ تجربہ کار اساتذہ کسی سبق یا کسی موضوع کی تدریس کا عملی مظاہرہ کریں۔ پھر متن پڑھانے کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ باغ و بہار، فسانۂ عجائب وغیرہ پڑھنے کے بجائے تنقید پڑھ لی۔ تو اب انہیں کیا معلوم کہ اٹھارویں صدی اور انیسوی صدی کا طرز فکر کیا تھا زندگی کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ بیشتر نقاد پلاٹ پر، کہانی پر، کردار پر زور دیتے ہیں تو یوں ادب کی تدریس کا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا۔ کسی معاشرے کو تاریخ کے ذریعے یا کسی اور بشری علم کے ذریعے اس طرح نہیں سمجھا جاتا جیسے ادب کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ادب میں تو کسی عہد اور اس کے مسائل کے ساتھ ساتھ اس عہد کا سانس لیتا انسان بھی ہوتا ہے مثلاً پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو نہری پانی کا معاہدہ ہے وہ ایسی انسانی قدر و قیمت نہیں رکھتا جو منٹو کا افسانہ یزید رکھتا ہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر جو بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں انسانوں کے مسائل خطوطِ غالب یا فغانِ دہلی کی طرح نہیں ملتے۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے تدریس کے طریقوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ریفریشر کورس ہو۔ بلکہ پاکستان کی سطح پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کی ایک انجمن ہونا چاہیئے، جیسی ہندوستان میں ہے اور یہ انجمن تنظیمی مسائل کے ساتھ ساتھ تدریس کے مسائل پر غور و فکر کرے۔ ہندوستان اور ان ملکوں سے رابطہ قائم کرے۔ جہاں اردو پڑھائی جا رہی ہے غیر ملکی طلبہ کے لئے ہم نے اردو میں درسی کتابیں تیار نہیں کیں امریکہ اور کینیڈا میں ہی ایسی کتابیں چھپیں۔ بارکر صاحب، چودھری نعیم۔ انگلستان میں بھی کام ہوا ہے حالانکہ یہ تو ہمارے کرنے کا کام تھا ہم نے کراچی یونیورسٹی

میں کامیابی کے ساتھ غیر ملکیوں کو اردو پڑھائی لیکن جو مواد استعمال کیا اسے کتابی شکل میں پیش نہیں کر سکے اور اس کا سبب ظاہر ہے اس میں کوئی تجارتی منافع نہیں۔ جامعہ کراچی یا پاکستان کی کسی اور جامعہ میں کتابوں کی اشاعت کو اب تک منظم طور پر نہیں کیا گیا مختلف سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کام کر سکتے تھے۔ ان کے ذریعے جب بھی کام کرانے کی کوشش کی گئی تو اس میں ناکامی ہوئی۔

سوال :- جواب تو آپ نے تفصیلی طور پر دے دیا لیکن تحقیق کی بات رہ گئی کہ پاکستانی جامعات میں تحقیق کی صورت حال ادب اردو میں کیا ہے۔ بھارت سے اس صورت حال کا کیسے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ بھارت کے نام کے ساتھ ہی ایک اور بات ذہن میں آتی ہے وہاں زندہ ادیبوں، شاعروں پر پی ایچ ڈی کا کام ہو رہا ہے۔ اس میں بہت پھیلاؤ ہے۔ پاکستان کی جامعات میں زندہ لوگوں پر کام کرنے کی اجازت کیوں نہیں ملتی ؟

جواب :- جب آپ کہتے ہیں جامعات میں تحقیق کا کام۔ اس سے میرے ذہن میں دو باتیں آتی ہیں۔ اساتذہ کیا کام کر رہے ہیں اور کیا کام کرا رہے ہیں۔ عام طور پر اساتذہ کا معاملہ یہ ہے کہ پی ایچ ڈی کے لئے برا بھلا مقالہ لکھ لیا۔ مشکل سے پانچ فیصد اساتذہ لگن سے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ باقی کے لئے تحقیق میں خود کوئی نشاط اور سرور نہیں۔ اس کا مسئلہ گریڈ اور ترقی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں اس لئے کہ ایسوسی ایٹ اور پروفیسر وغیرہ بن جائیں اور ان مضامین کے لئے ادبی معیار یا رسائل کی قید کا بھی بسا اوقات احترام نہیں کیا جاتا۔ اپنی ہر تحریر کو تحقیق کہنے پر اصرار ہوتا ہے جو ظاہر ہے درست نہیں۔ ترقی، منصب کے لئے درخواست دینے والے اخبارات کے مضامین بھی شامل کر لیتے ہیں۔

آج ہمیں اپنی جامعات میں کوئی حافظ محمود شیرانی نظر نہیں آتا۔ کہنے کو تو وہ آخری وقت تک لیکچرر رہے لیکن کم ہی پروفیسر ایسے ہوں گے جو ان کے گھٹنے تک پہنچ سکیں۔ یہ تو بڑی مثال ہے آج کوئی ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ان میں نظر نہیں آتا کہ ان میں کام کرنے کی ایسی ہی لگن ہو۔ مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ جامعات سے باہر جن افراد نے کام کیا ہے وہ ان سے زیادہ موقر ہے۔ اب رہا جو کام کرایا جا رہا ہے تو اب پی ایچ ڈی کرنے کا بہت رجحان ہے اور شاید یہ کوئی بے رحمی نہ ہو جو میں کہوں کہ اس کا سب سے قوی سبب تنخواہ میں پندرہ سو روپے ماہانہ کا اضافہ ہے۔

بعض لوگ تو بعض اپنے دوستوں کی مدد سے مقالہ مرتب کر لیتے ہیں اور اس کا اندازہ زبانی امتحان کے وقت ہوتا ہے۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے مقالے میں کیا لکھا ہوا ہے۔ یہ صورت حال مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی ایک اچھے علمی و تحقیقی معیار کو باقی رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اب رہی بات ہندوستان کی۔ وہاں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامعات پی ایچ ڈی کرنے کے کارخانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اردو کی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ پی ایچ ڈی کر کے اپنے اپنے علاقوں میں استاد

ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی کم و بیش ساٹھ یونیورسٹیوں اور ان سے متعلق کالجوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کا سبب بغیر کسی تعصب کے یہ ہے کہ ہندوستان کو دنیا کے سامنے اپنا ایک سیکولر چہرہ پیش کرنا ہے اور ہندوستان میں اردو کے فروغ کا سبب بھی قیام پاکستان ہے۔ ہندو سیاست میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ وہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو احساس زیاں دلانا چاہتا ہے کہ تم کہتے ہو تم نے اپنے کلچر کے تحفظ کے لئے پاکستان قائم کیا۔ اب دیکھو کہ ہم ہندوستان میں اردو کی ترقی کے لئے کیا کر رہے ہیں بہت ساری اردو اکیڈیمیاں اردو حلقوں کے لئے ایک رشوت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ ادیبوں کو کتابیں چھاپنے کے لئے رقم دیتی ہیں۔ میری بات بے وزن اور بے دلیل نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ویسے ہی ہے جیسے آپ آرائشی پودا لگا دیں جس کو بار بار دھوپ میں نکال لیں مگر جڑیں نہیں ہیں۔ کوئی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک ملازمت اور روزگار سے اس کا رشتہ نہ ہو۔ اردو کے اس حق سے اس کو وہاں محروم رکھا گیا ہے۔ مصنف اپنی کتاب چھاپ کر اپنے پاس رکھتا ہے۔ پڑھنے والے نہیں ہیں۔ یوپی میں اور دہلی میں بھی اردو کو دوسری زبان نہیں بنایا گیا۔

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر آپ سے پھر کسی وقت گفتگو کریں گے۔ براہ کرم اب ہندوستان میں تحقیق کے موضوع پر آجائیں؟

جواب:۔ ہندوستان میں پی ایچ ڈی کے لئے ہر آدمی پر تحقیق ہو رہی ہے۔ ایسے لوگ جن کا بلند قد و قامت نہیں ہے ان پر بھی پی ایچ ڈی ہوئی ہے۔ دوسرے درجے کے لکھنے والوں پر کام ہو رہا ہے، جن کا کوئی ادبی مستقبل نہیں ہے۔ زندہ آدمیوں پر اعلیٰ درجے کا تنقیدی مضمون تو لکھا جا سکتا ہے لیکن تحقیق شاید ممکن نہیں۔ مثلاً ان کو دیکھنے کے لئے وقت کا تناظر درکار ہے وہ شاید ابھی نہیں۔ ایک دوری چاہیے، وقت چاہیے۔ جیسے پورٹریٹ کو دیکھنے کے لئے۔ دور ہٹ کر جب صحیح مقام تناظر سے آپ دیکھتے ہیں تو تصویر نظر آتی ہے۔

ایک اور قباحت، زندہ آدمی کو جب آپ لکھتے ہیں تو گویا طے کر لیتے ہیں کہ اب اس کا کام مکمل ہو چکا ہے اور اب اس کے ارتقا کی کوئی گنجائش نہیں ہے یا آپ سمجھتے ہیں کہ اب اس کا تنزل شروع ہو گیا۔ اور اب اس کام میں تعین بیشتر ادبی شخصیتوں کی حد تک نہیں ہو سکتا کہ ان کے کیا ادبی اثرات مرتب ہوں گے۔ میری دانست میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن پر ان کی زندگی میں بھی لکھا جا سکتا ہے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے، ٹھہر جاتے ہیں۔ یا ان کے اثرات ان کی زندگی میں ہی مرتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاعری میں میرے ذہن میں جو نام آتے ہیں۔ جوش، راشد اور فیض، افسانہ نگاروں میں کرشن، عصمت، منٹو، اور بیدی ان پر فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔

قرۃ العین حیدر کے سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں وہ خاتون اپنا معیار آپ ہیں۔ اس اعتبار سے آگ کا دریا کے بعد ان کے حوالے سے اردو ناول پر پی ایچ ڈی کا کام ہو سکتا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قرۃ العین حیدر پر اب بھی پی ایچ ڈی کا کام اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ان کا نقطۂ عروج ابھی نہیں آیا۔ وہ اپنے آپ کو دہراتی نہیں۔ ان کا ہر ناول ایک الگ دنیا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخر شب

کے ہم سفر" ۔ "آگ کا دریا" سے زیادہ مشکل ، اہم اور مکمل ناول ہے اور اس میں آزادی سے کچھ پہلے کے حالات کو کئی کرداروں کی مدد سے سمجھا گیا ہے اور مصنفہ کی غیر جانبداری کی انتہا ہے کہ ہم انگریز آئی سی ایس اور ہندوستان کے اینگلو انڈین کرداروں کے کرب کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

اب ہم پھر واپس آتے ہیں۔ ہندوستان میں پی ایچ ڈی کے معیار پر، تو ہندوستان میں تو عالم یہ ہے کہ دو صاحبان نے داغ اور امیر مینائی پر جو مقالے لکھے ہیں، ان میں سے ایک مقالہ یقیناً دوسرے مقالے کی نقل ہے۔ نام بدل دیا ہے، اشعار بدل دیئے ہیں۔ پہلا باب بدل دیا ہے۔ باقی ساری تنقید وہی ہے اور ستم یہ ہے کہ ان دونوں مقالوں کے ممتحن مشترک تھے، یعنی ایک ہی تھے۔

سوال :۔ ادبی شخصیتوں پر پی ایچ ڈی کا کام ہو رہا ہے ؟

جواب :۔ ادبی شخصیتوں پر ہمارے ہاں ایک ادبی تحقیق کا سانچہ بن گیا ہے کہ ادبی شخصیتوں پر کام ہو رہا ہے حالانکہ جب برصغیر میں تحقیق کا آغاز ہوا تو اداروں، تحریکوں اور دوسرے بڑے موضوعات پر نظر تھی۔ مثلاً پہلے جو تین مقالات لکھے گئے۔ ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ان کے مقالے پہلے مقالے تھے۔ میں سمجھتا ہوں آج یہ صاحبان اپنے مقالے کے موضوعات منتخب کرتے تو شاید مختصر موضوعات پر لکھتے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے مسائل، ادوار اور تحریکوں پر توجہ دینی چاہیئے اور ان معاشرتی مسائل پر جو ادب کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔ ایسے موضوعات ہوں جن میں کوئی پرابلم ہو، کوئی مسئلہ، اگر کسی دور پر لکھ رہے ہوں تو وہ بہت وسیع نہ ہو۔ مثلاً جدید اردو غزل پر کئی مقالے لکھے گئے جن میں کم و بیش وہی شاعر ہیں۔ لیکن یہ کہ جدید اردو غزل کیسے وجود میں آئی، اس کے عوامل کیا ہیں اس پر کسی نے بھی وہ توجہ نہیں دی جو دینی چاہیئے تھی۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ رجحان کچھ بدلے۔ چنانچہ ایک امیدوار سے میں نے پاکستانی شاعری میں پاکستانی قومیت کے اظہار پر کام کرایا۔ ایک خاتون افسانے میں شہر اور دیہات کی کشمکش پر کام کر رہی ہیں یا مثلاً اردو افسانوی ادب کے حوالے سے پاکستانی قومیت کا ایک خاتون جائزہ لے رہی ہیں اور اس میں اس مخالف نقطۂ نظر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو ہندوستانی ادیبوں کی تحریروں میں ملتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کو ایک مزاح نگار کے طور پر پڑھتے ہیں لیکن ان کے ہاں عورت کی مظلومیت کا جو احساس ہے اس کی مدد سے ان کے عہد کی متوسط مسلمان عورت کے عمرانی مطالعے پر لکھا جا سکتا ہے یا عصمت کو بھی شامل کریں کہ ان کے ہاں یہ مسائل کیوں آئے ؟

کراچی یونیورسٹی میں اب افراد کے مطالعے کی حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک مجموعی طور پر یہ رویہ درست ہے۔ لیکن بہرحال ہر دور میں ایسے ادیب موجود ہیں جن پر تنقیدی یا تحقیقی ویسا کام نہیں ہوا جیسا ہونا چاہیئے۔ مثلاً قائم پر، یا مصحفی پر یا آتش پر، اتنی کتابوں کی موجودگی کے باوجود وہ کام نہیں ہوا جو ہونا چاہیئے۔ تو یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ادوار کا مطالعہ ہونا چاہیئے کہ مختلف ادوار میں صف اوّل اور صف دوم کے ادیبوں کی خصوصیات کیا ہیں جس سے وہ دور سمجھ میں

آئے۔ مثلاً آپ ہی سے میں میر ناصر علی پر جو کام کر رہا ہوں کہ اس کا جو خاکہ پہلے میرے یا آپ کے ذہن میں تھا اب وہ کام پہلے سے مختلف ہے۔ وہ میر ناصر کا بھی مطالعہ ہے۔ اردو انشائیے کا بھی مطالعہ ہے۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید بھی اس میں ہے اور تحریکوں کا مطالعہ بھی ہے۔ ہمارے جو مقالے لکھے جا رہے ہیں تو ان میں قدر و قیمت کا تعین نہیں ملتا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔

سوال :۔ ڈاکٹر صاحب یہ تو ایک بڑی تشویشناک صورت حال ہے جس کا اظہار آپ نے فرمایا اور اس میں ہمارے لئے ایک انتباہ بھی ہے اس کو کیسے بدلا جا سکتا ہے۔

جواب :۔ ابھی جو آپ نے کہا کہ بھیانک ہے تو بس یہ باید کرد اس کو بدلنے کے لئے اب تک جو باتیں ہوئیں ان میں بھی اس کا جواب مضمر ہے۔ لڑکے میں کوئی ادبی ذوق نہیں ہوتا۔ معلومات لبوجھ کی طرح جمع کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایم اے کی سطح پر اس کا اہتمام کیا جائے کہ بڑے ادیبوں یا رجحانات کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے انہیں آگاہ کر دیا جائے۔ کیونکہ تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ کس موضوع پر تحقیق ہو۔ طلبا کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کسی ایسے آدمی کا داخلہ ہی نہیں ہونا چاہیئے جو خود موضوع کا تعین نہ کرے۔ آپ کے زمانے میں تو نہ تھا، مگر اب کچھ اختیاری کورس ہیں ایم اے کی سطح پر۔ ان کورسز سے یہ فائدہ ہے کہ طالب علموں کی تعداد کورسوں میں کم ہو جاتی ہے اور استاد اچھے طلباء کو آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ ٹیوٹوریل کا اچھا انتظام ہو۔ ٹیوٹوریل کا مغربی جامعات میں اور ہماری جامعات میں بھی یہی تصور تھا کہ کسی کتاب پر یا مضمون پر طالب علم تنقیدی مقالہ لکھتا تھا۔ پھر اس پر استاد اور طلبا کے درمیان بحث ہوتی تھی۔ آج کے طالب علم کو ٹیوٹوریل کا صحیح اندازہ نہیں۔ اگر ٹیوٹوریل کا وہ طریقہ مروج ہو جائے جو یونیورسٹی میں ہونا چاہیئے تو طالب علم کے مزاج کا اندازہ ہو جائے گا۔

دوسری بات میرے خیال میں ایم فل کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ اسے ایک سال یا ڈیڑھ سال میں مکمل کر لیا جائے۔ طالب علم کو موقع دیا جائے کہ ایم فل کو زیادہ سے زیادہ دو سال تک کر لے۔ ایم فل میں کچھ کورسز ہوں جیسے منہاجیات تحقیق، لائبریری کا استعمال، مخطوطہ شناسی، اشاریہ سازی، کتابیات، تھوڑی سی منطق اور تنقیدی فکر (CRITICAL THINKING)۔ کو ایک مضمون کی طرح پڑھایا جا سکتا ہے۔ انہی کورسز کے ساتھ ساتھ ایک متعلقہ زبان کی باضابطہ تعلیم اس سطح پر ہو کہ آدمی اسے علمی مقاصد کے لئے استعمال کر سکے۔ مثلاً اردو تحقیق کے سلسلے میں لبا اوقات عربی و فارسی یا ہندی میں سے کسی ایک زبان کا ایسا علم ضروری ہوتا ہے۔ ممکن ہے علاقائی زبان کی تعلیم کی ضرورت ہو جیسے پنجابی یا سندھی اور اردو صوفیانہ شاعری کے مشترک عناصر اور اسالیب پر کام ہو سکتا ہے۔ ایم فل میں طالب علم کے لئے ایک مختصر مقالہ لکھنا لازم ہو اور ایم فل کرنے کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ دیا جائے۔ ایم فل کے مقالے کی توسیع کی جگہ نئے موضوع پر کام کرنا لازم ہو۔

یہ وہ تدابیر ہیں جن سے میرے خیال میں صورتحال بدل سکتی ہے۔

مشرف احمد

# بچّوں کا ادب

## حسن عابدی
## سے ایک گفتگو

(۱) عابدی صاحب سب سے پہلے تو آپ اپنے حالاتِ زندگی بیان فرمائیں۔ ادب اور شاعری کی جانب آپ نے کب رجوع کیا؟

(۲) آپ ایک طویل عرصے سے شاعری بھی کر رہے ہیں۔ صحافت سے بھی آپ کا دیرینہ تعلق ہے۔ بچوں کے لئے بھی آپ نے خاصا وقیع ادب تخلیق کیا ہے۔ آج اس گفتگو میں آپ سے بطور خاص بچوں کے ادب کے حوالے سے بات ہوگی۔ عام طور سے ہمارے قلم کار بہت کم ہی بچوں کے ادب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ آپ کو کب بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کا خیال آیا؟

(۳) بچوں کے لئے ادب تخلیق کرتے وقت اکثر قلم کار ہیں لے دیکھا ہے بزرگانہ اور اصلاحی انداز کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی نظموں میں معلومات یا مشاہیر کی طرف بچوں کی توجہ دلانا زیادہ اہم سمجھنے لگتے ہیں اور اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ایسی دلکش چیزیں لکھنا چاہئیں جس سے بچے خوشی و مسرت اور حیرت کے جذبات سے دوچار ہوں۔ آپ کے نزدیک بچوں کے لئے ادب لکھنے والے کو کیسا رویّہ اپنانا چاہیئے؟

(۴) "کاغذ کی کشتی" کے عنوان سے بچوں کے لئے آپ کی شاعری کی کتاب آچکی ہے، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ صوفی تبسم کے علاوہ کسی اور شاعر نے ایسی دلکش اور حقیقی معنوں میں بچوں کے لئے نظمیں نہیں لکھیں۔ پیروڈی عام سے ہٹ کر ایسی نظموں کے لکھنے کا خیال آپ کو کب آیا؟

(۵) آپ کے بچپن کے زمانے سے لے کر آج تک بچوں کے ادب کے موضوعات میں آپ کے خیال میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں؟

(۶) آج کل بچوں کے رسائل میں اور مختلف کتابوں میں بچوں کے لئے لکھا جانے والا جو ادب شائع ہو رہا ہے اس کے معیار اور موضوعات سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں۔

(۷) کیا آپ کے خیال میں آج کے بچوں کے لئے بھی جنوں، بھوتوں، پریوں اور بادشاہوں وغیرہ کی کہانیوں کی وہی اہمیت اور دلکشی برقرار ہے جو کبھی پہلے تھی؟

(۸) "کاغذ کی کشتی" کے بعد بھی بچوں کے لئے آپ نے نظمیں لکھی ہیں۔ کیا ہم ایک نئے مجموعے کی آپ سے توقع کر سکتے ہیں۔

نوٹ:۔ عابدی صاحب کو مندرجہ بالا سوالات بھیجے گئے تھے۔ جن کے جوابات حاضر ہیں۔ (ادارہ)

مشرف صاحب:۔ میں کسی کام کو ٹالنے کا عادی نہیں ہوں۔ میری حتی الوسع یہ کوشش ہوتی ہے کہ جب کوئی وعدہ کر لوں تو اسے ہر قیمت پر پورا بھی کر لوں۔ ایفائے عہد کو اپنی زندگی میں بہت اہم سمجھتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں نے بڑا کام تو کیا، کبھی کوئی ڈھنگ کے کام نہیں کئے، اس لئے چھوٹی چھوٹی ذمہ داریوں کی بجا آوری سے اپنے ناآسودہ ضمیر کو تسکین فراہم کرتا آیا ہوں۔ جیسے کوئی کاغذ کی رنگین جھنڈیوں سے اپنے کچے مکان کے بام و در سجاتا ہے۔ اس تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ آپ کا سوالنامہ پڑھ کر میرا بہت جی چاہا کہ ٹال جاؤں، ہر سوال کا جواب گول کر جاؤں، لیکن وعدہ کر کے اپنے دام میں خود ہی پھنس گیا تھا۔

یہ انکسار نہیں، واقعہ ہے کہ میں ایک بے مصرف آدمی ہوں، جس نے اپنی زندگی کی کوئی راہ متعین نہیں کی اور شب و روز اس طرح گزارے جیسے کوئی سراسیمہ دیہاتی جیب میں ریزگاری ڈال کر میلے میں یونہی بھٹکتا پھرتا ہے۔ ہر چمکتی ہوئی چیز اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن عمر کی کھنکتی ہوئی نقدی بہت تھوڑی سی ہے، جسے خرچ کرنے سے ڈرتا ہے اور اس خیال سے بچا بچا کر رکھتا ہے کہ ابھی ملے ہیں۔ دیکھنے کی چیزیں اور بہت سی ہیں یہاں تک کہ شام ہونے کو آتی ہے اور میلا اجڑنے لگتا ہے اور تب اسے احساس ہوتا ہے کہ متاعِ حیات کو سینت سینت کر بچا بچا کر رکھنا بے فائدہ ثابت ہوا۔ جیب میں کھنکتی ہوئی ریزگاری نہ جانے کب اور کس طرح خرچ ہوئی کچھ یاد نہیں۔

میں بنیادی طور پہ ایک دل گرفتہ، ناآسودہ اور مضطرب آدمی ہوں۔ بچپن ویسا ہی گزرا، جیسا کہ متوسط گھرانے میں گزرتا آیا ہے۔ خوشیاں بھی ملیں اور غم بھی، خوشیوں نے کبھی روح کو سیراب نہیں کیا، البتہ آزردگی کے گھاؤ بہت گہرے تھے۔ میرے والد کو شاعری اور ادب کے مطالعہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی، البتہ ہمارے یہاں محرم کی مجالس میں میر انیس کے مراثی بڑے اہتمام اور رکھ رکھاؤ اور مرثیہ خوانی کے جملہ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے پڑھے جاتے تھے۔ میرے دادا ایک اچھے مرثیہ خواں اور مرثیہ گو بھی تھے۔ انہوں نے یہ ذوق مجھ میں اس طرح منتقل کیا کہ میں جب تین سال کا تھا تو انیس کی متعدد رباعیاں مجھے ازبر ہو چکی تھیں اور اپنی توتلی زبان میں یہ رباعیاں آغازِ مجلس میں پڑھ کر حاضرین سے داد پاتا تھا۔ ابتدائی اردو اور فارسی گھر پر پڑھی۔ پانچویں درجے تک پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی اسکول میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے ایک ٹیوٹر سے انگریزی میں معمولی استعداد پیدا کر لی تھی۔ تعلیم و تدریس میں میرا ریکارڈ شاندار بالکل نہیں۔ میٹرک معلوم نہیں کیسے فرسٹ ڈویژن میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا لیکن میں اپنی کامیابی سے خود کبھی مطمئن نہیں ہوا۔ پھر ایف اے اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ ایف تک کا بیشتر زمانہ اعظم گڑھ کے شبلی کالج میں گزارا۔ اعظم گڑھ اس زمانے میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ لیکن اس کی مختصر آبادی میں پانچ ہائی اسکول اور ایک معیاری میونسپل لائبریری موجود تھی۔ شبلی اسکول اور کالج سے ملحق دارالمصنفین اور اس کے کتب خانے کا ذکر میں نہیں کر رہا ہوں۔ یہ ایک بڑا علمی ادارہ تھا۔ جس میں ہم اسکول کے لڑکے تجسس کے طور پر چھاپے خانے اور اس کے باغیچے کو دیکھنے کے لئے جا نکلتے تھے۔ وہاں کی تصانیف سے اکتساب کرنا، اس وقت تک ہمارے امکان میں نہ تھا۔ اعظم گڑھ کا ایک علمی، تہذیبی اور ادبی مزاج تھا۔ شام کو میں اور میرے چند ہم جماعت اپنے اپنے گھروں سے ٹہلنے کے لئے نکلتے اور میونسپل لائبریری جا پہنچتے۔ ۴۲-۱۹۴۳ء کا ذکر ہے معارف، (نگار، عالمگیر، نیرنگِ خیال، شمع اور متعدد دیگر پرچے وہاں پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ اردو ادب کی نئی تحریروں سے اور نئے ناموں سے ہم انہی دنوں آشنا ہوئے۔ پھر ہمارے اسکول ۴۶-۱۹۴۵ء تک بڑی دھوم سے دو تین آل انڈیا مشاعرے بھی ہوئے۔ سرمست و بے خود جگر، وارفتہ مزاج ساغر، شاعرِ مزدور احسان بن دانش، صوفی مزاج نشور واحدی، اسرار الحق

جمال، وامق اور لاتعداد شاعروں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے کلام سے بقدر ظرف لطف اندوز ہونے کا موقع مجھے انہی دنوں ملا۔ یہی زمانہ تھا جب فیض، مجاز، اختر الایمان، جذبی، سلام مچھلی شہری اور ساحر لدھیانوی کا کلام میری نظر سے گذرا، اور ان کی آوازوں نے مل جل کر مجھے اپنے شہر طلسمات میں اسیر کر لیا۔ ترقی پسند ادب اور شاعری کا میری فکر، مزاج، کردار اور پوری زندگی پر بڑا گہرا اثر ہے۔ نثر میں اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کی تحریروں نے مجھے مستقبل کا راستہ دکھایا۔ نئے ادب کے توسط سے سبط حسن کی تحریروں تک رسائی حاصل کی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزوں نے سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین کی آتش بار نظموں کو پڑھنے اور ان کے مطالب کو سمجھنے کی توفیق دی۔ یہ میرے ایف اے اور بی اے کے تعلیمی دور کی باتیں ہیں۔ اس زمانے میں، میں خود بھی شعر کہنے لگا تھا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں ہمارے پروفیسر اعجاز حسین ایک اچھے راہنما ثابت ہوئے۔ مجنوں صاحب اور ممتاز حسین صاحب کو پہلی بار انہی کے یہاں دیکھا اور ان کی باتیں سنیں۔

عیراستے بہت سے بڑے بڑے نام گنوانے سے کچھ حاصل نہیں، مختصر یہ کہ میرے شعور کی پرورش میں میرے عہد کے اساتذہ کی تحریروں کا بڑا حصہ ہے۔ میں برا بھلا جو کچھ بھی ہوں، انہی تحریروں کی بدولت ہوں اور میں نے زندگی میں جو بھی راستہ اختیار کیا، اس پر نادم بالکل نہیں ہوں۔ یہ کہانی بڑی طویل یعنی ۱۹۳۶ء کے بعد سے دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک اور اس کے بعد قیام پاکستان اور پھر گذشتہ ۴۲ سال کی سماجی اور سیاسی زندگی کی کہانی ہے اسے اختصار سے بیان کرنے کو بھی ایک عمر درکار ہے۔ زندہ رہنے کو کوئی وسیلہ چاہیئے، میں نے اخبار میں نوکری کر لی اور صحافی کے نام سے، جس میں ایک خود اختیاری توقیر کا شائبہ بہر طور موجود ہے، یاد کیا جانے لگا۔ شاید چند ماہ اس پیشے میں اور گذار لوں، اس کے بعد اللہ مالک ہے۔

وہ بڑا انقلاب پرور دور تھا یعنی ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک کا دور۔ جب شاعری بڑے انقلابی اور بلند آہنگ لہجے میں کی جاتی تھی، اس آہنگ سے میں بھی متاثر ہوا۔ لیکن میں اس کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہ کر سکا۔ اس طرح میں کچھ عجب طرح کے تضاد کا شکار رہا۔ ایک طرف علامہ اقبالؒ کا یہ ارشاد کہ ؎

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

دوسری طرف، میرے اندر کا کرب اور گہری اداسی، جس کی وجہ میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں (خیر کچھ اتنا قاصر بھی نہیں ہوں۔ لیکن یہ وقت اس تجزیے کا نہیں) تو مختصر یہ کہ میں "ترقی پسند حزنیہ شاعری" کی طرف مائل ہوا اور اب تک غزل میں اسی کیفیت کی شاعری کر رہا ہوں، جو خود کلامی کے انداز سے آگے نہیں بڑھی، اس لئے مشاعروں سے تو کیا احباب کی فرشی نشستوں سے بھی دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہاں تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں آپ کو بہت سے تضادات، ابہام اور وضاحت طلب باتیں ملی ہوں گی۔ اسے میرے ذہن کا انتشار سمجھ کر نظر انداز کر دیجئے۔ میں اپنے بارے میں ایک دم بہت سا سچ لکھ کر اپنے متعلق مستقبل کی افسانہ طرازی کے باب بند کرنا نہیں چاہتا۔

اب ذرا کچھ باتیں بچوں کے ادب کے حوالے سے۔ آپ نے سوال کیا ہے کہ میں بچوں کے ادب کی طرف کب اور کس طرح مائل ہوا؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر اس کا بچپن چھپا ہوا ہوتا ہے بلکہ مہ و سال کے بھاری پتھروں تلے دبا رہتا ہے اور یہ پتھر سرکا کر بار بار اوپر آنا چاہتا ہے۔ آمریت کے زمانے میں جب کھل کر بات کرنا اور لکھنا دشوار ہو گیا تو میں نے اپنے بچپن کی طرف مراجعت اختیار کی۔ اس مراجعت نے میرے اندر یک گونہ شادابی اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی امنگ پیدا کی۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ ان دنوں میرے بچے جن کی عمریں پانچ سے بارہ سال کے درمیان تھیں (اور اب تو خاصے بڑے ہو گئے ہیں) مجھ میں دلچسپی لینے لگے تھے اور گھر میں ٹیلی ویژن کے علاوہ، میں ان کی واحد تفریح تھا۔ رات میں، میں بستر پہ دراز ہو جاتا اور بچوں کو دائیں بائیں لیٹا

کہ انہیں اتنی سیدھی کہانیاں، لطیفے، چٹکلے، گھڑ گھڑ کر سناتا۔ کاغذ کی کشتی کی زیادہ تر نظمیں اس زمانے کی ہیں۔ یہ سب مجھے بڑا دلچسپ لگتا تھا۔ بچوں کا ہاتھ پکڑے پکڑے میں اپنے بچپن میں پہنچ جاتا تھا۔ اس بچپن میں جسے میں نے گزارا اور اس بچپن میں بھی جسے گزارنے کی آرزو رکھتا تھا۔ لیکن جو مجھے میسر نہیں آیا۔ اس طرح میں اپنی حسرتوں کی تسکین بھی کرتا تھا۔ پھر میں نے سوچا، کچھ نثر میں بھی لکھنا چاہیئے۔ ایک رسالے کے لئے کہانیاں لکھیں جو ذرا بڑے بچوں کے لئے تھیں۔ بچوں کے لئے میری نظمیں اور کہانیاں، میرے اپنے بچوں کی عمر کے ساتھ پروان چڑھتی اور بڑی ہوتی آئی ہیں۔ اور اب کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ میں بھی اپنے بچپن کے بھول بن سے باہر آ گیا ہوں، ویسے بچوں کے لئے لکھنے کی امنگ اب بھی موجود ہے۔ کچھ چیزیں غیر مطبوعہ — نظمیں اور کہانیاں میرے بستے میں بند ہیں۔ کبھی فرصت ہوئی تو انہیں شائع کروں گا۔

بچوں کے لئے لکھنا ہو تو خود بھی بچہ بننا پڑتا ہے اور جو ادیب بچہ نہیں بن سکتا بلکہ داڑھی مونچھوں کے ساتھ بچوں کے درمیان آن وارد ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بزرگانہ اور اصلاحی انداز ہی اختیار کرے گا۔ آپ اسے "بزرگوار" کی مجبوری سمجھیئے۔ میں بچوں کے لئے ارادتاً نہیں لکھتا۔ میں ان کی موجودگی سے لطف اندوز ہونا چا[illegible] ان کے ساتھ ٹھٹھول کرنا اور جی بھر کر ہنسنا چاہتا ہوں۔ یہی ہنسی جب آہنگ اختیار کرتی ہے تو نظم بن جاتی ہے یا کہانی میں ڈھل جاتی ہے۔ میں پند آموز باتیں لکھنے کا سرے سے اہل ہی نہیں۔

کاغذ کی کشتی کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے میرے لئے بڑی حوصلہ افزا ہے، لیکن براہ کرم ہمارے زمانے کے بڑے لکھنے والوں کی تحریروں سے اس کا موازنہ نہ کیجئے۔ صوفی صاحب تو بہت بڑے شاعر تھے اور مرحوم انشا کی نظمیں جو انہوں نے بچوں کے لئے لکھیں، ہمارے ادب کا گراں مایہ ورثہ ہیں۔ میری حیثیت ان کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ مجھے پیروئ عام سے ہٹ کر لکھنے کا خیال کیسے آیا تو اس بارے میں میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں نے اپنے بچوں کو بہلانے، انہیں خوش کرنے کے لئے لکھنا شروع کیا، وہ میری نظموں کو جس قدر پسند کرتے، اتنا ہی زیادہ لکھنے کی تحریک پیدا ہوتی، بس اتنی سی بات ہے۔

بچوں کے ادب کو بچوں کی زندگی سے قریب ہونا چاہیئے۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی اسماعیل میرٹھی نے جب بچوں کے لئے لکھا تو ایک تو درسی اور غیر نصابی ادب کی تفریق نہیں کی جو ہمارے یہاں آج موجود ہے اور اس سے ہمارے نصاب کے افلاس کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کا مشاہدہ گہرا اور بچوں کی نفسیات کا مطالعہ عمیق تھا۔ گھر، آنگن، کھیت، پن چکی، باپ، ماں، چولہا، چکی، حقہ۔ یہ سب کچھ ان کی نظموں میں اور اسباق میں موجود ہو گا۔ گرمی، سردی، برسات، صبح، شام، غرض کہ بدلتے ہوئے موسم اور وقت کی ہر کیفیت ان کے یہاں پائی جاتی تھی۔ اور یہی سبب ان کی مقبولیت کا تھا۔ اس کے بعد جو تبدیلیاں ہمارے معاشرے میں آئیں، ادیب اور شاعر ان کا احاطہ اپنے ادب میں نہ کر سکے۔ ہاں کچھ شفیع الدین نیر، افسر میرٹھی، امتیاز علی تاج، غلام عباس اور دوسروں نے لکھا۔ مگر وہ بات جو اگلوں کے یہاں تھی پیدا نہ ہو سکی۔ الف لیلہ، قصہ چہار درویش، داستانِ امیر حمزہ اور بعض مثنویوں مثلاً سحر البیان کے قصے بچوں میں بھی اپنی طلسماتی کشش کی بنا پر مقبول ہوئے اور پھر جنوں، پریوں کی کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ بچوں میں تحیر اور تجسس کو بیدار کرنے اور ان کے تخیل کی قوت کو مہمیز کرنے کے لئے ایسی کہانیاں لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ آج کے بچے زیادہ حقیقت پسند بلکہ عقلیت پسند ہو گئے ہیں۔ وہ اب اس طرح کی کہانیوں پر یقین نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ جنوں پریوں کی کہانیاں اب مقبول نہیں رہیں۔ ان کی جگہ دو رجحانات نے لے لی ہے۔ ایک تو جاسوسی کہانیاں جن کی مقبولیت میں ابنِ صفی اور اشتیاق احمد کی کاوشوں کو بڑا

دخل ہے ۔ دوسرے تمام جہاد سائنس فکشن ، جو انگلش کومکس اور ٹی وی کے بعض غیر ملکی سیریلز کے زیرِ اثر تصنیف کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بہت مصنوعی لگتا ہے۔ سائنس کو ہماری عملی زندگی میں کچھ زیادہ دخل نہیں، اس لئے اکیسویں صدی میں سیاروں کی سیر اور مریخ کی مخلوق سے ناقابلِ یقین جنگ آزمائی ایسی فہم شے ہے جو بچے اور ایجاد انگیز طلسماتی کشش تو رکھتی ہے، لیکن بچوں کو کوئی راہ نہیں سجھاتی۔ سائنس فکشن سے پاکستان میں سائنس کو فروغ نہیں ہوگا ، البتہ سائنس اور ٹکنولوجی کی ترقی کے ساتھ سائنس فکشن میں معنویت پیدا ہوگی اور یہ ادب مقبول ہوگا ۔

بچوں کے لئے آج کل بکثرت لکھا جا رہا ہے۔ بچوں کے رسالے بھی شائع ہوتے ہیں، جن میں سے ایک دو کے سوا بیشتر تجارتی اور کاروباری نوعیت کے ہوتے ہیں اور اپنا کوئی معیار نہیں رکھتے۔ بہر حال جو کچھ ہے غنیمت ہے اور بچے اگر اس سے خوش ہیں تو اور کیا چاہیئے۔

بچوں کے ادب کے سلسلے میں بعض لوگ بڑا سخت معیار رکھتے ہیں، انہیں ادیبوں سے گلہ ہے کہ وہ معیاری چیزیں بکثرت نہیں لکھتے ، لیکن مجھے شکایت ہے کہ جب کوئی ڈھنگ کی چیز لکھی جاتی ہے تو اس کی پذیرائی نہیں ہوتی اور ہوتی ہے تو پبلشر اس کے فیض کو مصنف تک پہنچنے نہیں دیتا۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی

# پودا ایک نیم کا

ایرش اوئرباخ ( ERICH AVERBACH ) نے اپنی کتاب میمیسس ( MIMESIS ) میں جس کا ترجمہ ولرڈ ٹراسک ( WILLARD TRASK ) نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا۔ ورجینیا وولف ( VIRGINIA WOLF ) کے ناول ٹو دی لائٹ ہاؤس (TO THE LIGHT HOUSE) پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"مختلف داخلی تاثرات کے ذریعے جو فرد پر مختلف
اوقات میں اثرانداز ہوتے ہیں۔ خارجی حقیقتوں
کو گرفت میں لینے کا طریقہ جدید تخلیقی تکنیک کیلئے
بہت اہم ہے۔ بنیادی طور پر یہ طریقہ ایک ذات کی
داخلیت سے مختلف ہے جس میں ایک ہی فرد کی آواز
سنائی دیتی ہے اور حقیقتوں کو پرکھنے کا طریقہ صرف
ایک ہی فرد کا طریقہ ہوتا ہے۔ ادبی تاریخ میں دونوں
طریقے شعور کی نمائندگی کرتے ہیں"

جس دور میں یہ تحریر لکھی گئی وہ پُرانا سہی لیکن جدید تخلیقات میں اظہار کے دونوں طریقے اب بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بہت سے نقاد جو صرف تشقیص کو تنقید سمجھتے ہیں اور فارمولا قسم کے نظریات کے پیرو ہیں وہ ایسے افسانے کو جس میں فرد نے معاشرے یا ماحول سے متاثر ہو کر اُس کا ذکر اپنی ذات کے حوالے سے کیا ہے۔ یکسر جدید افسانہ ماننے سے انکار کردیتے ہیں۔ ایسے نقاد کا نظریہ انانیت یا ( SOLIP - SISM ) کے نظریہ کے قریب ہے جسے موجودہ دور کے فلسفی جس میں جین پال سارتر بھی شامل ہیں غلط تسلیم کرتے ہیں کوئی بھی فرد بغیر شعوری کوشش کے اپنے تاثرات کے فطری اظہار میں ماحول اور معاشرے سے بالکل الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ مشرف احمد کے افسانوں میں مجھے اس قسم کی داخلیت نظر آتی ہے جس میں افسانہ نگار کے تاثرات کا اظہار اس پیرائے میں ہوا ہے کہ وہ مشرف احمد جیسے تمام آدمیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

"وہ اپنے کرب سے نجات پانے کے لئے
چڑیاں آزاد کرتا تھا۔ اس کا یہ عمل کس کے لئے
تھا میں نہیں جانتا۔ ہاں یہ ہے کہ دوسروں
کے ساتھ ہم بھی اُن کی قید میں اپنی آزادی کے
باوجود شریک ہوتے ہیں!

(پرندے سے اقتباس)

"ہمارے شہروں کی بہت سی گلیوں کوچوں کے
نام مشاہیر کے ناموں پر نہیں رکھے گئے تھے
بلکہ وہ تو عام دنیاوی اعتبار سے چھوٹے چھوٹے
لوگ تھے جن کی خوبیوں کو ان کے ہمسایوں نے
محسوس کیا۔۔۔"

( بے نام گلیوں اور محلوں کا نوحہ" سے )

مشرف احمد کے افسانوں کا مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک

فرد کے ذاتی تجربات کا اظہار ہے جن سے وہ مختلف اوقات میں گزرا اور اُسے ( EPIPHANIEO ) کے طور پر جمع کرکے کثیر الذاتی ( MULTIPERSONAL ) مشاہدوں کو اپنی ذات سے منسلک کرلیا۔ یہی عمل ہمیں مارسل پراؤسٹ کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے اور زیادہ تر اردو ادب کے جدید افسانہ نگاروں میں بھی۔ دنیا میں تقریباً سارے ہی نفوس کسی نہ کسی تجربے سے گزرتے ہیں اور بہت سے واقعات اور حادثات چاہے وہ بڑے ہوں یا چھوٹے اُن کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن ایک آرٹسٹ اور عام آدمی میں فرق یہ ہے کہ آرٹسٹ حساس ہوتا ہے اور تجربوں کا اثر اس طرح قبول کرتا ہے کہ اس کے ذہنی کمپیوٹر پر یہ تاثرات ہزاروں بائٹ BYTE

کی طرح نقش ہو جاتے ہیں آرٹسٹ کی ذات کا استغراق (Involvement) اس طرح ہوتا ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں سے تعلق رکھنے والے واقعات کو یوں سمجھتا ہے جیسے وہ اُسی پر گزر رہے ہوں پھر اس کا تخلیقی ذہن اُن تاثرات یا اپنائے ہوئے مشاہدات کا اظہار کرنے کے لئے بےچین ہو جاتا ہے۔ چاہے یہ اظہار کینوس پر ہو یا کاغذ پر اور اظہار کے وقت وہ فرد دنیا کی ہر فرد کا نمائندہ ہوتا ہے ایک اچھی تخلیق کا یہی معیار ایسے فرد کا انحصار نہ کسی تکنیک کے تابع ہوتا ہے اور نہ منطق کے حالانکہ مشرف احمد کے تجربات اور تاثرات کا اظہار روایتی دائرے ہی میں ہے اور روایتی تکنیک بھی بڑی حد تک موجود ہے لیکن اِن کے اظہار میں اب برجستگی اور ( SPONTANIETY ) ہے جس میں تکلف اور بناوٹ نظر نہیں آتی بلکہ شعور کی یہ منطقی رَو ایک تربیت یافتہ دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جو اظہار کے وقت سارٹنگ ( SORTING ) اس تیزی سے کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ محترم ادیب اشفاق احمد نے ماہنامہ "تخلیق" کے ایک مذاکرے میں جو "تخلیق" کے کہانی نمبر میں شائع ہوا ہے فرمایا تھا کہ آج کا افسانہ نگار کتابوں سے شیخوف جیسے ادیبوں سے متاثر ہو کر افسانہ لکھتا ہے۔ یعنی محترم اشفاق احمد آج کے افسانہ نگار کو آرٹسٹ تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں۔ میں اُن کو مشرف احمد کے افسانے پڑھنے کی دعوت دوں گا کم سے کم اُن پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ نئی نسل کے اس افسانہ نگار نے کسی خاص ادیب یا کسی خاص کتاب سے کوئی اثر قبول نہیں کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عمومی طور پر وسیع المطالعہ ہونے کی نشاندہی افسانہ نگاری کے اسلوب اور طرزِ اظہار سے ہو جاتی ہے۔ مشرف احمد کے افسانوں میں روایت کی جھلک بھی ہے اور جدید فلسفیانہ نکتہ نظر کی بھی

"لکڑی کے وہ تینوں کندے جو انہوں نے الاؤ میں
ڈالے تھے، جھاڑ جھنکاڑ کے ساتھ مل کر اب سُلگنا
شروع ہو گئے تھے۔ پھر آگ کا شعلہ دوبارا اُبھرا
اور روشنی کا دائرہ جو سمٹ کر تنگ ہوتا جا رہا تھا،
دوبارہ پھیل گیا۔"

("غار" سے)

"کبھی کبھار جب چاند کو ابر کے ٹکڑے اپنی اوٹ
میں لے لیتے یا تاریک راتوں میں آسمان مجھے
عجیب پُرہیبت آواز میں اپنے وجود پر پھیلا ہوا
محسوس ہوتا تھا۔ آسمان پر بادل عجیب عجیب سی
شکلیں بناتے بگاڑتے رہتے تھے......
بچپن میں ماں بتایا کرتی تھی کہ آسمان پر بادلوں
سے بننے والی شکلیں اُن آدمیوں کی ہوتی ہیں جو اب
اس دنیا میں زندہ نہیں۔ ان کی روحیں عالمِ بالا میں
ہیں اور ان کی شکلیں آسمان پر اس لئے آتی ہیں کہ
دنیا میں آباد ان کے پیارے انہیں دیکھ دیکھ

کر تسکین حاصل کریں...... شاید مجھے کوئی رات
ایسی یاد نہیں ہے جب میں نے اپنے اوپر پھیلے ہوئے
آسمان کو دیکھتے ہوئے موت کے بارے میں، فنا
ہو جانے کے بارے میں نہ سوچا ہو۔"
("شہر ہجر" سے)

جب میں نے مشرف احمد کا افسانہ خوف پڑھا تو مجھے جوزف کونریڈ کا افسانہ (AN OUT POST OF PROGRESS) یاد آگیا جس میں خوف کو انسانی زندگی سے اس طرح منسلک کیا گیا ہے جس طرح مشرف احمد نے اپنے افسانے میں کیا ہے۔

جوزف کنراڈ لکھتا ہے۔

"اس دن کوئی بھی گوبیلا کے گاؤں سے اسٹیشن کے
قریب نہیں آیا۔ کوئی دوسرے دن بھی نہیں آیا اور
اس کے دوسرے دن بھی نہیں۔ بلکہ ایک ہفتے تک
کوئی نہ آیا۔ شاید گوبیلا کے آدمی مر گئے ہوں اور
دفن ہو گئے ہوں......
بدمعاش لوگ چلے گئے تھے لیکن خوف باقی تھا۔
خوف ہمیشہ باقی رہتا ہے آدمی اپنے اندر سب کچھ
ختم کر سکتا ہے۔ محبت، نفرت، عقیدہ یہاں تک کہ
شک بھی۔ لیکن جب تک وہ زندگی سے منسلک
رہتا ہے وہ خوف کو نہیں ختم کر سکتا۔ خوف نہایت
سخت۔ غیر فانی اور ڈراؤنا ہے جو آدمی کے سارے
وجود میں سرایت کرتا ہے۔ اس کے خیالوں میں چھپا
رہتا ہے۔ اس کے دل میں چھپا رہتا ہے۔ اور اس
کے ہونٹوں پر زندگی کی آخری سانسوں کی کشمکش
کو دیکھتا رہتا ہے۔"

مشرف احمد اپنے افسانے "خوف" میں لکھتے ہیں

"جب میں نے بہت دور تک اپنی ماضی کی زندگی
کا تعاقب کیا تو مجھے ایک دھندلی سی خواب کے مانند
کچھ پُر اسرار سی کیفیت محسوس ہوئی۔ مگر میں نے اس خواب
کو ایک عام اور بے فکری پر مبنی زندگی گزارنے کی خاطر
فراموش کر دیا تھا۔ یہ خواب جو میں دیکھا کرتا تھا اپنا
راستہ قید خانوں کے درمیان سے بناتا تھا اور مجھے
قید خانوں سے ہمیشہ خوف آیا ہے۔ جس طرح موت
سے خوف آیا ہے اور قبر کی تاریکی سے خوف آیا ہے۔
قبر اور قید خانوں میں فرق بھی کیا ہوتا ہے گو کلیت زدہ
لوگوں کا کہنا ہے کہ زندگی خود بھی ایک بہت بڑا قید خانہ
ہے لیکن سنگین دیواروں کے پیچھے مجبوری اور لاچاری
کے ساتھ درشت، سخت دل اور اذیت پہونچانے
والے پہرے داروں کی نگرانی میں قیدیوں کے شب و
روز کا تصور کر کے مجھ پر ہمیشہ ایک خوف طاری ہو جاتا
ہے اور میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

اس طرح مشرف احمد کے افسانے میں خوف کے بے پیکر وجود کا ذکر بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اور زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے جوزف کنراد کے یہاں بھی خوف کا تاثر وہی کچھ ہے جو مشرف احمد نے پیش کیا۔ زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو زمان و مکان کی بندش سے آزاد ہوتی ہیں اور تخلیقی ذہنوں میں مماثلت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ شاید یہ خوف ہی ہے جسے وجودی فلسفہ میں (ANGUISH) کا نام دیا گیا ہے مشرف احمد کے افسانے میں یہ (ANGUISH) اتنے تخلیقی عمل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ یہ انسان کی پوری زندگی کو محیط

لیتا ہے۔ نوشتۂ دیوار کا خوف، گھٹن کا خوف یہاں تک کہ آزاد پھلنے کا خوف سب زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ مشرف احمد کے افسانے میں دیوار کے گرنے کے بعد خوف سے نجات پانے کا نظریہ صرف ریشنلائزیشن معلوم ہوتا ہے شیو اور چیک بک پر دستخط کرنے کا ذکر اور ہاتھوں کے سلامت ہونے کا تصور صرف عارضی سکون معلوم ہوتا ہے۔ خوف نے بے دیوار کے گھر میں بھی انہیں نہ چھوڑا ہوگا لیکن شاید وہ دوسری کہانی ہوگی۔

جناب شوکت صدیقی نے اپنے دیباچے میں مشرف احمد کے افسانوں میں علامتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ علامتیں واضح ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مشرف احمد نے بعض علامتوں کو بہت زیادہ واضح کرکے انہیں صرف تشبیہ کا درجہ دے دیا اور قاری کو ان پر غور کرنے کا موقع نہ دیا۔ مثال کے طور پر وہ اپنے چھوٹے بچوں کو بتاتے ہیں "میں بھی درخت ہی ہوں۔ بلکہ ہر آدمی درخت ہی ہوتا ہے" اوّل تو بچے کے ساتھ مکالمے میں ایسے فلسفیانہ خیال کا اظہار ہی کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ درخت کی علامت کو سمجھنے اور اس کے ( TREAT MENT ) پر غور کرنے کا موقع نہیں ملتا ہاں اسی افسانے میں آگے چل کر نیم کا درخت ایک علامت بن کر ابھرتا ہے اور اسے زیادہ واضح نہ کرکے مشرف احمد نے اس کے معنی کی گہرائی کو برقرار رکھا ہے۔

> "نیم کا وہ درخت پھلتا پھولتا چلا گیا۔ بیماروں کو ضرورت ہوتی تو لوگ آ کر اس نیم کے پتے لے جاتے اور نیم کا سایہ کم نہ ہوتا۔ کہیں میت ہو جاتی تو مردے کو نہلانے کیلئے نیم کے پتے لینے لوگ آ جاتے اور نیم کا سایہ کم نہ ہوتا۔"

افسانے کا یہ حصہ زندگی کی کڑواہٹ اور اس کی طلب کے تضاد کی علامت بن کر ابھرتا ہے ایک بہت ہی غمناک طنز! اس لئے کہ یہ کڑواہٹ قبر میں بھی آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مگر وہ زندگی میں ہمیشہ اس کے سایہ سے استفادہ کرتا ہے۔

مشرف احمد کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ اور ان افسانوں میں وہ سب کچھ موجود ہے جو زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے Pathos تلخیاں جدوجہد۔ ناسٹلجیا۔ استحصال فکر مستقبل کی ممکنات اور راہوں کا ڈر۔ غرض کہ مجموعی طور پر یہ افسانہ ایک ایسے فرد کی یا ایک جیسے بہت سے افراد کی روداد معلوم ہوتے ہیں جو جبر و استحصال، منافقت، لوٹ گھسوٹ، نا امیدی اور ناکامی کے ماحول میں زندہ ہیں اور یہی ہے آج کے آدمی کا المیہ، مشرف احمد کے لئے یا ان کے جیسے ادیبوں کے لئے جین پال سارتر کے "نہیں" کہنے کی بھی آزادی باقی نہیں اور وہ خاموشی اور بے بسی کے ساتھ بھنور میں ڈوب جانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

مشرف احمد نے اپنی کتاب میں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ سپاہی پیشہ نہ بن سکے مگر عشق پیشہ ضرور بن گئے۔ لیکن ان کے افسانوں میں مجھے روحانی۔ رومانی یا مادی عشق کا کوئی وجود نہ ملا۔ ہاں اگر عشق سے مطلب اقربا اور بچوں کی محبت اور عالم انسانیت سے لگاؤ ہے تو وہ یقیناً عشق پیشہ ہیں۔

افسانوں کا یہ مجموعہ ہمارے جدید ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ مشرف احمد نے نیم کا پودہ لگا دیا ہے۔ اب وہ بڑھ کر ادب دوستوں کی برادری کے لئے سائے اور اکسیر کا کام کرے گا۔ ہمیں امید ہے کہ مشرف احمد اس درخت میں پابندی کے ساتھ پانی ڈالتے رہیں گے۔

واللہ ولی التوفیق۔

ممتاز مرزا

# بزرگان لواری شریف

درگاہ عالیہ لواری شریف (ضلع بدین سندھ) کے چھٹے صاحبِ ارشاد اور سجادہ نشین حضرت خواجہ احمد زماں قدس سرہ بن حضرت خواجہ محمد سعید مہاجر مکی قدس سرہ کی ولادت' لواری شریف میں ۱۶ ذی الحج ۱۲۹۷ھ میں ہوئی' آپ کے والد ماجد حضرت خواجہ محمد سعید قدس سرہ نے آپ کی تاریخ ولادت اس طرح فرمائی۔

احمد زماں چوں زادہ شد تا مش بگفتہ فال او
بادا چوں احمد در زماں ہچوں مجد وحال او
گفتا' سعید از فال خوش برآیۂ دیانی فزا
بعز الزاں' آید براں اعداد زیبا سال او

آپ کی تربیت آپ کے والد ماجد خواجہ محمد سعید قدس سرہ نے خود کی' جو ایک باشرع معلم و ادب کے گوہر یکتا' عبادت اور ریاضت میں باکمال ہستی تھے۔ لیکن ظاہری تعلیم کے ایک مشہور عالم قاضی محمد علی مرحوم کے سپرد کی۔ لیکن جو دل باطنی علم کی روشنی سے منور ہو۔ انہیں ظاہری علوم کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں۔ آپ کی عمر جب بیس سال کو پہنچی تھی تو درگاہ عالیہ لواری شریف کی تمام تر ذمہ داری آپ کے سپرد ہوئی' اور یہ ذمہ داریاں آپ نے اپنے والد کی نگرانی بہ احسن طریق سرانجام دیں۔ اور پھر ۱۳۲۴ھ اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد آپ اس علم و فضل کے اعلیٰ سرچشمہ کے سربراہ اور صاحبِ ارشاد ہوئے۔ آپ نے تین مرتبہ فریضۂ حج ادا فرمایا۔ شریعت کی پابندی آپ کی گھٹی میں تھی' لہٰذا درگاہ عالیہ پر کسی طور پر بھی ایسے کسی امر کی اجازت نہیں دی جس سے شریعت محمدی ؐ سے انحراف کا شائبہ تک ہو۔ آپ نے بزرگان کے دن بھی منانے کا اہتمام بھی فرمایا۔ درگاہ عالیہ لواری شریف کے چھٹے سجادہ نشین حضرت خواجہ احمد زماں قدس سرہ نے وصال فرمایا۔

آپ کی شخصیت کے متعلق پیر علی محمد راشدی مرحوم اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "اُبے ڈینہن اُہے شینہن" میں لکھتے ہیں کہ "اگر کبھی کسی مصور کو انسانیتِ کبریٰ تصویر کشی کرنی پڑی تو سائیں احمد زماںؒ کی صورت سامنے رکھنی پڑے گی' جن کو دیکھنے سے روح کو راحت اور قلب کو قرار حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیاروں کی پہچان ہی یہ ہی ہوتی ہے۔ انہیں دیکھتے ہی تمام دکھ دور اور درد رفع ہو جاتے ہیں سائیں احمد زماںؒ کی شخصیت بالکل منفرد تھی۔ اپنے دور کے بڑے بڑے علماء اور علامہ حضرات سے افضل تھے۔ آپ سے مختصر سی گفتگو کے بعد یہ احساس ہوا کہ علم و آگہی کا ایسا کوئی زینہ تصور میں نہیں آیا' جس پر آپ کے قدم پہلے پڑ نہ چکے ہوں۔"

سادگی آپ کا شعار تھی۔ قیام پاکستان سے پندرہ سولہ سال قبل پیر علی محمد راشدی مرحوم نے حضرت خواجہ احمد زماں قدس سرہ کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھا۔ آپ کا مشاہدہ کچھ یوں ہے۔ سامنے آخری کونے پر دیکھا کہ ایک پختہ عمر شخص الکراجی

کی مسہری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مسہری پر سوتی دری بچھی ہوئی تھی میں یہ نہیں سمجھا کہ یہ شخص خود خواجہ صاحبؒ ہیں۔ پیروں جیسی شان و شوکت نہیں تھا۔ گندمی رنگ تھے، قدہ میانہ، تراشی ہوئی ریش، جسم پر باریک سفید کرتہ، سادہ شلوار، سر پر سفید ٹوپی جو اکثر لوگ نماز کے وقت پہنتے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن سے کہا کہ مجھے حضرت خواجہ صاحبؒ سے ملنا ہے۔ آپ مسہری سے مسکراتے ہوئے اُٹھے اور انتہائی محبت سے ملتے ہوئے فرمانے لگے "میرے حبیب لبیب، احمد زمان میں ہوں"۔ میری حیرانی کی انتہا ہی نہ رہی"۔

حضرت خواجہ احمد زماں قدس سرہ کے متعلق دو اقتباس اُن شخصیت کے ہیں، جن کی تاریخ پر گہری نظر رہی ہے اور سندھ کی اُن شخصیات پر قلم اٹھایا جن کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ وہ شخصیات ہیں جن کے حالات اور اُنہوں نے برصغیر کی تاریخ پر خصوصی اثرات چھوڑے۔

حضرت خواجہ احمد زماں قدس سرہ کی زندگی کے بہت سارے پہلو وطنِ عزیز کے لوگوں پر ابھی تک واضح نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کا دَور برصغیر کی تاریخ کا انتہائی اہم دَور رہا ہے۔ سیاسی اعتبار سے تحریکِ آزادی کا دور کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ مختلف مکاتبِ فکر کے سیاسی رہنما انگریز حکومت سے اپنے اپنے انداز سے برسرِ پیکار تھے مختلف سیاسی رہنما اپنی اپنی تحریکوں کے لئے علاقوں کے سربرآوردہ شخصیات سے تعاون کے لئے کوشاں تھے۔ اور حضرت خواجہ احمد زماں قدس سرہ کی شخصیت اُس دَور میں انتہائی بااثر تھی۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے جو گزیٹیئر مرتب کیا اُس میں آپ کے متعلق لکھا کہ

"سندھ میں بے شمار سید ہیں۔ ان میں سے کچھ پیر کہلاتے ہیں حیدرآباد ضلع (اُس وقت بدین ضلع نہیں تھا اور یہ حیدرآباد ضلع کا حصّہ تھا) میں ایک بڑے پیر ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق وہ سندھ میں بڑے پیر ہیں۔ حالانکہ سید زادہ نہیں ہیں لیکن اسلام کے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آپ کا خاندان ملتا ہے۔ یہ پیر بزرگ ہیں پیر آف لواری شریف احمد زمان بن خواجہ محمد سعیدؒ۔ (گز: گزیٹیئر آف سندھ: گولڈ سمتھ جلد ۲، ص ۱۰)

حضرت خواجہ صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے مختلف الخیال سیاسی رہنماؤں کی نظروں کا مرکز بنی رہی۔ سندھ میں ہجرت کی تحریک زوروں پر تھی۔ تحریک کے روحِ رواں مولانا تاج محمود امروٹی مرحوم اپنے چند رفقاء کے ساتھ لواری شریف میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے گزارش کی کہ ان کی تحریک میں شامل ہوں۔ آپ نے انہیں جواب دیا کہ "اگر آپ میں سے کسی کو بھی روحانی طور پر حکم ہوا ہو تو بتائیں میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہجرت کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن اگر ایسا کوئی حکم خداوندی نہیں تو آپ لوگ اس عمل سے کبھی کامیابی حاصل نہیں کریں گے۔ تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ افغانستان کے حکمران نے انگریزوں کے کہنے پر اس تحریک میں وعدہ خلافی کی اور ہجرت کرنے والے لوگوں کو کیسی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو بھارت کے سب سے بڑے رہنما آنجہانی مہاتما گاندھی نے بھی لواری شریف کا سفر کیا۔ اور حضرت خواجہ احمد زمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کانگریس میں شریک ہونے کے لئے گزارش کی۔ آپ کی دوررس نظروں نے کانگریس کی چالوں کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ بحیثیت ایک سچے مسلمان اور شرعِ محمدی کے پابند آپ کیسے ہندو سامراج کی گرفت میں آسکتے تھے۔ آپ نے کانگریس میں شرکت سے انکار کیا، اور گاندھی صاحب مایوس ہوکر لواری شریف سے واپس چلے گئے۔ اور میری رائے میں یہ ہی ایک

وجہ ہے کہ درگاہ لواری شریف کے خلاف کانگریس سے ہم خیال مولوی
صاحبان نے جھوٹی اور من گھڑت کہانی گھڑی جو آج تک چل رہی
ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اس پس منظر میں درگاہ لواری شریف کے
متعلق چھان بین کی جائے تو حقائق سامنے آجائیں گے۔

آپ تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پیر علی محمد راشدی لکھتے
ہیں کہ آپ کے دور میں اٹلی میں مسولینی کی آمریت قائم ہو چکی تھی۔
جرمنی میں ہٹلر اپنے عزائم کو تکمیل پر پہنچانے کے لئے پر تول رہا تھا
دنیا کے اخبارات میں اس کے متعلق بحث مباحثے ہوتے رہتے تھے۔
آپ نے فرمایا۔

"آمریت سیزر کو بھی راس نہیں آئی تو ان کو کیا دے گی۔
خدا تعالیٰ اپنے نافرمان بندوں کے علاج کے لئے وقتی طور پر
ایسی مصیبتیں نازل فرماتے ہیں۔ لیکن یہ علاج عارضی ہوتا ہے۔
خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو مستقل طور پر مجبور و ذلیل رکھنا پسند نہیں فرماتے۔
اگر باری تعالیٰ کو یہ منظور ہوتا تو انسانوں کو اندھیروں میں چھوڑ دیتے
اُن کی رہنمائی کے لئے نہ تو پیغمبر بھیجتے نہ ہی کتابیں۔ اور نہ ہی نیکوکاری
کے اصول متعین فرماتے۔"

میں نے گذارش کی کہ دنیا کی تاریخ کے مطابق تو کچھ اقوام
کو طویل مدت تک ایسی مصیبتوں میں گرفتار رہنا پڑا ہے۔" آپ نے
فرمایا۔ ہاں ایسے طبیب، حکیم، علاج کا عرصہ مرض اور مریض کے حالات
کے مطابق تعین کرتا ہے۔ بڑا مرض تو طویل علاج۔ ایک دوسری ملاقات
میں قوموں کے تنزل اور تباہی کے اسباب پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا
اس سے معلوم ہو رہا تھا کہ مشرق و مغرب کی کسی بھی قوم کی تاریخ
تہذیب، تمدن، ترقی اور تنزل پر کسی بھی زبان میں شاید ہی کوئی
ایسی کتاب ہو جو آپ کی نظر سے نہ گزری ہو۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ
کے دوران سمیری، اشوری، مصری، بابلی، عبرانی، فنیقی، یونانی، رومی

چینی اور ہندی اقوام کی تاریخ پر تبصرے فرماتے رہے۔ عقل دنگ اور
زبان گنگ رہ گئی۔ آخر میں نتیجے کے طور پر فرمایا۔

"قومیں اُس وقت تباہ ہوتی ہیں، جب اُن میں سے انسانی
محبت ختم ہو جاتی ہے اور پیسے کی پوجا شروع کر دیتی ہیں۔ انسان
انسان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بطور انسان
محبت کرنا ترک کر دیتے ہیں اور دولت کے پیچھے اس طرح پڑ جاتے
ہیں۔ گویا پیسہ ہی اُن کا معبود ہو۔ یہ شرک کی بدترین قسم ہے
اور خدا تعالیٰ کے نزدیک شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ بادشاہ
بغاوت کو اور خدا تعالیٰ شرک کو ناپسند کرتے ہیں۔

راشدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ "مجھے تعجب اس بات کا
تھا کہ ان نظریات کی تائید میں آپ نے جو دلائل دیئے وہ نہ صرف
قرآن مجید، انجیل، توریت، ، اور مختلف قوموں کی مذہبی کتابوں
پر مبنی تھے، بلکہ اقوام عالم کی سیاسی تاریخ، تہذیبی اور معاشرتی
روایات اور ذہنی رجحانات (ادب و فن وغیرہ) کے ریکارڈ پر
بھی تھے۔ حضرت خواجہ احمد زمان قدس سرہ، سندھ کی تاریخ میں
بزرگانِ دین کی حیثیت میں انتہائی منفرد شخصیت کے حامل تھے۔
آپ نے درگاہ لواری شریف کا انتظام اپنے والد ماجد حضرت خواجہ محمد
سعید قدس سرہ کی زندگی ہی میں سنبھالا اور ان ہی کی تربیت کی وجہ
سے آپ نے اپنے اجداد کی روایات کو مستحکم کیا۔ اور جماعت لواری
شریف کی اس انداز سے بنیاد رکھی کہ بزرگان کے روشن کئے چراغ کی
روشنی دائمی طور پر قائم رہے اور انسان کے دل کو منور کرتی رہے
آپ نے درگاہ لواری شریف سے وابستہ جماعت کو منظم کیا اور انسانیت
کو حق اور صداقت کی نئے سرے کی راہ دکھائی۔ سندھ کے بزرگانِ
دین میں آپ کا مقام اعلیٰ محض اس لئے ہے کہ آپ نے اس عہد کے
انسان کو نیکی کی راہ سے نئے سرے سے روشناس کرایا اور عالمگیر
انسانیت کا درس دیا جو آج کے معاشرے میں سب سے اہم مسئلہ بن گیا۔

جاذب قریشی

# شیدا جبلپوری کا "زادِ راہ"

شیدا جبلپوری کی کتاب "زادِ راہ" حیات و کائنات کا رخت سفر ہے۔ جس میں وحدت، رسالت، خلافت، امامت اور ولایت کی وہ روحانی، فکری اور تجرباتی روشنیاں موجود ہیں جو مٹی سے چل کر جنت کو نورانی فضاؤں تک سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

میں نے انہیں گزشتہ دنوں دو حوالوں سے جانا ہے ایک حوالہ تو ان کے بیٹے اور میرے یونیورسٹی فیلو، نئی نسل کے معروف شاعر اور ٹیلی ویژن کے سینئر پروڈیوسر اقبال حیدر ہیں جن کے توسط سے میں اس وقت ان سے ملا جب وہ ۱۹۸۵ء میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لیے جا رہے تھے اور میرے اور ان کے درمیان بہت سی باتیں رہیں۔ دوسرا حوالہ ان کا مجموعۂ کلام "زادِ راہ" ہے۔ جس میں حمدیں، نعتیں، منقبتیں اور مناجاتیں موجود ہیں۔ جس کے آغاز میں انہوں نے خود اپنے بارے میں اور اپنے خاندان کے بارے میں کچھ باتیں لکھی ہیں اور اس کا عنوان "احوالِ واقعی" رکھا ہے۔ احوالِ واقعی کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ

"احوالِ واقعی کے شمول کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاری میرے شخصی، خاندانی اور ذہنی پس منظر میں میری شاعری کا مطالعہ بہتر طور پر کر سکے۔ اس کا مقصد ہرگز ہرگز اپنی ذات کا اظہار اور نمود نہیں۔"

احوالِ واقعی پڑھ کر شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ شیدا صاحب اعلیٰ نسبی اور بہترین علمی و ادبی صلاحیتوں کے امانت دار رہے ہیں۔ وہ اپنا شجرۂ نسب یوں بیان کرتے ہیں۔

"میرے مورثِ اعلیٰ جدِّ امجد زمانہ ماضی میں سپہ سالار محمد بن قاسم کے ہمراہ فوج میں راجہ داہر والی سندھ کی سرکوبی کے لیے ہندوستان تشریف لائے تھے اور محمد بن قاسم کی واپسی کے بعد ہندوستان ہی میں بس گئے تھے۔ میرے دادا بزرگوار حاجی سید اسمٰعیل شاہ مرحوم و مغفور نوراللہ مرقدہٗ حیدرآباد دکن میں رہے پھر فوج میں میرٹھ چھاؤنی تبدیل ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دادا جان محترم کو ہجرت کرنا پڑی۔ در بدر پھرے آخر دوبارہ گلبرگہ شریف حیدرآباد دکن پہنچے مگر نظام حیدرآباد کے حالات ناسازگار

ہونے کی وجہ سے وہاں سے بھی واپس ہوئے۔ عزم اپنے آبائی شہر میرٹھ کا تھا مگر راستے میں صوبہ متوسط کا شہر جبل پور بہت پسند آیا تو وہیں مقیم ہو گئے۔ حکام رس تھے۔ دلی دربار میں کرسی نشین ہوئے۔ سرکارِ برطانیہ کی وائسرے کونسل کے ممبر ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے نوے لاکھ کا ٹھیکہ لے کر جبل پور سے بمبئی تک ریلوے جی آئی پی آر کے لیے پٹری بچھائی۔ جبل پور کے وسط شہر میں ایک عالی شان جامع مسجد تعمیر فرمائی اور اپنے خرچے سے سو مسلمانوں کو حج بیت اللہ کرایا۔ آپ دکنی برادری اور متی کے سرپنچ بھی تھے والد ماجد سید محمد علی شاہ مرحوم بی اے ملیگ ایل ایل بی ناگپور، جنوبی ہند کی دو ریاستوں کے دیوان رابرٹس کالج جبلپور کے پروفیسر اور عدالتِ عالیہ جبلپور کے ایڈووکیٹ بھی رہے۔ آپ انجمن اطلیہ ہائی اسکول کے بانیوں میں سے تھے اور متولی جامع مسجد جبلپور کے علاوہ تحصیلدار بھی رہے میرا شجرہ انتالیسویں واسطے سے حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔"

ماجاننے کے بعد شیدا صاحب کی شخصی وتخلیقی اہمیت کے لیے کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ شیدا صاحب کی ہم وتربیت میں ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کے پس منظر میں جو محرکات ملتے ہیں وہ اللہ کی محبت اور انسانوں خدمت کے لیے اپنی زندگی کو سپرد کر دینے والے ہیں۔ شیدا صاحب نے جو زندگی گزاری ہے وہ مشکلات اور توں کی زندگی ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے خاندانوں پر اگر کوئی وقت آ پڑا ہے تو افراد نے اپنی اعلیٰ قدروں سے ٹ کر مادّی خواہشوں کی سمت خود کو موڑ لیا ہے لیکن شیدا صاحب جتنا زندگی کی الجھنوں میں پڑتے گئے اتنا ہی اللہ رضا اور اس کے احکامات کو اپنے جسم وجان کا حصّہ بناتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر ایک ایسا کڑا وقت بھی آیا کہ رق العباد ادا کرنے کے لیے انہیں سخن کو بھی ترک کرنا پڑا وہ خود لکھتے ہیں کہ

"ابتدائی دور کا کلام تو جبلپور میں کئی سال دبائے طاعون کی بنا پر گھر سے بے گھر ہوتے رہنے کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکا اور جو بعد میں کہا وہ زمانے کی فتنہ انگیزی اور سیاست کی حشر سامانی کی نذر ہو گیا۔ پاکستان آیا تو مجھ پر ادبی جمود طاری ہو گیا کچھ کہنا چاہا تو عالم کسمپرسی میں یکسوئی نہ رہی خیالات منتشر ہو گئے کہ بیوی اور بچّوں کی خاطر مکان و معاش کی فکر بھی اہم تھی۔ واقف کار احباب کے بار بار اصرار پر تین چار مشاعروں میں گیا تو یہ دیکھا کہ پورے شعر کی ادائیگی سے قبل ہی شاعر کے گروہ بند طرفدار سنہ دیکھی داد دینے لگتے ہیں لیکن کسی اور کا کلام کتنا ہی بہتر ہو خاطر میں نہیں لایا جاتا ۔ چنانچہ اس رویئے اور تلاشِ روزگار کی جدوجہد میں شاعرانہ مجلسوں سے کنارہ کش ہو گیا۔ خدا خدا کر کے مکان و معاش کا کچھ بندوبست ہوا تو بدقسمتی کا دور پھر شروع ہوا اور میں سخت بیمار پڑ گیا معالج کے مشوروں کے تحت ترکِ سخن کیا لیکن اپنی علالت کے باوجود شب و روز محنت کر کے اپنی اولاد کو

تعلیم دلوائی اور بحمداللہ میرے چاروں بیٹے لائق فائق تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار ہیں "۔

شیدا صاحب اپنی علالت اور ذمہ داریوں کے پیشِ نظر فکرِ سخن سے منہ موڑ کر جگر کی مشقت میں مصروف رہے لیکن وہ اپنے رب کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حمد و نعت کی صورت اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے رہے اور جب حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کا موقع آیا تو اپنے اس کلام کو یکجا کر کے اُمیدِ نجات میں "زادِ راہ" کے طور پر حرمین تشریف لے گئے۔

شیدا صاحب درمیان میں ترکِ سخن کی بنا پر گمنام رہے لیکن ان کی شاعری ان کے جسم و جان کی سچی آواز ہے اس شاعری میں خیالی اُڑانیں یا فنی کارناموں کی اہمیت اور شہرت زیادہ نہ سہی لیکن یہ حقیقت خود کتنی اہم ہے کہ اس کتاب کا ایک ایک مصرعہ ان کے داخلی تجربے سے پیدا ہوا ہے اس شاعری کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم شیدا صاحب کے سوچے سمجھے معاملات کو نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان کی آتی جاتی سانسوں اور ان کی زندہ دھڑکنوں کی وہ صدائیں سُن رہے ہیں جو ان کے خون میں گردش کرتے ہوئے ان کے سادہ، پُر تاثیر اور سچے لفظوں میں اظہار پا رہی ہیں۔ وہ خیال و خبر کے شاعر نہیں، احساس و نظر کے شاعر ہیں۔ وہ اللہ سے لو لگائے عشقِ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ و اہلِ بیت کی محبت سے سرشار ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں بھی اور اپنی گفتگو میں بھی وہی باتیں کرتے ہیں جن کا تعلق اللہ کی رضا سے بنتا ہے ان کی حمد کے کچھ اشعار دیکھیے وہ اللہ کی وحدت کا اقرار یوں کرتے ہیں کہ

اے خدا تیرے سوا میرا خدا کوئی نہیں — ذات یکتا ہے تری اور دوسرا کوئی نہیں
پختہ ایمان کو ڈھا سکتا نہیں کافر کوئی — کعبۂ دل کے لیے تو ابرہا کوئی نہیں

اللہ اور اللہ کی عظمتوں کا شعور اور اس کا اظہار بھی دیکھیے۔

لائق حمد و ثنا وہ کردگار — جس نے کُن سے کر دیا سب آشکار
عرش پر لوح و قلم پیدا کیے — فرش پر دیر و حرم پیدا کیے
وہ ہے خلاقِ جہانِ شش جہات — خلق کیں اس نے ہزاروں کائنات
بحر و بر شمس و قمر ہفت آسماں — بر سرِ سطحِ زمین کوہِ گراں
آشکارا اس پر ہے انجامِ نمود — اُس پہ روشن عالمِ غیب و شہود

اللہ اور اس کی عظمتوں کو پورے وجود کے ساتھ ماننے کے بعد وہ اس کی بارگاہ میں یوں دعا کرتے ہیں کہ

اے خدا رکھتا ہوں اُمیدِ نجات — ہو مری جانب نگاہِ التفات
سینۂ تاریک کو پُر نور کر — قلب کو مثلِ چراغِ طور کر
وقتِ آخر کلمۂ توحید ہو — سبز گنبد کے مکیں کی دید ہو

شیدا صاحب کے یہاں سبز گنبد کے مکیں کی دید یوں بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدتیں اور ان کی محبتیں اس طرح محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے وہ لمحہ لمحہ ان کے سامنے ان کی نظر میں موجود ہوں۔ وہ سرکارِ دو عالم کو یوں پکارتے کہ ان کی دستگیری کا ان کو پورا یقین تھا۔ نبی کریمؐ کی عظمت کا احساس شیدا صاحب کے لیے ایک زندہ حقیقت رہا ہے جیسے وہ دیکھتے بھی محسوس بھی کرتے اور جسے وہ پا بھی لیتے حضرت حسانؓ سے لے کر شیدا صاحب تک نعت لکھنے والوں کے ان گنت نام ملتے ہیں ا ر جو کیفیت شیدا صاحب کے یہاں محسوس ہوتی ہے وہ خوش نصیبی کے بغیر نہیں ملتی ان کے کچھ نعتیہ شعر آپ کو سنانا چاہتا ہوں جو رسول اکرمؐ کے مختلف رخوں کو اظہار میں لاتے ہیں۔

انساں کی حقیقت کو بتایا تو نے
انسان کو انسان بنایا تو نے
قربان ترے صاحبِ لولاک لما
اللہ سے بندوں کو ملایا تو نے

محمد ظلِ سبحانی محمدؐ نورِ لافانی
محمدؐ شکلِ قرآنی محمدؐ لطفِ ربانی
مٹی ظلمت ہوئی شمعِ رسالت کی درخشانی
لیا نامِ محمدؐ مٹ گئی تاریک ویرانی

محمدؐ کیا ہیں فخرِ انبیاء ختمِ رسالت ہیں
مجسم ناطقِ قرآں سراپا علم حکمت ہیں
محمدؐ کیا ہیں خلاقِ دو عالم کی مشیت ہیں
وہ یکتائے زماں ہیں شاہکارِ دستِ قدرت ہیں

سلام اے مظہرِ عرفاں سلام اے نور یزدانی
سلام اے جلوۂ سبحاں سلام اے شمعِ نورانی
سلام اے معنیِ قرآں سلام اے شارحِ قرآں
سلام اے ناطقِ امر و نواہی رازِ حقانی

رسول اکرم کی ان عقیدتوں اور ان محبتوں کے ساتھ ساتھ شیدا صاحب نے سرکارِ دو عالم کی اہمیتوں کو ان کی صفات کو اور ان کے اثرات کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس حوالے سے بھی کچھ شعر دیکھئے

ازل سے ہے تا ابد نبیؐ کا
وسیلہ عالم کی بہتری کا
شرف وہ انسانیت کو بخشا
بلند رتبہ ہے آدمی کا
حضورؐ نے عقل کو جِلا دی
مٹا دیا جہل کافری کا
نہ کیوں ہو قسمت پہ ناز مجھ کو
میں اُمتی آخری نبیؐ کا

محمدؐ کو آخری نبی ماننے کے بعد شیدا صاحب اس دنیا میں ان کے اثرات کو اپنے لفظوں میں لکھتے چلے

جاتے ہیں۔ انسانی اقدار کو اور جسم و جان کو توازن کی جو اہمیت نبی کریمؐ کی ذات سے ملی ہے اُسے وہ یوں لکھتے ہیں۔

مٹی دختر کشی بد طینتی ارمان خود بینی ‍ ‍ ‍ ‍ مٹی بردہ فروشی چور بازاری و کم ظرفی
مٹا دی انتقامی خانہ جنگی حق کی پامالی ‍ ‍ ‍ ‍ مٹا دی بدنگاہی شر پسندی و زبوں حالی
رہی باقی نہ فرعونی نہ نمرودی نہ شدادی ‍ ‍ ‍ ‍ رہی باقی نہ بے دینی نہ بد خلقی نہ بیدادی

شیدا صاحب محمدؐ کے اثرات کو کائنات سے ماوراء تک دیکھتے اور رسولِ اکرمؐ کی اہمیتوں کو محسوس کرتے ہوئے چاہتے کہ کسی طرح انہیں بیان کر سکیں لیکن محبوبِ خدا کی صفات کا مکمل بیان کون کر سکا ہے اور کون کر سکے گا کہ خود اللہ کا قرآن ان کی صفات کا مظہر ہے۔ پھر بھی نبی کریمؐ کے جاں نثاروں نے یہ چاہا ضرور ہے۔ شیدا صاحب بھی اسی خواہش میں سرگرداں رہے۔ اور مختلف انداز میں اپنے اس احساس کو اظہار میں لانے کی خواہش کرتے رہے

آپ ہیں محبوبِ رب العالمین ‍ ‍ ‍ ‍ عرش پر معراج میں پہلو نشیں
سر سے پا تک نور ہے سایہ جسد ‍ ‍ ‍ ‍ احسن تقویم اللہ الصمد
وہ ازل سے تا ابد پائندہ ہیں ‍ ‍ ‍ ‍ مثلِ نور لم یزل تابندہ ہیں
اس مقدس ذات پر لاکھوں درود ‍ ‍ ‍ ‍ دوست رکھتا تھا انہیں ربِ ودود

شیدا صاحب کی شاعری میں نیکیوں کا تسلسل اور سچی محبتوں کی بے کرانی کا احساس شدت سے ہوتا ہے اللہ کے رسول کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ اور اہلِ بیت سے بھی اس کی عقیدتیں کم نہیں تھیں انہوں نے مختلف صورتوں میں سادگی اور سچائی کے ساتھ صحابہ کرامؓ اور خاندانِ رسول کا ذکر کیا ہے میں یہاں چند مختصر مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

محمد مظہر شانِ احد محبوبِ اکبر ہیں ‍ ‍ ‍ ‍ نیابت پر ابو بکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ ہیں
ہے صدیق اکبرؓ سے نامِ صداقت ‍ ‍ ‍ ‍ ہے فاروقِ اعظمؓ سے عدل و عدالت
ہے عثمانؓ حیادار سے شانِ عفت ‍ ‍ ‍ ‍ علیؓ کی بدولت ہے زورِ شجاعت



اور اب خاندانِ رسولؐ کی محبت دیکھیے۔

نگہبانِ شانِ حرم اہلِ بیت ‍ ‍ ‍ ‍ معزز مکرم وہ عالی دماغ
علیؓ، فاطمہؓ وہ حسنؓ وہ حسینؓ ‍ ‍ ‍ ‍ نبیؐ کے گھرانے کے روشن چراغ

خدا کی رضا اور اس کے اوامر و نواہی کا عملی سلسلہ شیدا صاحب کی تخلیقی اور شخصی زندگی میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا ہے۔ جس کی بہت سی مثالیں ان کی غزل میں بھی موجود ہیں۔ اس حوالے سے شیدا صاحب کے شعری موضوعات میں "احساسِ مرگ" کو بڑی شدت سے دیکھتا ہوں ان کی غزلوں میں یہ موضوع بار بار اپنا اظہار کرتا ہے کہ ان کے یہاں موت کی نوعیت تہذیبی اور مذہبی ہے۔ غالب کی طرح اڑنے سے پہلے نہ تو ان کا رنگ زرد ہوا ہے اور نہ ہی انھیں زندگی میں







ترسیل زر اپنے بینک کے ذریعے کیجئے۔

# محفوظ بھی اور
# باکفایت بھی

## فوری ترسیل کے لئے
## نیشنل بینک آف پاکستان

کی شاخیں ملک کے قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔
کراچی اور لاہور میں ٹیلی فیکس کی سہولت بھی۔

**Overseas Branches**

| | | |
|---|---|---|
| United Kingdom | i) | 18, Finsbury Circus, EC2M, 7BJ LONDON |
| | ii) | 30, Sloane Street, Knightsbridge Branch London SWIX 9 NJ Also at Manchester, Sheffield, Birmingham, Bradford, Edinburgh, Glasgow |
| United States | i) | 100, Wall Street, P O Box 500, New York N Y 10005, |
| | ii) | I U N Plaza, 1st Avenue, 44, East Street, New York N Y 10017, |
| | iii) | 1825, Connecticut Avenue, N W Washington DC 20009 Also at Chicago |
| Hongkong | | 324, Central Building, Queen's Road, G P O Box 3920, Central Hong Kong Also at Kowloon |
| West Germany | | 6000, Frankfurt Main Schwindstrasse 3, P O Box 101-643, Frankfurt |
| France | | 90, Avenue Des Champs Elysees, 75008 Paris |
| Japan | | Mori Building No 20 7 4, 2 Chome, Nishi Shimbashi, Minato Ku, P O Box Shiba 272, Tokyo 105 91 |
| Bahrain | | 9/10, Manama Centre, P O Box No 775, Manama State of BAHRAIN |
| Egypt | | 64 Gameat Al Dawal, Al Arabia Street, Mohandessin Giza, P O Box No 168 (Mohd Farid) Cairo |
| Republic of Korea | | Kyobo Building, 12th Floor 1 Chongro, 1 KA, Chongro-Ku KPO Box 1663 Seoul |
| People's Republic of China | | 435, Kunlun Hotel, 21, Liangmaqiao Chaoyang District Beijing. |
| Affiliate | | Bank Al Jazira, Saudi Arabia with 28 branches at all important cities of the Kingdom |

نیشنل بینک آف پاکستان — قومی ترقی قومی بینک